



Included in UGC Care List
ISSN : 2394-7381

ہماری آواز

گوشہ ادب اطفال

شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

شمارہ: 1-2
جلد نمبر: 21-22



ہماری آواز
گوشہ ادب اطفال

हमारी आवाज़
शैली-ए-अदब अलطفال

ISSN : 2394-7381

یو جی سی کیئرلسٹ میں شامل جرنل

ہماری آواز

Hamari Aawaz

شمارہ: جنوری تا جون - 2026

شمارہ: 1 جلد نمبر 26

- سرپرست اعلیٰ : پروفیسر سنگیتا شکلا (شیخ الجامعہ، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
سرپرست : پروفیسر اتویر سنگھ (ڈین فیکلٹی آف آرٹس، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
مدیر اعلیٰ : پروفیسر اسلم جمشید پوری (صدر، شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
مدیر : ڈاکٹر آصف علی (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
نگران : ڈاکٹر شاداب علیم (شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
مشیر : ڈاکٹر الکاوش ششہ، ڈاکٹر ارشاد سیانوی (شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
ایڈیٹوریل بورڈ : شا کرملوب (ریسرچ اسکالر)، اطہر خان (ریسرچ اسکالر)، سرتاج جہاں (ریسرچ اسکالر)
مہوش (ایم۔ اے سال دوم)، نایاب (ایم۔ اے سال دوم) محمد عابد (ایم۔ اے سال اول)
کمپوزنگ : سعید احمد سہارنپوری، محمد شمشاد (سی، سی، ایس، یونیورسٹی، میرٹھ)
قانونی مشیر : پروفیسر انجلی مثل (سابق پرنسپل، میرٹھ کالج، میرٹھ) ڈاکٹر محمد شعیب (ایڈوکیٹ)
مجلس ماہرین : EXPERT PANNEL

- ☆ پروفیسر یوسف عامر (جامعہ ازہر، مصر) ☆ ڈاکٹر تقی عابدی (کنناڈا)
☆ پروفیسر محمد غلام ربانی (ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش) ☆ ڈاکٹر سکینہ رسم علی بہادر (ماریشس)
☆ پروفیسر الطاف انجم (کشمیر) ☆ ڈاکٹر نعیم اصلاحي، راجستھان

قیمت: تازہ شمارہ: -/Rs. 500 مجلد: 550 بیرونی ممالک 5 امریکی ڈالر

ناشر: پروفیسر اسلم جمشید پوری

نصبہ اردو: چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

URL: <http://ccsuniversity.ac.in/ccsu/adminSdept/>

duccsumrt@gmail.com, aslamjamshedpuri@gmail.com,

muhammadshamshadinfo@gmail.com

Mobile: 09456259850, 9759238472

فہرست

ہماری آواز

5-6	پروفیسر اسلم جمشید پوری، میرٹھ	مدیر اعلیٰ کے قلم سے
7-8	ڈاکٹر آصف علی، میرٹھ	اداریہ
9		گوشہ: ادب اطفال
10-12	امیر مہدی، انگلینڈ	ادب اطفال: روحِ عصر اور تعمیر فرد کی شعریات
13-25	پروفیسر صغیر افرامیم، علی گڑھ	بچوں کے ادب کی ضرورت
26-29	حقانی القاسمی، دہلی	اردو کی ہم رشتہ زبانیں اور ادب اطفال
30-38	ڈاکٹر کبکشاں لطیف، مانو حیدر آباد	ادب اطفال میں چند اہم فرانسیسی تراجم
39-41	رونق جمال، دُرگ	اطفال ادب میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت
42-45	سینٹی سرونجی، بھوپال	اردو ادب اور بچوں کے رسائل
46-56	ڈاکٹر آصف علی، میرٹھ	بچوں کا پہلا ناول: مراۃ العروس
57-64	ڈاکٹر شاداب علیم، میرٹھ	ادب اطفال میں خواتین کا حصہ
65-68	ڈاکٹر وحیٰ اعظم انصاری، لکھنؤ	ڈیجیٹل عہد میں بچوں کا ادب: مسائل اور امکانات
69-88	ڈاکٹر عادل انصاری، لکھنؤ	اکیسویں صدی کے افسانوں میں بچوں کے مسائل
89-100	ڈاکٹر ارشاد سیانوی، بلند شہر	اطفالی نظمیں اور یونس غازی
101-108	ڈاکٹر شبنم شمشاد، راجوری	ساحر لدھیانوی بچوں کی دنیا میں
109-112	ڈاکٹر رضوانہ سٹشی	نشہِ مگت بھارت میں ادب اطفال کی اہمیت
113-115	ڈاکٹر تابش فرید، میرٹھ	ذہن اطفال پر اردو کہانیوں کے مثبت اثرات
116-119	ڈاکٹر شبتاں آس محمد، میرٹھ	ادب اطفال کا درخشندہ ستارہ: شفیع الدین نیر
120-135		بہار میں ادب اطفال کی روایت اور چند نمائندہ قلم کار
136-138	علما نصیب، سہارنپور	ادب اطفال میں اخلاقی و تربیتی اقدار کا تنقیدی جائزہ..
139-142	شاہ تاج خان، پونہ، مہاراشٹ	جدید اردو ادب اطفال اور خواتین سے وابستہ نئی توقعات

143-148	اطہر خان، میرٹھ	ادب اطفال اور افسر میرٹھی
149-152	محمد شمشاد، میرٹھ	بچوں کا ادب اور اردو کے ممتاز ادیب
153-156	محمد عابد، میرٹھ	ادب اطفال: ایک مطالعہ
157		کہانیاں
158-159	افسر میرٹھی	دو بیٹیاں
160-165	امیر مہدی، انگلینڈ	بے وقوف
166-169	پروفیسر اسلم جمشید پوری	ایمان کی دولت
170-171	مہتاب عالم پرویز، کویت	اوٹلیٹ
172-173	ڈاکٹر ارشد اقبال، مراد آباد	چمکتی دنیا اور نانی کی کہانیاں
174-176	ڈاکٹر شاداب علیم	چنٹو چلا سفید بنے
177	منور جہاں	نیکی کا بدلہ
178		نظمیں
179	اسماعیل میرٹھی	ہماری گائے
180	// // //	اسلم کی ٹی
181	ڈاکٹر یونس غازی	نیکی
182-183	ڈاکٹر فرقان احمد سر دھنوی	خلق کا پیکر
184	شبنم بیگم	علم کی دولت
185	اجرا احمد	علم نو نہال
186		مضامین
187-205	پروفیسر آمنہ تحسین، حیدر آباد	سلطانہ کا خواب: ایک تائیدی مطالعہ
206-212	ڈاکٹر آصف علی	اردو ادب کے فروغ میں علماء کا حصہ علامہ شبلی کی سوانحی خدمات کے خصوصی حوالے سے
213-220	ڈاکٹر ابراہیم افسر، دہلی	ڈراما ”دروازہ کھول دو“ کی عصری معنویت کا تنقیدی..
221-231	عامر مظفر بھٹ، کشمیر	شورش کاشمیری کی صحافت: شخصی اسلوب اور فکری....

232-239	ڈاکٹر چنید رکمانم، بلند شہر	اردو وطن و مزاح کی روایت میں میل کا پتھر: بطرس بخاری
240-243	سیدہ مریم الہی، میرٹھ	علم شخصیت نکھارتا ہے
244-248	نزهت اختر، میرٹھ	تخلیقی ذہن کا متفکر رہنما: مولانا ابولکلام آزاد
249-251	فرحت اختر، میرٹھ	مولانا امتیاز علی عرشی، بحیثیت محقق غالب
252-253	پروفیسر اسلم جمشید پوری	آہ! فاروق سید
254		تبصرے
255-258	ڈاکٹر آصف علی	خوشبو ادھر ادھر [ڈاکٹر فرقان سر دھنوی]
259-269	ڈاکٹر ارشد سیانوی	جدید ترقی پسندی [پروفیسر اسلم جمشید پوری]
270-272	ڈاکٹر ابراہیم افسر	حرفوں کا جادو [رشید حسن خاں]
273-274	اقبال حسن آزاد	جلتا پہاڑی سیارہ [ڈاکٹر اختر آزاد]
275-277	مفتی راحت علی صدیقی، دہلی	تذکرہ نگاری کی روایت اور تذکرۃ التحلیل
278-291	ادارہ	شعبۂ اردو کی سرگرمیاں
292-303	ادارہ	ادب نما کی خبریں
304-309	ادارہ	خطوط



مدیر اعلیٰ کے قلم سے

کسی بھی رسالے کا مستقل شائع ہونا اور مسلسل قارئین تک پہنچنا بڑی بات ہے۔ اس زمرے میں شعبہ اردو کا ”ہماری آواز“ شامل ہے۔ اس کا پہلا شمارہ 2003ء میں یوم ہر سید کے موقع پر سامنے آیا تھا۔ جب سے اب تک اس کے متعدد شمارے شائع ہوئے اور اس نے ادبی دنیا میں اپنی ایک شناخت قائم کی۔ ہر شمارے میں کوئی گوشہ یا کوئی خاص نمبر ہوا کرتا تھا۔ ہماری آواز میں اب تک اسماعیل میرٹھی، امتیاز علی خاں عرشی، انجم جمالی، مکلیشور، قرۃ العین حیدر، پریم چند، جنگ آزادی نمبر، حفیظ میرٹھی، بشیر بدر، بھارت بھوشن، غالب، اکیسویں صدی کی دودھائیوں کا فلشن نمبر، عارف نقوی نمبر وغیرہ کے علاوہ موجودہ شمارہ ادب اطفال کے گوشے پر مشتمل ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ اس رسالے کو یو جی سی کیئرلسٹ میں شمولیت کا موقع ملا۔ اس کا اپنا ISSN نمبر ہے اور یہ پری ریویو جرنل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ ہندی سیکشن میں ہمارے شعبے کے علاوہ دیگر شعبوں اور کالجز کے طلباء اور اساتذہ کے مضامین شامل ہوتے ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کا مغربی یو پی کا اور یونیورسٹی کے شعبوں سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد میں واحد جرنل ہے جو اردو کے ساتھ ہندی کی بھی خدمت انجام دے رہا ہے۔

اس جرنل کا مقصد اردو اور ہندی کے طلبہ و طالبات کو بین الاقوامی پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے۔ چونکہ یہ رسالہ بنگلہ دیش، جرمنی، انگلینڈ، مصر، امریکہ، کناڈا، ماریشش، پاکستان وغیرہ ممالک کے معتبر مصنفین اور مقالہ نگاروں کی تخلیقات سے مزین ہوتا ہے۔ یعنی اس کی رسائی ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں ہے۔ اس میں جن طلبہ و طالبات کے مضامین یا تبصرے شائع ہوتے ہیں ان کو دور تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے ساتھ ہی ساتھ یہ ایک ادبی ماحول بنانے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔

میرٹھ ادب اطفال کے لیے مشہور رہا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے بعد اسماعیل میرٹھی اور افسر میرٹھی کو بچوں کے ادیب و شاعر کے طور پر ساری دنیا جانتی ہے۔ ادب اطفال کی ضرورت، عہد حاضر میں اس کی معنویت اور بچوں کے ادیبوں کی تحریریں اس کا حصہ ہیں۔ ادب اطفال گوشے میں کوشش کی گئی ہے کہ اردو کے معروف ادب اطفال تحریر کرنے والے ادیب و شاعر شامل ہو سکیں تاکہ گوشے کو تقویت ملے اور یہ ایک یادگار شمارہ ثابت ہو اور یادگار شماروں کی فہرست میں اضافہ ہو سکے۔

گوشے کے علاوہ مضامین، افسانے، نظمیں، غزلیں، تبصرے، شعبہ اردو کی سرگرمیاں اور

شعبۂ اردو میں آنے والے مہمانوں کے تاثرات ساتھ ساتھ ادب نما کے پروگراموں کی ایک جھلک آپ کو دیکھنے کو ملے گی۔

شعبۂ اردو کے اساتذہ اور طلباء کا ایک مشن ہے۔ یہ مشن میرٹھ کو ایک ادبی دبستان ثابت کرنا ہے۔ یہاں بہت سارے ایسے شعرا پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے کلام سے بعد کی آنے والی نسلوں کو متاثر کیا۔ اسی لیے ہم نے 2022ء میں ایک شمارہ ”دبستان میرٹھ: شاعری“ شائع کیا جس میں ہم نے کوشش کی کہ میرٹھ کے معروف شعرا کو شامل کیا جائے۔ ان کے اوپر مضامین لکھے گئے اور ان کی تخلیقات کو شامل کیا گیا۔ پھر بھی کچھ شعرا ہمارے دائرے میں آنے سے رہ گئے۔ ان کو ہم ضمیمے میں شامل کریں گے۔ عنقریب ”ہماری آواز“ کا ایک ضخیم شمارہ ”دبستان میرٹھ: نثر“ شائع ہونے والا ہے۔ اس میں ہم کوشش کر رہے ہیں کہ میرٹھ سے متعلق تحقیق، تنقید، صحافت، ناول، افسانے، سفر نامے، خاکے، انشائیے، طنز و مزاح اور دیگر نثری اصناف کے فن پاروں اور ان کے تخلیق کاروں کو شامل کریں۔ آپ کے پاس بھی میرٹھ کے نثری سرمائے سے متعلق کوئی مضمون یا فن پارہ ہو تو ہم سے فوراً رابطہ کریں۔

میں اپنی پوری ٹیم [اردو۔ ہندی] کو اس کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں اور ان کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس شمارے کو منظر عام پر لانے کے لیے کافی محنت کی ہے۔

☆☆☆

پروفیسر اسلم جمشید پوری
مدیر اعلیٰ: ہماری آواز

ہماری آواز کا بچپن واں شمارہ ”گوشہ اطفال“ کی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں اگرچہ ہندی اور اردو کی دیگر تخلیقات بھی شامل ہیں لیکن شمارہ کا بنیادی مقصد ادب اطفال کی اشاعت ہے۔ کیونکہ بچے ملک کا مستقبل ہیں اور بچوں کا ادب کسی بھی معاشرے کی مستقبل کی تعمیر میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دیتا، زبان کی فہم کو بہتر بناتا اور اخلاقی اقدار کو ان کے دماغ میں راسخ کرتا ہے۔ یعنی یہ محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں شخصیت سازی کا مؤثر وسیلہ ہے۔ بچوں کے ادب میں کہانیاں، نظمیں، غزلیں، ڈرامے، ناول، ناولٹ، داستانیں، افسانے، افسانچے، بلکہ یوں کہئے کہ ادب کی ہر وہ صنف شامل ہے جو بچوں کے نازک ذہن اور نفسیات کے مطابق سادہ، سہل، دلکش اور سبق آموز ہو۔ وہ بچوں میں صداقت، محبت، اخوت، محنت، ایمانداری، دوستی، ہمدردی، کفایت شعاری اور انصاف و برابری کے اوصاف پیدا کرے اور انہیں اپنے سماجی اور ثقافتی ماحول کو سمجھنے میں مدد دے۔

بچوں کا ادب حیات انسانی کا ایک انتہائی اہم اور حساس شعبہ ہے۔ اس لیے ابتداء سے آفرینش سے اس کی روایت موجود ہے۔ لوریوں، لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کی صورت میں علم سینا کے بطور ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد تحریری روایات کے ساتھ ہی ادب اطفال کا بھی تحریری ظہور ہوا۔ ہندوستان میں ادب اطفال کا نقش اولین پنج تنز کی کہانیاں تسلیم کی جاتی ہیں۔ یہ کہانیاں شہزادوں کی تعلیم و تربیت اور اخلاقیات کی اصلاح کے مد نظر معرض وجود میں آئی تھیں۔ پالی اور پراکرت زبانوں کی جانتک کتھائیں اس سلسلے کی اگلی کڑی تھیں۔ پنج تنز کی کہانیوں اور جانتک کتھاؤں کے زیر اثر رفتہ رفتہ دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی پروان چڑھتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ اردو زبان کے آغاز تک یہ اچھی خاصی توانا صورت اختیار کر چکی تھی۔

اردو زبان اس اعتبار سے بڑی خوش نصیب ہے کہ اس کے اولین معتبر معمار حضرت امیر خسرو کے یہاں ہی ادب اطفال کے بڑے عمدہ، دلچسپ اور سبق آموز نمونے، پہیلیوں، کہہ مکر نیوں، دوستانوں اور الہنوں کی صورت میں دستیاب ہیں۔ گذرتے وقت کے ساتھ یہ روایت مزید تابناک اور دن بدن کیفیت و کمیت کے اعتبار سے وسیع تر ہوتی چلی گئی بالخصوص انیسویں صدی کے تعلیمی انقلاب کے بعد تو اردو کے ادب اطفال میں ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ اس نے پریوں، ماورائی کہانیوں اور اخلاقی تعلیم کی حدود سے گزر کر تخیل، سائنس، ٹیکنالوجی، مہم جوئی، سماجی حقائق، ماحولیاتی مسائل اور نفسیاتی عوامل جیسے

تمام عصری موضوعات سے خود کو ہم آہنگ کر لیا ہے جس نے اس ادب کو مزید با معنی اور موثر بنا دیا ہے۔ اب شاید ہی بچوں سے جڑا کوئی ایسا موضوع ہو جس پر اردو میں بھی خاطر خواہ ادب دستیاب نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عہد حاضر کے ڈیجیٹل نریشن بچوں کے ادب کو بھی متعدد چیلنجز کا سامنا ہے۔ ایک طرف بچوں کی دلچسپی اگر موبائل فون، انٹرنیٹ اور ویڈیوز میں بڑھ رہی ہے تو دوسری طرف اردو زبان کا دائرہ بھی بوجہ محدود ہوتا جا رہا ہے جس کا اثر لامحالہ بچوں کے ادب پر بھی پڑ رہا ہے۔ البتہ خوش آئند بات یہ ہے کہ اردو کے حساس ادیب اور ادارے بچوں کے ادب کو زندہ رکھنے اور اس کے دائرے کو مزید وسعت دینے کے لیے ہمہ تن کوشاں ہیں۔ نئی کتابوں، آن لائن پلیٹ فارمز اور ای بکس جیسے وسائل کے ذریعے بچوں کا ادب ان تک پہنچانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں اور نئے موضوعات پر بھی کام کیا جا رہا ہے تاکہ نئی نسل کے لیے یہ ادب پرکشش اور دلچسپ بن سکے۔

یہ اکیسویں صدی ہے اور اس میں تبدیلی کی رفتار کا عالم یہ ہے کہ 1822ء کے کمپیوٹروں کی رفتار پر سینکڑوں ایکڑ لین اینڈیشنز سے بھی متجاوز ہو گئی ہے۔ ایسے حالات میں ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ اردو زبان کی تعلیم کو فروغ اور بچوں کو ان کی دلچسپی اور ان کے مستقبل کی افادیت کے ادب کی دستیابی کو یقینی بنائے۔ اگر تخلیق کار اساتذہ، سرپرست اور معاشرہ مل کر اپنے حصے کی شمع روشن کریں تو اردو میں بچوں کا ادب نہ صرف زندہ رہے گا بلکہ ترقی کی نئی منازل بھی طے کرے گا۔

ہماری آواز کا یہ شمارہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ میں ”ہماری آواز“ کے اس شمارے کے تمام قلمی معاونین کا مشکور ہوں اور سبھی قارئین سے درخواست گزار ہوں کہ مفید مشوروں سے نوازیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر آصف علی

اسٹنٹ پروفیسر

گوشه ادب اطفال

ادب اطفال: روح عصر اور تعمیر فرد کی شعریات

ادب اپنی بنیاد میں انسانی تجربے کا وہ اظہار ہے جو لفظ کو معنویت اور جذبے کو حرکیات عطا کرتا ہے لیکن جب ہم ادب اطفال کی بات کرتے ہیں تو یہ کیونکر محض تفریح یا حکایت نگاری تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ ایک نسل کی فکری آبیاری اور تہذیبی تشکیل کا فریضہ بن جاتا ہے۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنا دراصل اس معصومیت کے جہان میں داخل ہونا ہے جہاں تخیل کی کوئی سرحد نہیں ہوتی اور جہاں ہر نیا لفظ ایک نئی کائنات کا دروازہ کھولتا ہے تاہم عصر حاضر میں بچوں کے ادب کو جن چیلنجز کا سامنا ہے وہ ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ اور ہمہ جہت ہیں۔ آج کا بچہ محض پریوں کی کہانیوں یا جادوئی طلسمات کا اسیر نہیں ہے بلکہ وہ ٹیکنالوجی کے اس دور میں سانس لے رہا ہے جہاں معلومات کا سیلاب اس کے گرد و پیش کو ہمہ وقت متاثر کر رہا ہے اس لیے آج کے تخلیق کار کے لیے سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ روایتی اخلاقیات اور جدید سائنسی شعور کے درمیان ایک ایسا توازن پیدا کرے جو بچے کی ذہنی نشوونما میں معاون ثابت ہو سکے۔ ادب اطفال کی روایت پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ سے سماج کی اخلاقی اور تعلیمی ضرورتوں سے جڑا رہا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اسلوب اور موضوعات میں جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ انسانی نفسیات کے ارتقا کی عکاسی کرتی ہیں۔ ایک دور تھا جب بچوں کے لیے لکھی گئی تحریریں محض پند و نصائح کا مجموعہ ہوتی تھیں جن کا مقصد بچے کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنا تھا مگر جدید تنقیدی شعور نے یہ ثابت کیا ہے کہ بچہ کوئی کوری تختی نہیں ہے بلکہ وہ ایک فعال ذہن کا مالک ہے جو اپنے گرد و پیش کا مشاہدہ کرتا ہے اور سوالات اٹھانے کی جرات رکھتا ہے لہذا اب وہ ادب زیادہ موثر ہے جو بچے کو براہ راست نصیحت کرنے کے بجائے اسے ایک ایسی کہانی یا ماحول کا حصہ بنادے جہاں وہ خود اپنی عقل اور ادراک سے سچ اور جھوٹ یا خیر اور شر میں تمیز کر سکے۔

اردو ادب میں بچوں کے لیے لکھی گئی تخلیقات کا سرمایہ بہت توانا ہے لیکن اس میں مزید تنوع اور گہرائی کی ضرورت ہمیشہ رہے گی کیونکہ ہر نیا دور اپنے ساتھ نئے استعارے اور نئی علامات لے کر آتا ہے بچوں کے لیے شاعری ہو یا نثر اس میں سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ ایک ایسی مٹھاس ہونی چاہیے جو ان کے تخیل کو ہمیز کرے اور ان کی لسانی گرفت کو مضبوط بنائے۔ شاعری کے حوالے سے دیکھیں تو بچوں کی نظموں میں لہجے اور ترنم کا عنصر کلیدی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ بچہ پہلے آواز سے متاثر ہوتا ہے اور

پھر معنی کی طرف راغب ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ نظمیں جو فطرت کے مناظر، جانوروں کی شرارتوں یا روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات پر مبنی ہوتی ہیں بچوں کے دلوں میں جلد گھر کر لیتی ہیں لیکن یہاں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ بچوں کا ادب محض بچوں تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ اسے بڑوں کے لیے بھی ایک ایسی کھڑکی بننا چاہیے جس سے وہ اپنے بچپن کی کھوئی ہوئی سچائیوں کو دوبارہ دیکھ سکیں۔ عصری تناظر میں ادب اطفال کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ بچے کو اس کی مٹی اور ثقافت سے جوڑے رکھے کیونکہ عالمگیریت کے اس دور میں جہاں ہر طرف ایک جیسی اشیاء اور افکار کا غلبہ ہے وہاں اپنی جڑوں سے وابستگی ہی وہ واحد راستہ ہے جو کسی بھی قوم کی شناخت کو زندہ رکھ سکتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم جدید علوم سے آنکھیں چڑالیں بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی لوک کہانیوں اور اساطیری قصوں کو جدید پیرائے میں اس طرح پیش کریں کہ وہ آج کے بچے کے لیے اجنبی نہ رہیں۔

بچوں کے ادب میں ایک اہم پہلو نفسیاتی باریکیوں کا بھی ہے تخلیق کار کو یہ جاننا ضروری ہے کہ کس عمر کے بچے کی ذہنی سطح کیا ہے اور اسے کن الفاظ اور خیالات کی ضرورت ہے چھوٹی عمر کے بچوں کے لیے جہاں تصویری کہانیاں اور مختصر جملے زیادہ کارگر ہوتے ہیں وہیں لڑکپن کی دہلیز پر قدم رکھنے والے بچوں کے لیے ایسی تحریریں درکار ہیں جو ان کے اندر جنس پیدا کریں اور انہیں کائنات کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی تحریک دیں۔ اس حوالے سے ہمیں عالمی ادب کے تراجم سے بھی استفادہ کرنا چاہیے تاکہ ہمارے بچوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ دنیا کے دوسرے خطوں میں بسنے والے ان کے ہم عمر ساتھی کس طرح سوچتے ہیں اور ان کے خواب کیا ہیں یہ عمل ان کے اندر وسعت قلبی اور انسانی ہمدردی کے جذبات کو فروغ دے گا جو کہ ایک پرامن معاشرے کی تشکیل کے لیے ناگزیر ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بچوں کے ادب کو محض ثانوی درجہ دیا جاتا ہے اور بڑے ادیب اسے سنجیدگی سے نہیں لیتے حالانکہ تاریخ گواہ ہے کہ جس قوم نے اپنے بچوں کے ذہنوں پر سرمایہ کاری نہیں کی وہ علمی اور فکری میدان میں کبھی آگے نہیں بڑھ سکی۔ بچوں کے لیے لکھنا دراصل ایک مشکل فن ہے کیونکہ اس میں آپ کو اپنی علیت کا رعب جھاڑے بغیر ایک معصوم ذہن کے ساتھ ہم آہنگ ہونا پڑتا ہے یہ ایک طرح کی تخلیقی ہجرت ہے جہاں آپ اپنے تجربات کی دنیا سے نکل کر حیرتوں کی اس بستی میں آباد ہوتے ہیں جہاں ایک تلی کا اڑنا یا ایک پھول کا کھلنا بھی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ ہوتا ہے۔

ادب اطفال کے فروغ کے لیے جرائد اور رسائل کا کردار ہمیشہ سے کلیدی رہا ہے کیونکہ یہ وہ پلیٹ فارم ہیں جہاں نئے لکھنے والوں کو اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ملتا ہے اور بچوں کو مسلسل نیا مواد میسر آتا ہے موجودہ دور میں جب ڈیجیٹل میڈیا نے کتاب کی جگہ لینے کی کوشش کی ہے وہاں رسائل کی ذمہ داری اور بڑھ گئی ہے کہ وہ اپنے مواد کو اتنا پرکشش اور معتبر بنائیں کہ بچہ سکرین سے ہٹ کر صفحات کی خوشبو میں پناہ تلاش کر سکے۔ ادب میں بچوں کی شمولیت محض ایک ضرورت نہیں بلکہ ایک تہذیبی تسلسل ہے اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زبان اور ہمارا ادب زندہ رہے تو ہمیں ایسے قارئین پیدا کرنے ہوں گے جو

بچپن ہی سے لفظ کی حرمت اور مطالعے کی لذت سے واقف ہوں اس مقصد کے لیے اسکولوں اور لائبریریوں کے ساتھ ساتھ گھر کے ماحول کو بھی کتاب دوست بنانا ہوگا جہاں والدین خود مطالعہ کر کے بچوں کے لیے ایک مثال قائم کریں کیونکہ بچہ جو دیکھتا ہے وہی سیکھتا ہے۔ آخر میں یہ بات سمجھنا بہت ضروری ہے کہ ادب اطفال محض ایک صنفِ سخن نہیں ہے بلکہ یہ ایک روشن مستقبل کی ضمانت ہے ہماری لکھی ہوئی ایک ایک سطر کسی بچے کے ذہن میں روشن ہونے والا وہ چراغ بن سکتی ہے جو کل کو کسی بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہو اس لیے ہمیں اس میدان میں بھرپور خلوص اور فنی مہارت کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ آنے والی نسلیں ایک ایسے فکری حصار میں پرورش پائیں جہاں ان کے پاس خواب دیکھنے کی جرات ہو اور ان خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے علم اور شعور کا ہتھیار موجود ہو۔



شعبہ اردو کے ہفتہ واری ادب نما کے ایک پروگرام بعنوان ”وقار رضوی اور اودھ نامہ“ کے شرکاء اور دائیں سے محترم امیر مہدی، انگلینڈ، پروفیسر اسلم جمشید پوری، پروفیسر صغیر افراہیم، ڈاکٹر کہکشاں عرفان، ڈاکٹر مجیب شہز، ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، پروفیسر رہنما پروین، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر موسیٰ رضا، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، ڈاکٹر عفت ذکیہ اور دیگر شرکاء کے علاوہ شعبے کے دیگر اراکین۔

بچوں کے ادب کی ضرورت

بچوں کے ادب کی ضرورت شاید اُس عہد میں ہی پیش آگئی تھی جب ہم تہذیبی دور میں داخل ہوئے تھے۔ اشاروں، کناہوں، جسم کے حرکات و سکنات کے بعد لور یوں، قصے کہانیوں، گیتوں اور نظموں کی تاریخ اس کی گواہ ہے کہ ماں کی گود سے سن بلوغ تک کی پرورش و نگاہداشت کے مقاصد میں یہ شامل تھا کہ بچے کو بغض و عناد، نفرت و تشدد سے محفوظ رکھتے ہوئے بنیادی ذمہ داریوں کو ذہن نشین کرا دیا جائے۔ اسی لیے خلوص و ایثار، حق و انصاف، حب الوطنی، اولوالعزمی اور نئی ایجادات سے اُسے برابر روشناس کرایا جاتا رہا ہے تاکہ بالغ ہو کر اُس پر مثبت اثرات مرتب ہوں۔ سیالکوٹ کی معروف ادیبہ فاکہہ قمر، ادب اطفال کے معیار کے تعلق سے لکھتی ہیں:

”ادب اطفال کا معیار ہمیشہ اس کی نثر نگاری اور مکالمے سے واضح ہوتا ہے۔ جس قدر مضبوط اور احسن انداز میں اس کی منظر نگاری کی جائے گی اور مکالمے اچھے سے پیش کیے جائیں گے، بچے اس قدر ہی راغب ہوں گے۔ لیکن اگر کہانی میں جگہ جگہ املاء کی غلطیوں کی بھرمار، نامکمل فقرے اور مشکل الفاظ استعمال ہوں گے تو بچے خود بخود اکتاہٹ محسوس کریں گے اور مطالعے سے دُور بھاگیں گے۔ موجودہ دور میں یہی مسئلہ نظر آ رہا ہے، جس کا سارا قصور ہم سائنس اور ٹکنالوجی پر ڈال کر بری الذمہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بچے کتب سے دُور ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ یہ کتابوں سے عشق کی آخری صدی ہے۔“

ہر دور میں بچوں کی تعلیم و تربیت اور اُن کے مستقبل کی فکر رہی ہے۔ دورِ حاضر میں ان کے حصول کی جتنی سہولتیں مہیا کی جا رہی ہیں، بالواسطہ طور پر نئی نسل مثبت اقدار سے دُور ہوتی جا رہی ہے جس کے ثبوت ہمیں عالمی وبا، کووڈ-۱۹ کے دوران ملے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس موضوع سے بے پناہ دلچسپی اور مسلسل عملی جدوجہد کی بدولت اب حکومت اور عدالت دونوں سطحوں پر زبان و ادب خصوصاً بچوں کی تعلیم کے تئیں کچھ اعلانات کیے جا رہے ہیں۔ یہ نیک شگون ہے۔ اس کے لیے ہم اُن تمام مجاہد علم و ادب کے ممنون ہیں جنہوں نے اُن گنت کوششیں کیں، اور اُن کی کاوشیں رنگ لارہی ہیں۔ اس صورتِ حال میں

ہم اردو والوں کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں بچوں کے ادب کو گھروں اور اسکولوں سے براہ راست جوڑنا ہوگا، اُن کی دلچسپی کے پیش نظر کتابوں اور رسالوں کو خریدنا ہوگا، یکسوئی اور دلجمعی سے پڑھنا پڑھانا ہوگا۔

آج بھی بیشتر ہندوستانی اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ مسئلہ لکھنے اور پڑھنے کا ہے۔ اس کا حل محض سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں میں اردو اساتذہ کا تقرر کرالینے سے پورا نہیں ہوگا بلکہ ہمارا یہ فرض ہوگا کہ نرسری، پرائمری سطح سے اعلیٰ درجات تک اس سے وابستہ منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے مثبت اقدام کریں۔ مثلاً بازاروں، دفاتروں اور اداروں کی فضا کو اردو کے حق میں سازگار بنانے کے ساتھ ساتھ والدین کے ذہنوں کو ہموار کرتے ہوئے بچوں کو اردو سکھانے کا جتن کریں۔ شاید یہ دور اس اعتبار سے اچھا کہلائے کہ بچوں کے لیے جدید ٹیکنالوجی پر مبنی دلچسپ رسالے اور کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ ”انمول موتی“، سیریز کے علاوہ ”صدائے اطفال“، ”گل بوٹے“، ”باغچہ“، ”کلیاں“، ”کھلونے“، ”بچپن“، ”پھول“، ”پھولاری“، ”اُمنگ“، ”پیام تعلیم“، ”گلشن اطفال“ جیسے ان گنت رسالوں نے اب تک تربیت کا یہ کام جس یکسوئی سے انجام دیا ہے، مستقبل کے پیش نظر ہمیں مزید دلجمعی سے پائیدار خاکہ تیار کرنے ہوں گے۔

ہمارے ملک میں بچوں کے ادب کا سرادراز، بہت دراز ہے۔ اردو کے در بچوں سے جھانکتے ہوئے دیکھیں تو اس کا سلسلہ ”خالق باری“ سے ملتا ہے اور خالق باری حضرت امیر خسرو کی تخلیق ہے یا عہدِ جہانگیر کے شاعر ضیاء الدین خسرو کی، یہ محقق جانیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ فارسی کی اُن گلی تھام کر ہم نے اردو ادب کا دامن پکڑا۔ صدیوں بعد، روایت سے ہٹ کر، ۶ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو سرسید احمد خاں نے کلکتہ کی مچھڑن لٹریچر سوسائٹی میں ”ترغیبِ تعلیم انگریزی“ کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا، جو فارسی زبان میں تھا اور جس میں اس امر کی ترغیب دی گئی تھی کہ مسلمانوں کو اپنے اسلامی، قومی اور دینی علوم کی تحصیل کے ساتھ انگریزی زبان اور اُس کے علوم بھی حاصل کرنے چاہئیں تاکہ نئی نسل دنیا کے جدید علوم و فنون سے بخوبی واقف ہو سکے۔ ۲

رفتائے سرسید کے ساتھ ساتھ پیارے لال آشوب، نواب سلطان جہاں بیگم اور شیخ عبداللہ عرف پاپامیاں نے اس نکتہ کی اہمیت و معنویت کو محسوس کیا اور اس جانب بے پناہ اور بے لوث خدمات انجام دیں۔ بیگم بھوپال نے اپنی ریاست کے علاوہ ملک کے دیگر حصوں میں قدیم و جدید تعلیم و تربیت میں معقول انتظام کیا اور اشاعت کی سہولتیں بھی مہیا کرائیں۔ شیخ عبداللہ نے مرکز و محورِ قلعہ علی گڑھ رکھا مگر اس کا دائرہ عمل بے حد وسیع کیا۔ علی گڑھ تحریک کے ہی خواہ، سرسید کے ساتھیوں میں محمد حسین آزاد کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے مظفر خنی نے اپنے مضمون ”اردو میں ادبِ اطفال“ میں لکھا ہے:

”مولانا محمد حسین آزاد نے جنھیں کرل ہالرائڈ نے پنجاب بلا کر بچوں کے لیے نصابی کتابیں تیار کرنے پر مامور کیا تھا، نہ صرف ایسی کتابیں لکھیں اور مرتب

کیس جو مختلف جماعتوں اور عہدوں کے طلبہ کی ضروریات کو پورا کر سکیں، بلکہ بچوں کے لیے دلچسپ نظمیں بھی تخلیق کیں، ان منظومات کے ذریعے دلنشین پیرائے میں مادی اور اخلاقی تعلیم دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۳

الطاف حسین حالی نے بچوں کی تعلیم و تربیت اور ذہنی نشوونما پر بھرپور زور دیتے ہوئے کئی نظمیں لکھیں جو آج تک نصاب میں شامل ہیں۔ شبلی نعمانی نے ”صبح امید“ اور ”عدل جہانگیری“ جیسی کامیاب نظمیں لکھیں۔ مولوی ذکاء اللہ نے تدریسی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے سائنسی اور سماجی علوم سے متعلق کتابوں کو آسان اردو میں منتقل کیا۔ اس دائرے سے ہٹ کر ادب اطفال کو فروغ دینے میں اسماعیل میرٹھی، عبدالعلیم شرر، انشاء اللہ خاں انشاء، خواجہ حسن نظامی، شفیع الدین ثیر بھی قابل تعظیم اور لائق تحسین ہیں، جنہوں نے نو نہالان وطن کا خاص خیال رکھا۔

بیسویں صدی میں شیو برت لال ورم، راشد الخیری، پریم چند اور پنڈت بدری ناتھ سدرشن بہت اہم ہیں جنہوں نے افسانوی اور غیر افسانوی تحریروں کے ذریعے بچوں کے ادب کو توانائی عطا کی ہے۔ دہلی، اودھ، حیدرآباد، پنجاب اور مملکت کے پرنٹ اور پبلشر بھی معاون ثابت ہوئے۔ طرح طرح کے رسائل جاری ہوئے جن میں چرند و پرند، حیوانات و نباتات کو عنوان بنا کر فن پارہ خلق ہونے لگا جو ادب، تہذیب، تعلیم اور تربیت کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا۔ دیانرائن گم اور نیاز فتح پوری نے ”زمانہ“ اور ”نگار“ میں گوشے نکالے۔ پریم چند نے ”بکمالوں کے درشن“ کے عنوان سے بچوں کے لیے اردو میں نصابی کتاب تیار کی جو اللہ آباد کے مشہور اردو ناشر، رام نارائن لال نے ۱۹۲۹ء میں شائع کی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ماہرین تعلیم کی نشاندہی پر بچوں میں جذبہ شوق بیدار کرنے کے لیے عالمی اور علاقائی ادب کے تراجم پر خاص توجہ دی جانے لگی۔ ”چنداماؤور کے“ جیسے نرم و نازک اور میٹھے بولوں میں ہلکی ہلکی چٹکی، خاموشی، ستانا، تہنائی، جھولا، بستر اور گود کو علامت بنا کر لوریوں کی اشاعت کا چلن عام ہو گیا۔

نور نظر، میرے لخت جگر تو بھی سو جا کہ تجھ کو سلاتی ہوں میں
تیرا سکھ چین ہے میرے پیش نظر اپنی باہوں میں جھولا جھلاتی ہوں میں

نیند کھڑی ہے باہیں پیارے کر آرام اب راج دُلا رے
ہر سو خاموشی چھائی ہے ساری دنیا سو گئی پیارے
حالانکہ آج لوریوں کا چلن کم ہو گیا ہے۔ پھر بھی مسلسل نظروں سے گزرتی رہتی ہیں۔ حافظ کرناٹکی اپنی لوریوں کے مجموعے ”لورستان“ میں لکھتے ہیں:
”مجھے خوشی ہے کہ میری لوریوں کو بچوں اور بچیوں کے علاوہ ماؤں نے بھی بے حد پسند کیا۔“

مختلف پہلوؤں اور دلکش زاویوں سے، شناخت و پہچان کے نئے نئے طریقے اپنائے جانے

لگتا کہ بچے کھیل کھیل میں علمی، ادبی، تاریخی، ریاضی، سائنسی اور لسانی اسباق سے واقف ہو سکیں لہذا بیت بازی، لسانی کھیل، طبی اور سائنسی کونز کے ذریعے اخلاقی اقدار کی جانب راغب کیا جانے لگا۔ تفریح کے ان وسائل میں نصیحت اور ہدایت کو بالواسطہ طور پر اس طرح تحلیل کر دیا جاتا کہ وہ ذہن و جسم کی نشوونما میں معاون ہو سکیں۔ خوشحال زیدی نے نصف صدی قبل کہا تھا:

”--- بچہ اپنی ماں کو دیکھتا ہے۔ اپنے آس پاس کے ماحول کو دیکھتا ہے۔ ایک سال سے تین سال کی عمر تک وہ آس پاس کی چیزوں کو پہچاننے لگتا ہے، بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ چھ برس سے دس برس کی عمر میں بچہ دنیا کی ہر شے میں دلچسپی لینے لگتا ہے، وہ ہر چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنے آس پاس اور اپنے ماحول میں نظر آنے والی چیزوں کے ساتھ وہ اپنے متعلق اور دنیا کی تمام چیزوں کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین اور بے قرار رہتا ہے۔“

آج ہم اکیسویں صدی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کل اور آج میں بہت زیادہ فرق آچکا ہے۔ ذرا اُنیسویں صدی کی آخری دہائیوں کو یاد کیجیے۔ سرسید اور اُن کے رفقاء، انگریزی تعلیم پر زور دے رہے ہیں۔ صاحبِ حیثیت اور ذی شعور حضرات اس سے فیض اُٹھا رہے ہیں۔ علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک سے متاثر ہو کر، دوسری تعلیمی انجمنیں، تنظیمیں، اس بنیادی ضرورت کو عوامی تحریک کی شکل دیتے ہیں تاکہ یہ فلاحی، اصلاحی اور تعمیری جذبہ ہر بستی، ہر کوپے میں پہنچ سکے۔ اس نقش قدم پر چلنے والوں میں ایک نام قاضی محمد جلال الدین سخا بھی ہے جو انگریزی زبان کی طرف بڑھتے ہوئے زحمان کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور اُس کے فروغ کے اسباب تلاش کرتے ہوئے ”خالق باری“ کو اینگلو اورینٹل خالق باری کے نام سے ۱۹۰۱ء میں منظر عام پر لاتے ہیں۔ اس کا ترمیم شدہ ایڈیشن ۱۹۱۵ء میں چھپواتے ہیں۔ وہ مذکورہ کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

”ضرورتِ زمانہ کے موافق ایک انگریزی خالق باری تیار کی جائے جو ترتیب الفاظ ترجمہ صحیح کے لحاظ سے لائق پسند ہر خاص و عام ہو اور الفاظ انگریزی وارد ہو، ایسی بحر و میں نظم کیے جاویں جو اردو میں مرغوب طبع انام ہوں۔“

اس کاوش کے لیے انھوں نے مدرسوں اور اسکولوں میں رائج ”خالق باری“ کے اُس طرز کو اپنایا جس سے ہندوستانی واقف تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

”چوں کہ خالق باری کا مفہوم عام ہے اس لیے میں نے اس رسالہ کا نیا نام تلاش کرنے کی فکر کرنا فضول سمجھا اور اس تصنیف جدید کو اینگلو اورینٹل خالق باری کے نام سے موسوم کیا تاکہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہو جائے کہ اس میں انگریزی الفاظ کا اردو ہندی یا فارسی ترجمہ نظم میں کیا گیا ہے۔“

در اصل 'خالق باری' ایک ایسی منظوم تصنیف ہے جو عرصہ دراز تک حضرت امیر خسرو سے منسوب رہی ہے اور پھر جدید تحقیق نے جس کے بارے میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ عہدِ جہانگیر کے ایک شاعر ضیاء الدین خسرو کی تخلیق ہے اور ایرانی و تورانی پناہ گزینوں اور ہندوستانی بچوں کو فارسی عربی الفاظ سکھانے کے واسطے لکھی گئی تھی اور صدیوں سے ہمارے نصاب میں شامل تھی۔ حافظ محمود شیرانی اور مولوی عبدالحق کے مطابق بیسویں صدی تک اس کے تقریباً چالیس ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ اس کی بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے اس کے طرز پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں مگر سب کے وزن اور بحر میں بڑی یکسانیت رہی ہے۔ البتہ قاضی محمد جلال الدین نے یہ جدت پیدا کی کہ مختلف اوزان میں اشعار محض اس وجہ سے شامل کیے کہ بچے آسانی سے انھیں یاد کر سکیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ گا کر، گنگنا کر پڑھنے والی چیزیں طالب علموں کو جلد یاد ہو جاتی ہیں جیسے ریاضی کا سبق، پہاڑے، دن، مہینے وغیرہ۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

جون، نومبر جانیے

اپریل، ستمبر

۲۸ کی ہے فروری

باقی سب ۳۱

اس طرح کی نغمگی سے فائدہ اٹھا کر بہت پہلے تاریخ کی کتابیں، مثنوی کے فارم میں منظوم کر دی جاتی تھیں۔ شاہنامہ کے بہت سے واقعات کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ بعد میں گرامر کی کتابیں بھی اسی طرز پر لکھی گئیں۔ لیکن اردو کے ذریعے انگریزی سکھانے کی، ایک سو پچیس سال پہلے، غالباً یہ پہلی کوشش ہے۔ اس میں انگریزی کے مترادف الفاظ جو منظوم کیے گئے ہیں وہ مثنوی اور غزل دونوں کی ہیئت میں ہیں۔ غور کیجیے، انیسویں صدی میں غزل حیات و کائنات کے دیگر مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے بھی عشق و عاشقی کی زبان تھی لیکن قاضی محمد جلال الدین نے اس نازک صنف کو لغت نویسی کے لیے بھی استعمال کر لیا گویا غزل میں ایک نیا امکان دریافت کیا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ٹو وٹ چاہنا اور ٹوکٹ کاٹ لینا
ہے پڑھنا ٹو ریڈ اور میریٹ لیاقت

ہے اسٹک چھڑی امبر یلا ہے چھتری
ڈفیکٹ عیب اور ویکٹیس ہے نفاہت

ہلنڈر ہے بھول اور مسٹیک غلطی
انرجی ہے چستی پریکٹس مہارت

فعلون فعلون فعلون (جو اس شور سے میرا روتا رہے گا) یعنی وزن پر مصرع کون سا ہے یہ بھی

بتا دیا ہے۔

رنگوں، مہینوں، دنوں، پرندوں، جانوروں کے نام کے ساتھ روزمرہ زندگی اور گھر بیلو استعمال کی چیزوں اور عام مشاہدے میں آنے والی اشیاء کے لیے انھوں نے ایک منظم طریقہ استعمال کیا اور ۳۴۶ شعروں کے لیے ۱۳۴۵ انگریزی الفاظ منتخب کیے جو روزمرہ، بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔ مذکورہ رسالہ اپنے وقت میں بیحد مقبول رہا۔ دونوں ایڈیشن کے ختم ہونے کے بعد تیسرے ایڈیشن کی جانب توجہ نہیں دی گئی۔ شاید اس وجہ سے اس کی مقبولیت کچھ لوگوں کو راس نہ آئی ہو اور پبلشروں نے غفلت برتی ہو یا پھر سودوزیاں کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئے نئے نصاب کو رائج کرنے کے ہوڑے میں، اور پھر رنگ برنگی کتابوں میں، نہایت دلچسپ تصویروں کی شمولیت نے اردو ادب کے اس بے نظیر اور مایہ ناز کارنامہ کو پیچھے ڈھکیل دیا ہو۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ یہ ایک طویل عرصہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اوراق پر پڑی ہوئی گرد کو آخر کار اُن کے پوتے قاضی نصیر الدین جلالی نے صاف کیا۔ اور بڑے تزک و احتشام اور ہندی کی شمولیت کے ساتھ وہ اسے ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر لائے۔ لکھتے ہیں:

”ایک لمبے عرصہ کے بعد اللہ رب العزت نے مجھے توفیق عطا فرمائی ہے کہ میں اپنے دادا صاحب کے اس عظیم شاہکار کو، اس کے تیسرے ایڈیشن کی شکل میں آپ سب کے سامنے ایک بار پھر پیش کروں تاکہ ان کی اردو ادب کی یہ خدمت آج کی نسل کے طلبہ کے لیے فائدہ مند ثابت ہو اور وہ اس سے مستفید ہو سکیں۔“

اس نئے ایڈیشن میں اردو کے مشکل الفاظ کے ہندی معنی بھی ہر سبق کے آخر میں، دیوناگری میں دے دیئے گئے ہیں تاکہ اردو سے پوری طرح واقفیت نہ رکھنے والے طالب علم بھی اس سے فائدہ اٹھاسکیں۔ قاضی نصیر الدین اس بابت لکھتے ہیں:

”فی زمانہ اردو زبان کی بد قسمتی اور فقدان کو مد نظر رکھتے ہوئے اصل تحریر کو بحسنہ پیش کرتے ہوئے ہر شعر کو ہندی میں بھی تحریر کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر سبق کے آخر میں اردو کے مشکل الفاظ کے معنی بھی ہندی میں لکھ دیئے ہیں تاکہ اردو سے کم نمئی رکھنے والے طلبہ اور شائقین حضرات ہندی کی مدد سے اس کو با آسانی پڑھ سکیں۔“

دودھائی قبل شائع ہونے والے ایڈیشن کی اہمیت اور افادیت اس وجہ سے بھی بڑھ گئی تھی کہ اسے ہندی رسم خط میں بھی لکھ دیا گیا تھا گویا یہ اردو، انگریزی لغت کا بھی کام دے رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہندی، انگریزی لغت کا نمونہ بھی بن گئی۔ عام طور سے لغات Bilingual (ڈولسانی) ہوتے ہیں لیکن اس میں ہندی رسم خط کی شمولیت کی وجہ سے Trilingual، (سہ لسانی) ڈکشنری کی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں۔ ہندی والوں کے لیے بھی یہ کتاب دو لحاظ سے مفید ہو گئی ہے۔ اول یہ کہ ہندی رسم خط کی وجہ سے انگریزی الفاظ کے معنی انھیں معلوم ہو جائیں اور دوم یہ کہ ہندی والے بہت سے ایسے اردو کے الفاظ

سے بھی واقف ہو جائیں جو پہلے سے اُن کے علم میں نہیں تھے۔

ہم سب اس سے بخوبی واقف ہیں کہ بچے قوم کا مستقبل اور ملک کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اس لیے ان کی معقول تعلیم، صحیح تربیت، اچھی پرورش، سلیقہ مندانہ نگہداشت اور ڈسپلن کا پابند بنانا تعلیمی اداروں کا اولین فرض ہے۔ وقت کے تقاضوں کے مطابق مثبت اور صحت مندر پر داخت سے نونہالان وطن مہذب انسان اور باوقار شہری بن سکتے ہیں تب کہیں جا کر اُن کے ذریعے ملک و ملت اور قوم و وطن کی ترقی کی امید کی جاسکتی ہے۔ لہذا اساتذہ اور انتظامیہ کے لیے بدلتے ہوئے منظر نامے کے تحت طلباء کی ضرورتوں اور اُن کی نفسیات کے بنیادی اصولوں سے واقف ہونا از حد ضروری ہے۔ اس کو تقویت دینے میں بہت سے نام نمایاں ہیں جن میں خوشحال زیدی اور مظفر حنفی، شاگرد اور اُستاد کی بے لوث خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تحقیقی مقالے روز لکھے جارہے ہیں۔ مقالہ نگار اور نگراں دونوں کی محنت بھی رنگ لاری ہے مگر بچوں کے ادب کے تعلق سے خوشحال زیدی اور اُن کے سُر وائر پر و فیسر مظفر حنفی کی محنت اور مہارت قابل رشک ہے۔ میں نے اپنے وطن اناؤ اور اس سے ملحق صنعتی شہر کانپور میں جس طرح اس موضوع کو گھر گھر پہنچتے دیکھا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال اب تک سامنے نہیں آئی ہے۔ ان شہروں میں خوشحال زیدی کے بڑے بھائی جان احمد زیدی جو ادبی حلقہ میں تسکین زیدی کے نام سے مشہور تھے، وہ خود اسکول جاتے، انتظامیہ، اساتذہ، بچوں اور ان کے سرپرستوں سے ملنے اور ادب اطفال کی جانب راغب کرنے کے ہر جتن کرتے۔ یہی کیفیت اُن کے اُستاد پر و فیسر مظفر حنفی کی تھی۔ ’چنداماموں‘، ’کھیل کھیل میں‘، ’نرسری کے گیت‘، ’بول میری بینا‘، ’حلوہ چور‘، ’نیلا ہیرا‘، ’تاک دھنا دھن‘، ’ہائے اللہ‘ اور ’سُر زمیں ہند‘ نہ صرف فکری اور فنی اعتبار سے منفرد فن پارے ہیں بلکہ یہ تاثر دینے میں بھی پوری طرح کامیاب ہیں کہ اعتدال اور توازن ہی حیات انسانی کا حُسن ہے۔ ان بزرگوں نے ملک کے بدلتے ہوئے منظر نامہ کے تحت عام و خاص ادب سے زیادہ بچوں کے ادب کی اہمیت کو ہر زاویہ سے اُجاگر کیا کیوں کہ بقول عشرت ظفر:

”بچوں کا ادب تخلیقی ادب کی خشت اول ہے۔ عالمی سطح پر اگر دیکھا جائے تو دنیا کی تمام زبانوں کے قلم کاروں نے کسی نہ کسی طور پر بچوں کا ادب ضرور تخلیق کیا ہے۔ بعضوں نے اسی کو اپنی زندگی کی متاع عزیز سمجھا۔“

نامور ادیبوں نے اس جانب بھرپور توجہ شاید اس وجہ سے نہیں دی کہ بچوں کے لیے ادب لکھنا آسان نہیں ہے۔ ”پھول ایک ہی چمن کے“ (۱۹۹۵ء)، ”ہریالی“ (۲۰۰۴ء) اور ”چراغ پھولوں کے“ (۲۰۱۸ء) کے خالق کوثر صدیقی نے اس نکتہ کی وضاحت ان لفظوں میں کی ہے:

”ہم اکثر بچوں کے ادب کی تخلیق کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ بچوں کی شاعری نہ مشاعرہ لوٹنے کے کام آتی ہے، نہ اس سے عوامی شہرت حاصل ہوتی ہے لیکن بچوں کے شاعر یا ادیب ہونے کی حیثیت سے جو ناموری حاصل ہوتی ہے وہ شعلہ خُس نہ ہو کر ہمیشہ روشن رہنے والے چراغ کی ہوتی ہے۔ بچے ہمارا

مستقبل ہیں۔ وطن کے چمن میں اُن کی حیثیت پھولوں کے ایسے چراغ کی ہے جن سے ہمارا مستقبل روشن رہتا ہے۔ خدا کرے میرے چمن کا ہر پھول چراغ بن کر ملک اور سماج کے تمام گوشوں کو روشن کرتا رہے۔

معروف دانش ور ظ. انصاری نے لکھا ہے:

”بچوں کا ادب، لکھنے کو خود سچے بنا پڑتا ہے، لیکن کیسا بچہ۔۔۔؟ وہ جس کو مشکل سے مشکل بات مزے مزے میں کہنا آتی ہو۔ تم جانو، یہ خود بہت مشکل کام ہے۔ بہت سا پڑھو، بہت سا سوچو، خود اپنا لکھا ہوا کاٹ کاٹ کر بھیٹو، تب کہیں جا کر مشکل، آسان ہوتی ہے۔“

وہ اس تعلق سے مزید لکھتے ہیں:

”اچھی زبان سکھانا بھی، بچوں کے ادب کا ایک مقصد ہے، جن کتابوں، کتابچوں کو وہ بچپن یا لڑکپن میں شوق سے پڑھ لیں گے، اُن کی زبان کا ذائقہ پکے بالوں کی عمر تک منہ میں رہے گا۔ تب بھی اس کی جگہ لی کیا کریں گے۔ زبان کی خوبی، ماں کی مامتا کا ایک ٹکڑا سمجھو۔ زبان ایسی لکھی جائے جو بہت کچھ تو جانی پہچانی ہو اور کسی قدر انجانی کہ پڑھنے میں مزہ ملے تو آگے جانے کا شوق بھی لگا رہے۔ جانی پہچانی، نرم اور رواں زبان اگر ماں کا لاڈ ہے تو انجانے لفظ اور محاورے ماں کی گھڑی ہیں لیکن اس گھڑی میں بھی ایک چاؤ ہوتا ہے۔“ ۶۔

بچہ بچپن میں جن باتوں کو ذہن نشین کر لیتا ہے، وہ عمر کے ہر حصہ میں معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ اسی لیے ادب اطفال کو زیادہ اہم مانا جاتا ہے، جیسا کہ میں نے مذکورہ بالا سطور میں ذکر کیا ہے۔ اطہر پرویز، م. ندیم، شفیق الدین ٹیر، کوثر چاند پوری، صالحہ عابد حسین، جگن ناتھ آزاد، علقہ شلی، بانو سرتاج وغیرہ نے اس سلسلہ میں الگ شناخت، الگ پہچان قائم کی۔ انھوں نے دلچسپی، سادگی، اختصار اور حسن پر زور دیا۔ بچوں کی نفسیات، مزاج، پسند اور ناپسند کو ملحوظ رکھا۔ مشکل اور غیر مانوس تراکیب سے دُوری بنائی۔ تلفظ کی صحیح ادائیگی کے لیے زیر، زبر، پیش، تشدید وغیرہ کا اہتمام کیا۔ انتہائی سادہ زبان میں تفریح کے جدید نقش و نگار کو نصیحت اور ہدایت میں خوبی سے تحلیل کر دیا۔ انھوں نے بھی اپنے بزرگوں کی طرح ہولی، دیوالی، عید، شبِ برات، محرم، گائے، ہرن، بھالو، خرگوش، بندر، کتا، بلی، بکری، طوطا، مینا، پھول، چٹی، جگنو، پتنگ، گھڑی کا سہارا لیا مگر ساتھ ہی ساتھ ریل، جہاز، کار، ریڈیو، ٹی وی، موبائل، کمپیوٹر کو بھی نشان زد کیا، اور ان کے ذریعہ سائنس کی نامور ہستیوں سے بھی متعارف کرا دیا۔

یہ منظر نامہ شاہد ہے کہ ادب اطفال، بچوں کی نشوونما اور ارتقاء میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ ادب اطفال بچوں کی ابتدائی نشوونما اور ذہنی ارتقاء میں معاونت کرتا ہے، بچہ، سب سے پہلے امیج کی طرف لپکتا ہے، اسے جانوروں کی تصویریں خاص طور سے متوجہ کرتی ہیں۔ ان کو لفظوں

کے بجائے اس کی شکل و شباهت اور صورت سے پہچانتا ہے چونکہ وہ لفظ کی معنویت سے بیگانہ ہوتا ہے، شعور آتے ہی وہ لفظوں میں معنوی پیکر دیکھتا ہے۔ اسی لیے بچوں کو تصاویر کے ذریعے لفظوں کی معنویت تک رسائی کرائی جاتی ہے، تاریخ گواہ ہے کہ بچوں کے لئے دنیا کی قدیم ترین کہانیاں ”پنچ تنتر“ سے سنائی یا پڑھائی جاتیں، جن میں کہانی کو جانوروں کی تصویریں عیاں کرتی ہیں۔ فطری طور پر بچے کہانی سے دلچسپی رکھتے ہیں جس کی وجہ کہانی کم تصاویر زیادہ ہیں۔ اس طرح ادب اطفال کئی معنوں میں اہمیت کا حامل ہے۔ شعبہ تعلیم کے تئیں ماضی قریب کی ہدایات نے دورِ حاضر میں اس کی اہمیت اور افادیت کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ جدید ترین تعلیمی نصاب کے نسخہ مجرب نے زندگی کے مختلف شعبوں کا احاطہ کر لیا ہے اور انسانی ذہن کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے کے لیے آج اس سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔

کچھ بچے فطری طور پر جھگڑالو ہوتے ہیں، ان کی جبلت میں شرارت موجود ہوتی ہے، جس کو قابو میں رکھنے کے لیے ادب اطفال نمایاں کردار ادا کرتا ہے، بچوں کی تخلیق میں نظم و ضبط، اخلاقی اقدار کو کلیدی اہمیت دی جاتی ہے، بچے اخلاقی اقدار کی پاسداری کسی کے سمجھانے سے نہیں کرتے، بلکہ یہ کہانیاں یا نظمیں ہی ان کی منفی سرشت کو مثبت سوچ میں بدلتی ہیں۔ کسی خوبصورت چیز کو توڑنا، پھوڑنا اور بھینکنا وغیرہ بچوں کی عادت، فطرت میں شامل ہے، اس جبلت کو قابو میں رکھنے کے لیے بھی بچوں کو اخلاقی درس دیتے ہوئے سبق آموز کہانیوں کی مدد لی جاتی ہے۔

بچوں میں رشتوں کی پہچان اور حفظ مراتب کا خیال بھی ادب اطفال کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ بچے غیر جذباتی ہوتے ہیں لیکن والدین اور دیگر بڑوں کے جذبات کا احترام کرنا اور سیکھنا بھی ضروری ہے جس کا احساس بچوں میں نہیں ہوتا، اس کی کو بھی ادب اطفال ہی پورا کرتا ہے۔

تعلیم اور ہنر کی اہمیت بچپن میں سمجھ میں نہیں آتی مگر بچوں کو راجاؤں، بادشاہوں کی فتوحات اور کامیاب و کامران شخصیات کی کہانیوں کو وہ سننے کے مشتاق رہتے ہیں، دیو، پریوں اور راکشس کے قصے جہاں انھیں ڈراتے ہیں وہیں انہیں محظوظ و محفوظ بھی کرتے ہیں، فتوحات کی کہانیاں انہیں بہادری کی طرف اور لیجنڈز کی کامرانیوں کی کہانیاں ان کے شعور میں اپنی جگہ بناتی ہیں جس کا اظہار جوانی میں ہوا کرتا ہے۔ جیسے جیسے بچوں کی عمریں بڑھتی ہیں، ان کی سوچ میں بھی تبدیلی آتی ہے، مختلف کلچر اور ثقافت انہیں تذبذب میں مبتلا رکھتی ہے، مذہبی کٹر پنہی ان کے دماغ میں گھر نہ بنائے، یہ سوچ بھی ادب اطفال سے بہم پہنچایا جاتا ہے۔ مثلاً اقبال کی نظم ”لب پہ آتی ہے دعا۔۔۔“ اسکولوں میں بطور ”پرارتنہ“ پڑھی جاتی ہے، اس نظم میں ذاتِ دھرم، سے اوپر اٹھ کر بچوں کی ذہانت کو علم کی عظمت سے متعارف کروایا جاتا ہے، بعض اسکولوں میں دلش بھگتی گیت بطور ”پرارتنہ“ گایا جاتا ہے، گیت بھی بچوں کی ذہنی تربیت کرنے میں معاونت کرتا ہے۔

اطفال ادب میں ہر قوم کی وراثت کو بھی نمایاں مقام حاصل ہے، سن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے ان میں قومی وراثت اور روایات کا شعور پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے، بچوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ

وہ جو بولیں یا لکھیں تو صحیح بولیں اور لکھیں، نثر اور نظم، دونوں صورتوں میں ادب اطفال وجود میں آتا رہا ہے، لفظوں کا تلفظ، جملوں کی ساخت اور ادائیگی وغیرہ بھی ادب اطفال کے ذریعے درست ہوتی ہے۔

بچوں کے ادب میں چونکہ پیکر سازی کا عمل زیادہ ہوتا ہے، لہذا بچوں کے اندر لاشعوری طور پر پیکروں کو از سر نو تشکیل و تعمیر کرنے کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور از خود یا تو ڈرائنگ بنانے یا آڑی ترچھی زبان میں کہانیاں لکھنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کہانیاں ان میں احساسات اور جذبات کو سمجھنے میں مدد پہنچاتی ہیں۔ کہانیوں کے کردار (جانور/ آدمی) کے انجام ان کے شعور کو گرفت میں لیتا ہے اور وہ ہدی سے نیکی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ نیز وہ رحم دلی کی اہمیت، غریبوں کی مجبوری، معذوروں کی تکالیف سے آگہی حاصل کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچوں میں رشتوں کے تئیں ہمدردی، پیار، محبت اور عقیدت کے علاوہ خدمت کا جذبہ بڑوں کے مقابلے زیادہ ہوتا ہے، یہ اوصاف فطری طور پر ان میں موجود ہوتے ہیں۔ اس طرح بچپن میں سنی، پڑھی گئیں نظموں، گیتوں، لوریوں اور کہانیوں کے سبق کے اثرات بھی ان پر بہت اچھے پڑتے ہیں۔ اردو کے شعراء ادب میں ادب اطفال کی معنویت اور اہمیت پر محمد حسین آزاد، سرسید احمد خان، خواجہ الطاف حسین حالی، اسماعیل میرٹھی، شفیع الدین نیر، پریم چند، محمد اقبال، رضیہ سجاد ظہیر، کرشن چندر، خوشحال زیدی، مظفر حنفی، مہر الہی، محبوب حسن، کوثر صدیقی، منور تابش وغیرہ نے خصوصی توجہ دی ہے۔ ایسے میں یہ سوال برابر اُبھرتا رہا ہے کہ نصابی ادب، بچوں کے ادب اور بالغوں کے تفریحی ادب میں کیا فرق ہے؟ کیا اسکولی کتب بچوں کو خاطر خواہ معلومات نہیں دے پاتیں۔ اس پر عبدالستار نے مدلل بیانیہ میں لکھا ہے:

”چوں کہ اسکولی کتابیں تعلیمی نقطہ نظر سے تیار کی جاتی ہیں اور ان میں فراہم کردہ معلومات کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ وہ بچوں کو تفریح، ذہنی سکون مہیا کرنے اور ان کے حیرت اور استعجاب کو آسودہ کرنے میں ناکام ہیں۔ اس لیے ایسی کتب کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو انھیں تفریح، ذہنی سکون اور زبان کی پختگی عطا کریں اور ہر چیز کے بارے میں ایسے انداز میں معلومات فراہم کریں کہ بچے کی دلچسپی برقرار رہے نیز ان کی صلاحیتیں بیدار ہو کر فروغ پائیں۔“

بچوں اور بالغوں کے ادب میں نظر آنے والے فرق کو شفیع الدین نیریوں اُجاگر کرتے ہیں:

”بچوں کے ادب سے مراد نظم و نثر کا وہ ذخیرہ ہے جو خاص طور پر بچوں کے لیے لکھا گیا ہو یا اپنی معنویت اور افادیت کے اعتبار سے بچوں کے لیے موزوں ہو یا یوں سمجھئے کہ جو ادب چار یا پانچ سال کی عمر سے تیرہ چودہ برس تک کے بچوں کے لیے مخصوص ہو اُسے ہم بچوں کے ادب سے تعبیر کرتے ہیں۔ بلاشبہ بچوں کے ادب کو بھی ان اقدار اور خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے جس میں کسی بھی جذبہ کی صداقت، زبان کی لطافت اور بیان کا حسن شامل ہیں۔“

خوشحالی زیدی کی رائے ہے کہ:

”بچوں کے ادب اور بچوں کی کتب کے بارے میں عموماً زبان اور اسلوب، اور بچوں کی مختلف عمروں کے اعتبار سے کتابوں کا تعین اور تقسیم کی جاتی ہے۔“
ہر چند کہ بچوں کے ادب، انصافی کتابوں سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ لیکن عصر حاضر نے فاصلوں کو کم کیا ہے۔ انصافی کتب میں مشقی اسباق زیادہ ہوتے ہیں۔ جو زینہ بہ زینہ (step by step) انھیں ایک خاص منزل تک لے جاتے ہیں، اب ان میں بھی ادب، معلومات، نفسیات، خواہشات، تجسس اور تحیر کا ممکن حد تک خیال رکھا جاتا ہے بلکہ گانے، گٹنا، ٹگ بندی کی رغبت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ پانچ چھ سال کی عمر تک بچہ صاف تلفظ کے ساتھ زبان بولنے لگتا ہے۔ بعد کی منزل میں اس کا ادبی شعور جاگتا ہے۔ چودہ پندرہ سال کے بعد باقاعدہ سمجھ آ جاتی ہے، پسند و ناپسند کے زاویے بدلنے لگتے ہیں۔ یہیں سے انصافی کتب کا ایک بڑا مرحلہ طے ہو جاتا ہے۔

مشیر فاطمہ نے بھی اس سلسلہ میں لکھا ہے:

”وہی کتاب اچھی ہے جو فن کا حق ادا کرتی ہے، جو بچے میں اُتج پیدا کرتی ہے اور علم کا راستہ بتاتی ہے، جو بچوں کی روح کو متحرک کرتی ہے، جو آئندہ زندگی میں ہمیشہ کام آتی ہے۔“ ۹۔

بغور دیکھیں تو لوریاں ہوں، قصہ کہانیاں یا نظمیں، وہی زیادہ مقبول رہی ہیں جو بچوں کو خوابوں کی سیر کراتی ہیں اور وہ سوتے جاگتے ان کے نئے نئے تانے بانے بنتے رہتے ہیں۔
کالج میں داخل ہونے والے طلباء سے زیادہ آج اسکول کے بچوں پر بھرپور توجہ دینا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ ان کے ادب کی شکل ایک علیحدہ اور مستقل حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ کل دنیا میں بچوں کے ادب کو جو منفرد مقام حاصل تھا وہ صرف ادیبوں کی کاوشوں کا نتیجہ تھا لیکن بدلے ہوئے عالمی پس منظر میں بچوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بچوں کے ادب میں انٹرنیٹ سے وابستہ جدید ترین اطلاعات اور ذہنی ورزش کے سوال نامے کو بھی عملی طور پر شامل کیا جا رہا ہے۔ عالمی پس منظر میں اس کی اہمیت کو شدت سے تسلیم کیا جا رہا ہے کہ بچوں کے لیے ایسا با معنی اور آسان مواد مہیا کیا جائے جو ان کی سیرت سازی میں موثر اور مفید ہوتا کہ بچوں کے ذہن پر انصاف، فرض شناسی، ایفاء وعدہ، محنت کی روزی، حسن سلوک، رفاہ عام، ذہانت، شجاعت، مساوات، وفاداری، پاسداری، علم و فضل کی عظمت، روشن خیالی جیسے اوصاف کا نقش مرتسم ہو سکے۔

ایک بات اور کہ آج بچوں کے ادب کو سرکاری ذمہ داری میں شامل کیا گیا ہے۔ ایسے میں تنظیموں اور اداروں کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادیبوں کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی ہیں۔ بچوں کے ادیبوں کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ہمارے عہد میں عالمی نظریات کیا ہیں؟ کیا کاوشیں ہو رہی ہیں؟ اور ہمارے یہاں ان کی کتنی ضرورت و اہمیت ہے؟ کیا ہم پیش آئند مسائل کو بخوبی آجا کر کر رہے ہیں؟ اس پیش رفت میں

بامعنی، با مقصد اور دلچسپ ادب کو اس طرح ڈھالا جائے کہ وہ آسانی مطالعے کے ساتھ ساتھ بچوں کی شخصیت سازی میں بھی پوری طرح معاون ہو۔ موجودہ صورت حال میں دانشوران قوم کو دیکھنا ہوگا کہ مسلمانوں سے وابستہ دانش گاہوں میں جو بچوں کا ادب شامل نصاب ہو رہا ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ معیار کیسا ہے؟ منزل تک جلد پہنچنے کے کیا طریقے اختیار ہوئے ہیں؟ اور اب کیا جدت و غدرت پیدا کی جائے۔ آج کے تقابلی دور میں شروعاتی مرحلہ میں لفظ کو بچے کے سامنے کس دلچسپ طریقے سے پیش کیا جائے؟ اُس کی شناخت کے کن مراحل کو اختیار کیا جائے جس سے تصور کا عکس رنگ و آہنگ میں ڈھل جائے۔ حواسِ خمسہ کے ربط میں تضاد سے کس طرح بچا جائے اور حرف شناسی میں مثبت پہلوؤں کو کن زاویوں سے اُجاگر کیا جائے اور پھر جیسے جیسے بچے کا ذہن بالیدہ ہوتا جائے، اُس کی مطابقت سے چیزوں کے مثبت اور منفی پہلوؤں سے روشناس کرایا جائے۔ یہ سب اس لیے کہ آج عالمی پیمانے پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ بچوں کی ایک الگ دنیا ہے۔ اس لیے اُن کے ذہن کو زیادہ متاثر کرنے والے مواد کی ضرورت ہے۔ ایسے میں ماہرین تعلیم اور بچوں کے ادیب اسی یکسوئی اور دلچسپی کا مسلسل مظاہرہ کرتے رہیں اور ان سے متاثر ہو کر اساتذہ اپنے عزم کو اور بھی مستحکم کریں۔ کیوں کہ جدید ٹیکنالوجی سے مزین کتابیں، ٹیلیٹ، پی سی اور لیپ ٹاپس جیسی چکا چوند کر دینے والی اشیاء اور آن لائن گیمس کو کس طرح موافق اور مددگار بنایا جائے جو بچوں کے اندر غور و فکر اور گریڈ و تجسس کی مثبت صلاحیت کو بروئے کار لانے میں کارآمد ہو۔ اب ہمیں ان جدید سائنسی حربوں کے ذریعے محبت، مساوات اور درگزر کے جذبے کو فروغ دینا ہوگا۔ ان کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنی ہوگی۔ ایسا بھی ممکن ہے جب منظم خاکے کے تحت گھر کے ماحول سے اسکول کے ابتدائی درجات تک سننے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کے مراحل تک، آنے والے کل کے وسائل اور مصائب کو ملحوظ رکھتے ہوئے پروان چڑھ رہی باشعور اور بے حد حساس نسل کو مثبت انداز میں متاثر کریں۔ ایسی توجہ جس میں انسانی محبت و مروت اور جذبہٴ فلاح و بہبود کے ساتھ ذہنی مشق زیادہ ہو اور دلچسپی بھی برقرار رہے۔ بھی اردو سے وابستہ بچوں کا مستقبل اور بھی روشن ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

حواشی

- ۱۔ ادبی نشین، لکھنؤ، ستمبر تا نومبر ۲۰۲۲ء، مدیر سلیم احمد، ص: ۵۹
- ۲۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق، جنوری ۲۰۱۸ء، ص: ۵۰
- ۳۔ جہات و جستجو، مظفر حنفی، ۱۹۸۲ء، ص: ۸۶
- ۴۔ اردو میں بچوں کا ادب، خوشحال زیدی، ۱۹۸۹ء، ص: ۲۴
- ۵۔ قاضی محمد جلال الدین مراد آبادی انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں کئی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیمی فرائض انجام دیتے ہوئے ایم اے او کا لے علی گڑھ میں بطور لکچرر تشریف لائے اور پھر شعبہٴ جغرافیہ میں کئی سال تک تدریسی فرائض انجام دیئے۔

- ۱۹۲۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے۔
 ۶ ظ: ایک شخص تھا، از ندیم صدیقی، ممبئی ۲۰۲۲ء، ص: ۱۶۳
 ۷ ڈاکٹر عبدالستار، بچوں کے ادب کا پہلا محقق ڈاکٹر خوشحال زیدی، ۲۰۰۹ء، ص: ۱۴
 ۸ شفیع الدین نیر، اردو زبان میں بچوں کا ادب، ص: ۲۸
 ۹ بچوں کے ادب کی خصوصیات، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء، ص: ۲۳

☆☆☆



شعبہ اردو کی الوداعی تقریب میں طلبہ و طالبات اور اساتذہ کرام



”کربلا کی ادبی اور عصری معنویت“ عنوان سے منعقدہ سیمینار میں مولانا محمد جرنیل اظہار خیال کرتے ہوئے، ڈاٹس اور ہال میں موجود مقررین و سامعین حضرات۔

اردو کی ہم رشتہ زبانیں اور ادب اطفال

نارسائی، معلومات کی کمی، اطلاعاتی وسائل کے فقدان کی وجہ سے جو چند سوالات ذہنوں میں جنم لیتے ہیں ان میں سے ایک سوال یہ بھی ہے کہ بچوں کے ادب پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ ادب اطفال سے جڑے ہوئے اکثر قلم کار یہ سوال اٹھاتے ہیں اور گزشتہ ایک دہائی سے اس کی گونج کچھ زیادہ ہی سنائی دے رہی ہے۔

بنیادی طور پر یہ سوال ہی مبہل ہے۔ ادب اطفال سے متعلق ڈاکٹر مشیر فاطمہ، خوش حال زیدی، مناظر عاشق ہر گانوی، بانو سرتاج اور ضیاء الرحمن غوثی کی تحقیقات اور رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے مضامین اس سوال کی لایعنیت ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ بچوں کے ادب کی روایت پر نگاہ ڈالنے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نظم و نثر کی مختلف اصناف میں بچوں کے لیے خاطر خواہ مواد موجود ہے۔ امیر خسرو کی خالق باری، غالب کے قادر نامہ سے لے کر آج تک قلم کاروں کی ایک کہکشاں ہے۔ اردو کے بڑے شاعروں میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، انشاء، غالب، چکبست، خواجہ الطاف حسین حالی، تلوک چند محروم، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، محمد حسین آزاد اور اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے شاعری کی، نظمیں لکھیں۔ پریم چند، انشاء، آزاد، حامد اللہ افسر، صالحہ عابد حسین، امتیاز علی تاج، عبدالغفار مدھولی، ایم۔ یوسف انصاری، محمد حسین حسان، تسکین زیدی اور رام لعل نے کہانیاں لکھیں۔ آغا حشر کاشمیری، عظیم بیگ چغتائی، محمد مجیب، مرزا ادیب نے ڈرامے لکھے۔ کرشن چندر نے ستاروں کی سیر اور الٹا درخت، عصمت چغتائی نے تین اناڑی، سراج انور نے کالی دنیا، نیلی دنیا، ظفر پامی نے ستاروں کے قیدی جیسے ناول لکھے۔ قدسیہ زیدی، قرۃ العین حیدر اور اطہر پرویز نے بچوں کے لیے ترجمے کیے۔ عادل اسیر دہلوی نے اپنی پوری زندگی ادب اطفال کے لیے وقف کر دی۔ بچوں کے لیے پھول، بھلونا، ٹافی، غنچہ، بلال، نور، جنت کا پھول، چاند ستارے اور سینکڑوں رسالے شائع ہوئے۔ اخبارات کے گوشہ اطفال شائع ہوتے رہے۔ ایسی صورت میں یہ سوال کہ بچوں کے ادب پر کم لکھا جا رہا ہے، خاصا مضحکہ خیز ہے۔ میرا خیال ہے کہ جتنا کچھ لکھا گیا ہے وہ بچوں کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ محمد حسین آزاد، مولوی اسماعیل میرٹھی، شفیع الدین نیر نے جو سرمایہ چھوڑا ہے وہی بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے کافی ہے۔ ان بزرگوں نے سدا بہار، دائمی افکار کی حامل تحریریں دی ہیں۔

ویسے بھی بچہ کتابوں سے زیادہ کچلر بیانیہ سے سیکھتا ہے۔ پاپولر کچلر بیانیہ ہی بچوں کی آگہی کا پہلا ذریعہ ہے۔ ہر قوم اور کچلر میں کچھ Narratives ہیں اور یہی بیانیہ بچوں کے تحت الشعور کا حصہ بنتے ہیں۔ انہیں نیکی، بدی، خیر و شر کی تمیز سکھاتے ہیں۔ بچپن میں نانی، دادی کی لوریاں، کہانیاں بچوں کو بہت کچھ سکھاتی ہیں۔

اب جب کہ صارفی معاشرت نے ہماری ترجیحات بدل دی ہیں، نیکینا لوجی نے بچوں کے رویے تبدیل کر دیے ہیں، اب بچوں کی Narrative fantasies بدل گئی ہیں۔ اب ان کے تحت الشعور میں جن اور پریوں کی جگہ ڈزنی، باربی، پاور رینجرز نے لے لی ہے۔ بچوں نے اپنی ذہنی ترجیحات خود مرتب کر لی ہیں۔ تکنیکی وائرس اتنا وائرل ہو چکا ہے کہ اب مسئلہ بچوں کی معصومیت کو بچانے کا آچکا ہے۔ اب صارفیت نے جو حالات پیدا کر دیے ہیں ان حالات کی مزاحمت بچوں کے ادیب کی بنیادی ضرورت بن گئی ہے۔ اب چونکہ سائنٹفک اتج میں سانس لے رہے ہیں اس لیے اب ادب اطفال پر ایک سائنٹفک نقطہ نظر سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں سائنسی آلات سے زیادہ سائنسی انداز فکر کی ضرورت ہے تبھی ہمارے لیے کنزرویٹو کچلر سے پیدا شدہ چیلنجز کو کاؤٹر کرنا آسان ہوگا۔

آج تفریحی ذرائع نے بچوں کو وقت سے پہلے بالغ کر دیا ہے۔ پروین شاکر نے کہا تھا کہ بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے تو یہ بات بالکل صحیح ہے۔ اب ہماری ذمہ داری ہے کہ اب بچوں کو تفریحی کچلر سے تخلیقی کچلر کی طرف لانے کی کوشش کریں۔ بچوں کے ادب پر اپنا زاویہ بدلنا ہوگا۔ کیونکہ اب بچوں کے ادب میں پائیلٹکل ایجنڈا بھی شامل ہو گیا ہے اور Cultural invatism بھی بڑا مسئلہ ہے۔ معاصر کچلر Tabula سے بچوں کو بچانا ضروری ہے۔ ورنہ ادب اطفال کی کوئی معنویت اور افادیت نہیں رہ جائے گی۔ کمپیوٹر کچلر کی جگہ کتاب کچلر کو فروغ دینا ہوگا۔

ادب اطفال کا پورا ارتکا ز اخلاقیات پر ہونا چاہئے۔ پرانے زمانے میں گلستاں، بوستاں اس لیے نصاب میں شامل تھیں کہ اس سے بچوں کا اخلاقی شعور بیدار کیا جائے۔ الف لیلیٰ آج بھی بچوں کے لیے کلاسکس کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے کردار، سند باد، الہ دین، علی بابا سے آج بھی پوری دنیا واقف ہے۔ ایسوپ کی کہانیاں، ہنودیش، پنج تنتر بنیادی طور پر بچوں کے لیے ہی لکھی گئی ہیں۔

راجا رانی سے بچوں کا رشتہ ابھی ٹوٹا نہیں ہے۔ جانوروں سے محبت کم نہیں ہوئی ہے۔ گلہری اور گائے سے دلچسپی ختم نہیں ہوئی ہے۔ کوا اور کتے سے بچے اب بھی مانوس ہیں۔ پہاڑ، پانی، درخت اور ریت یہ سب بچوں کے لیے Inspirational forces ہیں۔ شیر، بکری آج بھی بچوں کی محبت کا مرکز ہیں۔ بچوں کی بنیادی جبلت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ کیونکہ سائنس، نیکینا لوجی ہمارے معاشی، سیاسی اقدار تو بدل سکتے ہیں مگر انسانی جذبات و احساسات کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ اسی لیے بچے آج بھی معصوم ہیں اور اس کی اسی معصومیت کو مستح ہونے سے بچانا ادب اطفال کے قلم کاروں کی ذمہ داری ہے۔ اردو میں بچوں کا ادب مولوی اسماعیل میرٹھی سے محبوب راہی تک معصومیت کے اسی محور پر

مرکوز ہے۔ اسی لیے شروع سے لے کر آج تک اردو میں بچوں کا ادب زیادہ تر ترمیم و تنسیخ کا محتاج نہیں رہا۔ وہی موضوعات لیے گئے جو بچوں کے بنیادی احساسات اور جذبات سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج بھی بچہ یہی گنگنااتا ہے۔

چنداما دور کے
پوری پکائیں پور کے

یا
چل میرے مکے لمبک ٹو
جہاں کی بڑھیا وہیں کی تو

ہماری ہم رشتہ زبانوں میں بھی زیادہ تر ارنیکا ز نصاب اور اخلاقیات سیریز پر ہی ہے۔ عربی کی عزیز و منا اور مارون یوسف نے بھی سوانح سیریز کو ہی بچوں کے لیے زیادہ بہتر سمجھا اور وہاں بچوں کے ادب کے تعلق سے ایک سنسرشپ بھی ہے کیوں کہ بچوں کے ادب میں کچھ ملکوں نے اپنا نسلی قومی اور مذہبی تعصب کو بھی شامل کر رکھا ہے۔ فارسی میں تاریخ ادبیات کو دکاں بھی ایک الگ زمرہ میں ہے۔

اردو میں بچوں کا ادب سارے ذہنی، مذہبی تعصبات سے پاک ہے۔ یہ اس زبان کے ادب کی بہت بڑی خوبی ہے جب کہ ہندی میں جو امر کھتا سیریز ۱۹۶۷ء میں شروع کی گئی اس میں فرقہ وارانہ قومی تعصب بھی ہے اور اس کے لٹریچر بھی ایسے ہیں جو بچوں کی ذہنی سطح سے میل نہیں کھاتے۔

یہ سچ ہے کہ اردو اپنی ہم رشتہ یا معاصر زبانوں کے بچوں کے ادب کے مقابلے میں قدرے کم تر ہے۔ ملیالم، تملگو، بنگلہ، مراٹھی، کنڑ وغیرہ میں بچوں کا ادب بہت مضبوط اور مستحکم ہے۔ ملیالم میں باضابطہ کیرالہ انسٹی ٹیوٹ آف چلڈرن لٹریچر قائم ہے جس نے بچوں کے لیے کتابوں کے علاوہ ایک ایسی انسائیکلو پیڈیا تیار کی ہے جس میں آرٹس، کلچر، جانوروں کی دنیا، انسانی تاریخ، زبان و ادب جیسے موضوعات ہیں۔ سوانحی سیریز ہے۔ ٹکنا لوجی اور اقوام عالم جیسے موضوعات پر معاری کتابیں ہیں۔ Thaliru نام سے ایک میگزین نکلتی ہے۔ اسی طرح بنگلہ میں بچوں کے ادب برٹش مشنری کی وجہ سے بہت مستحکم تھا۔ وہاں ودیا ساگر، سرت چندر، ٹیکور جیسے بڑے تخلیق کاروں نے بچوں کے ادب پر خاص توجہ دی۔ وہاں کے بچوں کا پہلا ماہنامہ ۱۸۱۸ء میں دگ درشن کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۸۲۲ء میں پیشوا بلی، گیا نو دے، دریا در پن، ستیہ پردیپ، ابراہا، ہندو جیسے ماہنامے بچوں کے لیے شائع ہوئے۔ تیلگو کا حال بھی بہتر ہے، کنڑ نے پہلی کتاب بچوں کے لیے لکھی جس کا نام ہندی کھتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ ہے تملگو کا یہ رسالہ چنداما بچوں کا واحد ایسا رسالہ ہے جو ہندی، مراٹھی، ملیالم، گجراتی، اڑیا، سندھی، بنگالی، پنجابی، آسامی، سنسکرت، سہنالی زبانوں میں شائع ہوا۔ انگریز اور ہندی میں بھی صورت حال بہتر ہے۔ منور ماہیلی کیشنز کے تحت Twinkle Magic Pot نکلتے ہیں۔ چمک ایک ایسا رسالہ ہے جس میں سائنس، تاریخ، اسپورٹس، کلچر، ماحولیات اور معمہ پر مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ہندی میں تپے سمرات، اندر دھنش، سمپک، چنداما،

بال بھاسکر، نندن جیسے رسالے ہیں۔

ان زبانوں کی حالت بہتر ضرور ہے مگر اردو بھی اپنے وسائل کی کمی کے باوجود خراب پوزیشن میں کبھی نہیں رہی ہے۔ ہاں بچوں کے لیے کوالٹی لٹریچر کی کمی ضرور ہے۔ مگر ادب موجود ہے۔ اب پرہتم بکس نے بہت ساری شکایتیں دور کر دی ہیں۔ یہاں بھی اردو کا دی کا امنگ، قومی نولسل کے بچوں کی دنیا، مکتبہ جامعہ کا بیامی تعلیم، فاروق سید کا گل بوٹے، نوشا دمومن کا نیا کھلونا، مالیکاؤں کا پہلا بچوں کا اخبار، خیال انصاری کی ادارت میں شائع ہوتا ہے اور بھی رسالے ہوں گے۔ پاکستان سے ہمدرد کا نونہال ایسا رسالہ ہے جس کا مقابلہ ہماری معاصر زبانیں نہیں کر سکتیں۔ علی احسن ساحد وہاں سے جنگل منگل نام کا رسالہ نکالتے ہیں جس کا فیض احمد فیض نمبر شائع ہوا ہے۔ جس میں بچوں سے متعلق فیض احمد فیض کی ساری تحریریں ہیں۔

اسی طرح مشہور ناول نگار مشرف علی فاروقی نے بچوں کا اشاعتی ادارہ کتاب کے نام سے قائم کیا تھا۔ جس کے تحت آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ صوفی تبسم، غلام عباس اور مہدی کی کتابیں مالیکاؤں کے رحمانی پہلی کیشنز کے تحت بچوں کی بہت سی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ مکتبہ پیام تعلیم کی ادب اطفال سیریز اور حکیم محمد سعید کی کتابوں کا ذکر بطور خاص کیا جاسکتا ہے۔ جو ادب اطفال میں پیش بہا اضافہ ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ بچوں کا ویب سائٹ بھی ہے جس کا نام ہے ابتدا۔ جس کے مختلف زمرے ہیں، فہم القرآن، قصے کہانیاں، مسکرائیے، نظمیں، فلمی نظمیں، انسائیکلو پیڈیا، پکوان، شہر کی سیر، چڑیا گھر کی سیر، عجائب گھر کی سیر، تاریخی مقام کی سیر، کھیل کود، آج کا سبق، مضامین، آپ کی تصاویر، مشہور ویب سائٹ، اردو پوائنٹ پر بھی ادب اطفال کا خاص گوشہ ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں بچوں کا ادب ارتقائی سفر طے کر رہا ہے۔ آج کے سب سے ممتاز ادیب و فنکار اس ادب کو فروغ دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ رتن سنگھ، ذکیہ مشہدی، نصرت ظہیر، وکیل نجیب، بانو سرتاج، غلام حیدر، محبوب راہی، نظیر فقہوری، مناظر عاشق ہر گانوی، مظفر حنفی، اسد رضا، اقبال احمد برگی، فراغ روہوی، عادل حیات، حافظ کرناٹکی اور بھی بہت سے معتبر نام ہیں جو بچوں کا ادب فروغ دینے کے لیے کوشاں ہیں۔

میرا خیال ہے کہ بچوں کا ادب فروغ دینے کی بنیادی ذمہ داری خواتین کی ہونی چاہئے کیونکہ وہ بچوں کی نفسیات، مزاج، سانکی سے زیادہ واقف ہوتی ہیں۔ خواتین اس میدان میں آئیں تو بچوں کا ادب بہت مالا مال ہوگا۔

ادب اطفال میں چند اہم فرانسیسی تراجم

یہ امر حقیقت پر مبنی ہے کہ ادب عالیہ میں تراجم مستقبل میں وجود پذیر ہونے والی تخلیقات کوئی جہات سے روشناس کراتے ہیں نیز ان کے تنقیدی زاویے کو بین ثقافتی تصور سے روشناس کراتے ہیں۔ اس کے پہلو بہ پہلو بچوں کے لئے تخلیق کردہ تخلیقات کے تراجم قارئین اور تخلیق کاروں کو انسانی فطرت میں معصومانہ عناصر کی یکسانیت اور ان کی آفاقیت کو پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں فرانسیسی ادب کی تخلیقات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اردو ادب میں یہ روایت خوش آئند رہی ہے کہ ارباب ادب جنہیں دیگر زبانوں میں لسانی استعداد اور مطالعے کا شغف رہا ہے، انہوں نے اس ضمن میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے تراجم کے سلسلے میں اہم کاوشیں انجام دی ہیں۔

جہاں تک اردو میں ادب اطفال کا تعلق ہے تو دیگر یورپی زبانوں کی طرح فرانسیسی زبان سے اردو میں تراجم ہوئے ہیں۔ ان میں شاعری، افسانہ، ناول اور ڈراموں کے تراجم قابل ذکر ہیں۔ رومانوی شاعر وکٹر ہیوگو (1802-1885) نے بچوں کے لئے نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں Demain, des laube بہت اہم ہے۔ اس کا فرانسیسی متن مندرجہ ذیل ہے:

Demain, dès l'aube, à l'heure où blanchit la campagne,
Je partirai. Vois-tu, je sais que tu m'attends.
J'irai par la forêt, j'irai par la montagne.
Je ne puis demeurer loin de toi plus longtemps.
Je marcherai les yeux fixés sur mes pensées,
Sans rien voir au dehors, sans entendre aucun bruit,
Seul, inconnu, le dos courbé, les mains croisées,
Triste, et le jour pour moi sera comme la nuit.
Je ne regarderai ni l'or du soir qui tombe,
Ni les voiles au loin descendant vers Harfleur,

Et quand j'arriverai, je mettrai sur ta tombe

Un bouquet de houx vert et de bruyère en fleur.

Tomorrow at اس کا انگریزی ترجمہ Charls Bernstein نے

Dawn کے عنوان سے کیا ہے:

Tomorrow, dawn, when the countryside's almost
white

I'll depart. You see, I know you're waiting for me.

I will go by the mountains, I'll go by the woods.

I can't be faraway from you any more.

I will be walking with my eyes fixed on my thoughts,

Without looking around, without hearing a sound,

Alone and unknown, with back bent, with my hands crossed,

Sad, and the day for me will be like the night.

Then I won't look at the golden evening, so grave

Nor at the faraway sails veering toward Harfleur

And when I do get there, I will put on your grave

A green holly bouquet and flowering heather.

اس کا اردو ترجمہ تنویر رؤف نے کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

کل صبح سویرے جب اجالہ بستی میں

پھیل رہا ہوگا

میں نکلوں گا

میں جانتا ہوں

تم میری منتظر ہوگی

کوہ و دامن عبور کرتا

اپنی ہی دھن میں بنا کچھ کہے

بنا کچھ سنے

اپنے ارد گرد سے لا پرواہ

تنہا گمنام
 خمیدہ کمد ہاتھ باندھے
 غمگین اور مضحل
 دن کا اجالا اور شفق کی لالی بھی بے معنی ہو جیسے
 اور حرفلور (harfleur) کے ساحل پر اترتے باد بان بھی
 تمہاری تربت پہ جب پہنچوں گا تو
 سبز پتیاں اور بہت سے پھول ڈالوں گا

یہ نظم وکٹر ہیگو کی مشہور نظم ہے جس میں شاعر نے اپنے انفرادی کرب و فطرت کے تناظر میں
 پیش کیا ہے۔ اس نظم میں قدرتی مناظر شاعر کے دکھ کی علامات کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ اس نظم کو
 فرانسیسی رومانوی شاعری میں نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ یہ نظم وکٹر ہیگو کی بیٹی جو 19 سال کی عمر میں
 ایک کشتی کے ڈوب جانے پر فوت ہو گئی تھی۔ یہ اس کی چوتھی برسی پر لکھی گئی تھی اور 1856 میں شائع ہوئی
 تھی۔ علاوہ ازیں یہ ترجمہ آزاد ترجمے کے زمرے میں شامل ہے۔

فرانسیسی ادیب اور افسانہ نگار الفونس دووے کی کہانی آخری سبق کا اصل عنوان la
 derniere classe ہے اس کہانی کے مجموعے پیر کی کہانیاں (Conte du lundi) سے یہ کہانی
 ماخوذ ہے جو پہلی مرتبہ 1873 میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس کا فرانسیسی اقتباس مندرجہ ذیل ہے:

Ce matin-là, j'étais très en retard pour aller à
 l'école, et j'avais grand-peur d'être grondé,
 d'autant que M. Hamel nous avait dit qu'il nous
 interrogerait sur les participes, et je n'en savais
 pas le premier mot. Un moment l'idée me vint de
 manquer la classe et de prendre ma course à
 travers champs.
 Le temps était si chaud, si clair !
 On entendait les merles siffler à la lisière du
 bois, et dans le pré Rippert, derrière la scierie, les
 Prussiens qui faisaient l'exercice. Tout cela me
 tentait bien plus que la règle des participes ; mais
 j'eus la force de résister, et je courus bien vite
 vers l'école.

اس کہانی کا انگریزی ترجمہ George Burnham Ives نے کیا ہے اس کا ایک اقتباس مندرجہ ذیل ہے:

I I was terribly afraid of being scolded
WAS very late that morning for school that morning, and
especially as Monsieur Hamel had told us that
he should examine us on participles, and I did
not know the first thing about them. For a
moment I thought of staying away from
school and wandering about the fields. It
was such a warm, lovely day. I could hear
the blackbirds whistling on the edge of the
wood, and in the Rippert field, behind the
sawmill, the Prussians going through their
drill. All that was much more tempting to
me than the rules concerning participles; b
I had the strength to resist, and I ran as fast as
I could to school.

اس کا اردو ترجمہ کمال ابدالی نے آخری سبق کے عنوان سے کیا ہے جو رسالہ آج کل میں شائع
ہوا تھا۔ اس کے علاوہ منور آکاش نے بھی اسے اردو کے قالب میں پیش کیا تھا جو ہم سب سے شائع ہوا ہے
اس کا اقتباس مندرجہ ذیل ہے:

اس صبح مجھے اسکول سے کافی تاخیر ہو چکی تھی اور میں ڈانٹ ڈپٹ سے ڈرا ہوا تھا خاص طور پر
سر حامل نے کہا ہوا تھا کہ وہ اسم، صفت اور فعل کا امتحان لیں گے اور مجھے ان کے بارے میں ٹھیک سے پتا
نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لئے میں نے اسکول سے دور رہنے اور کھیتوں میں آوارہ گردی کا سوچا، میں یہ
سب اس لئے کرنا چاہتا تھا کہ امتحان سے بچ سکوں مگر میرے اندر مزاحمت کی طاقت نہیں تھی اور میں اتنی
تیزی سے اسکول کی طرف دوڑا جتنا تیز میں چل سکتا تھا۔

میں کوٹوال کے دفتر کے پاس سے گزرا تو دیکھا یہاں چند لوگ ایک بورڈ کے گرد جمع تھے جس
پر نوٹس آویزاں کیا تھا۔ گزشتہ دو سال سے ہماری تمام بری خبریں اسی بورڈ پر آویزاں کی جاتی تھیں۔ ہم
جنگ ہار گئے۔ ہیڈ کوارٹر کی طرف فوج میں جبری بھرتی کا حکم، میں نے بغیر رُکے سوچا، اب کیا ہوگا؟ پھر
جب میں دوڑتے ہوئے چوک کے پاس سے گزرا۔ ایک محافظ لوہار نے جو اپنے شاگردوں کے ساتھ

کھڑا اعلان پڑھ رہا تھا مجھے پکار کر کہا۔ بچے۔۔ اتنی جلدی نہ کرو، تم جلد ہی اسکول پہنچ جاؤ گے۔
مندرجہ بالا کہانی کا تعلق فرانس کے الزاس کے علاقے سے ہے جو کبھی فرانس اور جرمنی کے
مابین اختلافات کا باعث رہا۔ اس میں جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تباہی اور عوامی نفسیات کے
ساتھ ساتھ بچے کے مشاہدات کو دلچسپ پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔
الفنس دودے کی کہانیوں کے بیشتر کردار اس کی ذاتی اور گرد و پیش کے افراد پر مشتمل ہیں
۔ اسے ادب میں فطرت پسند Naturalism تحریک کا نمائندہ فن کار شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے فن میں
نفسیاتی کشمکش اور انسانی دکھ اور کرب کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

فرانز کا فکا (1883-1923) بیسویں صدی کے ان ادیبوں میں شامل ہے جس نے عالمی
سطح پر ادبیات کو متاثر کیا حالانکہ اس نے اصلاً جرمن زبان کا اپنی تخلیقات کے لئے انتخاب کیا مگر اسے
فرانسیسی اور انگریزی اور عبرانی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اس کا سبھی مواد بہت جلد فرانسیسی زبان میں منتقل
کر دیا گیا اور اس ادب پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ بایں ہمدانگریزی ادب کے ساتھ ساتھ
دیگر زبان کی تخلیقات نے اس کا اثر اس حد تک قبول کیا کہ وہ ارباب ادب کے مطابق سب سے زیادہ با اثر
ادیبوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ اردو میں سجاد حیدر یلدرم قمر جمیل، انتظار حسین، انیس ناگی، سریندر
پرکاش مظہر الاسلام انور سجاد بلراج کوئل، خالدہ حسین اور نیر مسعود شامل ہیں۔ نئے افسانہ نگاروں میں
بالخصوص بیگ احساس کے یہاں نمایاں طور کا فکا کا اثر نظر آتا ہے پر اس زمرے میں شامل ہیں۔

ایسے بھی اردو کے ناقدین اور فن کار ہیں کہ جنہوں نے براہ راست فرانسیسی کسی ادیب کا اثر
قبول کرتے ہوئے وہاں کے اختراعی نظریات کے بارے میں نہ صرف تحریر کیا ہے بلکہ انہیں برتا بھی ہے
۔ ان میں قرۃ العین حیدر، شمس الرحمن فاروقی اور انور سجاد اس کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ موجودہ دور
کے افسانہ نگاروں میں اسلم جمشید پوری نے کولاژ تکنیک کے بارے میں نہ صرف مدلل تحریر پیش کی ہے بلکہ
اسے برتا بھی ہے ان کے کئی افسانوں میں یہ تکنیک جا بجا نظر آتی ہے۔ ان میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وغیرہ
قابل ذکر ہیں۔

Kafka lui a dit de le rencontrer le lendemain et ils
reviendraient la chercher.

Le lendemain, quand ils n'avaient pas encore trouvé la
poupée, Kafka donna à la petite fille une lettre "écrite" de la
poupée qui disait : " S'il te plaît ne pleure pas. J'ai fait un
voyage pour voir le monde. Je vais t'écrire sur mes
aventures."

C'est ainsi que commença une histoire qui se poursuit

jusqu'à la fin de la vie de Kafka.

One summer morning,

Franz Kafka was going for a stroll at Steglitz Park, as usual

It was a place full of life: there were couples, elder people, soldiers, policemen, sellers, well dressed children...

Franz loved watching people and enjoyed the silence.

The air, the trees, the heat of the sun...

Everything was lovely, just like a gift.

Suddenly, he heard a loud crying that stopped him.

It was a little girl near him, standing alone.

No one was looking at her.

Franz didn't know what to do. Kids were a mystery to him.

The little girl looked very young and she was nicely dressed:

a lace collared blouse, a ruffled skirt, a jacket and boots.

She had dark long hair, braided on each side.

She was beautiful, just like every little girl.

What can I do? Franz thought. Is she lost?

Should I go with her to find a policeman that could help her?

Will she be afraid of me?

I can't go and leave her here all alone, in the middle of the park.

اس کا اردو ترجمہ خالد سہیل نے کافکا کی گڑیا کے عنوان سے کیا ہے۔ اس کا اقتباس مندرجہ

ذیل ہے:

گر میوں کا موسم تھا اور پارک میں کافی گہما گہما تھی۔ پارک کے ایک کونے میں بچے کھیل رہے تھے۔ اس کے دوسرے کونے میں نوجوان جوڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اس کے تیسرے کونے میں چند بزرگ خاموش بیٹھے تھے۔ فرانز کافکا بھی پارک میں خاموشی سے اکیلے کھڑے زندگی کے ان مناظر سے محظوظ و مسحور ہو رہے تھے جب اچانک انہیں ایک بچی کے رونے کی آواز آئی۔ پہلے وہ سمجھے انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے لیکن جب بچی کے رونے کی آواز بڑھتی گئی اور رونے میں ہچکیاں شامل ہو گئیں تو

انہوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی انہیں اپنے قریب ہی ایک بچی نظر آئی جو اکیلی کھڑی زارو قطار رو رہی تھی۔

کاؤکا نے سوچا آخر یہ بچی کیوں رو رہی ہے؟
نہ تو اسے کسی بچے نے مارا ہے اور نہ ہی اس کی ماں نے اسے سرزنش کی ہے اور نہ ہی وہ گر کر زخمی ہوئی ہے تو پھر آخر وہ بچی کیوں رو رہی ہے؟
کاؤکا نے چاروں طرف دیکھا۔ سب لوگ اس بچی کی حالت زار سے بے نیاز اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

کاؤکا چونکہ بہت حساس تھے اور انہوں نے اپنے بچپن میں نفسیاتی کشمکش کا سامنا کیا تھا تو اس بچی کے رونے کا ان پر بہت گہرا اثر ہوا۔ اس ضمن میں یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ کاؤکا کی گڑیا کا اردو میں ترجمے میں حذف و اضافے سے کام لیا گیا معلوم ہوتا ہے یا انگریزی متن کو مرکزیت دیتے ہوئے کئے جانے کا گمان ہوتا ہے تاہم ترجمے میں عمومی طور پر حذف و اضافے کا عمل بڑی حد تک کارفرما رہتا ہے۔
اس ضمن میں عاصم بٹ کا مندرجہ ذیل اقتباس قابل ذکر ہے:

کاؤکا کی آواز بیسویں صدی کی ایک نہایت توانا اور منفرد آواز مانی جاتی ہے۔ اس آواز میں جدید بتلائے کرب انسان کی چیخ ہے، مشینوں کی گڑ گڑاہٹ اور عالمی جنگوں کی قتل و غارت گری اور کساد بازاری کی دہائی موجود ہے۔ اس نے جدید انسان کی صورت حال بیان کرنے کا ایک یکتا و منفرد زاویہ وضع کیا جس کے تحت ادب میں حقیقت کو دیکھنے کی ایک تیسری آنکھ، ایک تیسرے فہم اور ایک تیسرے افق کا اضافہ ہوا۔

(رسالہ تجزیات سہ ماہی، ص۔ اول)

بیسویں صدی کے فرانسیسی ادیبوں میں موپاساں (1850-1893) کی شہرہ آفاق کہانی Aux Champs نہایت اہم ہے اس کا اردو ترجمہ عالمی ادب کے اردو تراجم کے توسط سے حاصل ہوا ہے۔ اس کا فرانسیسی زبان میں اقتباس مندرجہ ذیل ہے:

Les deux chaumières étaient côte à côte, au pied d'une colline, proches d'une petite ville de bains. Les deux paysans besognaient dur sur la terre inféconde pour élever tous leurs petits. Chaque ménage en avait quatre. Devant les deux portes voisines, toute la marmaille grouillait du matin au soir. Les deux aînés avaient six ans et les deux cadets quinze mois environ ; les mariages, et, ensuite, les

naissances, s'étaient produites à peu près simultanément dans l'une et l'autre maison.

مذکورہ اقتباس کا انگریزی ترجمہ:

The two cottages stood side by side at the foot of a hill near a little seaside resort. The two peasants laboured hard on the fertile soil to rear their little ones, of whom each family had four.

Before the adjoining doors a whole troop of brats swarmed from morning till night. The two eldest were six years old, and the youngest were about fifteen months; the marriages, and afterwards the births, having taken place nearly simultaneously in both families.

مذکورہ اقتباس کا اردو ترجمہ مندرجہ ذیل ہے: دونوں جھونپڑیاں ایک چھوٹے سے ساحل کے قریب ایک پہاڑی کے دامن میں ایک دوسرے سے بالکل لگ کر کھڑی تھیں دونوں کسان اپنے بچوں کی پرورش کے لئے ناہم وار اور بنجر زمین پر سخت محنت کر رہے تھے۔ ہر کسان کے چار بچے تھے۔ ملحقہ دروازوں کے سامنے گندے کپڑوں میں ملبوس بچوں کا ایک پورا دستہ صبح سے رات تک کھیلتا اور زمین پر گرتا رہتا تھا۔ دونوں خاندان کے چھوٹے بچوں کی عمر تقریباً پندرہ ماہ تھی۔ کسانوں کی شادیاں، اور پھر بچوں کی پیدائش، دونوں خاندانوں میں تقریباً ایک ساتھ ہوئیں تھیں۔ سبھی ایک دوسرے سے اتنا گھل مل گئے تھے کہ دونوں مانسیں بمشکل اولاد میں فرق کر پاتی تھیں۔

اس طرح موپاساں کی کہانیوں میں دیہی حقیقت نگاری، خاندانوں کا تذکرہ، بچوں کے لئے والدین کے مقاصد اور جدت طرازی کا تصور بخوبی نمایاں ہے۔ اسی طرح موپاساں کی ایک اور کہانی L'Enfant جس کا انگریزی ترجمہ Adopted Son کے عنوان سے ہوا ہے اور اردو کا ترجمہ بعنوان نور چشم دیب ڈیسک پر باسانی دیکھا جاسکتا ہے۔

واضح رہے کہ اتنے مختصر مضمون میں سبھی اہم فرانسیسی تراجم کا احاطہ ممکن نہیں ہے ان کی ایک کثیر تعداد ہے۔ ان میں البرٹ کامیو، موپاساں، کافکا کے علاوہ بھی دیگر فن کار اور ناقدین شامل ہیں۔ فرانسیسی نظریات پر مشتمل ترجمے اور تحریروں بزرگ میں تحریکوں کا موجب بنیں۔ ترقی پسند تحریک پر فرانسیسی حقیقت نگاری غالب تھی گو اس پر جرمن ادیب کارل مارکس اور روسی ادیبوں کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ جدیدیت کے نفسیاتی عوامل میں ارباب ادب کے مطابق کافکا کا اثر نسبتاً زیادہ نظر آتا ہے۔ جہاں تک

ادب اطفال کا تعلق ہے اس میں البرت کا میو کی اخلاقی کہانیاں، ننھے کولس کا کردار اور سندریلا کی کہانی اس میں شاہی دعوت کا اہتمام جس کا اخلاقی پیغام بھلائی کے انجام پر مشتمل ہے۔ قارئین بالخصوص بچوں کا اعتماد حاصل کر لیتے ہیں۔

موجودہ دور میں کمپیوٹر سے متعلق مختلف تکنیکی عناصر اور مصنوعی ذہانت کے معاشرے میں اطلاق سے ادب اطفال میں نئے ابعاد روشن ہو گئے ہیں جن کے مثبت اور منفہ پہلوؤں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔



میرٹھ کی معروف سماجی تنظیم وی کمٹ کے ایک پروگرام میں بانیوں سے ڈاکٹر آصف علی، معروف شاعر مولانا سید نایاب الدین نایاب، پروفیسر اسلم جمشید پوری، وی کمٹ کی بانی محترمہ رمانہ وغیرہ سیدہ مریم الہی کے اسکول کے بچوں کے لیے تحائف دیتے ہوئے۔



شارٹ فلم و مزمر معروف اسٹیج اداکار محترم راشد یوسف شعبہ اردو کے پریم چند سیمینار ہال میں پروفیسر اسلم جمشید پوری، محترم امل شرما اور محترم بدر محمود سے ٹرافی لیتے ہوئے۔

اطفالِ ادب میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت

دنیا سمٹ کر ایک گاؤں بن کر رہ گئی ہے! ایسا ممکن ہو پایا ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے۔ پہلے کمپیوٹر پھر موبائل اور آئی پیڈ نے دنیا کو اتنا قریب کر دیا ہے کہ اب دنیا کو گلوبل ویلج کہا جانے لگا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی روپوٹ کی ایجاد کی ہے۔ روپوٹ کتنا کامیاب ہے اور روپوٹ سے کیسے کام لیے جا رہے ہیں کہ انسانوں کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے کام روپوٹ خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ مشینوں کو ہنڈل کرنا ہو، وزن اٹھانا ہو یا آپریشن کرنا ہو یعنی انسانی زندگی کی حفاظت میں روپوٹ اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ آنے والے وقت میں روپوٹ ہر جگہ کام کرتے ہوئے پائیں جائیں گے۔ چاہے وہ آفس ہو یا میدانِ جنگ ہو انسانوں کی جگہ روپوٹ ہی دکھائی دیں گے۔

وقت کسی کی پروا نہیں کرتا بلکہ ہمیں وقت کی پروا کرنا پڑتا ہے اور جو وقت کی پروا نہیں کرتے وہ ترقی سے، سماج سے، دنیا زمانے سے بچھڑ جاتے ہیں۔ بچھڑ جانا جہالت کی نشانی ہے۔ اب علم صرف ڈگریوں کا نام نہیں ہے بلکہ اب جس کے پاس جدید یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم ہے وہی قابل ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی سے جڑنے کے لیے ہمیں اپنے تعلیمی اداروں کو، مدرسوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی سے جوڑنا پڑے گا۔ تعلیمی اداروں اور مدرسوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی سے جوڑنے کے لیے ہمیں نئی نسل کی ذہن سازی کرنا پڑے گا۔ ذہن سازی کا سب سے اچھا ذریعہ ہے ادب اطفال۔

Childis یعنی بچپن کبھار کی مٹی کی طرح ہوتا ہے۔ بچوں کو ہم جس طرح چاہیں موڑ سکتے ہیں۔ اس کے لیے ادب اطفال کو بھی سائنس اور ٹیکنالوجی سے جوڑنا پڑے گا۔ اس کے لیے ہمیں بچپن کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔ پہلا حصہ Childish اور دوسرا حصہ Child Like یعنی بچوں کی پسند۔ بچوں کے زمرے میں ایک سے پانچ سال کی عمر کے بچے آتے ہیں اور چھ سے بارہ سال کی عمر کے Child like کے زمرے میں آتے ہیں کیونکہ انہیں پسند اور نا پسند کی تمیز ہو جاتی ہے۔ اس لیے ادب اور ادب اور اطفالی رسائل کے مدیران کو پہلے چھوٹی عمر کے بچوں کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی پر تصویروں کے ذریعے مواد پیش کرنا پڑے گا تاکہ بچے عمر کے ابتدائی دور میں ہی سائنس اور ٹیکنالوجی کے معنی سمجھ سکیں۔

اس کے بعد کی عمر والے بچے پسندنا پسند کی تمیز کرتے ہیں اس لیے ادب و شعر اور مدیران کو ان کی عمر اور پسند کا خیال رکھتے ہوئے مضامین رقم کرنا اور شائع کرنا پڑے گا۔ چھوٹی عمر کے بچوں کے لیے کارٹون اور تصویر کی کہانیوں کے ذریعے سائنس اور ٹیکنالوجی کے سلسلے میں تخلیقات پیش کرنا پڑے گا اور ان سے بڑی عمر کے بچوں کے لیے ان کی پسند کے مطابق سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین، کہانیاں دلچسپ انداز میں لکھ کر پیش کرنا پڑے گا اور یہ کام صرف اور صرف ہمارے اطفالی رسائل، ادب و شعر اہی کر سکتے ہیں۔ بچوں کو مطالعے کے لیے دلچسپ و مزاحیہ ادب لکھ کر بتانا ہوگا کہ ناسا کیا ہے؟ منگل گرہ کیا ہے؟ ٹیکنالوجی کیا ہے؟ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے دنیا کو کس طرح فتح کیا جاسکتا ہے۔

آج اسکول کی کتابیں بھی ڈیجیٹل فارم میں آ رہی ہیں تو ہمارے اطفالی رسائل کیوں ڈیجیٹل فارم میں شائع نہیں ہو سکتے۔ رسائل اب کوئی خرید کر پڑھنا نہیں چاہتا یہ سوچ کر رسالہ بند کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا کہاں کی دانش مندی ہے۔ مدیران کو بھی آگے آنا چاہئے، حوصلہ رکھنا چاہئے، اپنے رسالے کو ڈیجیٹل فارم میں شائع کرنا چاہئے۔ ہم نے بچوں کو موبائل دے دیا ہے، کمپیوٹر یا لپ ٹاپ دے دیا ہے تو انہیں ڈیجیٹل ادبی رسائل بھی مہیا کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ ہم اگر اسی طرح تماش بین بنے رہے تو اس کے نتائج بہت خراب اور بھیانک انداز میں سامنے آنے والے ہیں۔ کیونکہ موبائل اخلاق کا دشمن بن گیا ہے۔ ہمیں بچوں کے مستقبل کی حفاظت کرنا ہے، اخلاق کی حفاظت کرنا ہے، دین و دنیا کی حفاظت کرنا ہے اور یہ تب ہی ممکن ہوگا جب اطفالی رسائل اور تخلیقات کو سائنس اور ٹیکنالوجی سے جوڑ دیا جائے گا۔

کورونا وبا کے دوران ساری دنیا نے دیکھا ہے کہ ورک ٹو ہوم چل رہا تھا۔ تعلیم کا سلسلہ بھی موبائل، لپ ٹاپ اور کمپیوٹر پر جاری تھا۔ بچے نہایت دلچسپی سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اگر ہم بچوں کو ڈیجیٹل رسائل پیش کریں گے تو وہ ضرور پڑھیں گے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ آج کی نئی نسل، بکری، بطخ اور شیر کی کہانی پڑھنا اور سننا پسند نہیں کرتی بلکہ انہیں آج کے دور کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی کہانی سننا اور پڑھنا پسند ہے۔ اس لیے ادب کو سائنس اور ٹیکنالوجی پر دلچسپ نئے نئے موضوعات پر کہانیاں اور مضامین لکھنے ہوں گے۔ ہمیں نہایت ایمان داری سے غور کرنا پڑے گا، سوچنا پڑے گا کہ ہمارا ادب اطفال کہاں کھڑا ہے۔ اس کا معیار کیا ہے، کیسا ہے؟ آج یورپ وغیرہ میں کیا لکھا جا رہا ہے، کس طرح پیش کیا جا رہا ہے۔ ہم ہر معاملے میں یورپ کی نقل کرتے ہیں تو ادب اطفال میں کیوں نہیں؟ یہ نقل ہی ہمیں ادب اطفال کے معاملے میں بھی یورپ کے برابر کھڑا کر دے گی۔

ادارہ بھٹکل ہندوستان میں اس جانب قدم اٹھا چکا ہے۔ وہ لوگ دل سے جدوجہد کر رہے ہیں، بچوں کی ذہن سازی کرتے رہتے ہیں، اسکولنگ کر رہے ہیں۔ بچے شوق سے جڑتے جا رہے ہیں۔ بھٹکل کے بچے وہ کام کر رہے ہیں کہ دل و دماغ حیران رہ جاتا ہے۔ سارے ہندوستان کے اردو اسکولوں اور مدرسوں کو بھٹکل سے سبق لینا چاہئے۔ صلاح لینی چاہئے، مشورے کرنا چاہئے، مدد مانگنی چاہئے۔ اب تو

قرآن بھی ڈیجیٹل ہو گیا ہے۔ میں نے خود ایک ڈیجیٹل قرآن خریدا ہے۔ قرآن کے ساتھ ساتھ تو ایک الیکٹرانک قلم بھی ہے جسے سطروں پر رکھ دو تو تلاوت کی آواز آنے لگتی ہے۔ اسی طرح قرآن کو پڑھنے اور سننے میں آسانی بھی ہوتی ہے اور لطف بھی آتا ہے۔

آج ادب اطفال رقم کرنے والے ادبا و شعرا کی کمی نہیں ہے لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی پر لکھنے والوں کا فقدان ہے۔ برسوں سے ایک ہی نام سنتے آرہے ہیں محمد خلیل خان۔ کبھی کبھی پروفیسر یعقوب صاحب کا بھی کوئی مضمون نظر سے گزر جاتا ہے۔ عبدالودود انصاری، ناصر اورنگ آبادی بھی کبھی جھلک دکھا جاتے ہیں۔ سراج عظیم کا بنایا بچپن گروپ بہت فعال ہے اور بنیادی کام کر رہا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کثرت سے لکھنے اور شائع ہونے والی پونے مہاراشٹر کی شاہ تاج خان بچپن گروپ کی دین ہے۔ وہ خوب لکھ رہی ہیں۔ ادبا کو شاہ تاج کی جانب توجہ کرنا چاہئے۔ ان سے مشورے کرنے چاہئیں۔ ہمیں اگر ادب اطفال کو زندہ رکھنا ہے تو سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنانا ہی پڑے گا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی پر مضامین اور کہانیاں لکھنا پڑے گا جو اس وقت پر زور مانگ ہے۔ وقت کا اہم تقاضہ ہے اور ہمیں وقت کے ساتھ چلنا پڑے گا۔ وقت کے ساتھ چل کر ہی ہم اطفال ادب اور اطفالی قارئین کو بچا سکتے ہیں۔

☆☆☆



محترمہ سکریٹریال (جوگندر پال کی صاحبزادی) شعبہ اردو میں منعقد ایک روزہ قومی سیمینار بعنوان ”جوگندر پال: کہانی کی دنیا“ پر اظہار خیال کرتے ہوئے اور اسٹیج پر موجود ہیں دائیں سے ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر ابو ظہیر ربانی، پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی، پروفیسر اسلم جمشید پوری اور پروفیسر عابد حسین حیدری۔

اردو ادب اور بچوں کے رسائل

اس سے پہلے کہ میں اپنا مضمون شروع کروں یہاں امتیاز احمد کے مضمون ”بچوں کے اردو رسائل“ کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہوں گا.....

”در اصل اردو میگزین کا مقصد تازہ علم و آگہی کی ترسیل ہے۔ بچے ملک و قوم کا مستقبل ہیں۔ ان کی تزئین حیات کے لئے رسائل اور میگزین محرک نیز موثر ذرائع ہیں۔ جو اپنے پیش قیمت مشمولات اور پُر تاثیر مواد سے بچوں میں زندگی جینے اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ ان معنوں میں رسائل کو ایک پختہ کارمری کا درجہ حاصل ہے جو اپنے زیر تربیت بچوں کے نفسیاتی تقاضوں، وقت اور زمانے کے مزاج اور ضرورتوں سے پوری طرح آگاہ ہے اور اپنی ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کے لیے وقتاً فوقتاً ناگزیر تبدیلیوں کو راہ دیتا ہے۔ اس طرح اس کی بنیاد اخلاقی اقدار، بصیرت اور تعمیر پسندی پر استوار ہوتی ہے۔ یہ میگزین بچوں کے لئے ادبی ذخائر کا درجہ رکھتے ہیں۔ عالمی ادب کے برعکس ادب اطفال کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے جو اردو میگزین شائع ہوئے ہیں وہ کبھی کچھ کم لائق اعتنا نہیں۔ کھلونا، کارٹون، باغ و بہار یعنی، پھلواڑی، پھول، کلیاں، ٹانی اور چند انگریزی وغیرہ۔ اردو رسائل نے بچوں کی ذہنی اور فکری نشوونما اور شخصیت سازی میں نمایاں طور پر حصہ لیا تا ہم یہ رسائل بہت دنوں تک اپنا وجود بحال رکھنے میں ناکام رہے۔“

موجودہ دور میں جو رسائل بڑی آب و تاب سے نکل رہے ہیں ان میں ”گل بوئے“ ہے جس کے مدیر فاروق سید ہیں۔ یہ بڑی تعداد میں تو شائع ہوتا ہی ہے ساتھ ہی مہاراشٹر کے تمام اسکولوں میں بھی جاتا ہے۔ ۱۸۰۰۰ کی تعداد میں شائع ہونے والا یہ رسالہ پورے مہاراشٹر میں بچوں کی ذہنی تربیت میں ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔ ویسے بھی اردو کے فروغ میں مہاراشٹر کو اولیت حاصل ہے۔ اردو ادب کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جن ماں باپ کے گھروں میں اردو کے اخبارات یا بچوں کے رسائل آتے رہے ہیں ان کی اولادیں آگے چل کر دنیائے ادب کی ممتاز شخصیت کہلائیں اس لئے کہ بچوں کی تربیت میں سب سے زیادہ اہم رول بچوں کے رسائل ہی ادا کرتے

ہیں۔ اگر بچوں کو آپ نہیں بھی پڑھائیں گے تو انہیں اپنے آپ پڑھنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور شوق پیدا کرنے کا فریضہ صرف اس کے ماں باپ ہی ادا کرتے ہیں۔ اگر وہ کچھ بھی نہ کریں تب بھی وہ اپنے گھر میں ادبی ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور رفتہ رفتہ یہ شوق ان کی ضرورت بن جاتا ہے۔ دنیا کی جتنی بھی بڑی شخصیات ہیں ان کے گھروں میں ادبی ماحول صرف بچوں کے رسائل ہی پیدا کرتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی، کوثر چاند پوری، جگن ناتھ آزاد، عصمت چغتائی سے لے کر مظفر حنفی تک بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اردو کے پروفیسر یا لیکچرار سے زیادہ معلومات ان بچوں کو ہوتی ہیں جن کے گھروں میں اردو رسائل آتے ہوں۔ دنیا کی ہر زبان کے ادب میں بچوں کی تربیت صرف ان رسائل سے ہوتی ہے اور ہر زبان میں بچوں کے رسائل کی اہمیت رہی ہے انگریزی، ہندی، مراٹھی زبانوں میں بچوں کے بیشمار رسالے نکلتے ہیں۔ اردو میں بھی بچوں کے درجنوں رسائل نکلتے ہیں۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ بچوں سے متعلق اردو رسائل کتنے اور کہاں کہاں سے نکلتے ہیں۔ اس سلسلے میں اردو دنیا کے ایڈیٹر عبدالحی لکھتے ہیں.....

”بچوں کے رسائل نے ادب اطفال کے فروغ میں اہم کارنامہ انجام دیا ہے، نہ صرف بچوں کی تربیت کی بلکہ ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم عطا کیا اور ان کی تخلیقات لوگوں میں مقبول ہوئیں۔ بچوں کا سب سے پہلا رسالہ بچوں کا اخبار تھا جو مئی ۱۹۰۲ء میں لاہور سے نکلتا شروع ہوا تھا۔ اس کی ادارت مثنیٰ محبوب عالم کے ذمے تھی۔ یہ رسالہ ۱۹۹۳ء تک نکلتا رہا اور آزادی سے قبل پھول کلیاں، پھولاری، نونہال پیام تعلیم، غنچہ وغیرہ مقبول رسالے ہیں۔ رامپور سے مولانا ابوسلیم عبدالحی نے ادارہ احسانات کا قائم کیا تھا اور اس ادارے نے بچوں بڑوں اور لڑکیوں کی اخلاقی تربیت کے لئے کئی رسالے جاری کئے۔ بچوں کا ڈائجسٹ نور اگست ۱۹۵۲ء میں اس ادارے سے شروع ہوا تھا۔“

پھر شمع کے ادارے سے کھلونا جب شروع ہوا تو اس رسالے نے بچوں کی ذہنی تربیت کا ایک ریکارڈ قائم کیا کہ باقاعدہ کھلونا ہر ادبی گھر میں جانے لگا۔ کھلونے بچوں کے رسائل میں ایک تاریخ مرتب کی ہے۔ یوں تو شمع کے ادارے سے بانو، شبستاں جیسے اور بھی کئی رسائل نکلے اور ہر رسالے نے اپنی ایک الگ پہچان قائم کی لیکن شمع اور کھلونا میں چھپنے والے آج دنیائے ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ کرشن چندر اور عصمت چغتائی تو باقاعدہ اس میں چھپتے تھے۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ بچوں کے رسائل بچوں کی تربیت میں جو رول ادا کرتے ہیں وہ کوئی استاد بھی ادا نہیں کر سکتا اس لئے کہ اصل چیز بچے میں شوق پیدا کرنا ہوتا ہے اور بچوں کے رسائل بچوں میں اخلاقی ہمدردی اور انسانیت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، حالانکہ ہمارے اردو سماج میں پڑھنے کا رجحان بہت کم ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے ماں باپ کے گھر ہی جب اردو کا ماحول نہ ہوگا تو بچے کیسے تربیت پائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بچوں

کو پڑھانے سے زیادہ ان کی تربیت کی ضرورت ہے اور ان کی تربیت کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اپنے گھر کو ادبی ماحول سے سجادیں۔ بچوں کے رسائل ہر گھر میں اگر آنے لگیں تو بچہ اپنے آپ اس طرف راغب ہوگا۔ شروع شروع میں وہ الٹ پلٹ کر دیکھے گا اور پھر رفتہ رفتہ اسے پڑھنے کا شوق پیدا ہو جائے گا اور پھر یہی شوق اس کی ضرورت بن جائے گا۔ ماں باپ کا اولین فرض یہی ہے کہ وہ اپنے گھروں میں اردو کا ماحول پیدا کریں۔ اردو کے اخبارات اور بچوں کے رسائل ان کے سامنے رکھ دیں۔ آج نہیں تو کل یقیناً وہ ان رسائل کو پڑھیں گے اور ماں باپ کو ان کی تربیت میں زیادہ محنت بھی نہیں کرنا پڑے گی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ممبئی سے شائع ہونے والا بچوں کا رسالہ ”گل بوٹے“ جو ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو رہا ہے اور مہاراشٹر کے سینکڑوں اسکولوں میں جاتا ہے، فاروق سید اس سلسلے میں بچوں کے رسائل اور بچوں کے ادب سے متعلق ایک بہت بڑی عالمی کانفرنس دہلی میں کر رہے ہیں جس میں دنیا بھر کے تمام ممالک کے بچوں کے شاعر ادیب شرکت کریں گے۔ اسی طرح دہلی اردو اکادمی کا امنگ، پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ حال ہی میں یوپی اردو اکادمی نے ”باغیچہ جاری کیا ہے۔ حیدرآباد اردو اکادمی نے ”روشن ستارے“ جاری کیا ہے۔ ”رہنمائے تعلیم“ کو جاری ہوئے سو سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ ابھی چند سال پہلے کا مٹی سے ریحان کوثر کا رسالہ ”الفاظِ ہند“ بھی شائع ہو رہا ہے اور اب تو قومی کونسل نے ”بچوں کی دنیا“ نکال کر ایک ایسا ریکارڈ قائم کیا ہے کہ جس کی مثال اردو دنیا میں نہیں ملے گی۔ اس رسالے نے بچوں کے رسائل کی تاریخ میں ایک نمایاں رول ادا کیا ہے کہ اس کی اشاعت ایک لاکھ کے قریب ہو گئی۔ بچوں سے متعلق سب سے زیادہ تعداد میں شائع ہونے والا یہ واحد رسالہ ہے جو اتنی بڑی تعداد میں چھپتا ہے۔ کون کہتا ہے کہ اردو ختم ہو رہی ہے؟ صحیح بات تو یہ ہے کہ اس میں بچوں کا کوئی قصور نہیں۔ آج بھی انہیں پڑھنے کا شوق ہے۔ اگر شوق نہیں بھی ہے تو پیدا کیا جاسکتا ہے اور یہ فریضہ صرف بچوں کے ماں باپ ہی ادا کر سکتے ہیں کہ اپنے گھر میں اردو کے اخبارات اور بچوں کے رسائل منگوائیں اور روزانہ کے سامنے رکھ دیں، حالانکہ آجکل انٹرنیٹ اور موبائل نے کچھ دوسرا ہی ماحول پیدا کر دیا ہے لیکن بہت سے بچے ایسے بھی ہیں جو موبائل اور کمپیوٹر سے اردو لکھنا پڑھنا سیکھ رہے ہیں جنہیں اپنی اولاد کو اچھے اخلاق اور انسانیت کا درس دینا ہے تو اپنی پہلی فرصت میں بچوں کی طرف دھیان دینا چاہئے۔ یہ سچ ہے کہ بچوں میں ہی نہیں بڑوں میں بھی پڑھنے کا رجحان کم ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد ثناء اپنی کتاب ”ہندوستان میں بچوں کے رسائل“ میں ایک جگہ لکھتے ہیں.....

”آزادی کے بعد اردو زبان کے بدلتے موقف کی وجہ سے بچوں کے ذریعے تعلیم میں تبدیلی آئی ہے، آہستہ آہستہ اردو تعلیم میں کمی کے باعث اردو رسائل کے پڑھنے والوں میں کمی آتی گئی۔ بہر حال آزادی کے بعد کے اس دور میں بچوں کے رسائل کی ایک قابل قدر تعداد ایسی بھی رہی ہے جو کامیابی کے ساتھ جاری ہوئے تھے اور آج بھی نئے نئے قارئین کی ذہنی تربیت اور ان کے ذوق کی تہذیبی آبیاری کرنے میں

مشغول ہیں۔ زمین سخت اور آسمان دور لیکن ہمت پرواز ابھی ٹوٹی نہیں۔“

یاد رہے کہ اردو زبان خدا کا دیا ہوا ایک قیمتی تحفہ ہے۔ اگر ہم اس کی قدر نہیں کریں گے تو دوسرے اسے اپنائیں گے۔ اگر ہم اسے نظر انداز کریں گے، اس سے محبت نہیں کریں گے تو دوسرے اسے گلے لگالیں گے اس لئے کہ جس نے بھی اردو سے محبت کی ہے شہرت نے اس کے قدم چومے ہیں۔ اگر ہم اپنے اسلاف کے اس قیمتی ورثے کی حفاظت نہیں کریں گے تو ہمارے پاس سوائے افسوس کے کچھ نہ رہے گا۔ اس کی زندہ مثال میں پیش کرتا ہوں وہ ہے استوئی اگر وال، جس نے نہ صرف ایک سال میں اردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا بلکہ کم از کم پچاس رسالوں میں اس کی کہانیاں، مضامین اور نظمیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ اس کا جواب بھی سن لیجئے! کہ اہل اگر وال جو کہ اردو نہیں جانتے لیکن انہوں نے اپنی بیٹی کی تربیت کے لئے اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اردو میں شائع ہونے والے بچوں کے تمام رسائل قبل از وقت جاری کر لئے۔ بچوں کی دنیا، امنگ، رہنمائے تعلیم، گل بوٹے، باغچہ، روشن ستارے وغیرہ جاری کر لئے جبکہ گھر میں کوئی بھی اردو نہیں جانتا تھا۔ ان کے بھائی اور خود استوئی نے کہا کہ پاپاجب آپ اردو نہیں جانتے، گھر میں کوئی بھی اردو نہیں جانتا تو پھر یہ اردو رسائل کیوں منگواتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ صرف تیرے لئے، آج نہیں تو کل تجھے اردو پڑھنا ضرور آئے گا اور اردو سیکھنے کا شوق پیدا کرنے کے لئے اس سے بہتر طریقہ میرے پاس نہیں ہے۔ اپنے پاپا کی یہ بات استوئی کے ذہن میں بیٹھ گئی اور اس نے دن رات محنت کر کے ایک سال کے اندر ہی نہ صرف اردو لکھنا پڑھنا سیکھا بلکہ اردو ادب میں بھی نام پیدا کر لیا۔ اب اس کے پاس بچوں کے رسائل ہی نہیں، بلکہ ان کے علاوہ آجکل، شاعر، تریاق، پیماک، اردو دنیا، ایوان اردو، سب رس، سرسبز، رنگ، انشاء، تکمیل، زبان و ادب، نیا دور، نیا ورق چشمائے اردو، قومی زبان جیسے کئی رسائل نہ صرف آرہے ہیں، بلکہ سب میں اس کی چیزیں شائع ہو رہی ہیں، جبکہ ان کے گھر میں ادبی ماحول تو کیا اردو کا نام لینے والا بھی کوئی نہ تھا، لیکن اپنے والد کے منگوائے ہوئے رسائل دیکھ کر اس میں پڑھنے کی ایسی لالچ پیدا ہوئی اور چھوٹی عمر میں ہی اس نے بڑے کارنامے انجام دے ڈالے۔ اب اسے اردو ادب کی اتنی معلومات ہو گئی کہ ہمارے شہر کے بیشتر شاعروں ادیبوں، پروفیسروں کو ان رسائل کے نام بھی معلوم نہیں ہوں گے۔ یہ ایک ایسی زندہ مثال تھی جو بچوں کے اردو رسائل کے پڑھنے کا ایک زندہ کرشمہ ہے جس کی مثال مدھیہ پردیش میں تو کیا پورے ہندوستان میں دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ آخر میں صرف اپنے ایک شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں.....

تم اپنے عہد کا ورثہ تو کھو چکے ہو تمام
جو بچ سکے تو یہ اردو زبان رکھ لینا

☆☆☆

بچوں کا پہلا ناول: مراۃ العروس

ڈپٹی نذیر احمد اردو کے ان اولین معماروں میں شامل ہیں جن کے تذکرے کے بغیر اردو کی کوئی بھی ادبی تاریخ مستند و مکمل تسلیم نہیں کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے یوں تو ”چند چند سودمند“، 1896ء، منتخب الحکایات 1869ء، موعظ حسنہ [مکتوبات] 1887ء، ترجمۃ القرآن 1896ء، الحقوق والفرائض [تین حصے] 1906ء، ادعیۃ القرآن، 1321ھ، امہات الامہ 1909ء، مطالب القرآن 1909ء، حرف صغیر [قواعد فارسی] 1870ء، مبادی الحکمۃ 1870ء، مابغنیہ کا فی الحرف [عربی قواعد] 1877ء، رسم الخط 1912ء وغیرہ مذہبی، اخلاقی اور علمی کتابوں کے ساتھ ساتھ تعزیرات ہند 1864ء، مصائب غدر 1863ء، مساوات 1872ء، اور تاریخ دربار تاج پوشی 1903ء وغیرہ تراجم کے علاوہ نصاب خسرو 1870ء [امیر خسرو کی خالق باری کی منظوم لغت] اور مجموعہ نظم بے نظیر 1909ء کی صورت میں شاعری کے بھی عمدہ اور قابل تقلید نمونے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ لیکن اردو کی ادبی تاریخ میں ان کی شہرت کی خاص وجہ ان کے ناول بنے۔ انہیں اردو میں صنف ناول نویسی کا موجد تسلیم کیا گیا۔ انہوں نے 1869ء میں ”مراۃ العروس“، 1872ء ”بنات العرش“، 1874ء میں ”توبۃ النصوح“، 1885ء میں ”فسانہ مبتلا“ 1888ء میں ”ابن الوقت“، 1891ء میں ”ایامی“ اور 1892ء میں ”رو یائے صادقہ“ کے نام سے کل سات ناول تحریر کیے۔ جن میں ”مراۃ العروس“ کو بعض جزوی اختلافات سے قطع نظر اردو کے اولین ناول ہونے کے ساتھ ساتھ میرے نزدیک بچوں کے پہلے ناول ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔

”مراۃ العروس“ اپنے عہد کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی ایک جدید اور انوکھی تخلیق تھی۔ جس نے متوسط طبقے کے گھروں کی چہار دیواری سے لے کر سرکاری ایوانوں تک میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ کیونکہ اس وقت تک اصلاحی ادب کے ایسے دلچسپ نمونے دستیاب نہیں تھے۔ خود ڈپٹی نذیر احمد ”مراۃ العروس“ کے دیباچے میں اصلاحی ادب کی عدم دستیابی کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”خاندان کے دستور کے مطابق میری لڑکیوں نے بھی قرآن شریف، اس کے

معنی اور اردو کے چھوٹے چھوٹے رسالے گھر کی بڑی بوڑھیوں سے پڑھے

گھر میں رات دن پڑھنے لکھنے کا چرچا تو رہتا ہی تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ ہم مردوں

کی دیکھا دیکھی لڑکیوں کو بھی علم کی طرف ایک طرح کی خاص رغبت ہے۔ لیکن

اس کے ساتھ ہی مجھ کو یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ نرے مذہبی خیالات بچوں کی حالت کے مناسب نہیں اور جو مضامین ان کے پیش نظر رہتے ہیں ان سے ان کے دل افسردہ، ان کی طبیعتیں منقبض اور ان کے ذہن کند ہوتے ہیں۔ تب مجھ کو ایسی کتاب کی جستجو ہوئی جو اخلاق و نصائح سے بھری ہوئی ہو اور ان معاملات میں جو عورتوں کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورتیں اپنے توہمات اور جہالت اور کج رائی کی وجہ سے ہمیشہ ان میں رنج و مصیبت رہا کرتی ہیں، ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کی عادات کی تہذیب کرے اور کسی قدر دلچسپ پیراے میں ہو، جس سے ان کا دل نہ اکتائے، طبیعت نہ گھبرائے مگر تمام کتاب خانہ چھان مارا۔ ایسی کتاب کا پتہ پر نہ ملا۔ تب میں نے اس قصے کا منصوبہ باندھا۔ تین برس ہوئے جب میں جھانسی میں تھا کہ اکبری کا حال قلم بند کیا۔ لڑکیوں کو تو اس کا وظیفہ ہو گیا اور ہر روز خط میں کتاب کا تقاضا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ڈیڑھ برس میں اصغر کی کا حال بھی لکھا گیا۔ ہوتے ہوتے اس کتاب کا چرچا محلے میں ہوا اور عورتیں اس کو سننے کو آئیں جس نے سنا سمجھ گئی۔ اونچے اونچے گھروں میں کتاب منگوائی گئی، نقل لینے کے ارادے ہوئے جب میں نے دیکھ لیا یہ کتاب عورتوں کے لیے نہایت مفید ہے اور خوب دل لگا کر پڑھتی ہیں اور سنتی ہیں، تب اس کو جناب ڈائریکٹر صاحب بہادر مدارس ممالک شمالی و مغربی کے ذریعے سے سرکار میں پیش کیا۔“ [دیباچہ مرآۃ العروس، ص 4-3]

کتاب شائع ہوئی اور بے حد پسند کی گئی۔ اس کی مقبولیت کا تذکرہ کرتے ہوئے نذیر احمد بنات العرش کے دیباچے کے فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں:

”مرآۃ العروس 1869ء میں تصنیف ہوئی اور اب 1888ء ہے۔ اس اثنا میں لاکھ جلدوں سے زیادہ شائع ہو چکی ہیں۔“

[نذیر احمد کے ناول: تنقیدی مطالعہ: اشفاق محمد خاں، ص 220]

عوامی مقبولیت کے ساتھ ساتھ سرکاری اور حکمران جماعت کی سطح پر بھی اس کی ستائش اور پذیرائی ہوئی۔ 26 جنوری 1869ء کے آگرہ دربار کے موقع پر لیفٹننٹ گورنر سر ولیم میور نے اپنے خطبے میں ”مرآۃ العروس“ اور اس کے مصنف کی تعریف کرتے ہوئے اس وقت کے بڑے سرکاری انعام ہزار روپے دینے کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا:

”اس شخص [مولانا نذیر احمد] کے لیے ایک ہزار روپے کا انعام تجویز ہوا ہے۔ کہ اس نے ایک کتاب مرآۃ العروس کے نام سے تصنیف کی جس میں ہندوستان کے مسلمانوں کی راہ و رسم خانہ داری کا ایک بہت خوب قصہ ہے۔

اس کا لطف یہ ہے کہ دلچسپ ہے اور اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو باعصمت اور صاحب حیا مستورات کے پڑھنے کے لائق نہ ہو۔ اس کے ہر صفحے سے عقل دانش کی اصلاح اور تہذیب اخلاق اور حسن معاشرت کی نصیحت نکلتی ہے۔ محمد نذیر احمد مجھے نہایت خوشی ہے کہ یہ انعام ہزار روپے کا تمہیں دوں اور اس واسطے تمہاری قدر زیادہ ہو۔ میں اپنی جیب خاص سے ایک گھڑی دیتا ہوں۔“

[نذیر احمد کے ناول: تنقیدی مطالعہ: اشفاق محمد خاں، ص 22-221]

دیگر زبانوں کے علاوہ ہندوستان میں رائج اس وقت کی تینوں بڑی زبانوں انگریزی، بنگلہ اور ہندی میں بھی اس کے تراجم اور نصاب میں شامل کیے جانے کے علاوہ ان کے اہم معاصرین میں الطاف حسین حالی، شاد عظیم آبادی، رشیدۃ النساء، مرزا عباس حسین ہوش، راشد الخیری، بشیر الدین احمد، قاری سر فراز حسین غری اور سید احمد دہلوی جیسے مایا نازادیوں نے ”مرآۃ العروس“ کے تنقیر میں ”مجالس النساء“ [حالی] صورت الخیال [شاد عظیم آبادی] اصلاح النساء [رشیدۃ النساء] نادر جہاں، ربط وضبط [مرزا عباس حسین ہوش] منازل السائرہ، صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی، نوحۂ زندگی، بنت الوقت، حیات صالحہ، سوکن کا جلاپا، نانی اٹو [راشد الخیری] اقبال دہلوی، حسن معاشرت، اصلاح معیشت، لخت جگر، انشائے بشیر، فغان اشرف [بشیر الدین احمد] سعید، سعادت، شاہد رانا، سزائے عیش، انجام عیش، سراب عیش، خمار عیش، بہار عیش، ثروت دہلوی، مس عنبریں [سرفراز حسین غری] اور قصہ پتر بہنیلی رقصہ مہر و افروز جیسے بے شمار اصلاحی قصے، ناول تحریر ہوئے جو موضوع اور مقصد کے لحاظ سے ”مرآۃ العروس“ کی بازگشت سنانی دیتے ہیں۔

”مرآۃ العروس“ کی اسی شہرت و مقبولیت نے اسے ناقدین و دانشوران ادب کا تختہ مشق بنا دیا۔ حتیٰ کہ مثبت و منفی رایوں کا ایک طویل سلسلہ آج تک جاری ہے۔ کچھ کے نزدیک اسے اردو میں ادب اطفال کا نقش اول ہونے کا فخر حاصل ہے تو بعض کے نزدیک اس کا مخاطب:

- ۱۔ بچوں کے بجائے بالغ خواتین ہیں۔
 - ۲۔ اس میں ازدواجی زندگی اور معاشرتی اصلاح کے پہلو نمایاں ہیں۔
 - ۳۔ بچوں کی نفسیات اور تفریحات کو مد نظر نہیں رکھا گیا ہے۔
- اس موضوع پر مزید گفتگو سے پہلے ڈاکٹر اشفاق محمد خاں کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:
- ”فکروفن کی جدید دنیا میں نذیر احمد کے ناولوں سے متعلق اس طرح کے خیالات اور اعتراضات بظاہر تو وزنی معلوم ہوتے ہیں مگر ایک سوئس [157] سال قبل نذیر احمد کی تنگ و تاریک مشرق کی دنیا کو آج مغرب کی روشن اور تابناک نظروں سے دیکھنا اور نئی نئی راہیں بھانا اس لیے مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ مانگے کا یہ نور زیادہ دیر اور زیادہ دور تک ہمارا ساتھ نہیں دیتا، محض اعتراض یا نکتہ چینی کبھی بھی

تقید صالح نہیں بن سکتے۔ تقید کا پہلو مقصد و منصب اگر انصاف اور صراحت تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہمیں سب سے پہلے نظیر احمد کے ماحول، زمانے، افکار و اقدار اور ان کی منفرد شخصیت کا مطالعہ اپنی ہی چشمہ بینا سے کرنا ہوگا۔“

[نذیر احمد کے ناول تقیدی مطالعہ، اشفاق محمد خاں، ص 207]

اور چشم بینا کا فیصلہ یہ ہے کہ جس زمانے میں ”مراۃ العروس“ منظر عام پر آیا اس زمانے تک آج کی طرح ایچ گروپ، کلاس وائز اجتماعی نظام تعلیم کے تحت کم عمر بچوں کو اسکولوں میں داخل کرانے اور نصابی ترتیب کے ذریعے درس دینے کی روایت موجود نہیں تھی۔ بچے پہلے اپنے گھروں، آس پاس کی عبادت گاہوں یا شرفاء کی چوپالوں میں صرف مذہبی کتابیں رٹتے اور قرأت کی عملی مشق کرتے تھے۔ بعد ازاں انہیں مذہبی کتابوں کے تراجم، مذہبی مسائل و نصائح کے رسائل اور لڑکوں کو قواعد و معلومات کی کچھ کتابیں بھی پڑھائی جاتی تھیں اور یہ سلسلہ عموماً نوجوانی کی دہائی یعنی تقریباً پندرہ سال کی عمر تک جاری رہتا تھا۔ اسی دوران شادی بیاہ کے مراحل بھی طے ہو جایا کرتے تھے۔ خود ”مراۃ العروس“ کی مرکزی کردار اصغری بیگم کی شادی تیرہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی جیسا کہ ناول کے اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے:

”اب خدا کے فضل و کرم سے اصغری کی عمر تیرہ برس ہوئی۔ بات تو اس کی محمد کامل سے بھری بھرائی تھی۔ اب چرچا ہونے لگا کہ مہینہ اور دن مقرر ہو جائے“

[مراۃ العروس، ڈپٹی نذیر احمد، ص 49]

اصغری پر ہی کیا موقوف۔ اس عہد میں تحریر کیے گئے دوسرے ناولوں کے مطالعے سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً بشیر الدین احمد اپنے ناول ”حسن معاشرت“ کی ہیروئن فرخندہ جمال کی شادی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”لڑکی کی عمر چودہ کی تھی۔ مگر امیر کا بچہ ماشاء اللہ چشم بد دورا ٹھان اچھا تھا، کوئی پندرہ برس کی معلوم ہوتی تھی۔“

[نذیر احمد کے ناول تقیدی مطالعہ، اشفاق محمد خاں، ص 192]

اس سلسلے میں یہ بات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ہندوستان میں تحریر کیے گئے ادب اطفال میں وشنو شرما کی بیچ تنز کی کہانیاں ہوں یا ہندی اور بنگلہ ادب میں اس روایت کے موجد بھارتیندو ہریش چندر اور ایثور چندو دیا ساگر کے تخلیقی نمونے سب کا ٹارگیٹ یہی نسل ہے۔ یہی نہیں اگر ہم عالمی سطح پر نظر ڈالیں تو وہاں بھی یہی نسل ادیبوں کا مح نظر آتی ہے اور اسی انداز کے ناول بچوں کے لیے تخلیق کیے جانے کے شواہد موجود ہیں۔ خود نذیر احمد نے اپنے ناول ”بنات العیش“ اور ”توبۃ النصوح“ بالترتیب جن انگریز مصنفوں کے Thomas day کے ”The history of Sandford and merton“ اور Danieal defoe کے ”The Faily instructor“ سے متاثر ہو کر لکھے تھے۔ وہ موضوع، مقصد اور مخاطبین کی عمروں کے لحاظ سے ہم مثل تھے۔ سینڈ فورڈ سے بیس سال پہلے شائع ہوئے

فرانس کے معروف فلسفی روسو Rousseau کا ناول Emile بالکل اسی انداز کا تھا۔ ڈاکٹر اشفاق محمد خاں لکھتے ہیں:

”جب بچہ بلوغ [Adolescent] کے اسٹیج پر پہنچ جائے تو اس کے ذہن کی تربیت کا کام شروع ہونا چاہئے۔ اس سے پہلے استاد کا کام یہ ہے کہ جو ایمیل [Emile] کے استاد کا تھا کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے حدود کو پہچانے۔ ایمیل کا استاد بہت سے سوالوں کا جواب دیتا ہے لیکن اتنے ہی سوالات کے جوابات دیتا ہے جو بچے کے اشتیاق کو بڑھاتے ہیں اور یہ سب کچھ ایسی زبان میں ہوتا ہے جن کو بچے سمجھ سکتے ہیں اور ان میں دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ دلچسپی بچے کے علم اور تجربے کو بڑھانے میں مدد دیتی ہے جب ایمیل کی عمر پندرہ سال کی ہو جاتی ہے تو اسے عملی اور سائنسی علوم میں دستگاہ حاصل ہوتی ہے۔“ [نذیر احمد کے ناول تنقیدی مطالعہ، اشفاق محمد خاں، ص 147]

گویا روسو کے مطابق بھی پندرہ سالہ عمر ہی ذہنی تربیت کے لیے زیادہ مناسب تھی۔ لہذا اس تناظر میں ”مراۃ العروس“ کو محض بالغ خواتین کی مخاطبت اور ازدواجی زندگی کی اصلاح تک محدود کر کے بچوں کے ادب سے خارج کر دینے کا فیصلہ حقیقت اور انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ کیونکہ ناول شخصیت کے کسی ایک ہی پہلو یا کردار کی کسی ایک ہی خاصیت کے بجائے زندگی کے مختلف رنگوں اور کردار کی متنوع خصوصیات کا عکاس ہوتا ہے۔ لہذا ”مراۃ العروس“ میں ازدواجی زندگی اور معاشرتی اصلاح کے کچھ پہلوؤں کا شامل ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس میں بچوں کی تفریحات، نفسیات اور دلچسپی کا کوئی بھی عنصر موجود نہیں ہے بلکہ یہ تو اس بات کی ضمانت ہے کہ ”مراۃ العروس“ اچھے اور کامیاب ناولوں کی طرز پر ملٹی ڈائمنشن اور زندگی کی رنگارنگی کا غماز ہے۔ اس میں اصغری کی صورت میں پوری شخصیت کا ایک ایسا کردار موجود ہے جو ہر اچھے سماج کے لیے مثالی ہو سکتا ہے۔ اصل ناول کا آغاز اگرچہ نہ صرف معترضین کے اعتراض کی تصدیق کرتے ہوئے پھوہڑ اور جاہل بڑی بہن کی ازدواجی زندگی سے ہوتا ہے بلکہ مرکزی کردار اصغری کا داخلہ بھی منگنی بیاہ کے تذکرے سے ہوا ہے تاہم محمودہ کی صورت میں بچپن اور بچوں کی تربیت کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ نہ صرف اصغری کی شخصیت کو مکمل کرتا ہے بلکہ بچوں کی تربیت کے ضمن میں قابل تقلید نمونہ ہے۔

بچوں کے ادب کا مقصد محض چند رسمی باتوں، چیزوں یا حرفوں کو سمجھنے اور عبارتوں کے رٹنے کا نام نہیں ہے بلکہ ایسا ادب مراد ہے جو بچوں کی پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہو، انہیں معلومات فراہم کرانے کے ساتھ ساتھ ان کی عادات و اطوار، اخلاق و کردار، نشست و برخاست، امانت و دیانت، بڑوں کا احترام، چھوٹوں سے شفقت، والدین کی عزت، مہمانوں کی توقیر، سچ کی تلقین، جھوٹ، بے ایمانی اور لہو و لعب سے پرہیز، نرم خوئی اور شرم و حیا غرض کے تمام اچھی باتوں، خصلتوں اور انسانیت کو عروج بخشنے والی

قدروں کی افزائش اور اسے شرم سار کرنے والے جذبوں پر قدغن لگانے میں معاون ہو۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو پورے مراۃ العروس میں قدم قدم پر اس کی عمدہ مثالیں موجود ہیں اور مخصوص طور پر ناول کے پانچ، پچیس، چھپیس، اکتیس، بیس اور تینتیس یعنی چھ ابواب تو براہ راست بچوں سے متعلق ہیں۔ ان میں نو عمر لڑکیوں کو پڑھانے، لکھانے کے ساتھ ساتھ ہر طرح کے ادب و آداب، بڑے چھوٹے کا لحاظ، اخوت و مساوات، سینے پر رونے اور امور خانہ داری کے تمام لوازمات بڑے موثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

مثلاً زردہ بنانے کی ترکیب دس سالہ فضیلت کے ذریعے اس طرح بیان کرائی گئی ہے:

”سیر بھر چاول تھے۔ پہلے ان کو لگن میں بھگویا، شاید دھیلے کی ہار سنگھار کی ڈنڈیاں منگوائی تھیں۔ پیسے بھر ملی تھیں۔ ان کو کوئی سیر بھر پانی میں جوش دیا۔ جب اُبال آگیا اور رنگ کٹ گیا تو چھان کر عرق میں چاول نچوڑ کر ڈال دیے۔ چاول ادھ کچرے ہو گئے اور ایک کئی رہی تو چاولوں کو کپڑے پر پھیلا دیا کہ جتنا پانی ہے سب نکل جائے۔ پھر آدھ پاؤ گھی دہنی میں لوگوں کا بھگاردے کر کڑکڑایا اور چاول ڈال دیے۔ اوپر سے چاولوں کے ہم وزن کھانڈ دی اور اٹکل سے اتنا پانی ڈال دیا کہ چاولوں کی جو ایک کئی باقی رہی تھی گل جائے پھر کوئی ایک چھٹانک کشمش گھی میں کڑکڑا کر جب پھول گئی چاولوں میں ڈال دی

اور اوپر تلے انگارے رکھ دم دے دیا۔“ [مراۃ العروس، ص 9-108]

یہی نہیں ایک دوسری بچی محمودہ کے ذریعے اس زردے کی لاگت کا پورا حساب کتاب بھی بیان کرایا گیا ہے۔ خود اندازہ لگائیے کہ اگر لڑکیاں اچھا سینے پر رونے اور کھانے پکانے کے ساتھ ساتھ حساب کتاب میں بھی ماہر ہو جائیں تو کیا گھر جنت کا نمونہ نہیں بن سکتا ہے۔ کہتے ہیں:

”استانی جی چھ سیر کے چاول، سیر بھر پونے تین آنے کے اور ایک پیسہ کی ڈنڈیاں اور لوٹکیں، دو سیر کا گھی ہے۔ پون پاؤ منگوا یا۔ پاؤ بگھارتے وقت ڈالا او ر چھٹانک بھر کشمش کڑکڑا کر دم دیتے وقت۔ ڈیڑھ آنے کا گھی ہوا اور چوسیری کھانڈ سیر بھر چار آنے کی۔ ایک پیسے کی کشمش کل پونے گیارہ آنے کے پیسے

خرچ ہوئے۔“ [مراۃ العروس، ص 109]

صدقہ و خیرات، ایمانداری اور برابری کے جذبات ابھارنے کے علاوہ اچھی عادتوں کی تلقین کس خوبصورتی سے کی گئی ہے اس مثال کے ذریعے ملاحظہ کیجئے:

”بھلا، دیگچہ بھرا، سیر بھر زردا، تم نے کیا کیا“

”دور کا بیاں چوٹی دار بھر کر تو اللہ کے نام کی مسجد میں بھیج دیں باقی میں تیرہ طشتریاں بھری کنیں۔ مکتب میں ہم سب پچیس لڑکیاں ہیں۔ دودو میں ایک ایک طشتری آئی۔ تیرہویں طشتری میں، میں اکیلی تھی۔

اصغری: کیا تم نے دو ہرا حصہ لیا؟
 حسن آرا: نہیں تو۔ میری ٹشتری آدھی ہی تھی۔ سب سے پوچھ لیجئے۔
 اصغری: تم برادری سے الگ کیوں رہیں۔
 حسن آرا تو چپ ہوئی، امۃ اللہ نے کہا: استانی جی ان کو سب کے ساتھ کھاتے
 گھن آتی ہے
 حسن آرا: نہیں استانی جی گھن کی بات نہیں۔ میں دسترخوان پر سب لڑکیوں سے
 پیچھے آئی۔ اس لیے اکیلی رہ گئی۔ آپ محمودہ سے دریافت کر لیجئے۔
 امۃ اللہ: کیوں، تم ابھی تھوڑی دیر ہوئی میرا جھوٹا پانی پینے پر لڑ نہیں چکیں۔
 حسن آرا: میں لڑی تھی یا صرف اتنی بات کہی تھی کہ جتنی پیاس ہوا کرے اسی قدر
 پانی لیا کرو۔ گلاس میں جھوٹا پانی چھوڑ دینا عیب کی بات ہے۔“

[مرآة العروس، 109-110]

بچوں میں وطن پرستانہ جذبات پیدا کرنے کے لیے انہیں وطن اور اشیائے وطن سے متعارف
 کرانا بھی ضروری ہے۔ نذیر احمد نے یہ فریضہ نہایت اہتمام کے ساتھ ادا کیا ہے۔ جتنے جتنے اخذ کی گئیں
 ان مثالوں میں دیکھئے:

”فضیلت کے ہاتھ کا کیکری مرمر، بوٹیاں، لہریا، چھڑیاں، خانہ توڑ، دیکھت
 بھولی، خاکہ، تار شمار، چنیللی کا جال، ترپن، نیل، برا بھلا جیسا کچھ ہو تو وہ بھی
 اٹھاتی لاؤ۔“

”معمولی روزمرہ کے کھانوں کی ترکیب سب کو معلوم ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہر
 قسم کے کباب، سیخ، کے، پسندوں کے، شامی۔ گولیوں کے، کوٹے، معمولی
 پلاؤ، قورمہ پلاؤ، کچی بریانی، نور محل، زردا، تنجن، سموسے میٹھے سلونے، قلمی بڑے
 ، دہی بڑے، سہال، سہو، گھی کی تلی دال، کچوریاں، پاپڑا، بورانی، فیرینی، حلوا
 سوہن پڑی، نرم اندر سے کی گولیاں سب چیزیں بار بار پک چکی ہیں۔

حسن آرا: استانی جی برسات کے رنگ سرخ، نارنجی، گل انار، گل شفتالو، سروئی،
 دھانی، اودا، جاڑے کے گیندئی، جوگیا، عنابی، کاہی، پیلی، کا کریزی،
 سیاہ، نیلا، گلابی، زعفرانی، کوئی، کرنجوی اور گرمی کے پیازی، آبی، چٹنی، کپاسی،
 بادامی، کافوری، دودھیا، خشکاشی، فالسی، ملاگیری، سندور یا۔ رنگ تو بہت ہیں
 مگر میں نے وہ ہی بیان کیے جو اکثر پہنتے ہیں۔ [مرآة العروس، 112-198]

اور یہ بھی یاد رکھئے کہ نذیر احمد نے اشیاء کے محض نام نہیں گنائے ہیں بلکہ ان کی خصوصیات اور
 ان کے استعمال کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ مثلاً وہ کپڑا رنگنے کا طریقہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اصغری: بھلا بتاؤ تو سرون کیوں کر رنگتے ہیں۔“

حسن آرا: کاہی قند اچھے گہرے رنگ کی آدھ گز منگوائی اور پانی کو خوب جوش دے کر کے پھٹکری کی ڈلی اوپر سے قند کا ٹکڑا ڈال کر ہلا دیا۔ پھٹکری کی تاثیر سے قند کا رنگ کٹ جائے گا۔ بس اس میں کپڑا رنگ دیا۔

اصغری: بھلا قند نہ ملے؟

حسن آرا: تو ٹیسو کے پھولوں کو جوش کر کے پھٹکری ی پیس کر ملا دی، سرون ہو جائے گا۔ لیکن ہلکا کپاسی ہوگا۔ اچھا سرون بے قند کے نہیں رنگا جاتا اور اگر قند کی جگہ بانات کا رنگ کاٹا جائے تو وہ عمدہ رنگ آتا ہے کہ سبحان اللہ! لیکن ان دنوں مجسٹن ایسا چلا ہے کہ سب رنگوں کو مات ہے۔ کپڑے تو کپڑے مٹھائی، کھانے کا گونا، مجسٹن میں نہایت خوش رنگ رنگا جاتا ہے۔“ [مرآة العروس 112]

اور خاص بات یہ ہے کہ یہ لکھنا پڑھنا، سینا پرونا اور کھانا پکانا سب کچھ آج کے موڈرن نظام تعلیم کی طرح کسی زور زبردستی یا مار پیٹ کی بجائے کھیل کھیل میں ہنسی خوشی سکھایا جاتا تھا۔ مثال کے لیے یہ اقتباس دیکھئے:

”استانی جی مجھ کو اس کی کیا خبر تھی فضیلت دن بھر تو یہاں رڑتی ہے، رات کو ایسی دیر کر جاتی ہے کہ کھانا کھایا اور سوئی۔ مجھ کو اس کے پوچھنے چھنے کا اتفاق تو ہوتا نہیں۔ دو چار مرتبہ جو میں ادھر کو آنکلی تو بھی گڑیا کھیتے پایا۔ کبھی ہنڈیا کھیا پکاتے، کبھی کہانیاں سنتے۔ اس سے مجھ کو خیال ہوا کہ یہ اپنا وقت کھیل کود میں کھوتی ہے۔“

اصغری: بے شک تمہارا شبہ بے کا نہیں تھا۔ لیکن میں کھیل ہی کھیل میں ان کو کام کی باتیں سکھاتی ہوں۔ ہنڈیا کھیلوں میں لڑکیاں ہر ایک طرح کے کھانے کی ترکیب سیکھتی ہیں۔ مصالح کا اندازہ، نمک کی انکل، ذائقے کی شناخت، بوباس کی پہچان ان کو آتی ہے۔“ [مرآة العروس 108]

ایک دوسرے مقام پر ڈپٹی نذیر احمد اپنے اس نظریے کو اصغری کی زبان سے کچھ اس طرح بیان کراتے ہیں:

”میں صرف پڑھنے پڑتاکید نہیں کرتی۔ پڑھنے کے علاوہ ان کو دنیا کا کام بھی بتاتی ہوں۔ جو چند روز بعد ان کے سر پڑے گا۔“ [مرآة العروس 111]

بچوں کو معلومات فراہم کرانے کے ساتھ ساتھ ڈپٹی نذیر احمد کا بنیادی مقصد انہیں خود کفیل بنانا تھا۔ انہوں نے اپنے اس مقصد کا اظہار ناول کے پہلے باب میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”لکھنے پڑھنے کے علاوہ سینا پرونا، کھانا پکانا یہ دونوں ہنر ہر ایک لڑکی کو سیکھنے

ضرور ہیں۔ کسی آدمی کو حال معلوم نہیں ہے کہ آئندہ اس کو کیا اتفاق پیش آئے گا۔ بڑے امیر اور بڑے دولت مند یکا یک غریب اور محتاج ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی ہنر ہاتھ میں پڑا ہوتا ہے ضرورت کے وقت کام آتا ہے۔ یہ ایک مشہور بات ہے کہ اگلے وقتوں کے بادشاہ باوجود دولت و ثروت کے ضرور کوئی ہنر سیکھ رکھا کرتے تھے تاکہ مصیبت کے وقت کام آئے۔ یاد رکھو دنیا میں کوئی حالت قائم بل اعتبار نہیں۔ اگر تم کو اس وقت آرام و فراغت میسر ہے، خدا کا شکر کرو کہ اس نے اپنی مہربانی سے ہمارے گھر میں برکت اور فراغت دی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تم اس آرام کی قدر نہ کرو یا آئندہ کے واسطے اپنا اطمینان کر لو۔ یہی آرام ہم کو ہمیشہ کے واسطے حاصل رہے گا۔“ [مرآة العروس 18-19]

اس کے بعد انہوں نے روزمرہ کی بہت سی مثالوں کے ذریعے اپنا کام خود کرنے کی تلقین کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

”اگرچہ خدا نے تم کو نوکر چا کر بھی دیے ہوں لیکن تم کو اپنی عادت نہیں بگاڑنی چاہئے۔ شاید خدا نخواستہ مقدور باقی نہ رہے تو یہ عادت بہت تکلیف دے گی۔ آپ اٹھ کر پانی پینا یا چھوٹے چھوٹے کاموں میں نوکروں یا چھوٹے بھائی بہنوں کو تکلیف دینا اور آپ احدی بن کر بیٹھے رہنا نامناسب اور عادت بگاڑنے کی نشانی ہے۔ تم کو اپنا کام سب آپ کرنا چاہئے بلکہ تم چست و چالاک رہو تو گھر کے بہت کام تم اٹھا سکتی ہو اور اگر تم تھوڑی سی محنت اختیار کرو تو اپنی ماں کو بہت کچھ مدد اور سہارا لگا سکتی ہو۔ خوب غور کر کے اپنا کوئی کام ایسا مت چھوڑو جس کو ماں اپنے ہاتھوں کرے یا دوسروں کو اس واسطے بلاتی اور تکلیف دیتی پھرے۔ رات کو جب سونے لگو اپنا چھونا اپنے آپ بچھا لیا کرو اور صبح سویرے اٹھ کر آپ تہہ کر کے احتیاط سے مناسب جگہ رکھ دیا کرو۔ اپنے کپڑوں کی گھڑی اپنے اہتمام میں رکھو۔ جب کپڑے بدلنے ہوں اپنے ہاتھ سے پھٹا ادھر ڈال دو۔ درست کر لیا کرو۔ میلے کپڑوں کی احتیاط کرو جب تک دھو بن کپڑے لینے آئے ان کو علیحدہ کھونٹی پر لٹکا رکھو۔ اگر کپڑے بدل کر میلے کپڑے اٹھا کر نہ رکھو گی تو شاید چوہے کاٹ ڈالیں۔ یا پڑے پڑے زیادہ میلے ہو جائیں اور دھو بن ان کو خوب صاف نہ کر سکے یا شاید زمین کی نمی اور پسینے کی تری سے ان میں دھبے لگ جائے۔ پھر دھو بن کو اپنے میلے کپڑے آپ دیکھ کر دیا کرو اور جب دھو کر لائے خود دیکھ لیا کرو، شاید کوئی کپڑا کم لائی ہو۔ یا کہیں سے پھاڑ نہ دیا ہو، کہیں پہ داغ باقی نہ رہ گئے ہوں۔ اس طرح جب تم اپنے کپڑوں کی خبر رکھو گی

تمہارے کپڑے خوب صاف دھلا کریں گے اور کوئی کپڑا گم نہ ہوگا۔ جو زیور تم پہنے رہتی ہو بڑے داموں کی چیز ہے۔ شام کو سونے سے پہلے اور صبح کو جب سو کراٹھو خیال کر لیا کرو سب ہیں یا نہیں۔“ [مراۃ العروس 19]

خود کفالتی ایک اہم موضوع اور سماجی ضرورت ہے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی اہمیت مزید دوچند ہوتی جا رہی ہے۔ عہد حاضر کی نیو ایجوکیشن پالیسی 2020 میں بھی اسے سرفہرست رکھا گیا ہے۔ اسے مقبول عام بنانے کی ہر طرف کوششیں جاری ہیں۔ سرکاری سطح پر بھی خوشکھیل ہندوستان کی مہم زور و شور سے جاری ہے۔ موجودہ حالات کے تناظر میں اس نظریہ مہم کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ 157 سال قبل منظر عام پر آئے ”مراۃ العروس“ میں بچوں کو خود کفیل بنانے کی یہ کوششیں کس قدر حیران کن ہیں اور ڈپٹی نذیر احمد کی دوراندیشی کا پتہ دیتی ہیں۔

لہذا ایسی صورت میں مراۃ العروس کو بچوں کے ادب یا بچوں کے ناول کی بحث سے یکسر نظر انداز کر دینا مناسب نہیں ہے۔

جہاں تک بات رہی فنی خامیوں کی تو یہ عرض کر دوں کہ علم و ادب کا کوئی گوشہ ہو یا صنعت و حرفت کا کوئی نمونہ یا کوئی دیگر تخلیقی کارنامہ یقیناً کسی کا نقش اول تمام فنی خوبیوں سے آراستہ اور مکمل نہیں ہو سکتا۔ ذرا غور کیجئے کہ پروفیسر Charles Babbage جنہیں ڈیجیٹل کمپیوٹر کا بابا آدم تسلیم کیا جاتا ہے نے 1842ء میں Analytical Engine کے نام سے جو مشین تیار کی تھی اس کی اسپید پر سیکنڈ صرف ایک Addition اور اس کی جسامت لگ بھگ ایک بڑے کمرے کے برابر تھی۔ حد تو یہ کہ 1943-46 کے دوران پروفیسر J. Presper Ekert اور پروفیسر John Mauchly کے ذریعہ بنا۔ اولین برقی کمپیوٹر The Electronic Numerical Integrator And Calculator [Eniac] کی لمبائی سو فٹ، اونچائی دس فٹ اور چوڑائی تین فٹ تھی نیز اس میں اٹھارہ ہزار ویکيوم ٹیوب لگے ہوئے تھے اور اس کی اسپید پانچ ہزار Addition یا 350-300 Multiplications پر سیکنڈ تک محدود تھی جب کہ آج کے کمپیوٹروں کی جسامت مٹھی میں سما جانے کے برابر اور اسپید Trillionth Additions پر سیکنڈ سے متجاوز ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی Charles Babbage کی اولیت اور J. Presper Ekert اور John Mauchly کے کارناموں کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اسی طرح مضمون، خاکہ، انشائیہ اور رپورٹ جیسی کئی ادبی اصناف کی آج کی اپنی انفرادی شناخت اور فنی خوبیوں کے دور عروج کے باوجود محمد حسین آزاد کی اولیت اور آب حیات کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل تدریجی ارتقا اس کائنات کا بنیادی اور اٹل اصول ہے۔ دنیا کا نظام نمودار خود خالق کائنات کا اپنے دین کو کروڑوں سالوں میں کم و بیش سوالا لکھ نیوں اور رسولوں کو بھیجنے کے بعد مکمل کرنا اس کی بین دلیل ہے۔ لہذا ”مراۃ العروس“ کو بچوں کے ادب کے جدید معیاروں پر جانچنا اور اعتراض کرنا میرے نزدیک صحت مند تنقید کے تقاضوں کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ مراۃ العروس کی زبان سادہ اور رواں

ہونے کے علاوہ اس میں اخلاقی اسباق، مثالی کردار سازی، عملی زندگی کی تربیت، نظم و ضبط، ذمہ داریوں کا احساس، گھریلو شعور، حسن معاشرت اور امور خانہ داری جیسے عناصر جو بچوں کے ادب کا بنیادی جز ہیں ان کی بکثرت اور عمدہ مثالیں موجود ہیں جن کی بنیاد پر میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ”مراۃ العروس“ آج کے تناظر میں مکمل طور پر بچوں کا ناول نہ سہی لیکن انیسویں صدی کے تناظر میں یہ بچوں کے ناول کا نقش اولین ضرور ہے۔



محترم شری ونیش کمار وششٹھ (ڈاکٹر اکاوششٹھ کے شوہر) کی یاد میں منعقد جلسے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر اکاوششٹھ، ڈاکس پر موجود ہیں ڈاکٹر ارشد سیانوی، محترم بی بی شرماء، محترم بھوشن شرما، صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری اور مانورٹی ایجوکیشنل سوسائٹی، میرٹھ کے جنرل سیکٹری محترم آفاق احمد خاں



دوروزہ عالمی سیمینار بعنوان ”پریم چند کا ادب: ماضی حال اور مستقبل“ میں اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری ڈاکس پر نظر آرہے ہیں ڈاکٹریشیکا ساگر، ڈاکٹر آصف علی، ایڈوکیٹ بدر محمود، پروفیسر تنویر چشتی، پروفیسر کویتا تیگی، محترم امیر مہدی اور صدر شعبہ لائبریری سائنس پروفیسر جمال احمد صدیقی۔

خواتین اور ادب اطفال

بچے ملک و قوم کا قیمتی سرمایہ افتخار ہوتے ہیں۔ لہذا ان کی پرورش و پرداخت اچھے خطوط پر کرنا والدین کا اہم فریضہ ہوتا ہے۔ بچوں کو بہترین غذا کھلانا، قیمتی لباس اور کھلونے مہیا کرانے کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کا خاص خیال رکھنا والدین کی اہم ذمہ داری ہوتی ہے۔ بچوں کی بہترین تربیت کے لیے بچوں کا ادب ایک ایسا ذریعہ ہوتا ہے جس سے بچوں کو نہایت آسان اور دلچسپ انداز میں تعلیم دی جاتی ہے۔ کیونکہ ادب اطفال کا اہم مقصد بچوں کی اخلاقی تربیت ہوتی ہے۔ کہانیوں کے ذریعے بچوں کو سچ بولنے، ایمانداری، محبت، صبر اور بڑوں کے احترام کا درس دیا جاتا ہے۔ اسی لیے ادب اطفال کسی بھی معاشرے کی بنیاد کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ادب صرف کہانیوں اور نظموں تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ یہ ادب بچوں کی ذہنی، اخلاقی، سماجی اور تخلیقی تربیت کا اہم ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ ادب اطفال بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی پروان چڑھاتا ہے۔ جب بچے پریوں، جادو اور خیالی دنیا کی کہانیاں پڑھتے ہیں تو تخیل وسیع ہوتا ہے، معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور بچوں کے ذہن میں خود بھی نئی کہانیاں وجود پانے لگتی ہیں۔ مزید برآں ادب اطفال بچوں کی زبان کی مہارت کو بہتر بناتا ہے، جب وہ کتابیں پڑھتے ہیں تو ان کے پاس ذخیرہ الفاظ بڑھتا ہے اور ان کے اندر بہتر طور پر بات کرنے اور لکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

ادب اطفال اور خواتین کا رشتہ روز ازل سے ہے۔ خواتین کے بغیر بچے کا وجود، اس کی پرورش و پرداخت ناممکنات میں سے ہے۔ چونکہ بچے کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔ لہذا ماں کی لوری سے ہی ادب اطفال کے ابتدائی نقوش ملنے شروع ہو جاتے ہیں جو ہماری شاعری کی بنیاد بنتے ہیں۔ نہ جانے کس ماں نے ضد کرتے بچے کا ذہن منتقل کرنے کے لیے ایک فرضی قصہ گڑھ کراسے سنایا ہو گا۔ لیکن اسے اس وقت یہ قطعاً علم نہ ہو گا کہ وہ ایک صنف کی بنیاد رکھ رہی ہے جس پر مستقبل میں داستان، ناول، افسانے کی بلند و بالا عمارت کھڑی ہوگی۔

یوں تو تحریری طور پر ادب اطفال کی روایت ہم کو امیر خسرو سے ملتی شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ادب اطفال کو تین ادوار میں تقسیم کیا جائے تو اس کا پہلا دور 1252ء سے 1325ء کے عرصے پر محیط ہے۔ یہ عہد امیر خسرو کا عہد ہے۔ اس عہد میں ادب اطفال میں خواتین کی شرکت نظر نہیں آتی۔ لیکن آگے چل کر ادب اطفال کی تاریخ میں مردوں کے شانہ بہ شانہ خواتین نے بھی اپنی موجودگی کا احساس کرایا

ہے۔ ادب اطفال کا دوسرا دور 1857ء کے جنگ آزادی کے بعد سے ماقبل آزادی تک جاری ہے۔ اس دور میں باقاعدہ شعوری طور پر بچوں کے ادب پر توجہ دی گئی اور بچوں کی نفسیات اور ان کی ذہنی و علمی سطح اور پسند و ذوق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے باقاعدہ طور پر بچوں کا ادب تحریر کرنے کا رواج عام ہوا۔ اس دور میں لیلیٰ خواجہ بانو، حجاب امتیاز علی، صالحہ عابد حسین اور بیگم قدسیہ زیدی کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔ اسی وجہ سے خواجہ حسن نظامی کی اہلیہ خواجہ لیلیٰ بانو کو ادب اطفال میں خواتین اول ہونے کا شرف حاصل ہے۔ انہوں نے ادب اطفال کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے سینہ بہ سینہ چلی آرہی قصے کہانیوں کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے ادب اطفال کا حصہ بنایا۔ حالانکہ یہ قصے کہانیاں ان کی طبع زاد نہیں ہیں لیکن اپنے عہد کی تہذیبی و سماجی سرمائے کے مد نظر بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ کہانیاں 1919ء میں سپر قلم کی گئی تھیں۔ ہر کہانی میں دو تصاویر شامل ہیں۔ یہ تصاویر مہاراجہ سرکشن صاحب کی تخلیق ہیں۔ ہر کہانی کے آخر میں خواجہ حسن نظامی نے اپنے گراں قدر خیالات تحریر کیے ہیں۔ جو ادب اطفال سے دونوں کی دلچسپی کا واضح ثبوت ہیں۔

امتیاز علی تاج کی بیگم حجاب امتیاز علی نے اپنے خاوند امتیاز علی صاحب کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے کثیر مقدار میں کہانیاں اور معلوماتی مضامین تحریر کیے اور بچوں کے ماہنامہ ”پھول“ لاہور کی ادارت بھی فرمائی۔ ان کی کہانیاں بچوں کے ادب میں اعلیٰ مقام کی حامل ہیں۔ بچوں کے متعلق ان کی تصنیفات، بچوں کے ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ادب اطفال میں ایک بہت ہی مستند نام صالحہ عابد حسین کا ہے۔ صالحہ عابد حسین کو بچوں کے ادب سے والہانہ عشق رہا ہے۔ جب ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ اسکول میں بچوں کی فلاح و بہبودی کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے تو سید عابد حسین کے دوش بہ دوش صالحہ عابد حسین نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ 1926ء میں ماہنامہ ”پیام تعلیم“ کا اجراء ڈاکٹر عابد حسین کے زیر ادارت عمل میں آیا۔ صالحہ صاحبہ پابندی سے پیام تعلیم کے لیے لکھتی رہیں۔ انہوں نے بچوں کے لیے افسانوی و غیر افسانوی دونوں طرح کا ادب تخلیق کیا۔ دوسری زبان کی کہانیوں کو اردو کا لباس زیب تن کرایا۔ کثیر تعداد میں کہانیاں اور مضامین کے علاوہ ان کی تقریباً درجن بھر کتابیں شائع ہو کر مقبول عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ جن میں سنڈر چنار، ایک دیس ایک خون، شملہ کی سیر، بچوں کے حالی وغیرہ بہت مقبول ہوئیں۔ ان کی کہانیاں اور مضامین بچوں میں حب الوطنی، قومی یکجہتی، بزرگوں کا احترام اور ایثار و قربانی کے جذبے سے معمور ہیں۔

ادب اطفال میں قدسیہ زیدی کا نام بھی مستند حیثیت کا حامل ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین اور پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں بچوں کے لیے با تصویر تفریحی ادب تحریر کیا۔ محترمہ نے اپنے قلم کو صرف ادب اطفال تک محدود رکھ کر قابل تحسین کارنامے انجام دیے۔ انہوں نے کہانیوں کے ساتھ ساتھ ڈرامے، معلوماتی مضامین سپر قلم کیے۔ آج سے 85-80 سال قبل اردو داں بچوں کے لیے خوبصورت رنگوں سے مزین دیدہ زیب کتابیں پیش کر کے مغربی ادب کے ہم پلہ ادب تخلیق کیا۔ جس کے

لیے وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

ادب اطفال کا تیسرا دور 1947ء سے 2000ء تک محیط ہے۔ اس دور میں بہت اہم خواتین آسمان ادب پر جلوہ افروز ہیں۔ جن میں سے کچھ ایسی ہیں جو ادب اطفال کے ساتھ ساتھ بڑوں کے ادب میں عالمی مقبولیت کی حامل ہیں۔ جن میں رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، شیفتہ فرحت، عفت موبانی، اشرف صبوحی، ثریا فروخ، عابدہ محبوب، مسعودہ حیات، اے آر خاتون، عطیہ پروین، واجدہ تبسم، رفیعہ منظور الامین، جیلانی بانو، سیدہ اعجاز، زینت النساء بیگم اور کرن شبنم وغیرہ کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔ جب ہم بیسویں صدی پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک اہم نام سامنے آتا ہے اور وہ ہے معروف ادیبہ عصمت چغتائی کا، جو اعلیٰ پائے کی فکشن نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قابل معلمہ بھی تھیں جن کو بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کے بہت سے مواقع فراہم تھے۔ انہوں نے بچوں کے لیے جو ادب تخلیق کیا اس میں بچوں کی نفسیاتی پہلوؤں پر خاص زور دیا اور بچوں میں کھل ل کر ایسی کہانیاں لکھیں جیسے بچوں سے باتیں کر رہی ہوں۔ ان کی کہانیوں میں بچپن، سفید جھوٹ، بلی کا کرشمہ، بشیر کی ماں اور قدرت کا مذاق قابل ذکر ہے۔ عصمت چغتائی نے بچوں کے لیے ایک ناول ”تین انٹری“ کے عنوان سے تحریر کیا جو 1980ء میں منظر عام پر آیا اور بچوں کی دنیا میں بہت مقبول ہوا۔ یہ ناول تین شرارتی لڑکوں کی شرارت پر مبنی ہے۔ جس میں عصمت چغتائی نے دلکش انداز اور بہترین اسلوب اختیار کیا ہے۔ جس کے باعث یہ ناول بچوں کے ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ادب اطفال میں ایک مقبول ترین نام رضیہ سجاد ظہیر کا ہے۔ جو ترقی پسند تحریک کے بانی ومہمانی سجاد ظہیر کی اہلیہ محترمہ ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں لکھیں ساتھ ہی دوسری زبانوں کی کہانیوں کو اردو میں فنی مہارت کے ساتھ منتقل بھی کیا تا کہ بچے دوسری زبانوں کے ادب سے بھی واقفیت حاصل کریں۔ محترمہ کی طبع زاد کہانیوں میں ننھا مہارتی، صبر، شہزادہ اور سنگیت قابل ذکر ہیں۔ ”ولی عہد“ ان کی ایک طویل کہانی ہے جو ماہنامہ ”کھلونے“ نئی دہلی میں فروری 1957ء سے مئی 1957ء تک قسط وار آئی۔ ہماری ندیوں کی کہانی، بہت دن ہوئے اور ”جنت کی سیر“ وہ کہانیاں ہیں جو دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ سلطان زین العابدین بڑا شاہ طبع زاد تاریخی نوعیت کی کہانی ہے جو ان کو ادب اطفال میں نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔

اردو کے افسانوی ادب پر اگر کوئی گفتگو ہو تو قرۃ العین حیدر کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ یہ وہ نام ہے جن کو مشرقی اور مغربی افسانوی ادب پر یکساں عبور حاصل تھا۔ آپ کی ادبی شخصیت کی دلربائی کا یہ عالم تھا کہ آپ کو ”گیان پیٹھ ایوارڈ“ سے نوازا گیا جو اردو ادب میں خواتین کا پہلا ایوارڈ ہے۔ بڑوں کے ساتھ بچے بھی ان کے منظور نظر رہے۔ انہوں نے غیر ملکی کہانیوں، معلومات افروز مضامین اور ناولوں کو اردو کے قالب میں اتنے فنی انداز سے ڈھالا کہ ان پر ترجمے کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ این لاگن کا ترجمہ کردہ ناول جن حسن عبدالرحمن کو اردو ادب کے سائنس فکشن میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ علاوہ ازیں بچوں

کے لیے دوسری زبانوں کے ادب کی جو کتابیں اردو میں منتقل کی ہیں ان میں بھیڑیے کے بچے، شیر خان، میاں ڈھینچو کے بچے، ہرن کے بچے، لومڑی کے بچے نہایت ہی دلچسپ انداز میں تحریر کیے گئے ہیں۔ دراصل مذکورہ تمام کتابیں روس سے ہندوستان ترجمے کے لیے آئی تھیں اور یہ فریضہ مکتبہ ”پیامِ تعلیم“ انجام دے رہا تھا۔ قرۃ العین حیدر کئی زبانوں پر مکمل دسترس رکھتی تھیں اور ترجمہ نگاری ان کا مخصوص میدا بھی تھا۔ اسی شوق نے ان کے اس فن کو جلا بخشی۔ روسی مصنف اپیروف کا کیا کہ متذکرہ کتب کے ترجمے میں قرۃ العین حیدر نے اپنی فنی مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسی رواں دواں زبان، بے ساختہ طرز بیان اختیار کیا جس پر ترجمہ سے زیادہ طبع زاد ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ کہیں کہیں تو مصنف کی زبان سے بھی زیادہ روانی یعنی آپا کے ترجمے میں نظر آتی ہے۔ ادب اطفال پر ان کا یہ کرم خاص ہے کہ انہوں نے غیر ملکی زبانوں کے ادب اطفال کو دلچسپ انداز میں ترجمہ کر کے اپنے وطن کے بچوں کو متعارف کرایا تاکہ ہمارے بچے دوسری زبانوں کے ادب سے واقفیت رکھیں اور ان کے ذہن میں کشادگی و وسعت پیدا ہو۔

یعنی آپا کی یہ خدمت ادب اطفال میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

اردو کی خواتین ناول نگاروں میں ایک مستند نام اے آر خاتون کا بھی ہے۔ انہوں نے اردو ادب کو کئی اہم سماجی ناول، افشاں، شمع، چشمہ، دیے جوان کا شناخت نامہ بنے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اے آر خاتون نے بچوں کے لیے بھی کئی دلچسپ طویل کہانیاں تحریر کیں جو مختلف رسائل کی زینت بنی۔ بعد ازاں مکتبہ کلیاں، لکھنؤ نے ان کو شائع کیا۔ جس میں سات خلائیں، سات کھلاڑی، ہٹین، بھائی بہن، زمانہ آبشار، شہزادہ ماہ رخ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اے آر خاتون نے بچوں کے لیے اخلاقی اور اصلاحی کہانیاں تخلیق کر کے ادب اطفال میں مزید اضافہ کیا۔ انداز بیان کا کمال تو یہ ہے کہ پڑھنے والے اور سننے والے از خود اپنی اصلاح پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

اردو ناول کی دنیا میں عفت موہانی کا نام محتاج تعارف نہیں جو ایک علمی و ادبی خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں۔ انہوں نے نو ناول قوم کی ذہنی آبیاری کے لیے متعدد کہانیاں اور ناول سپر دقلم کیے۔ وہ ادب اطفال کی محفل میں منفرد انداز میں داخل ہوئیں۔ امتیاز علی تاج کا مشہور زمانہ مزاحیہ کردار ”چچا چھکن“ کے انداز میں بچوں کے لیے دلچسپ کردار نانی اماں تخلیق کیا اور ادب اطفال میں صنف مزاح کا اضافہ کیا۔ عفت نے اپنی کہانیوں میں نانی اماں کے معصومانہ مضحکہ خیز واقعات کو بچوں کی عام فہم زبان اور تسلسل بیان کے ساتھ تحریر کیا جو دلچسپ بھی ہے اور مضحکہ خیز بھی۔

اردو میں ایک صاحب قلم افسانہ نگار، انشاء پرداز، مزاح نگار اور ادب اطفال کی ادیبہ شیفینہ فرحت کا نام بہت مقبول ہے جنہوں نے ادب اطفال کو اپنے احساسات اور جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ وہ پوری زندگی بچوں سے بہت قریب رہیں کیونکہ درس و تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ تھیں۔ اس لیے بچوں کے ادب کی تمام تر وصف ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔ محترمہ نے بچوں کے لیے کہانیاں، ڈرامے، بچوں کے فیچر بھی تخلیق کیے اور بچوں کے رسائل ”چاند اور کرنیں“ کی ادارت کے

فرائض بھی انجام دیے۔ بچوں کی نصابی کتب کی تدوین و تربیت میں بھی ساجھے داری کی۔ فرحت صاحبہ کی کئی کتابیں اہمیت کی حامل ہیں جن میں چوں چوں بیگم، ایک ٹکرا بادل کا اور بچوں کے نظیر اکبر آبادی ان کے تحسین آمیز کارنامے ہیں۔

خواتین کی صاحب طرز ادیبائوں اور شاعرات، افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں میں ایک محترم نام عطیہ پروین صاحبہ کا ہے۔ ادب اطفال کے حوالے سے عطیہ پروین کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ محترمہ نے بچوں کے لیے متنوع اصناف ادب تخلیق کیا جن میں نظمیں، ڈرامے، خاکے، مزاحیہ فیچرز اور ناول میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے جو ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ محترمہ کی زیادہ تر تحریریں موضوع، زبان، ٹرمینٹ اور اسلوب کے حوالے سے ادب اطفال کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کا قلم آج بھی رواں دواں ہے جب کہ آپ چھ دہائیوں سے مستقل لکھ رہی ہیں۔ ہندوپاک کے موثر رسائل و جرائد میں آپ کی تخلیقات جگہ پاتی ہیں۔ آپ کی شائع شدہ کتابوں میں شہزادی شب نور، فاخستہ شہزادی، ننھے میاں، کبیر کھائی، اور جنت کی تلاش قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام تخلیقات مکتبہ کلیاں، لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہیں۔ ناگ شہزادہ زالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی نے شائع کی ہے۔

حیدر آباد جو ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اس ادبی گہوارے سے تعلق رکھنے والی ادیبہ عابدہ محبوب تقریباً ستر سال سے ادب اطفال کے لیے اپنے آپ کو وقف کیے ہوئے ہیں۔ ان کا منفرد کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان کی خوش گوطن و مزاح نگار شفیق الرحمن کے زندہ جاوید کردار حکومت آ پا اور شیطان سے متاثر ہو کر آ پا اور میں کرداروں کو تخلیق کیا ہے۔ مزاحیہ سبق آموز کہانیوں کا مجموعہ ”چکنی ہانڈی“ کے عنوان سے تحریر کیا۔ چکنی ہانڈی میں عابدہ صاحبہ کا فن پورے عروج پر ہے۔ جس میں زبان بیان پر قدرت، دلچسپ اور عبرت آمیز واقعات کے ساتھ طنز و مزاح کے حسین و جمیل امتیاز نے چکنی ہانڈی کو لڈیز ہانڈی میں تبدیل کر دیا ہے۔

اگر ہم ادب اطفال کے چوتھے دور پر گفتگو کریں تو یہ 2002ء سے 2026ء پر محیط ہے۔ ان پچیس سالوں میں خواتین قلم کاروں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ ان میں اہم نام کشورناہید، عقیلہ بانو، نور جہاں نور، سرتاج مہر رحمن، زینب نقوی، شہناز نبی، طیبہ بیگم شبانہ، ذکیہ تجلی، وسیمہ عشرت بیابانی، رحمت انجم، انیس فاطمہ، عطیہ حبیب، نوشین انجم، معراج النساء بیگم، عرشی فردوس، ڈاکٹر عالیہ خان، شاکرہ بیگم صبا، ڈاکٹر فوزیہ چودھری، ڈاکٹر حلیمہ فردوس، شاہوار بیگم، ڈاکٹر انجم، النشرح انور اور صادقہ نواب سحر کے اسمائے گرامی ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ خواتین قلم کاروں کی یہ فہرست واضح کر رہی ہے کہ آج کے وقت میں خواتین قلم کار ادب اطفال پر خاص توجہ دے رہی ہیں۔ ادب اطفال کو محض بچوں کا دب سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا رہا ہے جو نہایت ہی فعال عمل ہے اور یہ بچوں کی ذہنی تربیت میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

شہرہ آفاق ادیبہ کشورناہید نے ادبی زندگی کا آغاز بچوں کے ہی ادب سے کیا۔ انہوں نے

بچوں کے لیے نثر اور نظم دونوں میں ادب تخلیق کیا اور نئے نئے تجربات بھی کیے۔ طبع زاد کہانیوں کے ساتھ ساتھ ماخوذ کہانیاں بھی لکھیں جن کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ کہانیاں ماخوذ ہیں یا طبع زاد۔ اسلوب کی ندرت، لہجے کی شگفتگی ترجمے کی فنی مہارت کہانیوں کو مزید معتبر اور مستند بنا دیتی ہے۔ کشورنا ہید کی تمام کہانیاں ماہنامہ ”نونہال“، کراچی اور فاؤنڈیشن کراچی سے شائع ہوئیں۔ بعد ازاں مکتبہ پیام تعلیم نئی دہلی سے کتابی شکل میں منظر عام پر آئیں۔ چاندی کی ہنڈیا، شیر اور بکری، ہیر و کاسیب، چاندی کی بیٹی اور گدھے کی بانسری ان کی کہانیوں کے مجموعے ہیں جو ادب اطفال میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ کشورنا ہید نے نثر کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی منظوم ادب بھی تحریر کیا۔ یہاں بھی انہوں نے نئے نئے تجربات کیے۔ ان کی منظوم کہانیوں میں لطیف اور سانپ، کتے اور خرگوش، آنکھ مچولی، مینڈک اور مرغی، چڑیا اور کوئل مکالماتی نظمیں ہیں جو منظوم کہانیوں کا نیا تجربہ ہے۔ محترمہ ہندوپاک کی بہت ہی مقبول و مشہور ادیبہ و شاعرہ رہی ہیں۔

ڈاکٹر بانو سرتاج صاحبہ اردو ادب کا ایک بلند قامت نام ہے جو عرصہ دراز سے تخلیقی ادب میں سرگرم عمل ہے۔ محترمہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں بیک وقت ادب تحریر کر رہی ہیں۔ آپ نے بچوں کے لیے کئی اصناف کا انتخاب کیا اور بہت لکھا۔ کہانیاں، ناول، ڈرامے، نظمیں تحریر کر کے ادب اطفال کے خزینوں کو مزید وسعت عطا کی۔ کہانیوں کے مجموعے می نہ بولیں، گھمنڈی کا سر نیچا، ناول جنگل میں منگل، ڈرامے جب جاگے تھے سویرا، مرا بھی ڈرامے کا ترجمہ وطن کے لیے، آئی برسات آئی، ٹکم ٹولا، گھی کا گولا، چناؤ کا چکر، مزاحیہ ڈرامے وغیرہ ان تمام اصناف کو انہوں نے بہت ہی ہنرمندی سے برتا اور اپنی تحریروں میں بچوں کی دلچسپی، حیرت و استعجاب، مسرت و مزاح کا خاص خیال رکھتے ہوئے سیدھی سادی زبان میں ادب تخلیق کیا اور اپنی تحریر میں کوئی نہ کوئی درس و پیغام ضرور دیا۔ ڈاکٹر بانو سرتاج صاحبہ کوڈراما نویسی میں بلا کا کمال حاصل ہے۔ ان کے ڈرامے بچوں کے ڈراموں میں خوش گوار اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے کچھ ڈرامے تو اتنے مقبول ہوئے کہ مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، تلنگانہ اور آندھرا پردیش کے سرکاری نصاب کا حصہ بن گئے۔ ان ڈراموں کی انفرادیت یہ ہے کہ ان ڈراموں کو بچے بہ آسانی اسٹیج کر لیتے ہیں۔

زینب نقوی عہد حاضر کی ایک ابھرتی ہوئی ایسی فن کارہ ہیں جو بچوں سے خاص انسیت رکھتی ہیں۔ ان کی ممتاز سے بھری تحریریں بچوں کے لیے تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند ہیں۔ جس میں ایک طرح کی شگفتگی و سکون قلبی ہے۔ نقوی صاحبہ کا قلم ہندی اور اردو دونوں میں جلوے بکھیرتا ہے۔ محترمہ ماہر نفسیات بھی ہیں۔ بچوں کی فطرت اور ان کی دلچسپی کو ملحوظ خاطر رکھتی ہیں۔ نقوی صاحبہ کا 23 کہانیوں کا مجموعہ ”خوابوں کی راج کماری“ زیور طبع سے آراستہ ہو کر عوام و خواص میں مقبول عام اور بقائے دوام کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔

ادب اطفال میں ایک خاصا نمایاں نام مہر رحمن کا ہے۔ جنہوں نے بچوں کے مزاج کا خاص

خیال رکھتے ہوئے بچوں کے لیے مزاحیہ ڈرامے تحریر کیے۔ ”بازیمچہ اطفال“ آپ کے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے کئی ڈرامے اسٹیج کیے جا چکے ہیں اور ان ڈراموں کو انعامات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ دوسرے ڈراموں کا مجموعہ ”طشت میں ہاتھی“ ہے۔ اس کے تمام ڈرامے بچوں کی عمر اور ان کی استعداد کو مد نظر رکھتے ہوئے تحریر کیے گئے ہیں۔ ڈراموں کے تمام کردار، مکالمے بچوں کی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے تحریر کیے گئے ہیں جس کے باعث مہر رحمن صاحب ادب اطفال میں مہر تاباں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جن خواتین نے ادب اطفال میں کالمس کے حوالے سے اپنی پہچان بنائی ان میں ایک اہم نام عقیلہ بانو صاحبہ کا ہے۔ انہوں نے کثیر تعداد میں بچوں کے لیے کالمس تحریر کر کے اردو داں بچوں کے لیے دلچسپ کالمس کی خلاء کو پُر کیا۔ ماہنامہ ”امنگ“، دہلی ان کے کالمس پابندی سے شائع کیے۔ جس کا پورے ماہ قارئین کو شدت سے انتظار رہتا۔ عقیلہ صاحبہ کے کالمس کے مجموعے ”انوکھا باغ“ اور ”کپاس بادل“ دہلی اردو اکادمی نے کتابی شکل میں شائع کیے ہیں۔

بچوں کے لیے تواتر کے ساتھ لکھنے والوں میں ایک نام نور جہاں نور کا ہے جو ”پیام تعلیم“ اور ”امنگ“ میں متواتر لکھتی رہتی ہیں۔ محترمہ منظر کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی خاصا شغف رکھتی ہیں اور بچوں کے لیے بہترین شاعری تخلیق کر کے ان کے ذہنوں میں حب الوطنی اور قومی جھنپتی کے دیپ جلاتی ہیں۔ ”یوم جمہوریت“ ان کی بہت مقبول نظم ہے۔ جس میں وہ بچوں سے یہ وعدہ لیتی ہیں کہ تم چاچا نہرو کے بتائے ہوئے راستے پر چلو۔ دنیا میں پھیلی نفرت، قتل و جنگ و جدل چھوڑ کر پورے عالم میں محبت و پیار کا پیغام عام کرو۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے اور یہی چیز آدمی کو انسان بناتی ہے۔

موجودہ وقت کی خواتین قلم کاروں میں ایک مقبول ترین نام ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا ہے۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر صاحبہ متعدد اصناف میں طبع آزمائی کر رہی ہیں۔ سائنس، اکادمی انعام یافتہ ناول نگار، معروف افسانہ نگار، محقق و ناقدہ، بچوں کی شاعرہ و ادیبہ کی حیثیت سے بھی آپ نے اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔ محترمہ کئی زبانوں میں لکھتی ہیں۔ ہندی کے علاوہ تیلگو اور انگریزی میں بھی ان کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کی کئی تخلیقات مغربی بنگال بورڈ آف سینڈری ایجوکیشن کی اردو کی دسویں کتب میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بال بھارتی کی اردو کی بچوں کی کتب میں ان کی کئی نظمیں ”آؤ دعا مانگیں“ شامل ہیں۔ بچوں کے لیے تخلیق کردہ نظموں کا مجموعہ ”پھول سے پیارے جگنو“ 2023ء میں منظر عام پر آچکا ہے جس میں بہت خوبصورت نظموں کا انتخاب ہے۔

بنگلور کی ایک اور معروف خاتون حلیمہ فردوس نے بچوں کے لیے لسانی کھیلوں پر مشتمل کتاب ”الفاظ کی دنیا“ ترتیب دی ہے۔ جس میں بہت محنت و جاں گاہی کے ساتھ لسانی رموز کو کھیلوں میں پیش کیا گیا ہے۔ جو بہت ہی جوہم بھرا کام ہے۔ اس کے علاوہ کہانیوں، ڈراموں اور مضامین کا مجموعہ ”بچوں کی دھنک رنگ دنیا“ 2016ء میں منظر عام پر آ کر مقبولیت کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ اس

کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ زیادہ تر تخلیقات میں عصر حاضر کے تقاضوں اور ضرورتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بہت دلچسپ انداز بیان میں تجسس و تخیل کے ساتھ افادی پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ جو ادبی معیار میں اضافہ بھی کرتا ہے اور ذہنی آسودگی کا سبب بھی بنتا ہے۔

مذکورہ بالا خواتین کے علاوہ ادب اطفال کے فروغ و اشاعت میں جن خواتین قلم کاروں نے اپنی موجودگی درج کرائی، ان میں رفیعہ شبنم عابدی، سیدہ سیدین حمیدہ، صوفیہ صدیقی، صائمہ انیس، غزالہ نورانی، امینہ فاطمہ، ثریا فروغ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ خواتین ایسی بھی ہیں جنہوں نے دوسری زبانوں کے ادب اطفال کے ترجمے کر کے بچوں کے ادب کی قوس و قزح میں مزید رنگوں کا اضافہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ جس کے زیر اہتمام بہت سی خواتین کی ترجمہ کردہ کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ ان میں سیدہ فرحت، صفری مہدی، ثریا جیس، نجمہ نقوی، جہاں آرا، کشور سلطانہ، ریحانہ رضوی، عائشہ خاتون، شہناز اقبال، زاہدہ خاتون، طلعت گل، سلمیٰ اجیری وغیرہ کے نام نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ ترجمے کے حوالے سے مندرجہ بالا خواتین پر خاطر خواہ گفتگو کی جائے اور ان کی ترجمہ کردہ کتابوں کے فنی محاسن سے قارئین کو روشناس کرایا جائے لیکن مضمون کی طوالت یہ اجازت نہیں دے رہی ہے۔ پھر بھی یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ اس مختصر جائزے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گذشتہ سو سال کے عرصے میں خواتین قلم کاروں نے سنجیدگی، خلوص و ایمانداری کے ساتھ بچوں کے لیے ادب تخلیق کیا ہے اور نو نہال قوم کی روحانی و اخلاقی تربیت و تہذیب، صالح اقدار کی ترسیل اور روایت کی پاسداری کی شعوری کوشش کی ہے اور انہیں اعلیٰ قدروں کا شہری، صالح انسان، فلاح بہبودی کا علمبردار بنانے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ ان کی یہ افادی و اصلاحی کوشش ادب اطفال میں ہمیشہ سنہری حرفوں میں لکھی جائے گی۔

☆☆☆



عہد حاضر کے معروف نقاد محترم حقانی القاسمی اور ڈاکٹر زیبا ناز کے اعزاز میں سچائی گئی محفل میں اسٹیج پر موجود دائیں سے ڈاکٹر ارشد سیانوی، حقانی القاسمی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر زیبا ناز اور ڈاکٹر شاداب علیم۔

ڈیجیٹل عہد میں بچوں کا ادب: مسائل اور امکانات

ادب انسانی زندگی کا وہ آئینہ ہے جس میں معاشرے کے افکار، جذبات، اقدار اور تہذیبی رویے منعکس ہوتے ہیں۔ جس قوم کا ادب جتنا مضبوط اور معیاری ہوتا ہے، اس کی فکری بنیادیں بھی اتنی ہی مستحکم ہوتی ہیں۔ ادب کی متعدد اصناف ہیں جن میں بچوں کا ادب نہایت اہم حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں ایک بچے کی ذہنی، اخلاقی اور تعلیمی تربیت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ بچوں کا ادب محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ ایک ایسا تعمیری وسیلہ ہے جو بچے کے ذہن میں اچھے خیالات، اعلیٰ اخلاق اور مثبت سوچ پیدا کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ موبائل فون، انٹرنیٹ، سوشل میڈیا، یوٹیوب، کارٹون چینلز اور مصنوعی ذہانت نے انسانی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ بچوں کی دنیا بھی اس تبدیلی سے شدید متاثر ہوئی ہے۔ آج کا بچہ کتابوں سے زیادہ موبائل اسکرین سے وابستہ نظر آتا ہے۔ ایسے حالات میں اردو زبان و ادب کو بچوں کے ادب کو لے کر نئے چینلنجز کا سامنا ہے۔ اگرچہ یہ دور کئی مشکلات لے کر آیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ بچوں کے ادب کے لیے نئے امکانات بھی پیدا ہوئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بچوں کے ادب کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے تاکہ نئی نسل کی ذہنی و اخلاقی تربیت بہتر انداز میں ممکن ہو سکے۔ اس حوالے سے محمد سراج عظیم نے بچوں کے زندگی اور ان کے مستقبل کو لے کر بہت ہی معنی خیز جملے تحریر کئے ہیں جو برق رفتار سائنسی تبدیلی اور بدلتے ہوئے سماجی، تہذیبی و اخلاقی اقدار کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ بہت ہی مثبت جملے قلم بند کرتے ہیں:

”زندگی میں صرف ادب ہی نہیں ہر شعبہ حیات میں اکیسویں صدی کے نزدیک پہنچتے پہنچتے سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایسی حیرت انگیز تبدیلیاں یا ترقیاں رونما ہوئیں کہ متحرک اذہان ایک خلفشار کا شکار ہونے لگے اور ہر لمحہ سائنسی ایجادات کے بدلتے منظر نامے سے انگشت بدنداں ہوتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے ہم رکاب کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ چاہے ادب ہو یا کوئی بھی شعبہ حیات ہو، جنہوں نے اپنے آپ کو وقت کے دھارے کی سمت اور رفتار سے مطابقت دے لی وہ کامیابی کی بلندیوں پر نظر آنے لگے جو چوک گئے یا بے اعتدالی برقی

وہ ماضی بن گئے۔ تبدیلی قانون فطرت ہے تبدیلی کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کو اپنا زندہ قوموں کی نشانی ہے۔ ادب میں عمومی طور پر اور ادب اطفال میں خصوصاً اس کا اطلاق ضروری ہے۔ بچہ آنے والے مستقبل کا فرد ہے اور مستقبل سائنس و ٹیکنالوجی کی حیران سامانیوں کے ساتھ ظاہر ہوگا، اگر اس کی تیاری آج کا بچہ نہیں کرے گا تو جینا محال ہوگا۔“ ۱

(اردو دنیا، اپریل ۲۰۲۳ء۔ عصر حاضر کے ادب اطفال میں سائنس و ٹیکنالوجی رجحانات و امکانات۔ محمد سراج عظیم) بچوں کا ادب اس ادب کو کہا جاتا ہے جو خاص طور پر بچوں کی ذہنی سطح، نفسیات، دلچسپی اور فہم کو مد نظر رکھ کر تخلیق کیا جائے۔ اس ادب میں زبان آسان، اسلوب دلکش اور موضوعات دلچسپ ہوتے ہیں۔ بچوں کی کہانیاں، نظمیں، لطیفے، حکایات، مہماتی قصے، اخلاقی اقدار اور پند و نصائح اسی دائرے میں شامل ہیں۔ اردو ادب میں بچوں کے ادب کی روایت کافی قدیم ہے۔ مولوی اسماعیل میرٹھی کو بچوں کے ادب کا ایک اہم معمار سمجھا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں نہ صرف آسان زبان میں تھیں بلکہ ان میں اخلاقی تربیت کا پہلو بھی نمایاں تھا۔ ان کے علاوہ متعدد ادباء ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، امتیاز علی تاج، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، حسین حسان، اطہر پرویز، بانو سرتاج وغیرہ نے اس میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں اور بچوں کے لیے دلچسپ اور معلوماتی ادب تخلیق کیا۔ بچوں کے ادب کی اہمیت اس وجہ سے بھی زیادہ ہے کہ بچپن انسان کی شخصیت سازی کا بنیادی مرحلہ ہوتا ہے۔ اگر بچے کو شروع ہی سے اچھا ادب ملے تو اس کے اندر مطالعہ کا شوق، اچھے اخلاق اور مثبت فکر پیدا ہوتی ہے۔ اچھی کہانیاں بچوں میں سچائی، دیانت داری، خلوص، ہمدردی اور حب الوطنی جیسے جذبات پیدا کرتی ہیں۔

موجودہ دور میں ٹیکنالوجی نے بچوں کی زندگی کو مکمل طور پر بدل دیا ہے۔ پہلے بچے کہانیاں، رسائل اور کتابیں پڑھ کر وقت گزارتے تھے، مگر اب موبائل فون، ویڈیو گیمز اور سوشل میڈیا نے ان کی دلچسپیوں کا رخ بدل دیا ہے۔ بچے گھنٹوں یوٹیوب، فیس بک اور دیگر پلیٹ فارمز پر وقت صرف کرتے ہیں جس کے نتیجے میں مطالعہ کا رجحان کم ہوتا جا رہا ہے۔ کارٹون اور ویڈیو گیمز نے بچوں کے تخیل کو تو وسیع کیا ہے لیکن ساتھ ہی ان کی توجہ کتابوں سے ہٹا دی ہے۔ آج کا بچہ مختصر ویڈیوز دیکھنے کا عادی ہو گیا ہے، اس لیے وہ لمبی تحریریں پڑھنے میں جلد اکتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے ادب کو نئے اسلوب اور جدید انداز اختیار کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اگرچہ ڈیجیٹل دنیا کے منفی اثرات موجود ہیں، لیکن اس کے مثبت پہلو بھی نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ انٹرنیٹ نے معلومات تک رسائی آسان کر دی ہے۔ اب بچے آن لائن کہانیاں، آڈیو بکس اور تعلیمی ویڈیوز کے ذریعے بھی علم حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر بچوں کے ادب کو جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو اس کی افادیت مزید بڑھ سکتی ہے۔ بچوں کا ادب اس وقت کئی مسائل سے دوچار ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ معیاری اور جدید ادب کی کمی کا ہے۔ آج بھی بیشتر بچوں کی کتابوں میں وہی پرانے موضوعات دہرائے جاتے ہیں، جبکہ موجودہ دور کے بچے سائنسی، تخیلاتی

اور مہماتی موضوعات میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ دوسرا مسئلہ زبان اور اسلوب کا ہے۔ بعض مصنفین بچوں کی نفسیات کو سمجھنے بغیر مشکل زبان استعمال کرتے ہیں، جس سے بچے دلچسپی کھودیتے ہیں۔ بچوں کے ادب میں سادگی، روانی اور دلکشی نہایت ضروری ہے۔ ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ اردو کے ناشرین بچوں کے ادب پر کم توجہ دیتے ہیں۔ انگریزی زبان میں بچوں کے لیے رنگین اور خوبصورت یاد دہندہ ذیب کتابیں بڑی تعداد میں شائع ہوتی ہیں، جبکہ اردو میں یہ رجحان نسبتاً کم ہے۔ نتیجتاً بچے اردو کے بجائے دوسری زبانوں کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ اردو زبان اور ادب اطفال کے اعداد و شمار کے تعلق سے محمد سراج عظیم لکھتے ہیں:

”اب آئیے ادب اطفال کے اعداد و شمار پر نظر ڈالتے ہیں۔ انگریزی زبان کا ادب اطفال سب سے زیادہ انگلینڈ میں 96 فی صد لکھا، پڑھا جاتا اور شائع ہوتا ہے۔ جب کہ لندن شہر میں یہ صد فی صد ہے۔ کناڈا میں 79 فی صد جرمنی میں 82 فی صد ہے۔ ہمارے ہندوستان میں اردو ادب اطفال کل 37 فی صد ہے۔ جب کہ ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں حیرت انگیز طور پر 25 فی صد ہے جہاں اردو کے تقریباً ساٹھ رسائل نکلتے ہیں اور بہت ضخیم کتابوں کی اشاعت ہوتی ہے مگر اعداد دوسری داستان بیان کرتے ہیں یعنی برصغیر ہند و پاک میں ادب اطفال کی حالت دگرگوں ہی کہی جاسکتی ہے۔ ان اعداد و شمار سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم مجموعی طور پر ادب اطفال کے لیے کتنے سنجیدہ اور فعال ہیں۔ یہ اعداد و شمار کیا سیکڑوں سوالات کے ساتھ ہمیں کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں؟“ ۲

(اردو دنیا، اپریل ۲۰۲۳ء۔ عصر حاضر کے ادب اطفال میں سائنس و ٹیکنالوجی رجحانات و امکانات۔ محمد سراج عظیم) ڈیجیٹل میڈیا بھی بچوں کے ادب کے لیے ایک بڑا چیلنج بن چکا ہے۔ موبائل اور انٹرنیٹ نے بچوں کو اس قدر مصروف کر دیا ہے کہ ان کے پاس کتاب پڑھنے کا وقت کم رہ گیا ہے۔ اگر یہی صورتحال برقرار رہی تو آنے والے وقت میں مطالعہ کی عادت مزید کمزور ہو سکتی ہے۔ اگرچہ بچوں کے ادب کو مختلف مسائل کا سامنا ہے، لیکن مستقبل کے حوالے سے امکانات بھی روشن ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کر کے ادب اطفال کو نئی زندگی دی جاسکتی ہے۔ آج ای بکس اور آڈیو بکس کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اگر بچوں کی دلچسپ کہانیوں کو آڈیو اور ویڈیو شکل میں پیش کیا جائے تو بچے زیادہ دلچسپی سے انہیں سن اور دیکھ سکیں گے۔ اسی طرح اپنی میشن کے ذریعے اردو کہانیوں کو جدید انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں محمد سراج عظیم رقم طراز ہیں:

”آج ہمیں ضرورت ہے کہ ہم دنیا اور وقت کے بدلنے منظر نامے کے مطابق اپنے ارد گرد ادب اور سوچ کو ڈھالیں۔ آج ضرورت ہے کہ ہم سائنس اور

ٹیکنالوجی کی ایجادات کو ادب اطفال کے لیے بروئے کار لاتے ہوئے، کارٹون کہانیاں، انیمیشن، سائنس فکشن، دلچسپ ناول جن میں خلائے بسیط کے قصے، جاسوسی قصے جس میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال ہو، وہ کردار جو سائنس کی نئی نئی ایجادات کا استعمال کر کے ماسٹر فار آل ایکشن ہو ادب اطفال میں ان سب کی آمیزش اور بہتائیت کی ضرورت ہے۔ اردو میں بچوں کا ادب لکھنے والوں کو ان سب باتوں اور سائنس و ٹیکنالوجی کی ایجادات اور سائنسی رجحانات کی سوچ سے پر ادب تحریر کرنا ہوگا تب ممکن ہوگا کہ اردو ادب اطفال کا معصوم قاری کتب بینی کی جانب متوجہ ہو۔“ ۳

(اردو دنیا، اپریل ۲۰۲۳ء۔ عصر حاضر کے ادب اطفال میں سائنس و ٹیکنالوجی رجحانات و امکانات۔ محمد سراج عظیم)

مصنوعی ذہانت یعنی AI بھی اس میدان میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ AI کی مدد سے بچوں کے لیے تعلیمی گیمز، دلچسپ کہانیاں اور انٹرایکٹو مواد تیار کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح بچے کھیل ہی کھیل میں اردو زبان اور ادب سے جڑ سکتے ہیں۔ اسکولوں اور والدین کا کردار بھی نہایت اہم ہے۔ اگر والدین بچوں کو موبائل کے ساتھ ساتھ کتابوں کی طرف بھی راغب کریں اور اساتذہ نصیباتی سرگرمیوں میں بچوں کے ادب کو شامل کریں تو مطالعہ کا ذوق دوبارہ پیدا ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ جدید موضوعات جیسے خلائی سائنس، ماحولیات، مصنوعی ذہانت، اخلاقی مسائل اور سائنسی ایجادات کو بچوں کے ادب میں شامل کیا جانا چاہیے تاکہ بچے جدید دنیا کے تقاضوں سے بھی واقف ہو سکیں۔ بچوں کا ادب کسی بھی قوم کے مستقبل کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اردو ادب اطفال اپنی ادنیٰ روایت اور اخلاقی اقدار کے اعتبار سے نہایت اہم سرمایہ ہے، لیکن موجودہ ڈیجیٹل دور میں اسے مختلف چیلنجز کا سامنا ہے۔ موبائل، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے بچوں کی دلچسپیوں کو تبدیل کر دیا ہے، جس کی وجہ سے مطالعہ کا رجحان کم ہوا ہے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ جدید ٹیکنالوجی بچوں کے ادب کے لیے نئے مواقع پیدا کر سکتی ہے۔ اگر مصنفین، ناشرین، اساتذہ اور والدین مل کر جدید تقاضوں کے مطابق دلچسپ اور معیاری ادب تخلیق کریں تو بچوں کا ادب دوبارہ اپنی اہمیت حاصل کر سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کے ادب کو محض نصیحت تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اسے دلچسپ، سائنسی، تخیلاتی اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا جائے۔ یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے نئی نسل کو اردو زبان، اخلاقی اقدار اور مطالعہ کی روایت سے جوڑا جاسکتا ہے۔ بچوں کے ادب کا مستقبل اسی وقت روشن ہوگا جب ہم اسے جدید دنیا کے تقاضوں کے مطابق نئے انداز میں پیش کریں گے۔

اکیسویں صدی کے افسانوں میں بچوں کے مسائل

موجودہ دور سائنس کا دور ہے۔ اُردو ادب میں موضوعاتی مطالعے پر ہر ادیب نے قلم اٹھا ہے لیکن بچوں کے ادب پر قلم اٹھانے والے ادیب خال خال نظر آتے ہیں۔ دور حاضر میں بچوں کے ادب کے تئیں غفلت برتی جا رہی ہے۔ زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے بچوں کی ادبی نشوونما ناگزیر ہے۔ ہمارا کلچر اور معاشرہ اُن صالح قدروں سے نا آشنا ہوتا جا رہا ہے جن کی اساس ادب اطفال میں پنہاں ہیں۔ جدید تکنیک نے بچوں کو وہ سہولتیں فراہم کر دی ہیں جن سے ان کی جسمانی ترقی روز بروز بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے لیکن ذہنی نشوونما کے لیے ہمارے پاس موبائل گیم اور دیگر مصروف ترین آلات موجود ہیں۔ ادبی ذہن سازی کے نام پر ہم اپنے بچوں کو کارٹون سے واقفیت کرا دیتے ہیں۔ اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے بچوں کے ادب کو تخلیق کرنا ہمارے ادیبوں کا اولین فرض ہے۔

زبان و ادب میں کوئی بھی زبان اس وقت تک اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ اس میں ادب اطفال کا ذکر نہ کیا جائے یعنی ادب میں ایسا خاکہ بنایا جائے جس میں ان سے متعلق باتیں بتائی جائیں۔ ادب اطفال ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت ہی کم ادیبوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں اور جن ادیبوں نے اس میدان میں قدم رکھا ان کی تعداد بہت کم ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ادیب ان بچوں سے زیادہ دوسرے موضوعات کو ترجیح دیتے ہیں، جن کا تعلق جدید تکنیک، نئی تہذیب و تمدن، نئے رسم و رواج اور رہن سہن سے ہے۔ یہ موضوع آج کل ہر خاص و عام کی گفتگو کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پوری دنیا ایک نئے گلوبل ویلج میں تبدیل ہو گئی ہے جو نئے رسم و رواج اور نئے کلچر کو جنم دے رہی ہے۔ اسی نئے رسم و رواج اور کلچر میں بچوں کا ذکر بھی لازمی ہے۔ ان کے بغیر ہر وہ شے بے کار ہے جس کا ہم سب تصور کرتے ہیں۔ ہمارے دل و دماغ میں وہ تصورات بھی جگہ پاسکتے ہیں جب تک کہ ان کو ادب میں ایک مستحکم جگہ نہ مل جائے۔ یہ کام بھی اپنے حقیقی روپ میں نظر آسکتا ہے جب ہم سب اس موضوع پر اپنے خیالات و نظریات پیش کریں اور لوگوں کو اس طرف آنے کی دعوت دیں۔ اگر ہر خاص و عام کار حجان اس طرف غالب ہو گیا تو شاید ادب میں بہت سے ایسے ادیب پیدا ہو جائیں گے جن کے خیالات و نظریات سے ہم سب فیضیاب ہو سکیں گے اور ادب کو ایک نئی منزل مل جائے گی۔ یہ منزل ہر اس بچے کے لیے نیا راستہ ہموار کرے گی جس میں کچھ کر گزرنے کی صلاحیت ہو اور جنون کی ایک

نئی جوالا ہو۔

ہندوستانی معاشرے میں بچوں کی ضروریات الگ ہوتی ہیں۔ ان کے جذبات جداگانہ ہوتے ہیں، اس لیے بڑوں کے مقابلے ان کا ادب بھی مختلف ہوتا ہے۔ ان کے ادب میں سیر و تفریح کے ساتھ ماحول اور رہن سہن خاص کر ان کی نفسیات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے جس سے فیضیاب ہو کر یہ اپنے سماج کے لیے ایک آئیڈیل انسان بن جائیں۔ اگر یہ بچے معاشرے کے لیے مثال بنیں گے تو ان کی دیکھا دیکھی دوسرے بچے بھی اپنے اندر نئی بیداری پیدا کریں گے۔ ان کے اس قدم سے سماج میں نیا انقلاب جنم لے گا جو دوسروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ لیکن یہ انقلاب اس وقت ترقی کی نئی منزلیں طے کر پائے گا جب اس میں نیا شعور جگہ پائے گا۔ اگر یہ شعور بس دکھاوے کے لیے ہوگا تو اس سے معاشرے پر برا اثر پڑے گا۔ اس سے پورے سماج میں غلط باتیں رواج پائیں گی جو بچوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ اسی لیے ہر ادیب کو چاہیے کہ بچوں کا ادب تخلیق کرتے وقت ہمیشہ ان کی حرکت و سرگرمی پر نظر رکھیں جس کے سبب ان میں نیا جوش اور نئی کشش پیدا ہوگی اور ان میں نئے خیالات و تصورات کی شمع روشن ہوگی۔ اگر ہر ادیب ان باتوں پر عمل کر لے تو شاید اس سے بچوں کی زندگی سنور سکتی ہے اور وہ اپنی فکر میں تبدیلی لاسکتے ہیں۔ پروفیسر محمد فاروق انصاری بچوں کی حقیقی زندگی کی وضاحت اس طرح بیان کرتے ہیں:

”کسی بھی قوم کا حقیقی سرمایہ بچے ہی ہوتے ہیں اور قوم کے مستقبل کا انحصار بھی بچوں پر ہی ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہم سب پر عیاں ہے کہ ملک و قوم کی ترقی میں تعلیمی نظام کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور نظام تعلیم کا مرکز بچہ ہی ہوتا ہے۔ تعلیم کا مقصد بچوں کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، انھیں جلا دینا اور ان کی شخصیت کے گونا گوں پہلوؤں اور کردار کی نشوونما کرنا ہے تاکہ وہ فرد کی حیثیت سے کامیاب اور مطمئن زندگی گزار سکیں اور اجتماعی طور پر معاشرے اور سماج کی تشکیل میں حصہ لے سکیں۔“ ۱

عہد حاضر میں جہاں انسانوں نے ترقی کی نئی منزلیں طے کیں ہیں وہیں سائنس اور ٹکنالوجی نے بھی ہر میدان میں اپنا پرچم لہرایا ہے۔ ایک طرف جہاں دنیا ترقی کی نئی منازل کی طرف گامزن ہے وہیں ہندوستانی معاشرے میں انسانی زندگی اپنی طبقاتی زندگی کے لیے جدوجہد کرتی نظر آ رہی ہے۔ اسی جدوجہد میں یہاں کی عوام اپنی غریبی اور مفلسی سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس کشش بھری زندگی میں وہ غریب اور مزدور بچے بھی شامل ہیں جو تعلیم حاصل کر کے اپنی زندگی کو سنوارنا چاہتے ہیں۔ مگر گھر کی معاشی حالت کو دیکھ کر وہ بھی اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ بھرنے کے لیے دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے محنت و مزدوری کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان بچوں کو معاشرے میں رہ کر جہاں ایک مثال بننا تھا وہ اب اس راہ پر نکل پڑے ہیں جہاں ان کو صرف اپنے اور اپنے خاندان کے مسائل

مصائب و پریشانیاں نظر آرہی ہیں۔ اسی سلسلے میں سماج کے کچھ ایسے بچے بھی دیکھنے کو مل جائیں گے جو ہندوستان کی گندی سیاست کی وجہ سے ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ معصوم بچے اپنے دوستوں سے اس لیے دور ہو جاتے ہیں کہ انھیں مذہب اور پہچان کے نام پر الگ کر دیا جاتا ہے۔ ان کے دل و ماغ میں ایسی نفرت بھردی جاتی ہے کہ یہ ایک ہو کر بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاتے ہیں۔ ہندوستانی معاشرے میں مزید یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ کس طرح تعلیم کے نام پر بچوں کے والدین سے زیادہ رقم وصولی جاتی ہے اور جو خاندان معاشی طور پر کمزور ہوتا ہے وہ اپنے بچوں کو بہتر اور معیاری اسکول میں تعلیم نہیں دلوا پاتا ہے۔ کیونکہ آج کل جس طرح سے یہ اسکول انگریزی میڈیم تعلیم کے نام پر پیسے لوٹ رہے ہیں اس سے ہر کس و نا کس واقف ہے۔

اردو افسانوں میں پیشتر موضوعات پر قلم فرسائی کی چابکی ہے اس سے ہر کوئی واقف ہے۔ ان فسانوں میں قدیم و جدید کی وہ ساری باتیں مل جائیں گی جن کا تعلق انسانیت سے ہے۔ لیکن بچوں کے موضوعات سے یہ افسانوی دنیا بہت حد تک خالی ہے۔ شاید ان کی بچوں سے بے خیالی اور لائق کی وجہ کچھ اور ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تر ادیب اور ناقد بچوں کے مقابلے نئے نئے موضوعات کو قلم بند کرنا زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ نئے خیالات و نظریات کو ادیب و ناقد بھی اپنی تخلیقات میں جگہ دے رہے ہیں۔ افسانوی دنیا کے بدلنے منظر نامے پر سلام بن رزاق اپنے نظریات کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

”بے شک پچھلے اسی پچاسی برسوں میں اردو مختصر افسانے نے کئی کروٹیں بدلی ہیں۔ ہیپٹی اور معنیاتی سطح پر بے شمار تجربے کیے گئے ہیں۔ فارم اور اسلوب کے اعتبار سے بھی اس کا رنگ و روپ نکھرا ہے۔ ان تجربوں میں بعض تجربے یقیناً اردو افسانے کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تجربوں کی روشنی میں اردو افسانے نے مختلف جہتوں میں سفر کیا ہے اور نئی نئی زمینوں کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے مگر بعض فیشن پرست، کم سواد اور کوتاہ اندیش قسم کے افسانہ نگاروں نے ان تجربوں کی روح کو سمجھے بغیر ان کی ایسی اندھا دھند تقلید شروع کر دی کہ افسانہ معنی کے اعتبار سے تو چیستا بن گیا اور ہیئت کے لحاظ سے ایک ایسی نکسال جس میں افسانے سکوں کی طرح ڈھل کر نکلنے لگے۔ یک رنگ، یک خیال، یک سرے، افسانے سے کردار، مکالمہ اور پلاٹ تو غائب ہو ہی چکا تھا۔ اب اس سے اس کی روح بھی چھین لی گئی یعنی افسانے سے اس کا کہانی پن ہی غائب ہو گیا اور افسانہ کا ٹھہ یا مٹی کی اس صورت کی مانند ہو گیا جو اکثر ملبوسات کی دکان پر شوروم میں نمائش کے لیے سجا کر کھڑی کی جاتی ہے پرکشش مگر بے جان، نہ یوگ کے لائق نہ بھوک کے۔ مگر آج گرہن چھوٹ رہا ہے۔ افسانے کے پاؤں دوبارہ کہانی پن کی ٹھوس زمین پر جم چکے ہیں۔ لیکن

ٹھیک اس وقت جب افسانے میں کہانی پن کی بازیافت ہو رہی ہے ہمارے
معاشرے کا منظر نامہ پوری طرح بدل چکا ہے۔“ ۲

ہندوستانی ادب میں جس طرح دیگر زبانوں میں بچوں سے متعلق افسانے لکھے جا رہے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ سارے افسانے اس بات کے گواہ ہیں کہ ان زبانوں کے ادیبوں اور ناقدوں نے ان کی دشواریوں اور پریشانیوں کو سمجھا اور انہیں اپنی تخلیقات میں جگہ دی۔ مختلف زبانوں کے مقابلے اردو ادب میں اس موضوع پر کم ہی ادیبوں اور ناقدوں نے افسانے لکھے ہیں۔ اکیسویں صدی کے رابع اول میں جن ادیبوں اور ناقدوں نے بچوں کے مسائل پر افسانے لکھے ان میں نیر مسعود، سلام بن رزاق، سید محمد اشرف، ابن کنول، غففر، مشرف عالم ذوقی، شوکت حیات، ذکیہ مشہدی، ترنم ریاض، طارق چھتری، بانو سرتاج، دیک بدکی، احمد صغیر وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل ہیں۔ ان ادیبوں اور ناقدوں نے بڑی حد تک اپنے افسانوں میں ان کے مسائل کو جگہ دی جس سے ادبی دنیا ان کی اہمیت و افادیت کو سمجھ سکے اور سماج میں ان کا جو مرتبہ ہے وہ انہیں حاصل ہو سکے۔

جدیدیت کو نئی پہچان دینے والوں میں نیر مسعود کو خاص مقام حاصل ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں علامتوں، استعاروں، تجریدی اور داستانی رنگ کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ حقیقی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ان کے اس فن میں جہاں بیانیہ کو خاص اہمیت حاصل ہے وہیں انہیں مختلف فضاؤں سے نئی کہانیاں بیان کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔ نیر مسعود کے اس فن سے جہاں ادب میں نئے خیالات و نظریات جنم لیتے ہیں وہیں ادبی دنیا میں نئے موضوعات کی طرف عوام کا رجحان بڑھتا ہے جس سے ادب میں نئی بیداری پیدا ہوتی ہے اور عوام کو نئی جدوجہد کی طرف گامزن کرتی ہے۔ اگر یہ جدوجہد، تلاش و جستجو کی کیفیت عوام میں پیدا نہیں ہوگی تو ادب کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اسی جدوجہد کے پس منظر میں ان کا افسانہ ”شیشہ گھاٹ“ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ان دو بچوں کی زندگی کو پیش کیا ہے جو ماحول کے ساتھ ہندوستانی معاشرے کی بد حالی کا شکار ہوئے ہیں۔ ایک طرف وہ معصوم ہے جو اپنے ہکلا پن سے مجبور ہے تو دوسری طرف پر یا ہے۔ پر یا جب سے پیدا ہوئی ہے اس کو زمین کی سوندھی خوشبو نصیب نہیں ہوئی۔ کیونکہ پر یا کی پیدائش پانی کے اندر ہوئی ہے اور وہ آٹھ سال کی ہو جانے کے باوجود بھی اپنی ناؤ میں ہی زندگی گزر بسر کرتی ہے جبکہ وہ معصوم جو ہکلاتا ہے زندگی کی کشمکش میں جدوجہد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ہکلانے پر معاشرے کے لوگ ہنستے ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ اپنے ہکلا ہٹ کو کسی طرح ختم کرنا چاہتا ہے مگر اسے بار بار ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور وہ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوتا۔ جب یہ اپنے گھر ہوتا تو اپنے والد سے باتیں کرتا اور بڑی حد تک اپنے اندر اصلاح کر چکا تھا۔ اسی بیچ اس کے والد دوسری شادی کر لیتے ہیں اور اس معصوم کو شہر سے دور ایک شیشہ گھاٹ پر اپنے دوست جہاز کے یہاں پہنچا دیتے ہیں۔ یہ جب آتا ہے تو یہاں کا ماحول دیکھ کر ڈر جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہاں کے لوگ کیسے رہتے ہوں گے۔ لیکن پھر یہ اسی ماحول میں گھل مل جاتا ہے

اور جب جہاز اسے بی بی کے پاس لے جاتا ہے تو بی بی اسے دیکھ کر دکھیا رکھتی ہے۔ جب یہ دکھیا را کا لفظ سنتا ہے تو اسے تعجب ہوتا ہے کہ لوگ کیوں اسے دکھیا را کہتے ہیں۔ اس دکھیا را لفظ سے اس کو نفرت ہو جاتی ہے۔ نیر مسعود نے جس طرح شیشہ گھاٹ کے ساتھ اس معصوم کی زندگی کو پیش کیا ہے وہ بڑی حد تک غورو فکر کی دعوت دیتا ہے۔ کیونکہ ہکلا نے والے بچوں کو ہر جگہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور معاشرے میں ان کو ذلیل و خوار ہونا پڑتا ہے۔ افسانہ ”شیشہ گھاٹ“ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں لوگ اس کے ہکلا پن کا مذاق اڑاتے ہیں:

”آخر میرا منہ بولا باپ مجبور ہوا کہ میرے لیے کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈھے، زیادتی اس کی نہیں تھی، میری بھی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا، اور مجھے بھی کہ کچھ دن اس کے ساتھ آرام سے رہنے کے بعد میرا ہکلا نا ختم ہو جائے گا۔ لیکن اس کو امید نہیں تھی، نہ مجھے کہ گھر کے باہر میرا تماشا بنالیں گے۔ جس طرح کسی پاگل کا تماشا بنالیا جاتا ہے۔ بازاروں میں میری بات سب سے زیادہ دلچسپی اور توجہ سے سنی جاتی تھی، اور وہ بات ہنسی کی ہو یا نہ ہو، لوگ اس پر ہنستے ضرور تھے۔ کچھ دن میں میری یہ حالت ہو گئی کہ بازار تو بازار گھر کے اندر بھی اگر کبھی کچھ کہنے کی کوشش کرتا تو بول میرے ہونٹوں سے اور میرے دانتوں سے اور میرے تالو سے ٹکرا کر واپس چلے جاتے، جیسے پانی کی لہریں کنارے کو چھو کر پلٹی ہیں۔ آخر میری زبان میں گرہیں سی پڑ جاتیں۔ گردن کی رگیں پھولنے لگتیں، گلے اور سینے پر اتنا زور پڑتا کہ دم کھٹنے لگتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ سانس اکھڑ جائے گی۔ ناچار بات ادھوری چھوڑ کر ہانپتے لگتا اور سانس ٹھہرنے کے بعد نئے سرے سے بات شروع کرتا۔ اس پر منہ بولا باپ مجھے ڈانٹتا: ”جہاں تک کہہ چکے ہو، میں نے سن لیا۔ اب آگے بڑھو۔“

اردو ادب کو جس شخص نے مابعد جدیدیت سے متعارف کرایا اور ادب میں نئی فکر کو جنم دیا وہ پروفیسر گوپی چند نارنگ ہیں۔ انھوں نے جدیدیت کے خلاف مابعد جدید رجحان کو نئی بلندی دی۔ اس رجحان سے جہاں اردو ادب میں نئی روایت پیدا ہوئی، وہیں ادب میں نئے نئے نظریات و خیالات ابھر کر سامنے آئے۔ اسی نئے رجحانات و نظریات سے فائدہ اٹھا کر سلام بن رزاق نے اپنی کہانیوں کی بنیاد رکھی اور اردو ادب میں نئے طرز و فکر کے افسانے لکھنے شروع کئے۔ اس نئے طرز و فکر کی بدولت انھیں مابعد جدیدیت کا سب سے پہلا افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ اپنے افسانوں میں نئی فکر، نئی تکنیک، نئے ماحول، نئے مسائل، نئے رجحان اور نئے انقلاب کو جس طرح پیش کرتے ہیں۔ اس میں بڑی حد تک انسانیت کا درد چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ انھیں معصوم انسانوں میں وہ بچے بھی شامل ہیں جنہیں ہر جگہ دشواریوں اور پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ سلام بن رزاق نے انھیں دشواریوں اور پریشانیوں کو مد

نظر رکھتے ہوئے ان معصوم بچوں کی زندگی کو پیش کیا ہے جو درد کی ٹھوکریں کھانے کو مجبور ہیں۔ اسی مجبوری اور ذلت بھری زندگی کی ترجمانی ان کا افسانہ ”یک لویہ“ کر رہا ہے۔ یہ افسانہ اس دلت، چنڈال یا بھیل ہرنیہ دھنیش کی نمائندگی کرتا ہے۔ جس کا لڑکا ایک لویہ دھنر و دیا راج گرو درونا چاریہ سے لینا چاہتا ہے۔ راج گرو درونا چاریہ دھنر کی دودیا صرف برہمن اور کشتری کے ہی بچوں کو ہی دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ دودیا صرف اونچی ذات کے لیے ہی ضروری ہے۔ کیونکہ اس ذات کو ملک اور دلش چلانا ہوتا ہے اس لیے وہی اس دودیا کے حقیقی حقدار ہیں۔ راج گرو کی اس سوچ سے ایک لویہ کو بہت دکھ ہوتا ہے اور من ہی من میں انھیں اپنا گرو مان کر ان کی ایک مورت بنا کر اس سے ہی اپنی جائز تمنا پوری کرتا ہے۔ ایک لویہ اپنی ہمت، حوصلہ، لگن اور جدوجہد سے ایسا دھنر بن جاتا ہے کہ ایک ہی تیر سے اپنی منزل کو حاصل کر لیتا ہے۔ یہ اپنے اس جنون کی وجہ سے بعد میں ایسا نشانہ باز بن جاتا ہے کہ اس کے قصے دور دور تک مشہور ہو جاتے ہیں۔ سلام بن رزاق کا یہ افسانہ ہمیں صدیوں پہلے اس مذہبی بھید بھاؤ کی طرف لے جاتا ہے جہاں ابتدا ہی سے شدروں، دلتوں، چنڈالوں اور بھیلوں کے بچوں کے ساتھ نا انصافی ہوتی رہی ہے اور آج بھی ریزرویشن کے نام پر ان کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک ہندوستان میں ذات پات کا مسئلہ ختم نہیں ہو جاتا تب تک انھیں ہر جگہ دشواریوں اور پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ افسانہ ”یک لویہ“ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”آپ کی کیا مجبوری ہو سکتی ہے سرکار؟“

”ہرنیہ تم ساڑھے تین ہزار برس کے بعد بھی موڑکھ ہی رہے۔“

”سرکار چھوٹا منہ بڑی بات۔ اس بکھت ہمارا جنم شدروں میں ہوا تھا مگر آج تو

ہم شدر نہیں ہیں۔ ایک لویہ کو اپنا ہیشیہ بنانے میں اب کیا کٹھینائی ہو سکتی ہے۔“

”یہی تو گڑبڑ ہے ہرنیہ! زمانہ بدل چکا ہے۔ تم آج بھی شدر یا ہرنجن ہوتے تو

میں آنکھیں بند کر کے ایک لویہ کو بی سی کے کوٹے سے سیٹ دیدیتا۔ مگر اب

اڑچن یہی ہے کہ تم شدر نہیں ہو۔“

”یک لویہ بڑا ابھاگا ہے۔ جب اسے کسی برہمن یا کشتری کے گھر میں جنم لینا

چاہیے تھا اس نے شدر کے گھر جنم لے لیا۔ اور جب اسے برہمن کے گھر میں جنم

لینا تھا تو پیدا ہوا غیر ہرنجن کے گھر میں۔ اب تم ہی بتاؤ ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

”سرکار کچھ بھی کیجئے۔ اس بار نراش مت لوٹائیے۔ بڑی آشنائے لے کر آیا ہوں

آپ کے چرنوں میں۔“

”ہم مجبور ہیں ہرنیہ۔۔۔“

سید محمد اشرف نے افسانہ ”طوفان“ میں اڑیہ کے سمندری علاقوں کی عکاسی کی ہے۔ جہاں طوفان آنے کے بعد بڑے پیمانے پر نقصانات ہوتے ہیں۔ ان نقصانات میں بہت سارے انسان لقمہ

اجل بن جاتے ہیں، مچھواروں کی کشتیاں ڈوب جاتی ہیں، گھر کے گھر تباہ ہو جاتے ہیں، کھیت کھلیانوں کی فصلیں برباد ہو جاتی ہیں اور چرند و پرند موت کا لقمہ بن جاتے ہیں۔ اسی طوفان کے بیچ کچھ ایسے بد نصیب بچے زندہ بچ جاتے ہیں جن کی آنکھوں میں طوفان کا خوف ہوتا ہے جو اس قدر قہر میں اپنے ماں باپ کو کھودیتے ہیں اور یتیم اور بے سہارا ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں وہ خوشیاں نہیں آ پاتیں جو اس حادثہ نے ان سے چھین لی ہیں۔ یہ بچے پھر بے یار و مددگار ادھر سے ادھر بھٹکتے رہتے ہیں اور اس منظر کو سوچ کر ڈر جاتے ہیں۔ قدرت کی یہ کیسی مار ہے کہ طوفان کی وجہ سے پورے کے پورے علاقے برباد ہو جاتے ہیں اور وہاں کے لوگوں کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ اس طوفان کی وجہ سے وہاں کے بچوں کے سامنے بھکمری اور روزمرہ کی ضروریات زندگی کی دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ بچوں کی اس مجبوری، دشواری کا فائدہ اٹھا کر کچھ امدادی تنظیمیں انھیں اپنے پاس رکھ لیتی ہیں اور ان بچوں کی آڑ میں وہ دوسروں سے مدد مانگتی پھرتی ہیں۔ ان کی اس مانگ پر دنیا بھر سے امداد آنا شروع ہو جاتی ہے۔ اندرون ملک اور بیرون ملک سے جو امداد آتی ہے اس میں سرکاری عملہ اپنا حصہ بنانے لگتا ہے اور بڑی حد تک وہ عملہ لوٹ کھسوٹ کرنے میں ملوث ہو جاتا ہے جس کے سبب بد نظمی پھیل جاتی ہے۔ اسی بد نظمی پر طنز کرتے ہوئے سید محمد اشرف یہ بھی بتاتے ہیں کہ کس طرح سفید پوش اور انسانی ہمدردی کے علم بردار اور ریلیف آرگنائزیشن کے لوگ دوسروں کی جیبوں سے پیسہ نکلاتے ہیں۔ یہ ریلیف آرگنائزیشن ان یتیم اور بے سہارا بچوں کی فوٹو کو اپنی میگزین میں شامل کرتے ہیں جس سے انھیں زیادہ سے زیادہ امداد ملتی ہے اور یہ ان یتیموں کا پیسہ ہضم کر جاتے ہیں۔ پروفیسر صغیر افراہم افسانہ طوفان کی حقیقت کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

”افسانہ نگار نے اڑیسہ کے طوفان کے منظر و پس منظر کو تخلیقی قوت سے پیش کیا ہے۔ یہ کہانی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں سمندری طوفان کی آمد اور اس کے نتیجے میں پھیلنے والی تباہی و بربادی کا ذکر ہے۔ انسان اور حیوان، چرند و پرند، پیڑ پودے، کھیت کھلیاں سب کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر طوفان ختم ہو جاتا ہے۔ کہانی کے دوسرے حصہ میں طوفان کے بعد کے اثرات اور حساب کتاب کا ذکر ہے۔ اندرون ملک اور بیرون ملک سے آئی امداد اور اس کے غلط استعمال پر بھرپور طنز ہے۔ مرکزی اور صوبائی سرکاروں کی ایک دوسرے پر الزام تراشی، پیسے کی امداد کا فرضی اعلان، سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کا صرف نام کے لیے کام کرنا، ان تمام واقعات اور حالات کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ کہانی کے تیسرے حصہ میں اس طوفان کا ذکر ہے جس سے انسانی روح گھائل ہوتی ہے مثلاً انسانی لاشوں کا سڑنا، کتوں کی غذا بننا، یتیموں اور لاوارثوں کی بے سروسامانی کی کیفیت کا منظر۔۔۔ یہ سمندری طوفان ہفتہ بھر میں ختم ہو جاتا ہے، اس کے لگائے زخم پانچ سات سال میں بھر پاتے ہیں لیکن روح کے

”رُخموں کا اندمال نہیں ہو پاتا۔“ ۵

پروفیسر ابن کنول کی افسانہ نگاری کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اس کی تہوں میں گنجینہ معانی کا انکشاف ہوتا ہے۔ ان کے افسانے رنگ رنگ موضوعات سے مزین ہیں جو اپنی تمام تر جلوہ آرائیوں کے ساتھ دنیاوی حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے فرقہ وارانہ فسادات کے موضوعات میں سمٹے ہوئے ہوتے ہیں یا پھر ان افسانوں میں دیومالائی عناصر کی کار فرمائیاں نظر آتی ہیں، کبھی جذباتی تہوں کو کریدتے ہوئے نسوانی حسیت کی بازگشت میں ملوث ہوتے ہیں، تو کبھی جاگیردارانہ نظام کے اسرار و رموز عیاں کرتے ہوئے کسمپرسی کے معیار میں ملبوس ہندو مسلم کی آڑ میں ایسی چپقلش کا نشانہ بنتی ہوئی نسوانی آبروؤں کی زد میں ہی کبھی دیومالائی عناصر کے چلمنوں سے عصری حقائق نمود پذیر ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ ابن کنول کے افسانے کی دنیا لا محدود موضوعات کی آماجگاہ ہے جو انسانی فکر کی حسیت کو ہمیز کرتے ہوئے اس کے وجدان تک پہنچ جاتا ہے۔

افسانہ ”سوئٹ ہوم“ میں ابن کنول نے علامتوں، داستانوں اور حکایتوں کو جس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے اس سے ہر کوئی واقف ہے۔ وہ اپنی کہانیوں کا کیونس ایسی داستانوں سے تیار کرتے ہیں جن کا تعلق حقیقت پر مبنی ہو۔ وہ اپنی کہانیوں میں بیانیہ کا استعمال کرتے ہیں تو وہ کہانی حقیقت سے پرے ہو جاتی ہے اور اس کی حیثیت ادبی دنیا میں وہ اثر نہیں دکھاپاتی جس کے وہ حقدار ہیں۔ ابن کنول کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ ادب میں ایسی چیزوں کو بیان کیا جائے جن کا حقیقت سے رشتہ ہو۔ اسی کڑی میں افسانہ ”سوئٹ ہوم“ کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس افسانے کی پوری کہانی شوکت کے ساتھ ساتھ اس کی بیٹی سعیدہ کے ارد گرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جو ایک مکان کے لیے کس طرح جدوجہد کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ شوکت گاؤں کا رہنے والا ایک فرد ہے جو روزگار کے سلسلے میں شہر آتا ہے اور جب روزگار مل جاتا ہے تو کرایہ کے مکان میں رہنے لگتا ہے۔ اس کی تنخواہ اتنی کم ہوتی ہے کہ اس کا زیادہ تر حصہ اسی کرایہ میں چلا جاتا ہے اور مکان مالک کی خواہش ہوتی ہے کہ کرایہ دار زیادہ سے زیادہ کرایہ دیں۔ اسی کشمکش میں شوکت کئی بار گھر بدلتا ہے اور آخر میں یہی سوچتا ہے کہ کیوں نہ خود کا گھر بنا لیا جائے۔ شوکت بڑی جدوجہد کے بعد زمین خریدتا ہے اور کسی طرح مکان بنا لیتا ہے۔ اس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ میرے بعد میرے بچے سکون سے رہ سکیں۔ وہ یہی سوچتا ہے کہ جو تکلیف میں نے اٹھائی ہے وہ میرے بچے نہ اٹھائیں۔ اسی فکر میں اس کے گھر کی دیوار اونچی ہوئی چلی گئی پھر ایک دن یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری زمین جس پر گھر بنا ہے وہ سرکاری ہے اور دلالوں نے دھوکہ سے بیچا ہے۔ اس طرح شوکت کا خواب ادھورہ رہ جاتا ہے اور سعیدہ کی ساری امیدیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ جب شوکت کا گھر گر لیا جاتا ہے تو سعیدہ اپنے والد شوکت سے پوچھتی ہے کہ ابو کیا ابائیلیں ہمارے گھر کی مدد کرنے آئیں گی، جس طرح ابراہمہ کے لشکر کو انھوں نے کنکریوں سے ختم کر دیا تھا۔ شوکت اس پر کوئی جواب نہیں دیتا ہے بس اس کے آنکھوں کے سامنے اپنے بچوں کی فکر لگی رہتی ہے کہ اب یہ کس طرح اپنا آشیانہ بنائیں گے۔ افسانہ ”سوئٹ ہوم“ کی

چند سطریں ملاحظہ ہوں:

”اسے اب اس سوٹ ہوم کی دیواریں ہلتی ہوئی نظر آرہی تھیں اور ان ہلتی ہوئی دیواروں کے بیچ جب وہ اپنے معصوم بچوں کو ایک بار پھر بے گھری کے عالم میں دیکھتا تو تڑپ اٹھتا تھا۔ ان بچوں نے اس گھر کے لئے کتنی قربانیاں دی تھیں۔ کھلونوں کے بجائے گھر کے لئے اینٹیں خریدی تھیں۔ اپنے آپ کو کھلونوں سے کھیلنے والے بچوں کی عمر سے بلند کر لیا تھا اور اس معصوم بڑے بچے نے بازاروں میں بکتے ہوئے کھلونوں کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا کہ انہیں سر چھپانے کے لئے اپنی چھت مل جائے۔ اس سے اپنی بیوی کی خالی خالی ویران آنکھیں نہیں دیکھی جاتی تھیں جس نے اپنے جسم کے تمام زیورات اتار کر مٹی کی نذر کر دیئے تھے اور اس گھر کو ہی اپنا زیور سمجھا تھا۔ اسے خود ہی اپنی خبر نہیں تھی کہ گھر کی دیواروں کو بچانے کی کوشش میں اس کے بالوں میں کتنی دھول اٹ گئی ہے اور اس کے پیر کتنے کچڑ میں دھنس گئے ہیں۔ اس بستی کے ہر شخص کا یہی حال تھا، سبھی لوگ اپنے گھروں کی حفاظت میں جان و مال سے لگے ہوئے تھے۔“ ۶

ہندوستان میں بچہ مزدوری کی بات کی جائے تو یہ قانوناً جرم ہے۔ کیونکہ ہندوستانی آئین کے مطابق ۶ سے ۱۴ سال تک کے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کا بنیادی حق ہے مگر جس خاندان کے مالی حالات خراب ہیں وہ اپنے بچوں سے بھی کام کروانے پر مجبور ہیں۔ ان بچوں کے کام سے گھر کی معاشی حالت بہتر ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ شہروں میں بچہ مزدور سب سے زیادہ دکھائی دیتے ہیں جو گھروں، دکانوں، کارخانوں اور فیکٹریوں میں کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی پس منظر میں ذکیہ مشہدی نے افسانہ ”گڑیا“ میں اس غریب بچی کی زندگی کو پیش کیا ہے جو گھر کی مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے اپنے گھر سے دور شہر میں ایک مالدار کے یہاں کام کرتی ہے اور ان کے دونوں بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اس کے مالک اور ان کی بیوی صبح کو اپنے آفس کے لئے نکل جاتے ہیں اور شام کو واپس آتے ہیں جس کی وجہ سے انھیں ان دونوں بچوں کی دیکھ بھال کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ذکیہ مشہدی نے اس کہانی میں یہ دکھایا ہے کہ یہ بچی شہر آ کر بہت خوش ہے کیونکہ اسے پیٹ بھر کھانا، اچھے کپڑوں کے علاوہ بچوں کے ساتھ کھیلنے کا سامان بھی مل جاتا تھا جس سے اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ لیکن اسے اس بات کا افسوس تھا کہ ان کھلونوں میں کوئی گڑیا نہیں تھی جس سے وہ اچھی طرح کھیل سکے۔ کیونکہ ایک بچی کو کھیلنے کے لئے ایک عدد گڑیا کا ہونا ضروری ہے۔ یہ بچی ایک دن مکان مالکن کے کمرے میں کام کرنے جاتی ہے تو وہاں ایک بڑی گڑیا دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہے۔ جب مکان مالکن اپنے آفس چلی جاتی ہے تو وہ دونوں بچوں کے ساتھ اس کمرے میں جا کر اس گڑیا سے کھیلتی اور پھر گڑیا کو وہیں رکھ دیتی تھیں۔ اس طرح ان کا اس گڑیا سے کھیلنے کا معمول بن گیا۔ ایک دن اس کے دل و دماغ میں یہ خیال آیا کہ میں یہاں ان کھلونوں

سے کھیل رہی ہوں اور وہاں میرے بھائی بہنوں کو کچھ بھی نصیب نہیں ہو رہا ہے۔ ذکیہ مشہدی نے اس افسانہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غریبوں کے بچوں میں بھی تعلیم حاصل کرنے اور اچھے کھلونوں سے کھیلنے کا شوق ہوتا ہے مگر یہ اپنی غربتی کی وجہ سے اس سے لاعلم ہوتے ہیں۔ یہ بچی اس فکر سے اپنے بھائی اور بہنوں کے لئے وہ گڑیا اور رنگین اے بی سی ڈی والی کتاب لے کر بھاگ جاتی ہے تاکہ میرے بھائی بہن بھی اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ بچی اس گڑیا اور رنگین کتاب کو لے کر اسٹیشن پہنچ جاتی ہے اور ہر آتی جاتی ٹرینوں کو دیکھتی رہتی ہے کہ کون سی ٹرین ہمارے گھر کی طرف جائے گی۔ افسانہ 'گڑیا' کی چند سطریں ملاحظہ ہو:

”اماں بہت لاڈ کرتی تھیں۔ سب سے زیادہ آرام انہیں کو تھا۔ ڈرتی تھیں اگر دل نہ لگایا نا آسودہ رہی تو چل دے گی۔ اب بھگتیں بلکہ سب کو بھگتوانیں۔ گاڑی لے کر نکلے۔ کیا پتہ ٹرین یا بس سے کہیں نکل گئی ہو تو کیا حشر ہوگا۔ گھر پہنچ گئی تو خیر، نہ پہنچی تو اس کے ماں باپ کو کیا منہ دکھائیں گے۔ غریب بے چارے بھر سے پرلڑکی سوئی تھی چلتے وقت رخصت کرنے کو کھڑی ماں نے میلے کچیلے آنچل سے نہ جانے کن خاموش آنسوؤں کو پونچھا تھا۔ سارے دن کی تگ و دو کے بعد اسٹیشن پر بیٹھی ملی۔ پھٹی پھٹی حیران آنکھوں کی حیرانی بکھیرتی، آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ کر یہ سمجھنے کی کوشش کرتی کہ کون سی گاڑی اس کے گاؤں جائے گی۔ ہونٹوں پر پچڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ گالوں پر آنسو خشک ہو چکے تھے۔ بغل میں گڑیا دبی ہوئی تھی اور اے بی سی ڈی والی پرائمر۔“

معاشرے میں انگریزی میڈیم اسکولوں کے بڑھتے رجحان کو دیکھتے ہوئے ہر کوئی اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم اسکول میں داخلہ دلوانا چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید سائنس نے جس طرح ترقی کے نئے راستے ہموار کئے ہیں ان میں بہت سی نئی تکنیک بھی شامل ہے جو لوگوں میں نئی سوچ کو بیدار کر رہی ہے۔ اس بیداری کا ہی اثر ہے کہ لوگ جدید دور میں انگریزی میڈیم تعلیم کو سب سے بہتر مانتے ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر دوسرے درس و تدریس کے نظام جو اس میدان میں کام کر رہے ہیں وہ سب بے کار ہوں گے اور ان کی ادبی دنیا میں کوئی حیثیت نہیں رہ جائے گی۔ لیکن اس کے برعکس بھی دوسرے میڈیم کے اسکول چلتے ہیں جہاں تعلیم و تعلم کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور بچوں کے مستقبل کو سنوارا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ایک بات عام ہے کہ جس روایت کی ایک بار شروعات ہو جاتی ہے وہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتی ہے بلکہ اس کو اور بڑھاوا دیا جاتا ہے۔ آج ان انگریزی میڈیم اسکولوں کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو اس میں پڑھانا ایک اسٹینڈرڈ سمبل سمجھنے لگے ہیں۔ ایک بات اور قابل غور ہے کہ انگریزی میڈیم اسکولوں میں بچے کے ماں باپ کو بلا کر ان کی تعلیم کے ساتھ ان کا بیک گراؤنڈ اور انکم کا بھی پتہ کیا جاتا ہے تاکہ ان سے اچھی خاصی رقم وصولی جا سکے۔ شوکت حیات اپنے

افسانہ چینی میں انگریزی میڈیم اسکولوں کی من مانی جس خوبی کے ساتھ منظر عام پر لائے ہیں اس کی روشنی میں یہی باتیں نکل کر سامنے آتی ہیں کہ آج کل لوگوں کو بس ایک ہی فکر سٹاتی ہے کہ کسی طرح بچے کا داخلہ اچھے کانونٹ میں ہو جائے۔ جب ان بچوں کا داخلہ ان کانونٹ میں ہو جاتا ہے تو یہ اپنے کو بہت خوش نصیب سمجھتے ہیں۔ مگر ان کی یہ خوشی جلد ہی غمی میں تبدیل ہو جاتی ہے جب انھیں اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ انگریزی میڈیم اسکول داخلہ کے نام پر ان سے کس طرح موٹی رقم وصول کر رہے ہیں۔ شوکت حیات نے اس افسانے میں کمزور طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی دشواریوں کو منظر عام پر لا کر یہ بتایا ہے کہ کس طرح اسکول والے دو تہندوں کے بچوں کو اپنے اسکول میں داخلہ دیتے ہیں اور کمزور طبقہ کے بچوں کو ٹسٹ میں فیل کر کے باہر کر دیتے ہیں۔ اسی کشمکش میں ایک بوڑھا باپ بھی پھنس جاتا ہے۔ اس بوڑھے باپ کو اپنے بیٹے پر پورا اعتماد تھا کہ وہ ٹسٹ میں ضرور پاس ہو جائے گا۔ لیکن جب لسٹ نکلتی ہے تو وہ بوڑھا ایک آدمی سے کہتا ہے کہ ذرا میرے بیٹے کا نام دیکھ لو وہ ضرور پاس ہو گیا ہوگا۔ اس آدمی نے جب لسٹ دیکھ کر بتایا کہ اس میں آپ کے بیٹے کا نام نہیں ہے تو وہ بوڑھا کچھ پریشان ہو گیا۔ تبھی وہ آدمی بچے کے باپ سے کہتا ہے کہ اب اپنے بچوں کو خود ہی پڑھانا پڑے گا۔ اب ان اداروں میں رکھا ہی کیا ہے۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی موجودہ تعلیمی نظام کی حقیقت اس طرح پیش کرتے ہیں:

”چینی موجودہ تعلیمی نظام پر لکھا گیا افسانہ ہے کہ کس طرح آج انگلش میڈیم اسکول میں اپنے بچوں کو پڑھانا اسٹینٹس سبیل بن چکا ہے۔ خواہ آپ میں ان اسکولوں میں پڑھانے کی سکت نہ ہو لیکن آپ اپنے بچوں کو انہی اسکولوں میں پڑھوائیں گے۔ افسانہ نگار نے بڑے خوبصورت انداز میں دکھایا ہے کہ کس طرح فیس سلیپ دیکھ کر ایک عام آدمی کی چینی نکل پڑتی ہیں۔ کس طرح وہاں کے اسٹینڈرڈ اور رکھ رکھاؤ کو مٹھین کرنے میں ان کی چینی نکل پڑتی ہے اور تو اور افسانہ نگار نے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح ایک انگریزی میڈیم اسکول میں داخل کرانے کے لیے ایڈمیشن ٹیسٹ ہوتا ہے اور منتخب طلبہ کی لسٹ دیکھتے ہوئے کس طرح بہت سے والدین اور گارجین کی چینی نکل پڑتی ہیں۔ موجودہ تعلیمی نظام پر یہ افسانہ ایک بھرپور طمانچہ ہے۔“ ۵

فرقہ وارانہ فسادات ہندوستانی معاشرے کے لیے ایسی وبا ہے جس سے پوری انسانیت متاثر نظر آتی ہے۔ اس فرقہ وارانہ تصادم میں سب سے زیادہ اقلیتوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے جس کی حیثیت جاگتی تصویر ہمیں افسانہ ”لیبارٹری“ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے اس کہانی میں گجرات سانحہ کی جو تصویر پیش کی ہے اس سے پوری انسانیت شرمسار ہو گئی ہے۔ یہ اکیسویں صدی کا پہلا فساد تھا جس میں تقریباً پانچ ہزار لوگ مارے گئے۔ اس فساد میں اقلیتوں کو پہچان پہچان کر نشانہ بنایا گیا، ان کی الماک کو نقصان پہنچایا گیا اور طبقہ خاص کو چن چن کر بے دریغ قتل کر دیا گیا۔ یہ ہندوستانی تاریخ کا ایسا فرقہ وارانہ

فساد تھا جس میں عورتوں کے ساتھ آبروریزی، حاملہ عورتوں کی کوکھ سے بچوں کو نکال کر کلڑے کلڑے کر کے انھیں آگ میں جلا دیا گیا۔ ان میں جو عورتیں اور بچیاں بچ گئی تھیں ان کے ساتھ آبروریزی کرنے کے بعد اس کے منہ میں تیزاب کے قطرے ڈال کر انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چپ کر دیا گیا۔ اسی طرح اس فساد میں مردوں اور عورتوں کے عضو تناسل کو کاٹ کر بدل دیا گیا تھا تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں کہ ایسی بھی درندگی ہو سکتی ہے۔ اس فساد میں جو بچے بچ گئے تھے انھیں فساد ہی بڑی بے دردی سے ڈھونڈ رہے تھے۔ ان کا مقصد تھا کہ یہ بچے معصوم ہیں اس لیے انھیں اپنے مذہب میں داخل کر لیا جائے گا یعنی انھیں تبدیل مذہب کر لیا جائے گا۔ لیکن ان فساد بول کو یہ بھی ڈر تھا کہ یہ بچے بہت چالاک ہوتے ہیں۔ یہ بچے موقع پاتے ہی ہم لوگوں پر حملہ کر دیں گے کیونکہ اس عمر میں بچوں میں غضب کی پھرتی ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیں ایسے بچوں کو پکڑ کر مار دینا چاہیے یا انھیں اپنے مذہب میں شامل کر لینا چاہیے۔ مشرف عالم ذوقی نے اس افسانے میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ مذہب کے نام پر کس طرح درندگی ہوتی ہے۔ اس درندگی کا ایک لیب میں پریکٹیکل ہو رہا ہو جس میں انسانوں کے جسم کو کاٹ کر اس پر تحقیق کی جاتی ہے۔ ان فرقہ وارانہ فسادات میں جو لوگ مارے گئے تھے انھیں کتے، گدھ، چیل اور کوئے نوچ کر کھا رہے تھے یعنی وہاں ایسا منظر تھا جہاں صرف لاشیں ہی لاشیں تھیں اور پورا شہر فساد میں جل رہا تھا۔ افسانہ 'لیبارٹری' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں بچے کے تبدیل مذہب کی باتیں کہی گئی ہیں:

”تو یہ سارا کچھ اس چھوٹے سے بچے کے لیے ہوا۔ اس چھوٹے سے آٹھ سالہ بچے کے لیے، جس کی آنکھیں نیلی تھیں، چہرہ خوبصورت تھا اور جس کا تعلق اقلیت سے تھا۔ تو یہ سب کچھ اس چھوٹے سے بچے کے لیے ہوا، جس کے لیے اکثریت کے بچے نے، بچاتے ہوئے اپنی جان دے دی اور جو تہذیب کی اس جنگ کے دوران جان بچانے کے لیے اپنے گھر میں ہی لاپتہ ہو گیا تھا۔ اور یقیناً ایسے بچے کو بچانا ایک اہم فریضہ تھا۔ اور جیسا کہ دانشور نے سوچا، تہذیب کے عروج کے لیے، مذہب کو ہی واحد ہتھیار کے طور پر سوچا جاسکتا ہے۔ بچے کا دھرم پر پورتن ہو جائے تو۔۔۔ اور یقیناً یہ ساری جنگ تہذیب کے لیے، تہذیب کے نام پر لڑی گئی تھی۔“ ۹

غصنف نے فرقہ وارانہ فسادات، دہشت اور نفرت کو سامنے رکھ کر تیزابی محبت، افسانہ تخلیق کیا ہے۔ اس کہانی میں ان دو بچوں اظہر الدین اور نبی کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ جو بابر می مسجد شہید ہو جانے کے بعد معاشرے میں پھیلی دہشت اور نفرت کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف اظہر الدین کے والد اسے نبی سے ملنے سے روک دیتے ہیں تو دوسری طرف نبی کے باپ اسے اظہر الدین سے دور رہنے کی تاکید کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ دونوں بچے اپنے والدین سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو ان کے والدین ایک دوسرے کو اپنا دشمن تسلیم کرتے ہیں۔ اس دشمنی کی وجہ نبی کے والد یہ بتاتے ہیں کہ مغل

بادشاہ بابر نے مندر توڑ کر مسجد بنائی تھی جسے ہندوؤں نے اب توڑ دیا ہے۔ اب اس کی جگہ دوبارہ مندر تعمیر کیا جائے گا۔ اظہر کے والد یہ بتاتے ہیں کہ قدیم دور میں یہ مسجد بابر کے سپہ سالار میر باقی نے بنوائی تھی جسے ہندوؤں نے اپنی مقدس جگہ بنا کر منہدم کر دیا ہے۔ ان دونوں کے والدین کے دلوں میں نفرت کا بیج کس نے بویا یہ تو وہ دونوں نہیں جانتے تھے۔ مگر اس نفرت سے دونوں بچوں کی زندگی میں اندھیرا چھا گیا اور یہ دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ ہندوستانی معاشرے میں اب ہندو مسلم نفرت کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جا رہا ہے جس سے ان دونوں مذاہب کے مابین نفرت کی خلیج اور زیادہ حائل ہو جائے اور ان میں جو محبت اور اخوت ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ یہ کھیل صرف اور صرف سیاست کے لیے کھیلا جا رہا ہے تاکہ آسانی سے ووٹوں کی تقسیم ہو جائے۔ اس تقسیم سے مذہب کے نام پر سیاست کرنے والے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اس گندی سیاست کی بھیٹ آنے والی نسلوں کو چڑھایا جا رہا ہے کیونکہ جب بچپن سے ہی ان معصوموں کے دلوں میں اس طرح کی نفرت کے بیج بوئے جائیں تاکہ وہ بڑے ہو کر دوسرے مذاہب سے نفرت کرنے لگیں۔ غضنفر نے اس کہانی کے ذریعہ ہندوستانی سماج کی اس حقیقت کو منظر عام پر لانا چاہتے ہیں جو سیاست کی بھیٹ چڑھ گئی ہے۔ اسی سیاست کی وجہ سے اب معاشرے میں بچوں کے اندر بھی نفرت کا زہر بویا جا رہا ہے جو ان سب باتوں سے انجان تھے۔ سیاست کی اس نفرت کو بٹی اور اظہر الدین کی محبت نے ہر دیا۔ افسانہ 'تیزابی محبت' کی چند سطر میں ملاحظہ ہوں:

”اس کے پتا کے چہرے کی لکیریں گہری ہو گئیں اور انھوں نے زخم سے پٹی نوچ کر الگ کر دی جیسے بٹی کے سر پر پٹی نہیں بلکہ کوئی سانپ لیٹا ہو۔ رکا ہوا خون پھر سے جاری ہو گیا۔“

”یہ کیا کیا؟ بٹی حیران ہو کر پتا کی طرف دیکھنے لگا۔“

”اس میں زہر ہو سکتا ہے بیٹے؟“

”زہر؟ بٹی کی حیرانی اور بڑھ گئی۔“

”تم دشمن کی گھات کو نہیں سمجھ سکتے بیٹے۔ چلو تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتا ہوں۔ بٹی کے پتا بٹی کو لے کر اپنے فیملی ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئے۔“

پرانی پٹی کو ڈاکٹر کے ڈسٹ بین سے بٹی نے اٹھالیا۔ اس کی نگاہیں پٹی کو غور سے

دیکھنے لگیں۔ پٹی کے دونوں سروں پر محبتیں بندھی تھیں۔ ایک سرے پر وہ محبت

تھی جس نے اس کے اندر ٹھنڈک پہنچائی تھی اور دوسری طرف وہ محبت تھی جس

نے اسے تیزابی کیفیت سے دو چار کر دیا تھا۔“ ۱۰

شہروں کی جگہ گاتی روشنی اور وہاں کے طور طریقوں سے ہر خاص و عام اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ مگر وہاں کی زندگی سے ہر کوئی اچھی طرح آگاہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کم ہی لوگ ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان میں وہ خلوص و محبت دیکھنے کو نہیں ملتی جیسی گاؤں میں دیکھنے

کولمبی ہے۔ اسی شہری فضا کو موضوع بنا کر ترنم ریاض نے ’شہر جیسا آفاقی افسانہ تخلیق کیا۔ اس افسانے میں انھوں نے اس حادثے کو بیان کیا ہے جس کی داستان سن کر ہر خاص و عام میں ایک طرح کی بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ پوری کہانی ان دو بچوں سونو اور ثوبیہ کے ارد گرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے جو اپنی چودہ منزلہ عمارت میں بند ہیں۔ سونو کے والد امان جب اپنے آفس کے کام سے شہر سے باہر جاتے ہیں تو اپنی بیوی برابر اسے کہہ جاتے ہیں کہ میں ایک روز بعد آؤں گا۔ لیکن جب کام پورا نہیں ہو پاتا تو وہ ایک روز اور رک جاتا ہے۔ اس طرح سونو کے والد امان وہاں کئی روز ٹھہر جاتے ہیں۔ باہر ادھر اپنے دونوں بچوں کے ساتھ رات کو گھر میں سوئی تھی تو اچانک اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں بچے اس کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ماں کیوں اتنا سو رہی ہے۔ ان کی یہ فکر تھی کہ آخر ماں آج کیوں نہیں اٹھ رہی ہیں اور گھر کا دروازہ بھی بند ہے۔ ادھر امان اپنے افسر و کرم بھسین کو فون کر کے کہتا ہے کہ میں آج نہیں آؤں گا اور آپ میری بیوی برابر کو یہ بات بتا دیں۔ و کرم بھسین تب اپنی نوکرائی کو امان کے کمرے پر بھیجتا تھا اور کہتا تھا کہ برابر اسے کہہ دینا کہ آج امان نہیں آئے گا۔ وہ نوکرائی جب امان کے کمرے کی گھنٹی بجاتی تھی تو اندر سے کوئی جواب نہ پا کر واپس چلی جاتی تھی۔ فون والا یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہا۔ امان کے گھر کی گھنٹی جب بجتی تو سونو دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا تھا لیکن وہ کھل نہیں پاتا تھا۔ سونو بار کر اپنی ماں کے پاس چلا جاتا تھا اور کہتا تھا کہ اٹھو دیکھو کوئی دروازہ کھلوا رہا ہے مگر وہ کوئی جواب نہ دیتی تھی۔ ثوبیہ کو جب بھوک لگتی تھی تو سونو فرج سے دودھ اور سیب نکال کر ثوبیہ کو دیتا اور خود بھی کھا لیتا تھا۔ مگر جب وہ بھی ختم ہو گیا تو یہ دونوں بچے بسکٹ اور پانی پر زندہ رہے۔ ترنم ریاض نے اس کہانی کو اتنا پیچیدہ بنا دیا ہے کہ ہر کوئی اس کشمکش میں مبتلا ہے کہ آخر یہ دونوں بچے اپنی ماں کی موت کے بعد اس گھر میں چار دن یا اس سے زیادہ روز تک کیسے زندہ رہے۔ افسانہ نگار نے یہاں قاری کو اس تجسس میں ڈال دیا ہے کہ پھر ان دونوں بچوں کا کیا ہوا۔ پروفیسر ابولکلام قاسمی افسانہ ’شہر‘ کے بارے میں اپنے خیالات و نظریات کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

”ان کی ایک مشہور کہانی ’شہر‘ بھی ہے، جس کے بارے میں ان کے اپنے خیالات بہت بلند معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے پیش لفظ سے ہوتا ہے۔ اس کہانی میں چودھویں منزل کے ایک فلیٹ اور اس نو وارد ایک ماں اور دو چھوٹے چھوٹے بچوں کی اذیت ناک صورت حال کو یوں تو بعض واقعاتی جواز کے ساتھ پیش کیا گیا ہے مگر کہانی کے ابتدائی حصے میں ہی بغیر کسی معقول وجہ کے ماں کی موت اور بچوں کی بے بسی کا جس طرح نقشہ کھینچا گیا ہے، اس نے راوی کو خاصا بے رحم بنا دیا ہے۔ فنی طور پر زندگی کے بے رحم پہلوؤں کی پیش کش اگر ترنم اور ترس کے ساتھ نہ ہو تو اس سے میلوڈرامائیت پیدا ہوتی ہے۔ شاید اسی باعث یہ کہانی بھی میلوڈرامائیت کے قریب پہنچ گئی ہے۔“

طارق چھتری نے ہندوستانی معاشرے میں بڑھتی نفرت کو موضوع بنا کر افسانہ ”لکیر“ قلم

بند کیا۔ یہ افسانہ اس ماحول کی نمائندگی کرتا ہے جہاں دندناہب کے لوگ ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ ان دونوں مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے کے تیوہاروں میں برابر شریک ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان میں اتحاد و اتفاق دیکھنے کو ملتا۔ اسی اتحاد کا ہی نتیجہ ہے کہ حمید اور کسم ایک دوسرے کے گھر جا کر دونوں تیوہاروں کو مناتے ہیں۔ حمید کا زیادہ وقت پنڈت برج کشور کے گھر گزرتا ہے۔ یہ اس لیے وہاں جاتا ہے کہ کرشن کی طرح بانسری بجا سکے اور ان کے جیسی نفل کر سکے۔ اس کی بچپن سے ہی خواہش تھی کہ جنم آشتی کے موقع پر کرشن بھگوان کی لیلہ کروں۔ پنڈت برج کشور حمید کو کرشن کا اوتا ر سمجھ کر اسی کو جنم آشتی پر کرشن کنہیا بنانے کا فیصلہ کرتے ہیں مگر ان کے اس عمل سے کچھ لوگ ناراض ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک مسلم بچہ کیسے کرشن کنہیا بن سکتا ہے۔ اس پر پنڈت برج کشور کہتے ہیں کہ بچے بھگوان کا روپ ہوتے ہیں اور ان میں کسی مذہب کا رنگ نہیں ہوتا ہے۔ پنڈت برج کے اس فیصلہ سے کچھ لوگ ناراض ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ آپ نے غلط کیا ہے اور اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ ان لوگوں کی باتوں کو پنڈت برج کشور کے ساتھ سیٹھ ڈوگرمل اور راما نند زیادہ ترجیح نہیں دیتے ہیں۔ کرشن کنہیا کی سواری دو پہر میں بڑی دھوم دھام سے نکلتی ہے اور چاروں طرف گھومنے کے بعد جب شام کو مسجد کے پاس پہنچتی ہے تو وہاں لاؤڈ اسپیکر کی آواز اور بلند کر دی جاتی ہے جس سے لوگ اور جو شیلے ہو جاتے ہیں۔ اسی تیز آواز کے بیچ مسجد کی طرف سے ایک اینٹ حمید کو آ کر لگ جاتی ہے اور اس کے ماتھے سے خون بہنے لگتا ہے جس کے سبب پوری فضا میں شور غل مچنے لگتا ہے۔ انھیں شور غل کے بیچ پنڈت برج کشور کا خیال حمید کی طرف جاتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ ایک تعصب پسند انسان حمید کو پھر سے مارنے کی کوشش کرتا ہے۔ پنڈت برج کشور کہتے ہیں کہ وہ کرشن کنہیا بھگوان ہیں۔ اس کو مت مارو لیکن وہ انسان ان کی بات نہیں مانتا ہے اور حمید کو قتل کر دیتا ہے۔ طارق چھتاری نے اس کہانی کے ذریعہ اس ہندوستان کی عکاسی کی ہے جہاں اب نفرت کی خلیج دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ اس نفرت کے بیچ کوئی یہ نہیں بتا پایا کہ یہ لکیر کس کی ہے اور کون اس میں زیادہ آگے ہے اور کون کم۔ افسانہ ”لکیر“ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں حمید جیسے کتنے معصوم اس فرقہ وارانہ تصادم کا شکار ہو جاتے ہیں جو اس نفرت کا اے۔ بی۔ سی۔ ڈی تک نہیں جانتے ہیں:

”پنڈت برج کشور کے منہ سے کانپتی ہوئی آواز نکلی۔ ”یہ کیا۔۔۔ یہ تو کرشن بھگوان ہیں۔۔۔ کنہیا۔۔۔ ہمرے کنہیا۔“ ہر پرساد جس نے ابھی ابھی آرتی گائی تھی، بھرائی ہوئی آواز میں مسمسا اٹھا۔ ”ناہیں۔۔۔ یہ حمید ہے۔ فقیر محمد کا لڑکا۔“ ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں۔ ”ہاں یہ حمید ہے، ایک مسلمان کا لڑکا۔ ہمارے کرشن بھگوان کا اپنا کیا ہے انہوں نے۔ ڈولے پرائنٹ پھینکی۔۔۔ بھگوان کے ماتھے سے خون بہا۔ اور اب دروازے بند کر کے گھروں میں چھپ گئے ہیں۔“ ڈولے پر کھڑا شخص پھر سا ہوا میں اٹھاتے ہوئے دہاڑا۔

”ہم اس کا بدلہ لیں گے۔ ہم آج اسے۔۔۔“

”نہیں۔“ پنڈت برج کشور چیخے اور اس کے ہاتھ سے پھر سا چھیننے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر اس شخص نے پنڈت جی کو زور سے دھکا دے کر ڈولے سے نیچے ڈھکیل دیا اور پھر جمید کے سر پر پھر سے ایک بھر پور وار کر دیا۔ مکٹ، کا چھنی اور نیچتی مال پہنے کرشن بھگوان ڈولے سے نیچے لڑھک پڑے اور دھرتی پر خون کی ایک لکیر بہت دور تک پھیلتی چلی گئی۔ کچھ لوگ لکیر کے ادھر تھے اور کچھ ادھر۔ دونوں طرف شور تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ لکیر کے ادھر زیادہ شور ہے یا ادھر۔!“ ۱۲

اردو ادب میں بانو سرتاج نے بچوں کے مسائل پر کئی کتابیں تخلیق کیں ہیں جن میں ”ادب اطفال ایک مطالعہ“ سب سے اہم ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں بچوں کے مسائل پر کھل کر بات کرتی ہیں جس سے کہ ان زندگی میں خوشیاں آجائیں۔ اسی پس منظر میں افسانہ ”بے زمینی کا درد“ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کہانی میں ایک طرف بین المذاہب شادی کا ذکر ملتا ہے تو دوسری طرف ایک بچی کو والدین کا مذہب اور ان کا پیار نصیب نہیں ہو پاتا۔ اسی کشمکش میں تارا اپنے والدین سے سوالات کرتی رہتی ہے اور اس تذبذب میں رہتی ہے کہ آخر میں کس مذہب کی طرف جاؤں۔ جہاں ایک طرف میری ماں ہندو اور دوسری طرف میرے والد مسلمان اور ان دونوں کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ یہ لوگ ہولی، دیوالی، عید، بقر عید کے ساتھ سبھی تیو ہار مناتے ہیں۔ لیکن ان کا جھکاؤ کس مذہب کی طرف ہے وہ یہ سمجھ نہیں پاتی۔ تارا اپنے والدین سے سوال کرتی ہے کہ آپ لوگ کس مذہب کو مانتے ہیں جس کو دیکھ کر میں بھی اس مذہب کی طرف مائل ہو جاؤں۔ اس سوال سے تارا کے والدین میں ایک بے چینی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ تارا سے پوچھتے ہیں کہ تمہیں کسی نے کچھ کہا ہے یا کسی نے تمہارے دل میں مذہب کی باتیں بھر دیں ہیں۔ ان سوالوں کو سننے کے بعد تارا کہتی ہے کہ آسیہ کے گھر کے سبھی لوگ اعلیٰ تعلیم کے باوجود اپنے مذہب کو مانتے ہیں اور اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ اسی طرح وندنا کے گھر والے گنتی بپا کی پوجا کرتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ میں جب امتحان دے کر نکل رہی تھی تو آسیہ خدا کا شکر ادا کر رہی تھی تو وہیں وندنا گنتی بپا کا شکر ادا کر رہی تھی۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس خدا کا شکر ادا کروں۔ کیونکہ میں تو ترشنگو میں پھنسی ہوئی ہوں اور میرے والدین تو سبھی مذاہب کو مانتے ہیں۔ تارا کی ان باتوں سے اس کے والدین سہیل خاں اور سیما پانڈے اس کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہم نے شادی کے وقت یہ طے نہیں کیا تھا کہ اپنے بچوں کا کون سا مذہب ہوگا اور وہ کس مذہب کو اپنائیں گے۔ سائنس کے اس ترقی یافتہ دور میں آج کل ہر کوئی اتنا مصروف ہے کہ وہ اپنے بچوں کو وقت نہیں دے پا رہے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس اپنے کاموں سے فرصت نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بچے والدین کے پیار سے محروم ہوتے جا رہے ہیں اور ان میں اپنے والدین کی وہ قدر نہیں رہ پاتی جس کی وہ تمنا کرتے ہیں۔ افسانہ ”بے زمینی کا درد“ کی چند سطریں ملاحظہ ہو:

”سیمہا کے صبر کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ چلائی ”تم یہ کیا بکواس کیے جا رہی ہو؟ ہم نے تمہارا ہر طرح خیال رکھا ہے۔ ہم نے ہر وہ عمدہ چیز جو ہمارے بس میں تھیں وہ تمہیں دی ہے۔۔۔“

”نہیں ماما۔۔۔ نہیں۔“ تارا اچانک پھوٹ پڑی۔۔۔ کوئی غلط دعویٰ نہ کیجیے۔ مجھے آپ لوگوں کی طرف سے کوئی خدا، کوئی گاڈ نہیں ملا۔ اخلاقیات کے وہ اسباق نہیں ملے جو ماں کے دودھ کے ساتھ جسم کی رگوں میں خون بن کر دوڑتے ہیں۔ وہ ماحول نہیں ملا جہاں مجھے خدا یا بھگوان کا خوف دکھا کر جھوٹ بولنے، نافرمانی کرنے، غلط سلوک کرنے یا برائی کرنے سے روکا جاتا یا تمام نعمتوں کے حاصل کرنے پر شکر ادا کرنے کے لیے سکھایا جاتا۔“ ۱۳

ہندوستانی سماج میں پسماندوں اور حاشیے پر کھڑے انسانوں کی زندگی اجیرن بھری ہے۔ اس بد حالی کی وجہ یہ ہے کہ انہیں اپنے خاندان کا پیٹ بھرنے کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اگر یہ پسماندہ اور غریب طبقہ محنت و مشقت نہیں کریں گے تو انہیں در در کی ٹھوکروں سے دوچار ہونا پڑے گا اور ان کی زندگی اجیرن بن جائے گی۔ انہیں پسماندوں اور حاشیائی طبقوں میں وہ انسان بھی شامل ہوتے ہیں۔ جو رکشا چلا کر یا کوڑا کرکٹ چن کر اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ ان کے اس جتن سے ان کے بچوں کی پرورش ٹھیک سے نہیں ہو پاتی ہے یا ان کے بچے کوڑا کرکٹ بین کر اپنا اور اپنے ماں باپ کا پیٹ بھرتے ہیں۔ احمد صغیر نے انہیں پسماندوں اور حاشیائی انسانوں کے ساتھ ان بچوں کی زندگی کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ جنہیں دو وقت کی روٹی بھی صحیح وقت پر میسر نہیں ہو پاتی ہے۔ اسی کشمکش بھری زندگی کی نمائندگی ان کا افسانہ ”لعفن“ کر رہا ہے۔ اس افسانے میں منوا کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے جو بہت ہی غریب ہے اور کوڑا چننے کا کام کرتا ہے۔ منوا کوڑا کرکٹ چننے کے بعد اس کو کباڑی کے وہاں بیچتا ہے۔ اس سے جو پیسہ ملتا ہے اس سے شام کو اس کے گھر کھانا بنتا ہے۔ منوا کے باپ رکشہ چلاتے ہیں اس سے جو کمائی ہوتی ہے اس کا آدھا شراب میں خرچ ہو جاتا ہے۔ جو پیسہ بچتا ہے اس سے منوا کی ماں کی دوائتے ہیں اور باقی جھوپڑی کے کرایہ میں دے دیتے ہیں۔ اس طرح یہ دونوں جدوجہد کر کے کچھ پیسہ کماتے ہیں۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ جب منوا کوڑا چننے کے لیے اپنے علاقے سے ہٹ کر دوسرے علاقے میں پہنچتا ہے تو اسے وہاں زیادہ کباڑ ملتا ہے۔ اسی علاقے میں مسز مکانی بھی رہتی تھیں۔ وہ منوا کوڑا چننے ہوئے دیکھتی ہیں تو افسوس کرتی ہیں اور سوچتی ہیں کہ اتنا چھوٹا بچہ پڑھائی کی جگہ کوڑا چن رہا ہے۔ منوا کی اس غریبی پر وہ ملال کرتی ہیں اور پاس بلا کر کھانا کھلاتی ہیں۔ مسز مکانی کے اندر اس لیے متاجاگ جاتی ہے کہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ منوا یہیں رہے۔ ایک دن وہ منوا کو نہلا کر نئے کپڑے پہناتی ہیں اور اس کو پرنیوم بھی لگاتی ہیں۔ مسز مکانی کی خواہش ہوتی ہے کہ میں منوا کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاؤں۔ وہ جیسے ہی اپنے ہاتھ کو آگے کرتی ہیں منوا چکر اکر نیچے گر جاتا ہے اور بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اس کے بے ہوش ہونے کی وجہ

یہ ہے کہ وہ زیادہ خوشبو کو برداشت نہیں کر پاتا کیونکہ اسے بچپن سے ہی گندگی، کچرے کی سڑاند اور لعفن میں رہنے کی عادت تھی۔ احمد صغیر نے یہاں منوا کے جیسے لاکھوں بچوں کی زندگی کو سامنے لا کر ان کی حقیقی زندگی کو پیش کیا ہے جو اسی ماحول میں زندگی جینے کو مجبور ہیں یا اسی ماحول میں پیدا ہو کر وہیں مر جاتے ہیں۔ افسانہ ’لعفن‘ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو منوا کے گھر کی بد حالی کو بیان کرتا ہے:

”یوں تو دن بھر اس کوڑے سے لعفن کے جھونکے اٹھتے رہتے تھے لیکن شام ہوتے ہوتے اس کی بدبو میں مزید اضافہ ہو جاتا مگر منوا کی زندگی میں ان بدبوؤں کو سونگھتے رہنے اور کچرا سینے کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ شام ہوتے ہوتے اس کا بوسیدہ بورا کچرے سے بھر جاتا۔ گندی بوتلیں، استعمال شدہ پولوٹھین، ٹین کے ڈبے، شیشے کے ٹکڑے اور مختلف بظاہر بے کار چیزوں سے اس کا بورا بھاری نظر آنے لگتا۔ تب وہ سیدھا کباڑی کی دکان پر پہنچتا۔ اسے فروخت کرتا اور پیسے لے کر گھر کی طرف چل پڑتا۔ ماں اس کے انتظار میں بیٹھی رہتی کہ کب وہ پیسے لے کر آئے کہ چولہا گرم ہو۔ منوا بورا کو ایک طرف ڈال کر بیٹے کی دکان پر پہنچ جاتا، آدھا کیلو آٹا، سو گرام دال، ۵۰ گرام تیل، نمک، مرچ اور ہلدی لا کر ماں کو پکڑا دیتا۔ ٹی۔ بی زدہ ماں دن بھر چن کر لائی ہوئی لکڑیوں سے چولہا گرم کرتی اور تو اس پر ڈال دیتی۔“ ۱۴

درس و تدریس کا انسانی زندگی سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ اس کے بغیر انسان نامکمل اور ادھورا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ تعلیم و تعلم سے انسانوں میں نئی بیداری پیدا ہوتی ہے جو اسے منزل مقصود تک لے جاتی ہے۔ انھیں درس و تدریس کی وجہ سے ان کی زندگی میں خوشیاں آتی ہیں جس سے ان میں تلاش و جستجو کی نئی فکر پیدا ہوتی ہے۔ یہ انھیں تلاش و جستجو، فکر اور تحقیق سے دنیا میں نئی تبدیلی لاتے ہیں جس سے کہ آنے والی نسلیں اس سے مستفید ہو سکیں۔ مگر آج کل جس قدر درس و تدریس کا دائرہ بڑھتا جا رہا ہے اس سے معصوموں کی پیٹھ پر بوجھ بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ سارے بوجھ جدید تعلیم کی وجہ سے ہی ان کے کندھوں پر ہیں۔ آج ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا جو نظام ہے وہ دن بہ دن تیزی سے اپنا دائرہ بڑھاتا جا رہا ہے۔ انھیں سارے مسائل کی نمائندگی دیکھ بدکی کا افسانہ ”بستے کا بوجھ“ کرتا ہو دکھائی دے رہا ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ان معصوم بچوں کی زندگی کو پیش کیا ہے جو اپنے بستے کے بوجھ کی وجہ سے پریشانی میں رہتے ہیں۔ یہ پوری کہانی شائستہ کے ساتھ اس کے والدین کے ارد گرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ شائستہ جب چھوٹی تھی تو انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کے والد اپنے کام میں اتنے مشغول رہتے تھے کہ انھیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ شائستہ کس درجہ میں پڑھتی ہے۔ شائستہ کے اسکول کی ساری فیس اس کی والدہ ادا کرتی تھیں۔ ایک دن شائستہ کے والدین اس سے ملنے اس کے اسکول جاتے ہیں اور اس کو ساتھ لے کر گھر آتے ہیں۔ شائستہ جب اسکول سے باہر نکلتی ہے تو اپنا بیگ اپنے والد کو دے دیتی

ہے۔ اس کے والد جب اس کا بیگ اٹھاتے ہیں تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ یہ کتنا وزنی ہے۔ وہ اس بیگ کو ایک کندھے سے دوسرے کندھوں پر بدلتے ہیں۔ جب یہ سب گھر پہنچتے ہیں تو شائستہ کے والد اس سے سوال کرتے ہیں کہ اس بیگ میں کیا کیا ہے۔ اس پر شائستہ کہتی ہے کہ اسکول کی کاپی اور کتاب ہے۔ وہ تب سوچتے ہیں کہ اتنی کم عمر میں یہ بچے کیسے اتنا وزنی بیگ اٹھا کر روزانہ اسکول آتے جاتے ہیں۔ شائستہ بنیادی تعلیم سے فارغ ہو کر اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی چلی جاتی ہے اور وہیں پارٹ ٹائم ایک ریسٹورنٹ میں کام کرتی ہے جس سے اس کا کچھ خرچ نکل جاتا ہے۔ شائستہ جب نوکری پاتی ہے تو وہیں کاشف کے ساتھ لوآن ریلیشن شپ میں رہنے لگتی ہے۔ جب ان کے والدین کو اس بات کا علم ہوتا ہے تو وہ دونوں کی شادی کر دیتے ہیں۔ شائستہ شادی کے بعد جرمنی میں رہنے لگتی ہے۔ اس کے بعد ان کے والدین کو احساس ہوتا ہے کہ اب ہم دونوں کا بوجھ کون اٹھائے گا۔ افسانہ ”بستے کا بوجھ“ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں شائستہ کے والد اس سے بیگ کے بارے میں بات کرتے ہیں:

”گھر پہنچ کر میں نے بیٹی کا اسکول بیگ کھول کر دیکھ لیا۔ نويس جماعت میں کتنی ساری کتابیں بیگ میں ٹھونس رکھی تھیں۔ پوچھا تو اس نے درجن بھر مضامین کے نام گنوا دیے۔

”کیا تم ہر روز یہ سب مضامین پڑھتے ہو؟ اور پھر یہ دودو کا پیاں کس لیے؟“ میں سوال کیا۔

”ڈیڈی۔ ایک کلاس ورک کے لیے اور دوسری ہوم ورک کے لیے۔ میڈیم کا آرڈر ہے کہ ہر روز سبھی کتابیں اور کاپیاں لایا کرو۔“ شائستہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے باپ کو آج کیا ہو گیا ہے کہ طرح طرح کے سوال کیے جا رہے ہیں۔ پہلے تو انہیں یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ میں کس جماعت میں پڑھتی ہوں۔

”اللہ رحم!۔۔۔ ان بچوں پر رحم کر لے۔“ میرے دل سے دعا نکلی۔ ”یہ نسل تو کتابوں کے بوجھ تلے دب چکی ہے۔ کھیل کود اور سرور و تفریح کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تھوڑا بہت وقت مل بھی گیا تو بند کمروں میں بیٹھ کر کمپیوٹر اور ویڈیو گیمز کھیلنے لگ جاتے ہیں۔“ ۱۵

عصر حاضر میں جس تیز رفتاری سے سائنس ترقی کرتی جا رہی ہے اس سے ہر کوئی فیضیاب بھی ہوتا جا رہا ہے۔ سائنس کے اس دور میں جہاں ہر طرف ترقی ہو رہی ہے وہیں سماجی زندگی کے تانے بانے میں تیزی سے الجھاؤ بھی دیکھنے کو مل رہا ہے۔ اس کا تعلق کہیں نہ کہیں انسانیت سے جڑا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ یہ سارے مسائل بعض موقعوں پر الگ الگ طرح سے دکھائی دے رہے ہیں۔ ان میں کچھ کا رشتہ غربی، مفلسی اور دشواری سے ہے تو کچھ کا تعلق اونچے نیچے، خانگی ملازم، طوفان میں اپنوں سے بچھڑنے کا غم، شہروں میں گھر کی پریشانی، معصوم بچوں کی دیکھ بھال کرتی معصوم بچی، انگریزی میڈیم اسکولوں کی من

مانی، فرقہ وارانہ تصادم میں بچوں کا قتل عام، سیاست کے کھیل میں قومی یکجہتی کا بکھراؤ، شہروں کی جگہ گاتی روشنی میں دم توڑتی معصومیت، سڑکوں پر بھیک مانگتے بچوں کی درد بھری داستان، معاشرے میں بڑھتی نفرت سے معصوم کا قتل، مشترکہ تہذیب میں مذہب کی درکار، کوڑا کرکٹ چلتا معصوم اور بستے کے بوجھ سے جدوجہد کرتی معصومیت شامل ہے۔ یہ سارے ایسے مسائل ہیں جنہوں نے پورے معاشرے کو بڑی حد تک یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہم کس طرح کے سماج میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں ان معصوموں کو اپنوں کے ساتھ خود سے جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے۔ اگر یہ معصوم بچے جدوجہد نہیں کریں گے تو انہیں دوسرے مقام پر دشوار یوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسی لیے یہ معصوم وقت کے ساتھ اپنے آپ کو بھی مضبوط کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ جس سے کہ ان کی زندگی میں نئی بہار آجائے اور انہیں سماج میں ایک بلند مرتبہ مل سکے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ معصوم بچے آنے والے کل کی نمائندگی کریں گے اور معاشرے کو ایک نئی پرواز دیں گے۔



حواشی

۱۔ تدریس کے عصری تقاضے (زبان کی تدریس کے حوالے) محمد فاروق انصاری۔ گولڈن گرافک اینڈ پرنٹرز۔ دہلی۔

۲۰۰۳ء۔ ص۔ ۳۵، ۳۶

۲۔ نیا افسانہ مسائل اور میلانات۔ ترتیب: پروفیسر قمر رئیس۔ اردو اکادمی۔ دہلی۔ ۲۰۱۰ء۔ ص۔ ۹۸

۳۔ طاؤس چین کی مینا۔ نیر مسعود۔ عریضہ پبلی کیشنز۔ دہلی۔ ۲۰۱۳ء۔ ص۔ ۲۲۱

۴۔ شکستہ بتوں کے درمیان۔ سلام بن رزاق۔ عقیف پرنٹرز۔ دہلی۔ ۲۰۱۰ء۔ ص۔ ۷۷

۵۔ اردو فکشن کے مضمرات، ابوالکلام قاسمی، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء، ص: ۲۱۸

۶۔ بند راستے، ابن کنول، فائن آف سیٹ ورکس۔ دہلی۔ ۲۰۰۰ء۔ ص۔ ۵۸، ۵۷

۷۔ آنکھن دیکھی، ذکیہ مشہدی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص: ۴۵، ۴۴

۸۔ گنبد کے کبوتر۔ شوکت حیات۔ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس۔ دہلی۔ ۲۰۱۰ء۔ ص۔ ۲۹

۹۔ نفرت کے دنوں میں۔ مشرف عالم ذوقی۔ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس۔ دہلی۔ ۲۰۱۳ء۔ ص۔ ۲۷۱

۱۰۔ حیرت فروش۔ غضنفر۔ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس۔ دہلی۔ ۲۰۰۶ء۔ ص۔ ۱۸۹

۱۱۔ اردو فکشن کے مضمرات، ابوالکلام قاسمی، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء، ص: ۲۱۸

۱۲۔ باغ کا دروازہ۔ طارق چغتاری۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ۔ ۲۰۰۱ء۔ ص۔ ۹۵

۱۳۔ بے زبانی کا درد۔ بانو سرتاج۔ ابوان اردو۔ جلد ۲۶، شمارہ: ۱۔ مئی۔ ۲۰۱۲ء۔ ص۔ ۲۸

۱۴۔ درمیاں کوئی تو ہے۔ احمد صغیر۔ تریبلی۔ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی۔ ۲۰۰۷ء۔ ص۔ ۱۸، ۱۷

۱۵۔ روح کا کرب۔ دیک بدکی۔ میزان پبلشرز۔ سرینگر۔ کشمیر۔ ۲۰۱۵ء۔ ص۔ ۲۹

اطفالی نظمیں اور یونس غازی

قصے کہانیوں کے حوالے سے ہندوستان کو اولیت حاصل ہے۔ ہندوستان میں ادب کے قارئین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قدیم زمانے سے ہی ہمارے گھروں کے بزرگ بچوں کو کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ہماری نانی، نانا، دادا اور دادی رات کے آخری پہر تک بچوں کو کہانیاں سنا کر سلا یا کرتی ہیں اور یہ بچے کہانیوں میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ کبھی خوف کھاتے ہیں، کبھی مسکراتے ہیں اور کبھی دیر تک مسکراہٹ ان کے لبوں پر قائم رہتی ہے۔ یہ بچے کہانیاں سنتے سنتے بڑے ہوئے ہیں اور اپنے بزرگوں کی کہانیوں میں ملنے والی تہذیب، تاریخ کو یاد کر کے ملک میں تہذیب و تاریخ کو عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ملک میں محبت اور تہذیب کو عام کرنا، نفرت کو دور کرنا، حب الوطنی کے جذبے سے ملک کی ترقی میں فروغ دینا ان کا فرض بن جاتا ہے۔ ان بچوں کی نشوونما کے فروغ کے لیے ہمارے افسانہ نگار اور شاعر اپنی تخلیقات پیش کرتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بچوں کا ادب وہی تخلیق کر سکتا ہے جو خود تعلیم و تربیت یافتہ ہو۔ بچوں کی نفسیات سے واقف ہو، تخلیقی صلاحیت رکھتا ہو۔ ان تمام خصوصیات کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کو بچوں کا ادب تخلیق کرتے وقت خود بچہ بننا پڑتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ بچوں کا ادب تخلیق کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کام کے لیے تجربہ، مشاہدہ، بچوں کی نفسیات سے واقفیت، زبان پر قدرت کا ہونا ضروری ہے۔ اکثر ہمارے ناقدین یہ شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ بچوں کے ادب پر کم لکھا گیا ہے یا بچوں کے ادب پر ہمارے اکثر ادبا، شعرا اور ناقدین اپنی توجہ مرکوز نہیں کرتے، یہ غلط ہے۔ حضرت امیر خسرو سے آج تک ہمارے ادبا و شعرا اور دیگر تخلیق کاروں نے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب پر بھی توجہ دی ہے۔ حضرت امیر خسرو کی پہیلیوں، مکرئیوں، دوہوں، گیتوں میں بچوں کا ادب بھی شامل ہے۔ حالانکہ امیر خسرو کے کلام میں خاص کر بچوں کے لیے کوئی خاص درس نہیں ملتا لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کے کلام میں کہیں کہیں بچوں کے ادب کے نمونے نظر آتے ہیں۔ میر تقی میر اور نظیر اکبر آبادی نے بچوں کے لیے کافی نظمیں لکھیں۔ میر تقی میر کی مثنویوں میں بچوں کا ادب بھی ملتا ہے۔ ریچھ کا تماشا، بندر کا تماشا، بننے کی دوکان وغیرہ کو ادب اطفال کا حصہ کہا جاسکتا ہے۔ بچوں کے ادب کے تعلق سے نظیر اکبر آبادی کی نظمیں گلہری کا بچہ، ریچھ کا بچہ، ہرن کا بچہ، روٹی نامہ، بخارہ نامہ، برسات، جاڑا، گرمی وغیرہ بڑی اہم ہیں۔ ان نظموں میں بچوں کی نفسیات، انسانی جذبات و احساسات کی نمائندگی ملتی ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں بہت سی ایسی کتابیں تخلیق یا ترجمہ ہوئیں جو بچوں کے لیے کارآمد ثابت ہوئیں۔ میرامن کی باغ و بہار آج اسکول، وکالجز کے نصاب میں شامل ہیں اور کافی تعداد میں طالب علم اس کا مطالعہ کر کے قدیم زمانے کی تہذیب و تمدن سے واقف ہوتے ہیں۔ ادب اطفال کی تاریخ میں مولانا اسماعیل میرٹھی کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، مولانا محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے بچوں کے ادب کے حوالے سے تاریخی کارنامے انجام دیے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی اور افسر میرٹھی نے بچوں کی نفسیات، جذبات و احساسات کو محسوس کرتے ہوئے نظمیں لکھیں۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کی نظمیں ہماری گائے، جگنو اور بچہ، اسلم کی بلی برسات وغیرہ نظمیں لکھیں۔ شعرا اور ادبا کے علاوہ بہت سے رسائل و جرائد اور کتب نے ادب اطفال میں کاربائے نمایاں انجام دیے۔ بہت سے افسانہ نگاروں نے بچوں کے لیے خوبصورت کہانیاں لکھیں، شعرا نے نظمیں لکھیں، اخبارات نے بچوں کے ادب پر گوشے شائع کیے ساتھ ہی بہت سی تحریکوں، انجمنوں اور اکیڈمیوں نے بچوں کے ادب پر خوب لکھا۔ عہد حاضر میں بھی بہت سی اکیڈمیاں بچوں کی تعلیم و تربیت اور نشوونما میں اپنا اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ کتابوں کا شائع کرانا، کتابوں پر ایوارڈ دینا، اشاعت کے لیے مالی تعاون دینا وغیرہ ایسے کام ہیں جن سے بچوں کے ادب کو فروغ ملا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، پیارے لال آشوب وغیرہ نے ادب اطفال پر کتابیں، مضامین، نظمیں تحریر کی ہیں۔ حالی کی نظموں میں نیک بنو، میں بہادر بنوں گا، لاڈلا بیٹا، مرغی اور اس کے بچے، شیر کا بچہ وغیرہ بڑی مقبول ہیں۔ ان نظموں میں بچوں کی دلچسپی اور ذوق و شوق نظر آتا ہے۔ ان نظموں میں بچوں کی نفسیات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ بقول پروفیسر اکبر رحمانی: ”وہ ادب جس کے ذریعے بچوں کی دلچسپی اور شوق کی تسکین ہو، جو مختلف عمر کے بچوں کی نفسیات، ضرورتوں، دلچسپوں، میلانات اور ان کی فہم و ادراک کو پیش نظر رکھ کر تخلیق کیا گیا ہو صحیح معنوں میں بچوں کا ادب کہلانے کا مستحق ہے۔“ یہ بھی سچ ہے کہ بچوں کا ادب تخلیق کرنے سے قبل یہ محسوس ہوتا ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا بڑا آسان ہے مگر بچوں کے لیے کہانیاں یا نظمیں لکھنا آسان کام نہیں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنا بڑا کارنامہ ہے۔ کیونکہ بڑے بڑے شعرا نے بچوں کے ادب پر نظمیں لکھی ہیں جیسے مولانا الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، علامہ اقبال وغیرہ نے اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ اقبال کی نظموں میں بچوں کے لیے ایک پیغام، ایک درس اور نصیحت ملتی ہے۔ ان کی نظموں کا انفرادیہ ہے کہ وہ بہت سے اسکول وکالجز کے نصاب میں شامل ہیں۔

بیسویں صدی میں بہت سے ادبا و شعرا نے بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں، ناول وغیرہ لکھے۔ ان میں منشی پریم چند، مظفر حنفی، مجنور سعیدی، ظفر گورکھپوری، عصمت چغتائی، شوکت تھانوی، سراج انور، کرشن چندر وغیرہ نے ادب اطفال کو مالا مال کیا۔ بہت سے ادبا نے بچوں کے لیے ہلکے پھلکے سائنسی ناول بھی لکھے اور دلچسپ منی کہانیاں اور نظمیں بھی۔ اکیسویں صدی میں بھی بچوں کے ادب پر کافی طبع آزمائی کی جا رہی ہے۔ ان لکھنے والوں میں حافظ کرناٹکی، عظیم اقبال، بانو سرتاج، فاروق سید، فوزیہ

چودھری، مناظر عاشق ہر گانوی، عاکف سنبھلی، اسلم پرویز، ظفر کمالی، شوکت حیات، رضوان احمد، نجیب پاشا، اطہر پرویز، انجم بہابی، مشتاق احمد نوری، شمس الرحمن فاروقی اور پروفیسر یونس غازی وغیرہ شامل ہیں۔ پروفیسر یونس غازی نے چھوٹے بڑے سب کے لیے شاعری کی ہے۔ نعت، نظم، مرثیہ، قصیدہ، غزل اور رباعیوں کے ذریعے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے ساتھ ہی بچوں کے حوالے سے بھی آپ کی نظموں کے تین مجموعے منظر عام پر آ کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کی نظموں میں بے شمار موضوعات ہیں۔ اصلاحی نظمیں، اخلاقی نظمیں، حب الوطنی سے لبریز نظمیں قارئین کا دل جیت لیتی ہیں۔ سرزمین میرٹھ ایک ایسا تاریخی شہر ہے جہاں علم و ادب، سائنس، سماج اور طب کے حوالے سے ایک جہاں آباد ہے۔ شاعری کے حوالے سے میرٹھ میں بہت سے شعرا، شاعری کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ وہیں ادب اطفال میں پروفیسر یونس غازی نے اپنے فن کے جوہر پیش کیے ہیں۔ پروفیسر یونس غازی شاعر بھی ہیں اور ناقد بھی، محقق بھی ہیں اور مبصر بھی۔ آپ کی تخلیقات میں تحقیقی و تنقیدی کتب کے علاوہ شاعری میں غزلیں، نظمیں اور بچوں کے لیے خوبصورت نظمیں شامل ہیں۔

یونس غازی نے بچوں کی شاعری کے حوالے سے تین شعری مجموعے [انمول خزانہ 2022ء]، [گشت اطفال 2025ء اور گلدستہ اطفال 2025ء] ادب اطفال کو عطا کیے۔ آپ کے پہلے مجموعے [بچوں کے لیے نظمیں] انمول خزانہ کی ابتدا میں پروفیسر صغیر افرام نے ”یونس غازی اور انمول خزانہ کے نام سے ایک مختصر مگر جامع تنقیدی مضمون قلم بند کیا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی کئی نظموں عبرت، نصیحت، شعری آداب، رب کی شان، والدین کی عزت، ہمدردی کے جذبات و احساسات شامل ہیں۔ اس مجموعے میں دوسرے مضمون ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے تحریر کیا جس میں یونس غازی کی شاعرانہ انفرادیت کو پیش کرتے سمجھانے کی کوشش کی کہ یونس غازی شاعری کے میدان کے ایسے سیاسی ہیں جن کی شعری کائنات میں ادبی ذوق، ادب اطفال کے عناصر، بچوں کی نفسیات، حسن اخلاق، تنہائی کا احساس، بکھرتے ٹوٹے انسانی رشتے اور دیگر الجھنوں میں بھنسا ہوا بچہ نظر آتا ہے جب ہم ڈاکٹر یونس غازی کے پہلے نظموں کا مجموعہ ”انمول خزانہ“ کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس مجموعے میں بچوں کے لیے نصیحتیں درس زندگی تہذیبی اقدار کے عناصر نظر آتے ہیں۔

یونس غازی کی نظمیں جہاں ایک طرف شعری چاشنی، بچوں کی تربیت میں رچی بسی ہیں وہیں دوسری طرف بچوں کے ذہنی توازن فکر و نظر کا چشمہ ہیں۔ اس مجموعے کے مضمون ”بچوں سے باتیں“ میں بچوں کو نصیحت کرنے کے ساتھ ساتھ ماں باپ سے محبت کرنا، استاد کا احترام کرنا اور خدا کی عبادت کرنا بھی بتایا ہے۔ سماج میں عزت دار زندگی گزارنے، ذلالت سے بچنے، صداقت پر قائم رہنے کی تعلیم دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ادب اطفال کا اسلوب، تعلیم و تربیت کا درس، والدین سے محبت وغیرہ خصوصیات سے یہ تمام نظمیں مزین ہیں۔ بیان میں سادگی، سلاست، روانی، بچوں کی نفسیات اور ذہنی توازن میں تاثر پیدا کرتی ہے۔ اللہ رب العزت کی حمد و ثنا کے بعد پروفیسر یونس غازی نے نبی کی شان میں نعت شریف کو

شامل کیا ہے۔ نعت میں شاعر نے اس سادگی و شکستگی کے ساتھ نبی کی عادات و اطوار، ان کی عظمت، مقام و مرتبہ کو فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نعت شریف میں شاعر نے بچوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے نبی کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ دنیا میں جتنے لوگ آئے ہیں ان میں بلند مقام و مرتبہ ہمارے نبی ہی ہے۔ یہ زمین و آسمان، پیڑ پودے، دن رات یعنی ہر شے نبی کا ادب و احترام کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

جس سے روشن ہے یہ بزم کون و مکان
ہیں وہ نور مجسم ہمارے نبی
بن کے آئے ہیں دنیا میں جو دو سنا
رحمت ہر دو عالم ہمارے نبی
وہ غریبوں یتیموں کے ہمدرد ہیں
بے سہاروں کے ہمد ہمارے نبی
کوئی ثانی نہیں ان کا کوئی دارین میں
سر بہ سر ہیں منظم ہمارے نبی

پروفیسر غازی ایک تجربہ کار شاعر، تجربہ کار استاد ادیب اور تجربہ کار شخصیت کا نام ہے، اسی لیے ان کی شاعری ہو یا تنقید، تحقیق ہو یا تبصرہ نگاری سب میں ان کے تجربے کے کرشمے نظر آتے ہیں، آپ نے بچوں کی عدم خواندگی پر خاص توجہ مرکوز کی۔ شاعر کو بخوبی احساس ہے کہ اگر بچے ماں باپ کا ادب و احترام کریں گے تو بچے دنیا میں بھی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جائیں گے اور آخرت میں بھی کامیاب ہوں گے۔ دنیا میں صرف والدین ہی وہ نعت ہیں جو ہر حال میں اپنے بچوں کے دکھ سکھ، خواہشیں اور تعلیم و تربیت کا خیال رکھتے ہیں۔ اس لیے شاعر کہتا ہے کہ

بھوکا رہ کر وہ کھلاتے ہیں تمہیں
لوریاں گا کر سلاتے ہیں تمہیں
ہر گھڑی رہتا ہے دکھ سکھ کا خیال
ان کی ممتا اصل میں ہے لازوال
ان کی حسرت ہے کہ تم قابل بنو
علم سیکھو عالم و فاضل بنو

ابتداء سے عہد حاضر تک جب اردو ادب کے شیدائیوں، شعرا اور ادبا پر نظر جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت امیر خسرو سے یونس غازی تک ایسے ادبا و شعرا ہوتے ہیں جنہوں نے نثری اور شعری خدمات میں خاصی طبع آزمائی کی۔ اردو شاعری کے طویل سفر میں امیر خسرو، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، میر غالب، اقبال وغیرہ سے عہد حاضر تک سبھی شعرا نے شاعری کی زلفوں کو سنوارا۔ ایسے ہی شعرا میں یونس

غازی نے اپنی تحقیق و تنقید، شاعری اور بچوں کی شاعری کے حوالے سے فکری زاویے پیش کیے۔ یونس غازی صرف اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ مذہبی افکار کے بھی مالک ہیں۔ خدا کی قدرت میں یقین رکھتے ہیں، رب کی حقانیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ آپ نے اپنے سنجیدہ کلام اور اطفالی نظموں میں بچوں کی صحت، تندرستی، کھیل کود، وقت کی اہمیت اور زندگی کو کامیاب بنانے والا کلام پیش کیا ہے۔ انمول خزانہ یعنی بچوں کے لیے نظمیں اپنے موضوع کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس مجموعے کی تمام نظمیں بچوں کی نشوونما میں اپنا کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ نظمیں بچے کی دعا، والدین کی خدمت، استاد کا فیضان، تعلیم، کھیل، وقت، زندگی، اخلاق، صداقت، بھلائی، نفرت، کام، پیارے بچے، پھل، گرمی، برسات وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو نہ صرف بچوں کی نفسیات پر مبنی ہیں بلکہ خود بھی انفرادی طور پر ان موضوعات پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے یونس غازی بھی بچہ بن کر، بچوں کی زبان میں کلام پیش کرتے ہیں تو کبھی استاد بن کر ان کی تربیت کرتے نظر آتے ہیں۔

اچھی عادت اچھی خصلت باعث توقیر ہے
یہ سراپا بوئے گل ہے حسن کی تصویر ہے
وصف ہے ایمانداری اے بشر
باعث تذلیل ہے اس سے صفر
سچ تو یہ ہے سچ ہے عظمت کا نشان
اصل میں ہے یہ سکون جسم و جاں
جھوٹ کر دیتا ہے انسان کو ذلیل
جھوٹ کھو دیتا ہے ہر لطف جمیل

یہ سچ ہے کہ یونس غازی بڑے شعرا میں شمار ہوتے ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ شاعری کے میدان میں آپ دکھاوے کو پسند نہیں کرتے۔ شاعری کی نوک پلک خود بھی سنوارتے ہیں اور اپنے عزیزوں کو بھی شاعری کا درس دیتے ہیں۔ آپ کے شاگرد آج بڑے بڑے مشاعروں میں اپنا کلام پیش کر کے سامعین اور قارئین کے دلوں کی دھڑکن بنے ہوئے ہیں۔ یونس غازی نے دبستان میرٹھ میں اپنی ایک منفرد پہچان بنائی ہے۔ آپ کی شاعرانہ انفرادیت سے نہ صرف میرٹھ بلکہ دیگر مقامات کے شعرا و ادبا بھی آپ کی وسیع النظری کو تسلیم کرتے ہیں۔ دیگر مقامات کے شعرا مثلاً وحید رینگھ پرواز، شعیب انجم، بکراسوی، صناس علی پھلاؤدہ وغیرہ آپ کی اطفالی نظموں سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں:

بچوں کے لئے آ گیا انمول خزانہ
جس نے بھی پڑھا پا گیا انمول خزانہ
غازی تیری پرواز ہے احسان ملک پر
ایک نور سا برسا گیا انمول خزانہ

(وجندرنگھ پرواز)

انمول خزانہ کی ہر بات نرالی ہے
نظمیں بھی عجوبہ ہیں ہر شعر مثالی ہے
غازی نے خزانہ یہ اطفال کو سونپا ہے
بندوں سے مزین ہے حکمت سے نہ خالی ہے

(شعیب انجم بکراسوی)

بچوں کی شاعری کے حوالے سے یوں تو بت سے شعراء نے طبع آزمائی کی ہے مگر یونس غازی ادب اطفال کے حوالے سے نظموں کے میدان کا ایک ایسا اہم نام ہے جس نے بچوں کی تعلیم و تربیت، نئی نسلوں کی ذہانت اور حب الوطنی کی تعمیر و ترقی میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ لہجہ کی متانت، مذہب اسلام سے رغبت، مصرعوں کی چستی اور منفرد لب و لہجہ یونس غازی کی اطفالی نظموں کا انفرادہ ہے۔ ان کی نظموں میں قوم کا درد، وطن سے محبت نظر آتی ہے۔ اس مجموعہ میں یونس غازی کا انداز کلام سادہ اور سلیس ہے۔ چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں بچوں کو بات سمجھانے کا سلیقہ دل کو لہجاتا ہے۔ ہر طرح کے موضوعات پر نظمیں شامل ہیں۔

ڈاکٹر یونس غازی نے بچوں کے لئے نظموں کا دوسرا مجموعہ ”گلشن اطفال“ کے نام سے لکھا جو ۲۰۲۵ء میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ یونس غازی نے یہ مجموعہ مولانا اسماعیل میرٹھی کے نام کیا ہے۔ جنہوں نے ادب اطفال کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ نظموں کے اس مجموعہ میں پروفیسر راحت ابرار نے پیش لفظ تحریر کرتے ہوئے یہ وضاحت کی کہ تحریک آزادی کی پہلی جنگ ۱۸۵۷ء کے حالات، جدید نظم کا آغاز، غالب کے خطوط (میرٹھ سے) عود ہندی، اردو شاعرات کا اولین تذکرہ حکیم فصیح الدین رنج وغیرہ کا تعلق میرٹھ سے ہی تھا۔ تنقید کا آغاز، بچوں کا ادب، جدید نظم نگاری کا آغاز بھی میرٹھ سے ہی ہوا۔

یونس غازی کی نظمیں (بچوں کے لئے) جو ”گلشن اطفال“ کے نام سے منظر عام پر آئیں، ان کے مطالعہ سے لگتا ہے کہ جیسے یونس غازی صرف بچوں کے ہی شاعر ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ جو شخص جس میدان میں ایمانداری سے طبع آزمائی کرتا ہے وہ اسی میدان کا ماہر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اقبال کی نظمیں بچوں کی نشوونما میں اہم رول ادا کر رہی ہیں اور ان کی نظمیں بہت سی یونیورسٹی اور کالجز کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔ یونس غازی نے اقبال کی نظم نگاری کو فروغ دیتے ہوئے بچوں کے لئے نظموں کا دوسرا مجموعہ ”گلشن اطفال“ کے نام سے لکھا۔ جس میں اسماعیل میرٹھی، اقبال وغیرہ کی نظم نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے کا منفرد کارنامہ انجام دینے کی بات کو بھی تحریر کیا ہے۔ یونس غازی کی شاعری میں پائرجیت، خلوص، ہمدردی، صبر، شفقت، راحت جیسے مضامین شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں حمد نعت کے علاوہ اہم موضوعات پر تقریباً اڑتالیس نظمیں شامل ہیں۔ آپ کی نظموں میں موضوعات کی پیش کش کا اصل مقصد اپنے عہد کے مسائل

اور میلانات سے عوام کو واقف کرانا ہے۔ ان کی نظموں میں حقیقت بھی ہے اور صداقت بھی۔ سچائی بھی ہے اور تخیل بھی۔ آپ کی نظموں میں نماز، روزہ، ماں، میرے ابو، میرے استاذ، علم، ہمارا اسکول وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں مذہبی افکار اور اساتذہ سے محبت کے ساتھ ساتھ والدین کی محبت، بچوں کی ذہن سازی کرتی نظر آتی ہیں۔ ان نظموں سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

فرض ہے ہر حال میں بچوں نماز
اس لئے ملتا ہے خدائے پاک باز
وقت پر کرتے رہو اس کو ادا
اجر دے گا با یقیں تم کو خدا

(نماز)

پانچ ہیں ارکان دیں سن اے عزیز
تم کو ہونی چاہئے اس کی تمیز
رکن اک روزہ بھی ہے اسلام کا
در حقیقت یہ بہت ہے کام کا

(روزہ)

میرے ابو ہیں شاندار بہت
نیز وہ ہیں ایماندار بہت
چاہتے ہیں وہ جان سے بڑھ کر
ان کا سایہ رہے مرے سر پر

(میرے ابو)

ڈاکٹر یونس غازی نے بچوں کی تعلیم و تربیت، کردار سازی، نفسیات، اخلاق پر جس منفرد اور سلیس انداز بیان میں نظمیں تخلیق کیں یہ صرف آپ ہی کا انفرادہ ہے۔ اس مجموعہ کی پشت پر پروفیسر اسلم جمشید پوری نے یونس غازی کے شعری انفراد پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ موجودہ عہد میں بچوں کے لئے بہت سے لوگوں نے لکھا ہے اور وہ کتابی شکل میں بھی سامنے آیا ہے، لیکن یونس غازی کی یہ کتاب ”گلشن اطفال“، ہم سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتی ہے۔ اس کتاب میں بچوں کی نفسیات اور ان کے اخلاق و کردار کی نشوونما کا بے حد خیال رکھا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اکیسویں صدی میں ہر شے میں تبدیلی نظر آ رہی ہے۔ اب قدیم زمانے کی مانند کہانیاں تفصیلی نہیں رہی بلکہ نثری اصناف میں مختصر کہانیاں اور افسانچوں کا چلن آ گیا ہے۔ جبکہ شعری اصناف میں بچوں کے لئے قدیم زمانے سے ہی نظموں نے اپنے قارئین کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی کافی متاثر کیا۔ اب پچھٹی صدی میں سانس لے رہا ہے۔ وہ سانس اور کمپیوٹر کے ساتھ ساتھ موبائل اور فیس بک پر نظمیں اور کہانیاں پڑھ رہا ہے۔ اب بچوں کو چاند میں بڑھیا

نظر نہیں آتی اور نہ ہی چرنے کی صورت نظر آتی ہے۔ جبکہ وہ چاند، سورج، زمین، آسمان کی بناوٹ پر غور و خوض کر رہا ہے۔ ستاروں کی گردش کے بارے میں سوچتا ہے۔ چاند اور سورج کے چکر لگانے پر غور کرتا ہے۔ یونس غازی نے چاند، سورج، تارے، پہاڑ، زمین، آسمان، ہوا، پانی وغیرہ پر ایسی نظمیں لکھی ہیں جن کو بچہ گنتا تا ہے۔ چند نظموں کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

روشنی اس کی ہم کو بھاتی ہے
ذہن و دل میں سرور لاتی ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہے چاندنی اس کی
کتنی اچھی ہے روشنی اس کی

(چاند)

مشرق سے جو نکلا سورج
مغرب میں جا ڈوبا سورج
صبح صبح کا ٹھنڈا سورج
لیکن آگ کا گولا سورج

(سورج)

دن میں تارے چھپ جاتے ہیں
راتوں میں ہی نظر آتے ہیں
سمتوں کی پہچان ہے ان سے
منزل کا امکان ہے ان سے

(تارے)

ڈاکٹر یونس غازی بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں۔ بچوں کی نفسیات اور ذہنی نشوونما میں ان کی نظمیں کارگر ثابت ہو رہی ہیں۔ بچوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے یونس غازی نے جغرافیائی اور سائنسی ماحول پر بھی خاص نظمیں تخلیق کیں۔ زمین، چاند، سورج، سمندر، پانی، ہوا، گرمی، سردی، بارش وغیرہ موضوعات کو اپنی نظموں میں ہنرمندی سے پیش کیا۔ سائنسی اور جغرافیائی ماحول کو اپنی نظموں میں سمیٹ لیا ہے کہ بچوں کے اندر سائنسی اور جغرافیائی ماحول کا عکس نظر آنے لگتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

کتنا دلکش و دل ربا ہے پہاڑ
مظہر شان کبریا ہے پہاڑ
اس کی عظمت کا کیا ٹھکا ہے
اس پہ حیرت زدہ زمانہ ہے

(پہاڑ)

رب نے فرش زمین بچھایا ہے
اور سبزے سے پھر سجایا ہے
اس کی وسعت کا کیا ٹھکانہ ہے
اس کے اندر بڑا خزانہ ہے

(زمین)

زندگی کی یہی کہانی ہے
یہ سرا سر رہن پانی ہے
بچو پانی خدا کی رحمت ہے
اس کی بندوں پہ یہ عنایت ہے

(پانی)

دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سے بڑے ناقدین ادب نے بچوں کے ادب پر لکھنے سے گریز کیا ہے لیکن یونس غازی بچوں کے ادب سے جی نہیں چراتے بلکہ بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم و تربیت، نفسیاتی شعور، دلچسپی اور بچوں کے ذوق و شوق پر خاص نظر رکھتے ہیں۔ اقبال ہمارے زمانے کے بڑے شاعر ہیں۔ اگر بچوں کے لئے لکھنا کمتر درجہ کی بات ہوتی تو وہ ہرگز نہ لکھتے بلکہ انہوں نے بچوں کے لئے ایسی نظمیں لکھیں جو آج تک نصابیات میں شامل ہیں۔ ہر کالج، اسکول اور مدرسے کے بچے ان کی نظموں کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ اسی لئے یونس غازی نے بھی بچوں کے لئے خوبصورت اور اطفالی نظمیں لکھیں۔ جو بچوں کے مزاج، ذہن اور ان کے کردار کو بخوبی سنوارتی ہیں۔ یونس غازی کے پہلے اور دوسرے نظموں کے مجموعے کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یونس غازی کی نظموں میں احساس زندگی، صداقت زندگی، کلاسیکی اصول بھی نظر آتے ہیں۔ نئے پرانے جذبات و خیالات سے قارئین واقف ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم یونس غازی کو ادب اطفال کا غازی کہیں تو غلط نہ ہوگا۔

ڈاکٹر یونس غازی کی نظموں کا تیسرا مجموعہ ”گلدستہ اطفال“ کے نام سے ۲۰۲۵ء میں ہی منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ کا انتساب ادب اطفال کے نمائندہ شاعر حامد اللہ افسر کاظمی کے نام کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کی ابتداء میں محترم شاہد چودھری، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر فرحت خاتون کے تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ جبکہ ”حرف چند“ کے نام سے ڈاکٹر یونس غازی کا پیش لفظ قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتا ہے۔ مجموعہ میں حمد باری تعالیٰ اور نعت شریف کے بعد اکیا ون نظمیں شامل ہیں۔ تمام نظمیں بچوں کی کردار سازی کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

یہ نئی صدی ہے۔ اور نئی صدی میں نوجوان شعراء بڑی تعداد میں اپنا کلام پیش کر رہے ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ نوجوان شعراء اس صدی میں گھاس کی مانند پیدا ہو رہے ہیں جو اردو نہ جاننے کے باوجود اپنا کلام ہندی میں پیش کر کے مشاعروں میں واہ واہی لوٹ رہے ہیں۔ دوسرے شعراء کا لکھا ہوا

کلام نئے شعراء ہندی میں لکھ کر لاتے ہیں اور اپنی مترنم آواز میں سامعین کے دلوں پر ایسا سحر طاری کرتے ہیں کہ اسے اسٹیج کا بڑا شاعر تسلیم کر لیا جاتا ہے جبکہ وہ کسی غزل کے مقطع، مطلع، ردیف، قافیہ کے بارے میں بھی انجان ہوتا ہے۔ ایسے شعراء سے نہ صرف اردو شاعری کے معیار میں گراوٹ آتی ہے بلکہ اردو زبان و ادب کو خاصا نقصان پہنچتا ہے۔ مگر یونس غازی ان تجربہ کار استاد شاعروں میں سے ہیں جو ایسے نئے نوجوان شعرا کی حتی الامکان اصلاح کرتے نظر آتے ہیں۔ بڑوں کے لئے شاعری کرتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کی نفسیات کو سمجھ کر ان کی کردار سازی کرتے ہیں۔ یونس غازی نظمیں لکھنے سے قبل خود بچہ بننے ہیں اور بچوں کے لئے نظمیں قلم بند کرتے ہیں۔ بچوں کی بھولی بھالی زبان، عام فہم انداز بیان استعمال کر کے یونس غازی نظموں کے ذریعہ بچوں کی ذہنی نشوونما اور کردار کی تعمیر کرتے ہیں۔ ماں باپ کی خدمت، وقت کی اہمیت، پڑوسی کا حق، کردار سازی، سب سے محبت، بڑوں کا ادب، غریبوں سے الفت وغیرہ باتوں کو اپنی نظموں میں پیش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے یونس غازی کی نظمیں ماں باپ کی خدمت، پڑوسی کا حق، شفقت، رغبت، حفاظت، حمایت، دولت، سخاوت، مروت، رسوائی وغیرہ نظمیں بچوں کے ذہنی توازن اور ان کے کردار میں ایک نیا انقلاب پیدا کرتی ہیں۔ چند نظموں کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

بحر و بر میں اسی کا جلوہ ہے
اس کے آگے جہان پھیکا ہے
اس کی مٹی میں ہے عدالت بھی
اس لئے ملتی ہے قیادت بھی

(دولت)

جو عمل رب جہاں کو ہو پسند
تم رہو اس پر ہمیشہ کار بند
کار شفقت ہے بزرگو کا شعار
اس سے پاؤ گے جہاں میں تم وقار

(شفقت)

ماں اور باپ کا کہنا مانو
ان کی عظمت کو پہچانو
ان کی عزت کرنا سیکھو
ان سے الفت کرنا سیکھو

(ماں باپ کی خدمت)

ڈاکٹر یونس غازی کی اطفالی نظموں کا انفرادیہ ہے کہ ان کے کلام میں بچوں کی باتیں، بچوں کی

ذہانت، بچوں کا کردار شامل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر بچہ صرف بچہ ہوتا ہے۔ اسے اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی۔ نفع نقصان کا اس کو علم نہیں ہوتا۔ بہت سے ادباء و شعراء نے بچوں کے لئے خاصا ادب تخلیق کیا ہے تاکہ بچہ نفع نقصان اور اچھے برے کو سمجھ سکے۔ اور یہ سچ بھی ہے کہ ادب اطفال کے ذریعہ بچوں میں پائی جانے والی کمیوں کو کم کیا جاسکتا ہے۔ ان کی سوچ میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ اخلاقی درس اور عمدہ نظموں کے ذریعہ بچوں میں پائی جانے والی خامیوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔ بقول پروفیسر صغیر افرام ”کچھ بچے فطری طور پر جھگڑالو ہوتے ہیں۔ ان کی جبلت میں شرارت موجود ہوتی ہے۔ ان کو قابو میں رکھنے کے لئے ادب اطفال نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ بچوں کی ہر تخلیق میں نظم و ضبط، اخلاقی اقدار کو کلیدی اہمیت دی جاتی ہے۔“ اخلاقی درس، تعلیم و تربیت اور سبق آموز کہانیوں اور نظموں کے ذریعہ بچوں کو تعلیم و تربیت اور ذہنی نشوونما سے آراستہ کر سکتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

یہ حق ہے آدمی کا آدمی پر
اسے ملحوظ رکھو تم سرا سر
خدا تو فنیق دے غازی سبھی کو
عیادت کی ہو عادت سبھی کو

(عیادت)

غیبت کرنا چھوڑ دو بچو
نفرت کرنا چھوڑ دو بچو
سب سے محبت کرنا سیکھو
سب کی عزت کرنا سیکھو

(غیبت)

ڈاکٹر یونس غازی دبستان میرٹھ کے ان چند شعراء میں ممتاز مقام رکھتے ہیں جنہوں نے اردو شعر و ادب میں میرٹھ کا نام دور دور تک روشن کیا ہے۔ اور یہ مقام آپ کو یوں ہی حاصل نہیں ہوا بلکہ تحقیق، تنقید، شعر و ادب کے حوالے سے آپ نے اپنے خون کو پانی اور پانی کو خون کیا ہے۔ اپنے فکر و نظر، اپنے تجربے، اپنی تخلیقی توانائی کی بدولت وہ شعر و ادب کے حلقوں میں اپنی خاص جگہ بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ یونس غازی کی نظموں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ماں بچے کے اندر چھپ کر اس کی تعلیم و تربیت کر رہی ہے۔ وزیر آغانے لکھی بات لکھی ہے کہ ”ماں اور بچے کی تمثیل کو ملحوظ رکھیں تو بھی اس آویزش کے شواہد عام طور سے دیکھنے کو ملیں گے۔ گیت میں بچہ ماں کے لپٹن میں تھا۔ غزل میں بچہ ماں کی انگلی تھامے ہوئے تھا لیکن نظم میں ماں ”بچے“ کے اندر چھپی ہوئی ہے۔“ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماں اپنے بچوں کی نشوونما میں اپنا کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اور ماں کی طرح یونس غازی نے اپنی نظموں کے ذریعہ ان تمام باتوں کو شامل کر کے ایک منفرد کارنامہ انجام دیا ہے۔ آپ کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن کو

کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً برائی، حقارت، نصیحت، اردو، انسان، حیوان، لومڑی، خرگوش، شاہین، روٹی، بھوک، عدالت، ہمارا وطن، وغیرہ میں اخلاقی قدریں، تہذیب و تمدن، حب الوطنی کے عنصر جا بجا نظر آتے ہیں۔ بچوں کو سچائی، صداقت، حقیقت کا درس ان نظموں میں جا بجا نظر آتا ہے۔ مثلاً:

ہر بری چیز ہے بری بچو
تم برائی سے خود کو دور رکھو
جو برائی کی بات کرتا ہے
تلخ اپنی حیات کرتا ہے

(برائی)

کسی کو نہ دیکھو حقارت سے بچو
ملو ہر کسی سے محبت سے بچو
بری ہیں یہ بچو حقارت کی باتیں
کرو تم ہمیشہ محبت کی باتیں

(حقارت)

کتنی شیریں زبان ہے اردو
یہ تلفظ کی جان ہے اردو
اپنی تہذیب کی علامت ہے
دوستی کا نشان ہے اردو

(اردو)

ڈاکٹر یونس غازی نے ادب اطفال میں طبع آزمائی کر کے ادب اطفال کے میدان کو وسیع کرنے کا منفرد کارنامہ انجام دیا ہے۔ سنجیدہ مزاجی، فنی چابکدستی اور تجربہ کاری سے غازی صاحب نے بچوں کے لئے مثالی نظمیں تخلیق کی ہیں۔ مجموعی اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں میرٹھ کے اہم شعراء میں یونس غازی نے اپنا اہم اور نمایاں مقام پیدا کیا ہے۔ بچوں کے لئے آپ معیاری ذخیرہ تخلیق کرنے میں مشغول ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ آنے والے وقت میں یونس غازی کی اطفالی نظمیں اور زیادہ ذوق و شوق سے پڑھی جائیں گی۔

☆☆☆

ساحر لدھیانوی بچوں کی دنیا میں

اس سچائی سے انحراف نہیں کیا جاسکتا کہ بچے ہماری قومی امانت ہیں، جن کی حفاظت ملک کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ کیوں کہ کسی بھی قوم میں بچے ہی اس کے کل سرمایہ ہوتے ہیں۔ دنیا کی ہر زبان و ادب کا مستقبل ان کے بچوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ توجہ ان کے ادب پر دی جاتی رہی ہے۔ جب دنیا علم و ادب سے بہرہ ور نہیں تھی، اس وقت بھی ان کے لیے عمدہ ادب مہیا کرانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اس طرح ان کا یہ زبانی ادب سینہ بہ سینہ ارتقائی سفر طے کرتا رہا ہے۔ پھر چاہے وہ دادی، نانی کی کہانیوں اور داستان کی شکل میں ہو، یا ماں کی لوریوں، گیتوں اور نظموں کی شکل میں ہو۔ ان کہانیوں، لوریوں اور گیتوں سے بچوں کے حوصلے بلند ہوتے، ان کے ذوق کو تسکین ملتی اور ان کا پروانہ خیل بلند ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی۔ مگر عصر حاضر کے بدلتے تقاضے میں دادی، نانی اور ماں کی کہانیوں اور لوریوں کی جگہ موبائل فون پر ریکارڈ کا میڈی اور نغموں نے لے لیا ہے۔ اردو ادب میں بچوں کے ادب کو کبھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ بچوں کے تحریری ادب کی تاریخ بہت مختصر نظر آتی ہے۔ بچوں کے ادب کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر سے ہوا لیکن بیسویں صدی میں اس کی تخلیق و اشاعت نے زور پکڑ لیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچوں کے ادب سے کیا مراد ہے، کس قسم کے ادب کو بچوں کا ادب کہا جائے گا؟ تو ڈاکٹر ہنری اسٹیل اس سلسلے میں اپنی مایہ ناز تصنیف ”اے کرٹیکل ہسٹری آف چلڈرن لٹریچر“ میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

”بچوں کے ادب میں پریوں اور جادو کی کہانیاں، لوریاں، نظمیں، گیت، اخلاقی مضامین، اسکول اور کھیل کا میدان، اور سیر و سیاحت کی کہانیاں سب ہی شامل ہیں اور اسی کو ادب اطفال مانا گیا ہے۔ مگر اس بات کا قطعی فیصلہ نہ تو اساتذہ، نہ ہی والدین، نہ ادیب اور نہ شاعر ہی کر پائے ہیں کہ یہی بچوں کا ادب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بات کا فیصلہ تو خود بچے ہی کر سکتے ہیں کہ ان کا ادب کیا ہو اور کیسا ہو۔ یہ کہنا بہت ہی مشکل ہے کہ بچے کس قسم کی کتب پسند کرتے ہیں، بچوں کا ادب کیسا ہونا چاہیے“۔ (1)

(بحوالہ: ڈاکٹر ہنری اسٹیل: اے کرٹیکل ہسٹری آف چلڈرن لٹریچر، ص: 7)

اس اقتباس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بچے کا ادب نظم و نثر کا وہ ذخیرہ ہے، جو بالخصوص بچوں کے لیے لکھا گیا ہو نیز جس کی زبان بچے بہ آسانی سمجھ سکیں۔ البتہ بچوں کے ادب میں نظم کی اہمیت مسلم ہے۔ جو نظمیں الفاظ کی تکرار، صوتی آہنگ اور ترنم لیے ہوتی ہیں انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے بچے جو قوم کے معمار اور ملک کی عظمت کے نشان ہوتے ہیں، اس روئے زمین پر قدرت کی ان سے حسین اور دل پذیر شاید ہی کوئی شے ہو۔ یہ حسن و صداقت کے وہ مینارہ ہیں، جن کے کاندھوں پر ملک کا تابناک مستقبل ہوتا ہے۔ ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو جنہیں بچوں سے بے انتہا عقیدت تھی، بچوں کے نام ایک خط میں لکھ یوں رقم طراز ہیں:

”اگر تم میرے پاس ہوتے تو میں تمہیں اپنی اس خوبصورت دنیا کے بارے میں کچھ باتیں بتاتا۔ یہ ہے وہ دنیا جو درختوں، پھولوں، جانوروں، پرندوں، پہاڑوں، ستاروں، سمندر میں تیرتے ہوئے برف کی چٹانوں اور بہت سی دوسری عجیب و غریب چیزوں سے بھری ہوئی ہے۔۔۔ تم نے پرانے زمانے کی پریوں کے قصے اور کہانیاں ضرور پڑھی ہوں گی، لیکن۔۔۔۔۔ یہ دنیا ان سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ شرط یہ ہے کہ دنیا کی خوبصورتی اور زندگی کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس مشاہدہ کرنے والی آنکھ، سننے والے کان اور کھلا ہوا دماغ ہونا چاہئے۔“ (2)

(بحوالہ: ایم چلاپتی رائے: بچوں کے نہرو، نئی دہلی۔ 1967ء، ص: 3)

اردو ادب کا کوئی گوشہ خواہ نثر ہو یا شاعری بچوں کے ذکر سے خالی نظر نہیں آتا۔ ہر دور کے شاعروں نے اپنے اپنے انداز میں بچوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن میں تلوک چند محروم، علامہ اقبال، میلا رام وفا، شہنشاہ ادب اطفال اسماعیل میرٹھ، سلام چھلی شہری، جگن ناتھ آزاد، نظیر اکبر آبادی، الطاف حسین حالی، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، حامد اللہ افسر میرٹھی، حفیظ جالندھری، راجن سرحدی، سیما اکبر آبادی، اختر شیرانی، غلام رسول مہر، چکبست، سرور جہاں آبادی، راز کشمیری، راجندر ناتھ رہبر، راجا مہدی علی خاں، قتیل شفائی، جمیل مظہری، غلام مصطفیٰ تبسم، خلیل الرحمن اعظمی، احمد ندیم قاسمی، مظفر حنفی، ساحر لدھیانوی، وغیرہ کا نام سرفہرست ہے۔ جنہوں نے بچوں کے ادب کو استحکام بخشا۔ ان کی بے شمار نظمیں، کہانیاں اور لوریاں ادب اطفال کا بیش قیمتی سرمایہ ثابت ہوئیں۔

دنیا نے نغمگی و شاعری کے شہنشاہ ساحر لدھیانوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ادب اطفال میں ان کا شمار بچوں کے نمائندہ شاعر میں ہوتا ہے۔ یوں تو ان کی پہچان ایک ترقی پسند شاعر کی زیادہ اور بچوں کے شاعر کی حیثیت سے کم ہے۔ لیکن مجھے کہنے دیجیے کہ ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے بچوں کی ذہنی نشوونما کے لیے صحت مند شعری ادب تخلیق کیا ہے۔ ان کی نگارشات میں بہت سی نظمیں،

گیت اور لوریاں شامل ہیں۔ ان نگارشات سے ان کی ادب اطفال سے دلچسپی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے بچوں کی نفسیات کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کا شعری مجموعہ ”بچے من کے سچے“ کی سبھی نظمیں شاعر کے وسیع النظری کا پتا دیتی ہیں اور ساتھ ہی بچوں کو جذبہ حب الوطنی، یکجہتی اور وطن کے رہنماؤں سے متعلق معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ ساحر لدھیانوی نے اپنی تمام نظموں میں بچوں کی نفسیات، ان کی ضروریات، ان کی دلچسپی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو پیش نظر رکھا ہے۔

بچے سب کے دل کو عزیز ہوتے ہیں۔ یہ وہ نازک پھول ہوتے ہیں جن پر خدا کو بھی پیارا آتا ہے۔ ساحر لدھیانوی نے بچوں کے تعلق سے اپنی نظم ”بچے من کے سچے“ میں بچوں کی معصومیت، سچائی اور صاف گوئی کا بیان کچھ ان لفظوں میں کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

بچے من کے سچے، سارے جگ کی آنکھ کے تارے
یہ وہ ننھے پھول ہیں جو بھگوان کو لگتے پیارے
خود روٹھیں خود من جائیں، پھر ہم جولی بن جائیں
بھگوان جس کے ساتھ کریں، گلے ہی پل پھر بات کریں
ان کو کسی سے بیر نہیں، ان کے لیے کوئی غیر نہیں
ان کا بھولا پن ملتا ہے سب کو بانہہ پیارے

ان کی یہ نظم فلم ”دو کلیاں“ 1968 میں بطور نغمہ استعمال ہوئی ہے۔ اس فلم کی کامیابی کا سہرا بھی ساحر لدھیانوی کے سر جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے خوبصورت نغموں کے ذریعہ فلمی دنیا میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ ان نغموں کی لے آج بھی ہزاروں دلوں کی دھڑکن اور روح کی جان بنے ہوئے ہیں۔ ساحر لدھیانوی اس نظم کے پہلے بند میں بچوں کی معصومیت اور بھولے پن کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کی فطرت ہے، یہ جس کے ساتھ جھگڑتے ہیں اگلے لمحہ اسی کے ساتھ ہم جولی بن کر کھیل رہے ہوتے ہیں۔ ان کو کوئی غیر نہیں لگتا ہے، پھر آگے چل کر ان کی اچھی خصلتوں کو بڑوں سے بہتر قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

انساں جب تک بچہ ہے، تب تک سمجھو سچا ہے
جوں جوں اس کی عمر بڑھے، من پر جھوٹ کا میل چڑھے
کرودھ بڑھے، نفرت گھیرے، لالچ کی عادت گھیرے بچپن ان
پاپوں سے ہٹ کر اپنی عمر گزارے تن کو مل، من سندر ہیں،
بچے بڑوں سے بہتر ہیں ان میں چھوٹ اور چھات نہیں، جھوٹی
ذات اور پات نہیں بھاشا کی تکرار نہیں مذہب کی دیوار
نہیں ان کی نظروں میں اک ہیں، مندر، مسجد، گردوارے

ساحر لدھیانوی کی نظر میں انسان جب تک بچہ ہوتا ہے، ہر برائی سے دور ہوتا ہے۔ اس کے دل میں ذات پات اور رنگ و نسل کا کوئی بھید بھاؤ نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کی نظر میں مذہب اور بھاشا کی کوئی

تکرار ہوتی ہے۔ ان کی سمجھ میں مسجد مندر سب ایک ہیں۔ ساحر لدھیانوی کی نظموں میں بچوں کے تخلیقی ادب کے دونوں لازمی جز کارفرما نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں سادہ، سلیس اور آسان زبان میں ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں وطن پرستی قدرتی نظارے، جذبہ وطن اور قومی یکجہتی کا بیان دلچسپ پیرائے میں ہوا ہے۔ اپنی نظم ”بھارت کے بچو“ میں بچوں کو اپنے ملک و قوم کی خدمت کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ انہیں بلا تفریق رنگ و نسل، قوم و مذہب یکجہتی کی تعلیم دیتے ہیں نیز ہر ایک کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

بھارت ماں کی آنکھ کے تارو
نہنے منے راج دلارو
جیسے میں نے تم کو سنوارا
ویسے ہی تم دلش سنوارو

بھارت ماں۔۔۔۔۔

یہ جواک چھوٹا سا بستہ
علم کے پھولوں کا گلدستہ
کرشن ہے اس میں، رام ہے اس میں
بدھ مت اور اسلام ہے اس میں
یہ بستہ عیسیٰ کی کہانی
یہ بستہ نانک کی بانی
اس میں چھپی ہے ہر سچائی
اپنا سکھ، اوروں کی بھلائی

بھارت ماں۔۔۔۔۔

چھوڑ کے جھوٹی ذاتیں پاتیں
سب سے سیکھو اچھی باتیں
نوجیون کی آس تمہیں ہو
بننا ہوا اتہاس تمہیں ہو

ساحر لدھیانوی کی بچوں کے لیے لکھی ہوئی بیشتر نظمیں دنیائے نغمگی میں بطور نغمہ ساز کی لے پر چھائی ہوئی ہیں۔ جیسا کہ ان کی یہ نظم، فلم ”بہو بیٹی“، 1965 کی اہم کڑی ثابت ہوئی ہے۔ انہوں نے بچوں میں مساوات، مذہبی رواداری، انسان دوستی، قومی اتحاد نیز حب الوطنی کو فروغ دینے والی نظمیں بھی تخلیق کی ہیں۔ انہوں نے بچوں کے دلوں سے نفرت کا جذبہ ختم کرنے اور باہمی الفت کا جذبہ پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ مساوات کے درس کو ان کی نظم ”انسان کی اولاد“ میں ملاحظہ کریں۔

تو ہندو بنے گا، نہ مسلمان بنے گا
 انسان کی اولاد ہے، انسان بنے گا
 اچھا ہے ابھی تک ترا کچھ نام نہیں ہے
 تجھ کو کسی مذہب سے کوئی کام نہیں ہے
 جس علم نے انسانوں کو تقسیم کیا ہے
 اس علم کا تجھ پر کوئی الزام نہیں ہے
 تو بدلے ہوئے وقت کی پہچان بنے گا
 انسان کی اولاد ہے، انسان بنے گا
 نفرت جو سکھائے وہ دھرم تیرا نہیں ہے
 انساں کو جو روندے وہ قدم تیرا نہیں ہے
 قرآن نہ ہو جس میں وہ مندر نہیں تیرا
 گیتا نہ ہو جس میں وہ حرم تیرا نہیں ہے
 تو امن اور صلح کا ارمان بنے گا
 انسان کی اولاد ہے، انسان بنے گا

ساحر لدھیانوی اس نظم میں بڑے برجستہ اور بے ساختہ انداز میں بچوں کو سبھی فرقوں، زبانوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ برابری کا سلوک کرنے، انہیں برابر حیثیت دلانے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کی یہ نظم بھی فلم ”دھول کا پھول“ 1959 میں بطور نغمہ استعمال ہوئی ہے۔ یہ فلم ان کے اس نغمے کی وجہ سے ایک کامیاب فلم بھی ثابت ہوئی۔

ساحر لدھیانوی بچوں کو آزادی کی نعمت کو سنبھال کر رکھنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ دنیا کے ہر مذہب سے قیمتی انسانی جان ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب ایسا نہیں جو انسانیت کی تعلیم نہ دیتا ہو۔ نظم ”ہندوستانی بچے“ ملاحظہ ہو۔

بچو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی
 باپو کے وردان کی نہرو کے ارمان کی
 جو صدیوں کے بعد ملی ہے، وہ آزادی کھوئے نہ
 دین دھرم کے نام پہ کوئی بیج پھوٹ کا بوئے نہ
 ہر مذہب سے اونچی ہے قیمت انسانی جان کی
 بچو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی
 رہ نہ سکے اب اس دنیا میں یگ سرمایہ داری کا
 تم کو جھنڈا لہرانا ہے محنت کی سرداری کا

ہل ہوں اب مزدوروں کے اور کھیتی ہو دہقان کی
 بچو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی
 ساحر لدھیانوی نے اس نظم میں بچوں کو آنے والے کل کے مستقبل سے تعبیر کیا ہے انہیں آنے
 والے وقت میں ملک کی تقدیر کہہ کر ان کے ننھے کندھوں پر ملک کے امن وامان اور تحفظ کا بھار ڈال دیا ہے
 ۔ نہرو اور گاندھی نے جس چمن کی آب یاری اپنے لہو سے کی تھی، وہ چمن، وہ وطن اب تمہارے حوالے ہے
 ۔ اس لیے اس راہ میں ان سے اگر کوئی کور کسر رہ گئی ہو تو اسے اب تمہیں پورا کرنا ہے۔ جو کہ ایک زندہ
 جاوید حقیقت بھی ہے۔ ان کی بچوں کے لیے لکھی ہوئی یہ نظم بھی فلم ”دی دی“ 1959 میں بطور نغمہ استعمال
 ہوئی ہے۔ یہ نظم ان کے نظریات کی واضح ترجمان بھی ہے۔

ساحر لدھیانوی نے جس ہندوستان کا خواب دیکھا تھا آزادی کے بعد اس کی صورت حال
 کو دیگر گوں پایا۔ ہر طرف نفرت، خوں ریزی اور لوٹ کا بازار گرم دیکھا۔ اس لیے نونہالوں کو جدید
 ہندوستان میں جاری و ساری خامیوں کو دور کرنے پر راغب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ نظم ”بچو بناؤ دنیا
 ہندوستان“ ملاحظہ ہو۔

ہم نے سنا تھا ایک ہے بھارت
 سب ملکوں سے نیک ہے بھارت
 لیکن جب نزدیک سے دیکھا
 سوچ سمجھ کر ٹھیک سے دیکھا
 ہم نے نقشے اور ہی پائے
 بدلے ہوئے سب طور ہی پائے
 ایک سے ایک کی بات جدا ہے
 دھرم جدا ہے، ذات جدا ہے

ساحر لدھیانوی کی یہ نظم بھی فلم ”دی دی“ 1959 کی اہم کڑی ہے۔ اس نظم کا ایک ایک مصرعہ
 سچائی پر مبنی نظر آتا ہے۔ اس سے بچوں کو بچہتی کا درس بھی ملتا ہے۔ اس میں سرمایہ دارانہ نظام کی چال
 بازیوں پر لعن اور سب کے ساتھ بھائی چارگی، نیکی اور اچھائی کی ترغیب ملتی ہے۔ اس نظم سے ساحر
 لدھیانوی کے نظریات کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔

ساحر لدھیانوی بچوں کی فطرت کے راز داں تھے۔ انہوں نے اپنی نظموں کو موضوع اور سالیب
 بیان کے لحاظ سے بچوں کی فطرت سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی نظموں میں
 مناظر فطرت کا بیان بھی جگہ جگہ ملتا ہے۔ ساحر لدھیانوی بچوں کو قدرت کے حسین دلکش نظاروں کے مانند
 تصور کرتے ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی یہ خوبصورت ”لوری“ جس میں مناظر فطرت کے دلکش
 نظاروں کے بیان کے ساتھ ممتا کے آنچل کی چھاؤں اور نرم تھکی بھی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

رات آگئی چن کے نظارے بھی سو گئے
 ندیا کو نیند آگئی ، دھارے بھی سو گئے
 نیلے گنگن کے راج دُلا رے بھی سو گئے
 سویا ہوا ہے چاند ستارے بھی سو گئے
 نیندیں کھلی ہوئی ہیں نشلی ہواؤں میں!
 سو جا رے لاڈلے مرے آنچل کی چھاؤں میں

ماں جو ممتا کی مورت ہوتی ہے۔ جس کی آغوش بچے کے لیے راحت جاں ہوتی ہے۔ جو اپنے بچے کے لیے ہر دکھ اٹھانے کے لیے ہر لمحہ تیار ہوتی ہے۔ ہر حال میں اپنے بچے کو خوش اور کامیاب دیکھنا چاہتی ہے۔ ہمیشہ اپنے جگر گوشے کو ہر پل اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود اسے اپنے بچے کا مستقبل عزیز ہوتا ہے۔ ساحر لدھیانوی ماں کے اپنے بچے کے تئیں ان جذبات کا احترام کرتے ہیں۔ نظم ”میرا دُتا“ ملاحظہ ہو۔

تو میرے ساتھ رہے گا مئے!
 میں تجھے رحم کے سائے میں نہ پلنے دوں گی
 زندگانی کی کڑی دھوپ میں جلنے دوں گی
 تاکہ تپ کے تو فولاد بنے
 ماں کی اولاد بنے
 تو میرے ساتھ رہے گا مئے!
 جب تلک ہوگا، ترا ساتھ نبھاؤں گی میں
 پھر چلی جاؤں گی اس پار کے سنائے میں
 اور تاروں سے تجھے جھانکوں گی
 زخم سینے میں لیے پھول نگاہوں میں لیے
 تیرا کوئی بھی نہیں میرے سوا
 میرا کوئی بھی نہیں تیرے سوا
 تو میرے ساتھ رہے گا مئے!

ساحر لدھیانوی کی یہ نظم ”ترم شول“ 1978 کا نغمہ بنی۔ اس نظم میں ایک ماں اپنے بچے کو فولاد بنانا چاہتی ہے۔ تاکہ اس کی موت کے بعد اس کا بچہ زندگی کی کڑی دھوپ میں تنہا چل سکے۔ عیش و آرام کے سایے تلے پل کر اگر اس کا بچہ بڑا ہوتا ہے تو پھر اس کی موت کے بعد اس کا بچہ زندگی کے طویل سفر میں تنہا پریشان ہو کر رہ جائے گا۔ کیوں کہ اس کے بعد اس کا اس بھری دنیا میں کوئی نہیں ہوگا۔ کتابوں سے محبت کرنا، حصول علم کی جستجو میں لگے رہنا اور محنت و مشقت کے ساتھ زندگی گزارنا

بچوں کے فکری پہنچ تک رسائی یہ ایسے عنوانات ہیں جو ساحر لدھیانوی کی نظموں کے اہم موضوع رہے ہیں۔ ان کی نظم ”بچوں کی سرکار“، ”بچے ہے مہمان“، ”میرے مٹنے“، ”نٹھی پری“، ”نٹھی لاڈلی“، ”ممی کے لیے ایک گیت“، ”بھتیہا کو سندھیا“، ”ماماجی کا راکٹ“، ”او بیٹا۔۔۔“، ”مرغا، مرغی“، ”اوبچوں لو بات“، ”سچ کا بول بالا“، ”کہتے ہیں اسے پیسا بچو!“ اور ”نٹھے گلغام“ اسی ضمن کی نظمیں ہیں۔

ساحر لدھیانوی کی نظم ”نٹھے گلغام“ میں ان کے ترقی پسندانہ خیالات کی جھلکیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔ لیکن اس میں کہیں بھی ان کا فن مجروح نہیں ہونے پایا ہے۔ یہ نظم فلم ”جاگرتی (بیداری)“ 1977 کا نغمہ بھی ہے۔ اس میں ایک ماں اپنے بچے پر اپنی ہر خوشی قربان کر دینا چاہتی ہے، اپنا سکھ، چین اور آرام سب کچھ اپنے بچے کے نام کر دینا چاہتی ہے، لیکن اپنے بچے کے اوپر زمانے کی بدنامی و رسوائی کا سایہ تک نہیں پڑنے دینا چاہتی ہے اس کا کہنا ہے کہ میری قسمت میں تو یہ زمانے کی بدنامی اور رسوائی لکھی تھی، لیکن تیرا دامن ان برائیوں سے پاک و صاف ہونا چاہئے۔ ملاحظہ ہو۔

اے میرے نٹھے گلغام

میری نیندیں تیرے نام

تیرا بچپن پاک رہے

مجھ پر تو ہیں سوا الزام

ان گلیوں کی قسمت ہے

ٹوٹے گجرے جھوٹے جام

زخمی سازوں کی جھنکار

گھائل گیتوں کی گنجار

دکھتے من کی چیخ پکار

عیاشوں کے کھیل کا نام

ان کو چوں میں ہوتا ہے

ارمانوں کا قتل عام

مختصر یہ کہ ساحر لدھیانوی بچوں کی دنیا کے اہم شاعر ہیں۔ ان کی نظموں کی زبان شگفتہ، شائستہ اور خوش اسلوب ہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے بے شمار نظمیں، گیت اور لوری تخلیق کی ہیں جو کہ موضوع، زبان اور اسلوب ہر اعتبار سے بچوں کی تخلیق کہی جاسکتی ہیں۔ مجھے کہنے دیجیے کہ ساحر لدھیانوی کی یہ تمام نگارشات اردو ادب اطفال کا بیش بہا سرمایہ ثابت ہوں گی نیز ادب اطفال کے سرمایے میں اضافے کا سبب بھی بنیں گی۔

نشہ مکت بھارت میں ادب اطفال کی اہمیت

کسی بھی معاشرے کی تعمیر کا انحصار اس کی نئی نسل پر ہوتا ہے۔ اگر بچوں کی تربیت مضبوط اخلاقی بنیادوں پر کی جائے تو وہ معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آج کے دور میں جب نشہ ایک خطرناک سماجی مسئلہ بن چکا ہے تو اس کے سد باب کے لئے محض قوانین کافی نہیں بلکہ فکری اور ادبی تربیت بھی ناگزیر ہے اس ضمن میں اطفال ادب ایک مؤثر اور دیرپا ذریعہ ہے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب بھی ادب مضبوط رہا معاشرہ بھی مضبوط رہا۔ انیسویں اور بیسویں صدی کا ادب اس کی روشن مثال ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بچوں کو دوبارہ وہی معیاری، فلاحی اور تعمیری ادب فراہم کریں اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو نہ صرف ڈپریشن اور ذہنی مسائل کم ہوں گے بلکہ نشہ جیسی لعنت کا خاتمہ بھی ممکن ہو سکے گا۔ ایسے میں ادب اطفال کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب بھی ادب مضبوط رہا معاشرہ بھی مضبوط رہا۔ انیسویں اور بیسویں صدی کا ادب اس کی روشن مثال ہے۔ بیسویں صدی کا ادب اطفال ان تمام خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے۔ وہ محض تفریح نہیں بلکہ تہذیب، اقتدار اور روایات کا آئینہ دار تھا۔

اس دور کے بچے جس ادب کو پڑھ کر پروان چڑھے وہ کردار سازی کا بہترین نمونہ تھا۔ یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ انیسویں صدی کا اطفال ادب تفریح کے ساتھ ساتھ فلاحی تربیت کا مکمل نظام تھا۔ خصوصاً ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے شہرہ آفاق ناول مراۃ العروس کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ ادب کے ذریعے ایک پوری نسل کی تربیت ممکن ہے۔ اکبری اور اصغری کے کردار صرف کہانی نہیں بلکہ عملی زندگی کے نمونے تھے۔ جنہوں نے گھریلو سماجی اور اخلاقی ذمہ داریوں کو واضح کیا۔ اس ناول کو اطفال ادب کے زمرے میں اس لیے رکھا جاسکتا ہے کیونکہ یہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کی تربیت کے لئے بچوں کی نفسیات کو مد نظر رکھ کر تخلیق کیا تھا۔

ادب اطفال اردو ادب کی ایک نہایت اہم اور با مقصد صنف ہے۔ جس کا بنیادی ہدف بچوں کی ذہنی، اخلاقی اور فکری تربیت ہے۔ ادب اطفال کے آغاز و ارتقاء کا سہرا مرزا اسد اللہ خاں غالب کے سر باندھا جاسکتا ہے غالب جنہیں عموماً ایک دقیق اور بلند آہنگ شاعر کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے اپنی

شاعری میں ایسے سادہ اور دلنشین اشعار بھی رکھتے ہیں جو بچوں کی فہم اور دلچسپی سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ قادر نامہ کے کچھ اشعار ۛ

وہ چراوے باغ میں میوہ جیسے پھاند جانا یاد ہو دیوار کا
پل ہی پر سے پھیر لائے ہم کو لوگ ورنہ تھا اپنا ارادہ پار کا
واہ بے لڑکے پڑھی اچھی غزل
شوق ابھی سے ہے تجھے اشعار کا

یہ چند اشعار اس امر کے بین ثبوت ہیں کہ وہ ادب اطفال سے یکسر غافل نہ تھے۔ بلکہ بچوں کی نفسیات اور ذوق سادہ کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ ان میں سادگی بیان روانی اور معصومانہ شوخی پائی جاتی ہے جو بچوں کے ذوق کے عین مطابق ہے۔ اور اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ غالب کے یہاں بھی ادب اطفال کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں اسی سلسلہ میں الطاف حسین حالی کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ حالی اردو نظم کے عظیم مصلح اور معلم شاعر تھے اگرچہ انکی پہچان زیادہ تر اصلاحی ہے اور تعلیمی نظموں سے وابستہ ہے۔ انہوں نے بچوں کے لئے بھی نہایت عمدہ سبق آموز نظمیں تخلیق کی ہیں۔ بلی اور چوہا۔ مرغی اور اس کے بچے۔ شیر کا شکار جیسی نظمیں اسکی روشن مثال ہیں حالی کی نظموں کا اسلوب نہایت سادہ رواں اور دلنشین ہے وہ کبھی معلم کی حیثیت سے بچوں سے ہم کلام ہوتے ہیں اور کبھی خود بھی طفلانہ معصومیت اختیار کر کے بچوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ انکی شاعری میں تفریح کے ساتھ تربیت کا عنصر بھی شامل ہے جس کے ذریعہ بچوں کی نشوونما اور فکری بالیدگی ممکن ہوتی ہے۔

ادب اطفال میں جن اہل قلم نے نمایاں کردار ادا کیا ان میں اسماعیل میرٹھی کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے انھوں نے قوم کے نو نہالوں کی تعلیم و تربیت کو اپنی تخلیقی کاوشوں کا محور بنایا اور نہایت سنجیدگی اخلاص اور تسلسل کے ساتھ ادب اطفال کی خدمت انجام دی۔ اسماعیل میرٹھی نے محض تفریحی ادب تخلیق کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اردو زبان کی تدریسی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے نظمیں اور کتب تصنیف کیں۔ نظمیں خدا کی تعریف۔ دوکھیاں ایک ایماندار لڑکا۔ اسلم کی بلی۔ اپنے سادہ موثر اور دلنشین اسلوب کے باعث بے حد مقبول ہوئیں۔ ان تخلیقات میں جہاں زبان میں سلاست ہے وہیں اخلاقی تربیت کا گہرا تصور بھی رونما نظر آتا ہے حقیقت یہ ہے۔ ان نظموں نے بچوں کی کردار سازی میں نمایاں کردار ادا کیا اور ایک پوری نسل کو شعور و آگہی کی روشنی عطا کی۔

اس تسلسل میں علامہ اقبال کا نام قابل ذکر ہے جن کی شاعری فکر و فلسفہ کی بلند پروازی کے باوجود بچوں کے لیے بھی یکساں طور پر دلکش اور بامعنی ہے۔ اقبال نے نہایت حکیمانہ انداز میں بچوں کے لیے ایسی نظمیں تخلیق کیں جو بیک وقت سادہ، پراثر اور سبق آموز ہیں۔ ایک پہاڑ اور ایک گلہری۔ ایک مکڑا اور ایک مٹی۔ ماں کا خواب۔ بچے کی دعا جیسی نظمیں اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔

اقبال کی نظموں میں محض تفریح کا پہلو نہیں بلکہ فکری بالیدگی، اخلاقی تطہیر اور روحانی ارتقا کے

عناصر نہایت خوبصورتی سے پیوست ہیں یہی سبب ہے کہ ادب اطفال کے باب میں اقبال کا ذکر کیے بغیر یہ روایت نامکمل تصور کی جاتی ہے۔

بیسویں صدی میں اردو رسائل نے بھی تربیت کے میدان میں اہم کردار ادا کیا جیسے ہلال، بتول، امنگ، پھول، مسرت، کھلونا میں چھپنے والے مضامین، نظمیں، کہانیاں، نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ ان میں اخلاقی سبق بھی پوشیدہ ہوتا تھا۔ یہ رسائل بچوں کو مثبت سوچ، محنت، دیانت، خود اعتمادی کی طرف راغب کرتے تھے۔

جب ہم عہد حاضر کا گہرائی سے جائزہ لیتے ہیں تو ایک واضح خلا ہمارے سامنے آتا ہے وہ روایت جو کبھی مطالعہ کتاب دوستی اور علمی ذوق سے وابستہ تھی اب ماند پڑتی جا رہی ہے۔ نئی نسل کتابوں سے دور اور سوشل میڈیا، فلموں اور ڈراموں کی طرف زیادہ مائل ہو چکی ہے۔ یہ امر محض ترجیحات کی تبدیلی نہیں بلکہ ذہنی و تہذیبی ساخت میں ایک بڑی تبدیلی کی علامت ہے۔ آج کا بچہ پڑھنے کے بجائے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے اور جو کچھ اسے دکھایا جا رہا ہے وہی اس کی فکری مزاج اور شخصیت کو تشکیل دے رہا ہے چونکہ یہ تمام ذرائع براہ راست ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں پیش کیا جانے والا مواد غیر معمولی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ بد قسمتی سے اس مواد کا بڑا حصہ سطحی، غیر سنجیدہ اور بعض اوقات اخلاقی اعتبار سے مضر ہے جو نئی نسل کے ذہنوں کو خاموشی سے متاثر کر رہا ہے۔ اگر ہم جدید نغمہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس کا معیار رفتہ رفتہ گرتا چلا گیا ہے وہ نئے جو کبھی امید، خودی، محنت اور اعلیٰ اقدار کا پیغام دیتے تھے۔ اب ان کی جگہ ایسے گیتوں نے لے لی ہے جن میں سطحیت اور منفی رجحانات نمایاں ہیں خصوصاً سچھ گانوں میں نشہ الکحل اور بے راہ روی کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے جیسے یہ کامیابی، آزادی یا جدید طرز زندگی کی علامت ہوں۔ ان کی زبان نہ صرف غیر معیاری ہے بلکہ خطرناک بھی ہے کیونکہ یہ بچے ذہنوں کو بہت جلد اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

موسیقی کی دلکش دھنوں کے ساتھ جب سطحی الفاظ پیش کیے جاتے ہیں تو ان کا اثر اور بھی گہرا ہو جاتا ہے اور بچے و نوجوان لاشعوری طور پر ان تصورات کو قبول کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے معاشرے میں نشہ محض ایک برائی نہیں رہا بلکہ بعض حلقوں میں اسے فیشن اور اسٹیٹس سمبل کے طور پر دیکھا جانے لگا ہے۔ یہ صورت حال نہایت افسوسناک ہے کیونکہ یہ نہ صرف ایک فرد بلکہ پورے معاشرے کی اخلاقی بنیادوں کو کمزور کر رہی ہے۔

نئی نسل بغیر کسی تنقیدی شعور کے ان رجحانات کی تقلید کر رہی ہے جس کے نتیجے میں وہ ایک ایسی راہ پر گامزن ہو رہی ہے جس کی منزل تباہی ہے۔ یہ رجحان دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب اور فن اپنی اصل روح سے محروم ہو جائیں تو وہ اصلاح کے بجائے بگاڑ کا ذریعہ بن جاتے ہیں ایسے نازک اور فیصلہ کن دور میں ہمیں ایک بار پھر ان عظیم ادباء اور شعراء کی ضرورت ہے جنہوں نے ادب کو شعور، بیداری اور اصلاح کا وسیلہ بنایا۔ مرزا غالب نے فکری گہرائی عطا کی۔ علامہ اقبال نے خودی، عمل

اور بلند ہمتی کا درس دیا جبکہ اسماعیل میرٹھی نے بچوں کی معصوم دنیا میں اخلاق، سچائی اور سادگی کے چراغ روشن کئے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم ادب اور نغمہ نگاری کو دوبارہ اس کے اصل مقصد یعنی اصلاح معاشرہ کی طرف لوٹائیں۔ ایسا ادب اطفال تخلیق کیا جائے جو نئی نسل کو اعلیٰ اقدار کی طرف مائل کرے۔ انہیں خودی، محنت اور علم کی اہمیت بتائے۔ نشہ اور دیگر برائیوں سے دور رہنے کا شعور دے جب بچوں کو مثبت اور تعمیری مواد فراہم کیا جائے تو ان کی سوچ، رویے اور زندگی کا رخ خود بخود درست سمت اختیار کرے گا۔

☆☆☆



شعبہ اردو میں منعقد یک روزہ قومی سیمینار بعنوان ”ہندوستانی فلم اور اردو“ میں ڈاکٹر انیتا رائی [پرنسپل آئی این مہیلا پی جی کالج، میرٹھ] اظہار خیال کرتے ہوئے اسٹیج پر موجود ہیں دائیں سے ڈاکٹر آصف علی، پروفیسر جمال احمد صدیقی، پروفیسر ونیش کمار، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز اور ڈاکٹر ریاض احمد



میرٹھ کے معروف اسٹیج اداکار سریندر شرما کو شعبہ اردو کے صدر پروفیسر اسلم جمشید پوری، محترم پربھو دیال بالمیکی اور اُچا کے اراکین محترم نل شرما، محترم بھارت بھوشن شرما اور کنور سنگھ بے چین خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے۔

ذہن اطفال پر اردو کہانیوں کے مثبت اثرات

موجودہ ڈیجیٹل دور نے انسانی زندگی کے تقریباً ہر شعبے کو متاثر کیا ہے۔ بظاہر ترقی، سہولت اور رفتار کے اس عہد میں جہاں انسان نے بے شمار مادی کامیابیاں حاصل کی ہیں، وہیں ذہنی سکون، خاندانی روابط اور اخلاقی اقدار کو شدید نقصان بھی پہنچا ہے۔ خاص طور پر بچوں کی ذہنی اور نفسیاتی نشوونما ایک ایسا موضوع ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی بھی معاشرے کی صحت اور مستقبل کا اندازہ اس کے بچوں کی ذہنی کیفیت، فکری تربیت اور اخلاقی رویوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ اگر نئی نسل ذہنی طور پر مضبوط، تخلیقی اور اخلاقی اقدار سے آراستہ ہو تو معاشرے کا مستقبل روشن ہوتا ہے، لیکن اگر بچوں کی تربیت میں غفلت برتی جائے تو اس کے اثرات پوری قوم کو بھگتنا پڑتے ہیں۔

بچوں کی شخصیت سازی میں ادب ہمیشہ سے ایک مؤثر ذریعہ رہا ہے۔ ادب خواہ کسی بھی زبان کا ہو، انسانی جذبات، خیالات اور احساسات کی آبیاری کرتا ہے۔ اردو ادب خصوصاً بچوں کے ادب کی ایک شاندار روایت رکھتا ہے۔ اردو کہانیاں نہ صرف تفریح طبع کا سامان فراہم کرتی ہیں بلکہ بچوں کی فکری، اخلاقی، لسانی اور سماجی تربیت میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

انسان کی فطرت میں ادب سے رغبت پیدا انہی طور پر موجود ہوتی ہے۔ ایک نومولود بچہ جب دنیا میں آتا ہے تو ماں اسے لوریاں سنا کر خاموش کرتی ہے۔ بچہ الفاظ کے معنی نہیں سمجھتا لیکن آواز کی مٹھاس، محبت کا احساس اور الفاظ کی موسیقیت اسے سکون پہنچاتی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب اور کہانی انسان کی فطرت کا حصہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی اداروں میں ابتدائی جماعتوں سے ہی نظمیں، کہانیوں اور اخلاقی اسباق کو نصاب کا حصہ بنایا جاتا رہا ہے۔

ماضی میں مشترکہ خاندانی نظام بچوں کی تربیت کا ایک مضبوط ذریعہ تھا۔ دادا، دادی، نانا، نانی رات کے وقت بچوں کو اپنے گرد جمع کر کے مختلف کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ یہ کہانیاں صرف وقت گزاری یا تفریح کا ذریعہ نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان کے ذریعے بچوں کو اخلاقیات، شجاعت، سچائی، ایمانداری، صبر، محنت اور انسان دوستی جیسے اوصاف سکھائے جاتے تھے۔ بچے انہی کہانیوں سے کردار سازی کے بنیادی اصول سیکھتے اور اپنی زندگی کے لیے مثالیں حاصل کرتے تھے۔

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ حالات تبدیل ہوتے گئے۔ مشترکہ خاندانی نظام کمزور پڑتا گیا،

والدین مصروفیات کا شکار ہوتے گئے اور بچوں کے لیے وقت نکالنا مشکل ہوتا گیا۔ آج بیشتر خاندانوں میں والدین صبح سے شام تک معاشی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ نتیجتاً بچوں کو وہ معیاری وقت میسر نہیں آتا جو ان کی ذہنی نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ ایسے میں موبائل فون، ٹیبلٹ اور دیگر ڈیجیٹل آلات بچوں کے مستقل ساتھی بن چکے ہیں۔

آج کا بچہ اپنی فرصت کا زیادہ تر وقت موبائل اسکرین پر گزارتا ہے۔ سوشل میڈیا کی مختصر ویڈیوز، کارٹونز اور گیمز وقتی طور پر دلچسپی تو پیدا کرتے ہیں لیکن اکثر اوقات وہ بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو محدود کر دیتے ہیں۔ مسلسل اسکرین کے استعمال سے توجہ کی کمی، جلد اکتاہٹ، تنہائی پسندی اور مطالعے سے دوری جیسے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ ایسے حالات میں اردو کہانیاں بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے ایک بہترین متبادل ثابت ہو سکتی ہیں۔

اردو کہانیوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ بچوں کے تخیل کو وسعت دیتی ہیں۔ جب بچہ کوئی کہانی سنتا یا پڑھتا ہے تو وہ اپنے ذہن میں کرداروں، مقامات اور واقعات کی تصویریں بناتا ہے۔ یہی عمل اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے۔ تخیل دراصل ہر بڑی ایجاد، دریافت اور کامیابی کی بنیاد ہوتا ہے۔ جو بچے اچھی کہانیاں پڑھتے ہیں وہ عموماً زیادہ تخلیقی اور اختراعی سوچ کے حامل ہوتے ہیں۔

اردو کہانیاں بچوں کی زبان دانی میں بھی نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ کہانیوں کے ذریعے بچے نئے الفاظ سیکھتے ہیں، جملوں کی ساخت کو سمجھتے ہیں اور اپنی اظہار خیال کی صلاحیت بہتر بناتے ہیں۔ زبان صرف ابلاغ کا ذریعہ نہیں بلکہ سوچنے کا وسیلہ بھی ہے۔ جتنی بہتر زبان ہوگی، اتنی ہی بہتر سوچ پروان چڑھے گی۔ اردو کہانیاں بچوں کو اپنی قومی اور تہذیبی زبان سے جوڑنے کا اہم ذریعہ ہیں۔

اخلاقی تربیت کے حوالے سے بھی اردو کہانیوں کی اہمیت مسلم ہے۔ بچوں کو براہ راست نصیحتیں اکثر جھل محسوس ہوتی ہیں لیکن جب وہی بات ایک دلچسپ کہانی کے ذریعے بیان کی جائے تو بچے نہ صرف اسے دلچسپی سے سنتے ہیں بلکہ اسے اپنی زندگی کا حصہ بھی بنا لیتے ہیں۔ اردو ادب میں ایسی بے شمار کہانیاں موجود ہیں جو سچائی، امانت داری، ہمدردی، محنت اور قربانی جیسے اعلیٰ انسانی اوصاف کو اجاگر کرتی ہیں۔

اردو کہانیاں بچوں میں مطالعے کی عادت بھی پیدا کرتی ہیں۔ جو بچے بچپن سے کتابوں سے دوستی کر لیتا ہے، وہ زندگی بھر علم اور شعور کے سفر سے جڑا رہتا ہے۔ مطالعہ انسان کو مختلف تجربات، خیالات اور ثقافتوں سے روشناس کراتا ہے۔ ایک اچھی کتاب دراصل خاموش استاد کی حیثیت رکھتی ہے جو ہر وقت رہنمائی کے لیے موجود ہوتی ہے۔

نفسیاتی اعتبار سے بھی کہانیاں بچوں کے لیے انتہائی مفید ہیں۔ مختلف کرداروں کے حالات اور مسائل کو پڑھ کر بچے جذبات کو سمجھنا سیکھتے ہیں۔ ان میں ہمدردی، برداشت اور دوسروں کے احساسات کا احترام پیدا ہوتا ہے۔ یہی خصوصیات آگے چل کر انہیں ایک بہتر انسان اور ذمہ دار شہری بناتی ہیں۔

اردو کہانیاں ہماری تہذیب، ثقافت اور روایات کی محافظ بھی ہیں۔ ہر زبان اپنے ساتھ ایک تہذیبی ورثہ لے کر چلتی ہے۔ اگر نئی نسل اپنی زبان اور ادب سے دور ہو جائے تو رفتہ رفتہ اپنی ثقافتی شناخت سے بھی محروم ہونے لگتی ہے۔ اردو کہانیوں کے ذریعے بچوں کو اپنی تاریخ، روایات، قومی شخصیات اور سماجی اقدار سے آگاہ کیا جاسکتا ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ والدین، اساتذہ اور معاشرے کے تمام ذمہ دار افراد بچوں کو اردو کہانیوں کی طرف راغب کریں۔ گھروں میں کہانی سنانے کی روایت کو دوبارہ زندہ کیا جائے، اسکولوں میں کہانی خوانی کے پروگرام منعقد کیے جائیں، بچوں کے لیے معیاری اردو ادب شائع کیا جائے اور جدید ٹیکنالوجی کو بھی اردو کہانیوں کے فروغ کے لیے استعمال کیا جائے۔

اختتامیہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کہانیاں محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ بچوں کی ذہنی، فکری، اخلاقی اور جذباتی تربیت کا ایک مؤثر وسیلہ ہیں۔ موجودہ دور کے چیلنجز کے باوجود اگر ہم اپنے بچوں کو اردو کہانیوں سے جوڑنے میں کامیاب ہو جائیں تو نہ صرف ان کی شخصیت بہتر بنائی جاسکتی ہے بلکہ ایک باکردار، باشعور اور متوازن معاشرے کی بنیاد بھی رکھی جاسکتی ہے۔ بچوں کے ذہنوں کو روشن کرنے، ان کے خوابوں کو وسعت دینے اور ان کے کردار کو نکھارنے میں اردو کہانیوں کا کردار آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا ماضی میں تھا، بلکہ موجودہ حالات میں اس کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔



ادب نمائے پروگرام بعنوان ”مرثیہ کی تحت اللفظ“ خوانی میں پروفیسر زماں آزر دہ، پروفیسر اسلم جمشید پوری، پروفیسر ناشرفقوی، پروفیسر ریشما پروین، محترم سید سراج مہدی، محترم اشجع رضا زیدی، ڈاکٹر ضیاء عالم، ڈاکٹر عفت ذکیہ اور دیگر شرکاء

ادب اطفال کا درخشندہ ستارہ: شفیع الدین نیر

بلاشبہ بچوں کی تربیت اور ان کے اخلاق و آداب دنیا کے کسی بھی انسانی معاشرے کی بنیاد ہوتے ہیں۔ کیونکہ بچے بلا تفریق مذہب و ملت کسی بھی قوم کا مستقبل اور گلشن انسانیت کے وہ شگفتہ پھول ہوتے ہیں کہ اگر ان کی آبیاری صحیح خطوط پر نہ کی جائے تو وہ بہت جلد مر جھکا جاتے ہیں اور اگر ان کی تربیت بہترین اور منظم ڈھنگ سے ہو تو یہی پھول ایک توانا اور خوشبودار معاشرے کی ضمانت بنتے ہیں۔ اسی بنا پر نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کے تمام مذاہب نے بچوں کی پرورش و پرداخت اور ان کے اخلاق حسنہ پر بہت زور دیا ہے۔ ادب اطفال سے مراد ہی ایسا ادب ہے جو بچوں کو صحیح طریقے پر ان کی عادات و اطوار، اخلاقی ضابطے، شائستگی، بڑوں کا ادب و احترام، چھوٹوں سے پیار و محبت، والدین اور بزرگوں کی عزت و توقیر، سچ کی تلقین، جھوٹ سے پرہیز، نرم گفتگو، بات چیت میں جی، آپ، شکریہ، مہربانی، قبلہ، محترم جیسے الفاظ کا صحیح استعمال، کھانے کے آداب، میل جول اور سماجی آداب، بغیر اجازت کسی کی چیز کو ہاتھ نہ لگانا، کسی سے ملنے وقت سلام، آداب یا ہائے، ہیلو میں پہل کرنا، مہمانوں کے سامنے شور و شغف اور ہول و لعب سے پرہیز نیز ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کرنا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ”ادب اطفال“ محض چند رسمی باتوں یا چیزوں کا نام نہیں بلکہ یہ وہ قیمتی سرمایہ ہے جو انسان کو عروج تک لے جاتا ہے۔ کیونکہ اس بات میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ جو بچے ادب سے عاری ہوتے ہیں اور اسی سچ پر بڑے ہو جاتے ہیں بے شک وہ علم کے باوجود معاشرے میں وہ مقام حاصل نہیں کر پاتے جو ایک باادب انسان کے حصے میں آتا ہے کہ معاشرے میں ہر کسی کا منظور نظر ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر مولانا اسماعیل میرٹھی سے لے کر مولانا الطاف حسین حالی، مولانا آزاد، افسر میرٹھی اور کچھ بعد میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، صالحہ عابد حسین، قدسیہ زیدی، مشتاق احمد اعظمی، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر وغیرہ پر مشتمل ایک طویل فہرست ہے جن کی تحریروں نے ملک و قوم کے نو نہالوں کی زندگی بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور بہت ہی عمدہ خطوط پر ان کی تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ ”ادب اطفال“ کے حوالے سے ایک ایسا ہی ”آب زر“ سے لکھا جانے والا نام شفیع الدین نیر کا بھی ہے۔

آج عالمی دنیا میں اپنی مستحکم شناخت و انفراد بنا چکا ہندوستان کا موقر ادارہ یعنی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے ابتدائی سفر میں مفکر قوم، دانشور، سابق صدر جمہوریہ ہند اور ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین نے

جو بچوں سے ہندوستان کے سابق اور پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی مانند بے انتہا محبت کرتے تھے، نے بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی تربیت و آداب پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے نصابی و غیر نصابی کتابوں کی اہمیت کو محسوس کیا۔ انہوں نے اس دور کے ماہر فن ادب و شعر اکو ”ادب اطفال“ کی تخلیق کرنے کی طرف راغب کیا اور اس فہرست میں بشمول ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، محمد مجیب، صالحہ عابد حسین، شفیع الدین نیر، حسین حسان، قدسیہ زیدی، عبدالواحد سندھی، عبدالغفار، پروفیسر عبدالغفور، مشتاق احمد اعظمی، سعید انصاری، ڈاکٹر سلامت، حامد حسین قادری، رشید احمد صدیقی، کوثر ماہر پوری، مسلم ضیائی، شجاع احمد قائد، آل احمد سرور، نور الحسن ہاشمی، منصور حسین خاں، رئیس احمد اور خلیل الرحمن اعظمی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

درج بالا مصنفین نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے ذریعے بچوں کے لیے جاری کردہ رسالہ ”پیام تعلیم“ میں نوہال قوم کے لیے اپنی تخلیقی نگارشات پیش کر کے ادب اطفال کے ارتقا میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس سلسلے میں رشید احمد صدیقی اطہر پرویز کی کتاب ”گلیلی“ کے پیش لفظ میں تحریر فرماتے ہیں

”اردو میں عام طور پر بچوں کے لیے جو کچھ لکھا گیا اسے پڑھ کر پرکھنے سے استادوں کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے یا پھر نانی اماں سے سنی ہوئی جنوں اور پریوں کی کہانی یاد آ جاتی ہے۔ ان کے بیان میں وہ چاشنی اور لہجہ بھی نہیں ملتا جو نانی اماں کی کہانیوں سے ملتا ہے۔ جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے پہلے پہل بچوں کے ادب پر باضابطہ توجہ کی اور ان کے لیے ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھی اور اسے اس طرح دلچسپ بنایا جائے جس طرح جنوں اور پریوں کی کہانیاں ہوتی ہیں۔“

[رشید احمد صدیقی، پیش لفظ، گلیلی، گلیلی، اطہر پرویز، اردو گھر، علی گڑھ، ص 11، جولائی 1958ء]

یہاں ہم جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک ایسے ہی ادیب و شاعر شفیع الدین نیر کے بارے میں روشنی ڈالیں گے جنہوں نے ”ادب اطفال“ کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ شفیع الدین نیر بچوں کے وہ بڑے ادیب اور شاعر ہیں جنہوں نے زندگی کے چراغ بجھنے تک اپنی روشنی سے ”ادب اطفال“ کو منور رکھا۔ حد تو یہ ہے کہ انہوں نے اس سے ہٹ کر کبھی لکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ انہوں نے بچوں کے لیے جو کچھ بھی لکھا وہ یہ سوچ کر لکھا کہ وہ ایک مقدس اور انسانی فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ان کے تعلق سے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کی تخلیقات نے اردو جاننے والوں کی کم و بیش چار نسلوں کی ذہنی تربیت میں نمایاں حصہ ادا کیا۔

شفیع الدین نیر نے مولانا اسماعیل میرٹھی کی قائم کردہ روایت کو نہایت دلچسپ اور خوبصورت انداز میں آگے بڑھایا اور آج ان کی شناخت بھی ”بچوں کے شاعر“ کے طور پر مستحکم ہو چکی ہے۔ شفیع الدین نیر کی پہلی تعلیمی نظم ”صبح“ 1926ء میں شائع ہوئی۔ ان کی زبان ہلکی پھلکی اور عام فہم ہے۔ بچوں کو ان کی

بات سمجھنے میں ذرا بھی مشکل نہیں ہوتی۔ ان کی حب الوطنی اور قومی یکجہتی پر لکھی گئی نظموں میں ”آزادی کا مبارک دن“، ”جھنڈا اونچا رہے گا“، ”دلش پری کی دعا“، ”برکھارت“، ”اچھے شہری“، ”وادی کشمیر“، ”یاد جواہر“ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی ایسی ہی نظموں کا مجموعہ ”وطنی نظموں“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

شفیع الدین نیر نے اپنی تحریروں میں وہ تمام خصوصیات استعمال کی ہیں جو ”ادب اطفال“ کے لیے ناگزیر ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا ایک مجموعہ ”بچوں کا تحفہ“ کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا جو اتنا معروف و مقبول ہوا کہ جہاں پہلا ایڈیشن 1934ء میں شائع ہوا تھا وہیں جون 1946ء تک اس کے گیارہ ایڈیشن شائع ہو چکے تھے اور تعداد اشاعت بھی چالیس ہزار تھی۔ اس کے علاوہ ان کی منظوم پہیلیوں کا مجموعہ ”گلی شکر“ کے نام سے شائع ہوا اور یہ مجموعہ بھی ایسا ہے جو ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بچوں میں آج تک مقبول ہے۔ ان کے دیگر مشہور و معروف مجموعوں میں ”منی کے گیت“، ”منی کا تحفہ“، ”بچوں کا کھلونا“ اور ”ہماری لغت“ منظر عام پر آئے۔ شفیع الدین نیر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں نہایت سادہ زبان استعمال کی۔ اس لحاظ سے اگر انہیں بچوں کا نظیر اکبر آبادی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ”اعتراف حق“ کے عنوان سے شفیع الدین نیر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے:

”ان میں بچوں کے ذہن کو سمجھنے اور ان سے محبت کرنے کی وہ صفت ہے جو پیدائشی معلم کا جوہر ہوتی ہے۔ نیز ذوق ادب اور ذوق جمال کی صنف بچوں کی رہنمائی کے لیے جس صلاحیت کی ضرورت ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔“ (پیام تعلیم، شفیع الدین نیر نمبر، ستمبر 1977ء ص 6)

شفیع الدین نیر نے نہ صرف مختلف موضوعات پر بچوں کے لیے نظمیں تحریر کیں بلکہ ”تارہ کا ڈنڈا“، ”گھر کا آئینہ“، ”لطیف شہزادی“، ”چپن مٹن“، ”پری کی چھڑی“، ”میاں مٹھو“، ”منی پرستان“ اور ”بونے کا بٹہ“ جیسی مشہور و مقبول کہانیاں بھی لکھیں۔

ہندوستان کی آزادی سے قبل ”پیام تعلیم“ کے 1926ء تا 1946ء کے شماروں میں ان کی 72 نظمیں، 10 مضامین، 8 نثری ترجمے اور 12 کہانیاں شائع ہوئیں۔ 1947ء تک شفیع الدین نیر کی شناخت ”ادب اطفال“ کے فن کار کے بطور مستحکم ہو چکی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد بھی ان کا تحقیقی سفر نئی بلندیاں طے کرتا رہا۔ اب وہ بچوں کے لیے نظمیں، لوریاں، نعت، قولی، پہیلیاں، کہانیاں اور ڈرامے لکھ رہے تھے۔ ”پوائن، تعلیمی میلے کی دھوم، تعلیمی میلہ، ایک پہیلی، باپ کی یاد وغیرہ ان کے بہترین مضامین ہیں۔

شفیع الدین نیر بچوں کے ادب کے تعلق سے اتنے مخلص تھے کہ انہوں نے بچوں کے ادب کے لیے خود کو توقف کر ہی دیا تھا اور تا عمر صرف بچوں کے لیے ہی لکھتے رہے، ساتھ ہی انہوں نے بچوں کے لیے سودمند دیگر کتابوں کا ترجمہ بھی کیا اور یہ ترجمہ شدہ کتابیں ”نہرو بال پستکالیہ، دہلی“ سے شائع

ہوئیں۔ ان کی ان کتابوں میں ”پرندوں کی دنیا“ اور ”خالہ لمبی کا خاندان“ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ایک اور یہ کارنامہ انجام دیا کہ بچوں کو مرزا غالب سے روشناس کرانے کے لیے ان کی حیات اور کارناموں پر مشتمل ”غالب کی کہانی“ اپنے جادوئی قلم سے قلم بند کی تاکہ بچے بھی غالب جیسے باکمال شاعر سے روشناس ہوں اور بچوں کے لیے یہ کام انہوں نے نہایت عام فہم زبان اور دل نشیں انداز بیان میں کیا ہے جسے بچے باسانی سمجھ سکیں۔ شیخ الدین نیر کی نثری کتابوں کی کل تعداد تینتیس ہے۔ مختصر یہ کہ شیخ الدین نیر ”ادب اطفال“ کے حوالے سے وہ درخشاں ستارہ ہیں جنہوں نے سمجھ لیا تھا کہ بچے ہی قوم کا مستقبل ہوتے ہیں۔ اگر ان کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہوگی تو یہی نو نہال ملک و قوم کا مستقبل سنوار سکتے ہیں۔ اسی سوچ نے انہیں بچوں کے ادب کے لیے وقف کر دیا اور ”ادب اطفال“ میں اپنی بہترین تخلیقات سے خوبصورت اضافہ کیا۔ اسی سبب وہ ادب اطفال کے آسمان پر ایک درخشندہ ستارے کی مانند ہمیشہ چمکتے رہیں گے۔



چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے اٹل سبھا گار میں منعقد پہلے ڈاکٹر معراج الدین احمد میموریل لیکچر اور ایوارڈ کی تقریب میں دائیں سے ایم۔ ایل۔ اے محترم رفیق انصاری، ڈاکٹر نواز دیوبندی، ایڈووکیٹ بدر محمود، پروفیسر اسلم جمشید پوری اور دیگر مہمانان محترمہ کا منابر ساد کو ایوارڈ پیش کرتے ہوئے۔

بہار میں ادب اطفال کی روایت اور چند نمائندہ قلم کار

بچوں کا ادب صرف کہانیوں، نظموں یا تفریح کا نام نہیں، بلکہ یہ نئی نسل کی اچھی تربیت، خوبصورت سوچ اور بہترین کردار سازی کا ایک مضبوط ذریعہ ہے۔

بہار کی سر زمین علم و ادب کی زرخیز زمین رہی ہے۔ یہاں بڑے ادیبوں اور شاعروں نے بچوں کے لیے بھی لکھا، مگر افسوس یہ رہا کہ ادب اطفال پر سنجیدہ تنقیدی گفتگو کم ہوئی۔ پھر بھی کچھ اہل قلم نے اس میدان میں قابل قدر کوششیں کیں۔ مختلف رسائل، کتابوں اور سیمیناروں کے ذریعے بچوں کے ادب کو نئی پہچان ملی اور یہ احساس بیدار ہوا کہ بچوں کے لیے لکھنا دراصل مستقبل کے لیے لکھنا ہے۔

بچوں کا ادب وہ آئینہ ہے جس میں بچے اپنی معصوم دنیا دیکھتے ہیں۔ اچھی کہانیاں انہیں سچ بولنا سکھاتی ہیں، نظمیں ان کے دل میں محبت جگاتی ہیں اور سبق آموز تحریریں انہیں ماں باپ کی عزت، استاد کے ادب اور بڑوں کے احترام کا شعور دیتی ہیں۔ جب ایک بچہ کسی کہانی میں ایماندار کردار کو کامیاب دیکھتا ہے تو اس کے دل میں بھی سچائی کی شمع روشن ہوتی ہے۔

آج کے دور میں جب موبائل، انٹرنیٹ اور مصروف زندگی نے بچوں کو کتابوں سے دور کر دیا ہے، تب بچوں کے ادب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بچوں کو ایسی کتابیں دیں جو ان کے دل و دماغ کو روشنی بخشیں۔ ایسی تحریریں جن میں اخلاق ہو، محبت ہو، انسانیت ہو اور اپنے وطن و معاشرے سے وفاداری کا جذبہ ہو۔

بچوں کی نفسیات بہت نازک ہوتی ہے۔ وہ نصیحت سے زیادہ عمل اور کہانی سے سیکھتے ہیں۔ اگر ہم انہیں پیار بھرے انداز میں اچھے کرداروں کی مثالیں دیں تو وہ بات ان کے دل میں اتر جاتی ہے۔ ایک چھوٹی سی کہانی کبھی کبھی وہ اثر چھوڑ دیتی ہے جو لمبی تقریریں بھی نہیں چھوڑ پاتیں۔ ادب اطفال کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تعلیم کے ساتھ تربیت بھی دیتا ہے۔ یہ بچوں کے اندر ہمدردی، بھائی چارہ، سچائی، محبت اور بلند حوصلگی جیسی خوبیاں پیدا کرتا ہے۔ یہی ادب ایک بچے کو اچھا انسان بننے کا راستہ دکھاتا ہے۔

بہار میں بچوں کے ادب کا سرمایہ اگرچہ بہت وسیع نہیں، لیکن جو کام ہوا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ کئی شاعروں اور ادیبوں نے اپنی تحریروں سے بچوں کے دلوں میں خوشبو بکھیرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تخلیقات میں معصومیت بھی ہے، سبق بھی ہے اور زندگی کی روشنی بھی۔ آج ضرورت اس بات کی ہے

کہ ادب اطفال کو مزید فروغ دیا جائے۔ اسکولوں، لائبریریوں اور ادبی محفلوں میں بچوں کے لیے پروگرام ہوں، کہانی سنانے کی نشستیں ہوں، اور بچوں کو اچھی کتابوں سے جوڑا جائے۔ کیونکہ کتاب سے جڑا ہوا بچہ کبھی اندھیروں میں نہیں بہکتا۔

بہار میں بچوں کا ادب لکھا گیا ہے لیکن تنقیدی نظر ڈالنے کی پہل بہت کم ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمن غوثی کی ایک کتاب ۲۰۰۵ء میں آئی تھی جس میں ان کے رسالہ ”مسرت“ کے حوالے سے زیادہ مواد تھا۔ بہار میں ادب اطفال کے سلسلہ میں تاریخ ضرور رقم ہوئی ہے کیونکہ کردار کی جزئیات کے ساتھ کلی طور پر توازن و تناسب کا گہرائی سے خواہ نظم کا حصہ ہو یا نثر کا ہو ملتا ہے۔ حالانکہ بہار میں ادب اطفال پر نثری حصہ کم لکھا گیا ہے لیکن موضوع کی خارجی اور داخلی شخصیت کے متعدد پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شاعروں نے بھی تواتر سے عطر گل پھیلانے کی کوشش کی ہے جو ادب آموز ہے اور ان کی کارکردگی کے لئے جلوہ نما ہے۔

بہار میں بچوں کے ادب کو فروغ دینے میں بچوں کے رسائل و جرائد نے نہایت اہم اور یادگار کردار ادا کیا ہے۔ ان رسائل نے نہ صرف بچوں کو دلچسپ اور سبق آموز ادب فراہم کیا بلکہ نئی نسل کے اندر مطالعے کا شوق، اخلاقی قدریں اور تخلیقی سوچ بھی پیدا کی۔ اگر بہار سے شائع ہونے والے بچوں کے رسائل پر نظر ڈالی جائے تو ایک خوبصورت ادبی تاریخ سامنے آتی ہے۔ 1950ء میں شائع ہونے والا رسالہ ”وطن“ بچوں کے ادب کے ابتدائی اور اہم رسائل میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد 1953ء میں پٹنہ سے خالد رشید صبا کی ادارت میں ”نو بہار“ منظر عام پر آیا، جس نے بچوں میں ادب سے دلچسپی بڑھانے میں نمایاں رول ادا کیا۔

جمشید پور سے ہرنس سنگھ دوست کی ادارت میں ”طفل“ شائع ہوا، جبکہ پٹنہ سے 1966ء میں ڈاکٹر ضیاء الرحمن غوثی کی نگرانی میں ”مسرت“ نے بچوں کے ادب کو نئی سمت دی۔ اسی طرح بہار شریف سے رضوان رضوی کی ادارت میں ”بچوں کا ڈائجسٹ“ شائع ہوا، جسے بچوں اور نوجوان قارئین میں خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔

سہرام سے شفق کی ادارت میں ”انوارِ صبح“، پٹنہ سے نفیس ارشد ہاشمی کی نگرانی میں ”شاہین کاکس“ اور درجہ سنگھ سے خصال احمد کرمی اور ڈاکٹر نہال کی ادارت میں ”آج کے نو نہال“ جیسے رسائل نے بچوں کی علمی اور اخلاقی تربیت میں اہم حصہ لیا۔ اسی سلسلے میں گیا سے جمال الدین ساحل کی ادارت میں ”شہد“ سہرام سے وزین معصوم کے زیرِ اہتمام ”خوشبو“ اور ”بچوں کی دنیا“، ”زمین کے تارے“ اور ”اطفال ادب“ جیسے رسائل بھی قابلِ ذکر ہیں۔ خاص طور پر ”اطفال ادب“ نے 1994ء میں گیا سے تمنا مظفر پوری کی سرپرستی اور ایم اے کرمی کی ادارت میں بچوں کے ادب کو نئی تازگی بخشی۔

ان کے علاوہ بہار شریف سے ”تربیت“، درجہ سنگھ کے مدرسہ احمدیہ سلفیہ سے سہ ماہی ”شگوفہ“، پٹنہ کے سبزی باغ سے ”تہفہ“ اور گیا سے ”غنچہ“ جیسے رسائل کی اشاعتوں کا بھی سراغ ملتا ہے، جنہوں نے

اپنے محدود وسائل کے باوجود بچوں کے ادب کی شمع روشن رکھنے کی کوشش کی۔
حقیقت یہ ہے کہ یہ رسائل صرف کاغذ کے چند صفحات نہیں تھے بلکہ بچوں کی تعلیم، تربیت اور
ذہنی نشوونما کے خوبصورت مراکز تھے۔ ان رسائل نے بچوں کے اندر اچھے اخلاق، علم دوستی، تخلیقی صلاحیت
اور اپنی زبان و تہذیب سے محبت پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر عطا عابدی نے اپنی کتاب ”خوشبو خوشبو نظمیں“ کے دیباچے میں موجودہ دور کے ایک
نہایت اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اُن کے مطابق آج الیکٹرانک میڈیا نے بچوں کی دنیا کو اس قدر
متاثر کر دیا ہے کہ کتاب اور مطالعے کی اہمیت پہلے جیسی نہیں رہی۔ مختلف کارٹون چینلز اور حیرت انگیز مناظر
بچوں کے ذہن کو ایسی خیالی اور طلسماتی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں حقیقت، اخلاق اور انسانی قدروں کی
جگہ سنسنی اور عجیب و غریب چیزیں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں۔

وہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ آج تعلیم کا مقصد زیادہ تر اچھی ملازمت اور
آرام دہ زندگی حاصل کرنا بن گیا ہے۔ چاہے سائنس ہو یا آرٹس، نصابی کتابوں کے موضوعات زیادہ تر
معاشی کامیابی کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ یقیناً روزگار اور اقتصادی استحکام زندگی کے لیے ضروری ہیں،
لیکن اگر تعلیم صرف دولت اور آسائش تک محدود ہو جائے تو اخلاقیات، انسانیت اور کردار سازی پیچھے رہ
جاتی ہے۔ ڈاکٹر عطا عابدی کا درد یہی ہے کہ جدید دور کی تعلیم اور میڈیا بچوں کے دل میں اچھے اخلاق،
ہمدردی، سچائی اور انسان دوستی جیسے جذبات پیدا کرنے میں خاموش دکھائی دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ
معاشرہ ظاہری ترقی تو کر رہا ہے، مگر وہ خوبصورت انسانی قدریں آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہیں جو کسی بھی
مہذب سماج کی اصل پہچان ہوتی ہیں۔

اسی لیے وہ ادب اطفال کی اہمیت پر زور دیتے ہیں، کیونکہ اچھی نظمیں، کہانیاں اور کتابیں ہی
بچوں کے اندر محبت، تہذیب، شرافت اور انسانیت کی روشنی پیدا کر سکتی ہیں۔

بہار میں بچوں کے ادب کو فروغ دینے میں کئی ادیبوں اور ادیبائوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔
شکیلہ اختر، سہیل عظیم آبادی، پروفیسر اشرف جہاں، ڈاکٹر قیام نیر، ذکیہ مشہدی، نزہت نبیلہ اور مظفر
مظفر پوری جیسے قلم کاروں نے بچوں کے لیے نہایت دلچسپ، سبق آموز اور دل کو چھو لینے والی کہانیاں تحریر
کیں۔ ان کہانیوں میں تفریح کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت اور اچھی زندگی کا پیغام بھی شامل ہوتا ہے۔

ان ادیبوں کی تحریروں میں بچوں کی معصوم دنیا، اُن کے خواب، جذبات اور روزمرہ زندگی
کے خوبصورت پہلو بڑی سادگی اور دلکشی کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ کہیں سچائی کی جیت دکھائی دیتی ہے،
کہیں محنت کا پھل، کہیں دوستی کی مٹھاس اور کہیں ہمدردی اور انسانیت کا سبق۔

بہار میں بچوں کی کہانیوں کے کئی اہم مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں، جنہوں نے ادب اطفال
کے ذخیرے کو مزید مالا مال کیا۔ تمنا مظفر پوری کا ”مظفند بچے“، ثناء احمد صدیقی کی ”سات ننھی منی
کہانیاں“، رحمن حمیدی کی ”گڑیا رانی“، سلطان آزاد کی ”سناچ کو آچ نہیں“، کہکشاں توحید کی ”ننھی

راہبر، اور میر احمد آزاد کا ”آؤ کہانی سنتے ہیں“ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان کتابوں میں بچوں کے لیے ہر رنگ کی کہانیاں موجود ہیں۔ کہیں دلچسپ واقعات ہیں، کہیں نصیحت بھری حکایتیں، کہیں خوابوں کی دنیا اور کہیں حقیقت سے جڑے سبق آموز قصے۔ یہی تنوع بچوں کے ادب کو دلکش بناتا ہے اور بچوں کو پڑھنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ تمام ادیب اور کتائیں اس بات کا خوبصورت ثبوت ہیں کہ بہار میں ادب اطفال کی روایت نہ صرف زندہ ہے بلکہ مسلسل آگے بڑھ رہی ہے، اور نئی نسل کے دلوں میں علم، اخلاق اور محبت کی روشنی بکھیر رہی ہے۔

بہار میں بچوں کے ادب کی بات کی جائے تو سب سے پہلے عبدالغفور شہباز کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے بے شمار خوبصورت اور سبق آموز نظمیں لکھیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان کا کوئی باقاعدہ شعری مجموعہ شائع نہ ہو سکا، لیکن ان کی تخلیقات آج بھی اپنی مٹھاس اور اثر کے ساتھ یاد کی جاتی ہیں۔ اسی طرح سید غلام رسول قوس نے بھی بچوں کے لیے دلنشین نظمیں اور رباعیات تخلیق کیں۔ اگرچہ ان کی کتابیں عام طور پر منظر عام پر نہیں آسکیں، مگر ان کے کلام میں بچوں کی معصوم دنیا، اچھی تربیت اور اخلاقی پیغام صاف محسوس ہوتا ہے۔

بہار میں ادب اطفال کا یہ سفر ناظم میوانی سے لے کر صغیر بلگرامی تک مسلسل جاری رہا۔ ان شاعروں نے اپنی نظموں کے ذریعے بچوں کے دلوں میں اچھے اخلاق، بڑوں کی عزت، سچائی، محنت اور انسان دوستی جیسے خوبصورت جذبے پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی شاعری صرف تفریح نہیں تھی بلکہ نئی نسل کی کردار سازی کا ایک خوبصورت وسیلہ بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان شعراء کی تخلیقات آج بھی بچوں کے ادب میں اہم مقام رکھتی ہیں اور نئی نسل کے لیے روشنی کا کام کرتی ہیں۔

شکیل الرحمن، جنہیں ادبی دنیا میں محبت سے ”بابا سائیں“ کہا جاتا ہے، اردو تنقید کے ایک منفرد اور جمالیاتی شعور رکھنے والے ادیب تھے۔ انہوں نے جہاں تنقیدی ادب میں اپنی الگ پہچان قائم کی، وہیں بچوں کے ادب کو بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال کیا۔ ان کی بچوں کے لیے لکھی گئی تحریروں میں کہانی، حکایت، تاریخ، تصوف اور اخلاقی اقدار کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ بابا سائیں کی بچوں سے متعلق تحریروں میں معصوم ذہنوں کی نفسیات اور دلچسپیوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ان کی کہانیاں محض تفریح فراہم نہیں کرتیں بلکہ بچوں کے اندر انسان دوستی، سچائی، برداشت اور علم کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں زبان کی سادگی اور بیان کی دلکشی بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

ان کی کہانیوں کا مجموعہ ”بابا سائیں کی کہانیاں“ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں مختلف رنگ کی کہانیاں شامل ہیں۔ کہیں تاریخی شخصیات بچوں کے قریب آتی دکھائی دیتی ہیں، کہیں جانوروں اور پرندوں کے ذریعے سبق آموز باتیں بیان کی گئی ہیں اور کہیں مزاح کے پیرائے میں زندگی کی حقیقتوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ”حضرت امیر خسرو اور بچے“ جیسی کہانی بچوں کو ادب، موسیقی اور ذہانت کی دنیا سے روشناس کرائی ہے، جب کہ ”ملا نصر الدین ہندوستان آئے“ میں ظرافت اور دانائی کا خوبصورت امتزاج

ملتا ہے۔

اسی طرح، ”لکھی اور کلزا“ اور ”کچھو اور مینڈک“ جیسی کہانیوں میں علامتی انداز اختیار کیا گیا ہے جس کے ذریعے بچوں کو محنت، احتیاط اور عقل مندی کا درس دیا گیا ہے۔ ”بابا گرونا تک اور بچے“ میں مذہبی رواداری، محبت اور انسانیت کا پیغام نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ ٹکلی الرحمن کی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں میں صرف قصہ گوئی نہیں بلکہ تہذیبی شعور اور فکری بالیدگی بھی موجود ہے۔ انہوں نے بچوں کے ادب کو محض تفریح تک محدود نہیں رکھا بلکہ اُسے تربیت اور شخصیت سازی کا ذریعہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی دلکشی اور معنویت رکھتی ہیں۔

مظہر امام اردو ادب کی ایک منفرد اور باوقار شخصیت تھے۔ انہوں نے نہ صرف بڑوں کے ادب میں اپنی الگ پہچان بنائی بلکہ بچوں کے لیے بھی نہایت خوبصورت، دلچسپ اور سبق آموز نظمیں لکھیں۔ بچوں کے ادب کی طرف اُن کی توجہ 1960ء کے آس پاس زیادہ ہوئی، اور پھر اُن کے قلم سے ایسی تخلیقات سامنے آئیں جن میں معصومیت بھی تھی اور زندگی کا پیغام بھی۔

”ہم ایک ہیں“، ”آؤ کھلونے کھیلنے والو“، ”روٹی اور چاند“، ”آج کا ترانہ“ اور ”شریر غزلیں“ جیسی نظمیں بچوں میں بے حد مقبول رہیں۔ ان نظموں میں کھیل کود کی خوشی بھی ہے، محبت اور اتحاد کا سبق بھی، اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کی خوبصورت عکاسی بھی۔

مظہر امام اپنی نفاستِ فکر اور جدید اندازِ اظہار کے لیے خاص شہرت رکھتے تھے۔ اردو ادب میں اُن کی سب سے بڑی شناخت ”آزاد غزل“ کے موجد کے طور پر ہوئی۔ وہ ادب میں نئے تجربات کے حامی تھے اور ہمیشہ روایت کے ساتھ جدت کو جوڑنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب انہوں نے ”آزاد غزل“ کا تجربہ پیش کیا تو ادبی حلقوں میں کافی بحث ہوئی، کئی لوگوں نے اعتراض بھی کیا، مگر وہ اپنے نظریے پر مضبوطی سے قائم رہے اور دلیل و محبت کے ساتھ اپنے فن کا دفاع کرتے رہے۔ اُن کی پیدائش 12 مارچ 1928ء کو مونگیر میں ہوئی۔ اُن کے والد محکمہ ڈاک میں ملازم تھے۔ اگرچہ اُن کا آبائی تعلق بکسر کے قریب سونی پٹی سے تھا، لیکن اُن کی ادبی زندگی کا ایک اہم حصہ درہنگہ سے جڑا رہا۔ درہنگہ میں اُن کی رہائش گاہ ”امیر منزل“ ادبی محفلوں کا مرکز بھی جاتی تھی اور اہل قلم کے لیے ایک معروف ادب کدہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ بعد میں وہ مستقل طور پر دہلی منتقل ہو گئے، جہاں 30 جنوری 2012ء کو اُن کا انتقال ہوا۔ مگر اُن کی شاعری آج بھی زندہ ہے اور ادب کے شائقین کے دلوں میں اپنی جگہ بنائے ہوئے ہے۔ مظہر امام کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں میں زبان کی سادگی، خیال کی تازگی اور تربیت کا خوبصورت احساس ملتا ہے۔ انہوں نے بچوں کے دل میں محبت، بھائی چارہ، خواب اور انسانیت کے چراغ روشن کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

علقہ شبلی اردو ادب کی اُن اہم شخصیات میں شمار کیے جاتے ہیں جنہوں نے شاعری اور نثر، دونوں میدانوں میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ بڑوں کے ادب کے ساتھ ساتھ انہوں نے بچوں کے

لیے بھی نہایت خوبصورت اور سبق آموز تحریریں تخلیق کیں۔ بچوں کے لیے ان کی تین معروف کتابیں ”تارے زمین کے“، ”پھول آنگن کے“ اور ”بوستان کی کہانیاں“ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں میں بچوں کی معصوم دنیا، اچھے اخلاق اور خوبصورت خوابوں کی جھلک صاف محسوس ہوتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بیس سے زیادہ درسی کتابیں بھی تحریر کیں، جو ان کے تعلیمی شعور اور بچوں سے محبت کا روشن ثبوت ہیں۔

”پھول آنگن کے“ ان کا ایک نہایت دلکش شعری مجموعہ ہے، جس میں اٹھائیس نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔ ان کی نظموں میں زبان کی سادگی، احساس کی مٹھاس اور تربیت کا خوبصورت انداز ملتا ہے، جو بچوں کے دل کو آسانی سے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

علاقہ شیلی کا تعلق بہار کے ایک گاؤں میر غیاث چک سے تھا، اگرچہ بعد میں ان کی زندگی کا زیادہ حصہ کلکتہ میں گزرا، مگر وہ ہمیشہ اپنے بہاری ہونے پر فخر کرتے رہے۔ اسی نسبت سے انہیں بہار کے اہم ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے 1950ء کے بعد باقاعدہ طور پر بچوں کے لیے لکھنا شروع کیا اور نظموں کے ساتھ رباعیات بھی تخلیق کیں۔ چونکہ وہ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے، اس لیے بچوں کی نفسیات، ان کی دلچسپیوں اور ذہنی کیفیت کو بخوبی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں بچوں کے دل کے قریب محسوس ہوتی ہیں اور ان میں تعلیم کے ساتھ تربیت کی خوشبو بھی شامل رہتی ہے۔

ثوبان فاروقی جدید اردو شاعری کے ان اہم شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں جنہوں نے اپنے منفرد انداز فکر اور جدید لہجے سے ادبی دنیا میں خاص پہچان بنائی۔ ان کا تعلق بہار کے ضلع ویشالی کے تاریخی شہر حاجی پور سے تھا، جہاں وہ ایک کالج میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ ادبی حلقوں میں انہیں جدیدیت کے مضبوط اور سنجیدہ شاعر کے طور پر جانا جاتا تھا، اور ان کا نام ان قلم کاروں میں لیا جاتا تھا جو معروف ادبی رسالہ ”شب خون“ سے وابستہ رہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ شاعری میں بلند مقام رکھنے کے باوجود ان کی پہلی شائع ہونے والی کتاب نظموں یا غزلوں کا مجموعہ نہیں تھی، بلکہ بچوں کے لیے لکھی گئی جاسوسی کہانیوں کی ایک دلکش کتاب ”رحمان کے کارنامے“ تھی۔ یہ بات اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ ان کے دل میں بچوں کے ادب کے لیے غیر معمولی محبت اور دلچسپی موجود تھی۔

کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مشہور جاسوسی کہانیاں پڑھیں اور ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ خود بھی بچوں کے لیے اسی انداز میں دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں تخلیق کرنے لگے۔ ان کی تحریروں میں تجسس بھی تھا، معصوم ذہنوں کے لیے تفریح بھی، اور ساتھ ہی ایسی باتیں بھی جو بچوں کی سوچ کو مثبت سمت دیتی تھیں۔

ثوبان فاروقی کی یہ کاوش اس بات کا خوبصورت ثبوت ہے کہ بڑا ادیب وہی ہوتا ہے جو بچوں کی دنیا کو بھی

اہم سمجھے اور ان کے لیے ادب تخلیق کرنے کو اپنے لیے باعثِ فخر جانے۔
ذکی احمد ان قلم کاروں میں شامل ہیں جو 1965ء سے مسلسل بچوں کے لیے لکھتے رہے۔
انہوں نے اپنی سادہ، دلچسپ اور پیاری نظموں کے ذریعے بچوں کے دلوں میں خاص جگہ بنائی۔ ان کی
چند کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں، جبکہ مختلف رسائل و جرائد میں ان کی تخلیقات پابندی سے چھپتی رہی
ہیں۔ ”جھولا“ اور ”میٹھے گیت“

ادب اطفال میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

”نانی کا پان دان“، ”چچا کی سائیکل“، ”نانی کا مکان“ اور ”دادی جان کی مرغیاں“ جیسی
نظمیں بچوں میں خاص طور پر پسند کی گئیں۔ ان نظموں میں گھریلو ماحول کی مٹھاس، بچپن کی شراتیں اور
معصوم جذبات نہایت خوبصورتی سے جھلکتے ہیں۔ یہی سادگی اور اپنائیت ان کی شاعری کو بچوں کے قریب
لے آتی ہے۔

ذکی احمد کی نظموں میں کھیل، محبت، ہنسی اور سبق سب کچھ ایک ساتھ ملتا ہے۔ ان کی ایک دلچسپ نظم ”مچھلی
رانی“ بچوں کی معصوم سوچ اور تخیل کی خوبصورت مثال ہے۔ اس نظم میں ایک بچہ بڑی محبت سے مچھلی کو پانی
سے باہر آکر اپنے گھر چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے معصوم انداز میں فکر بھی ہے، اپنائیت بھی اور بچپن کی
شرارتی معصومیت بھی۔ نظم کے اشعار بچوں کے دل میں فوراً جگہ بنا لیتے ہیں:

مچھلی رانی مچھلی رانی
باہر نکلو چھوڑو پانی
ساتھ چلو میرے گھر آؤ
ڈر ہے مجھ کو ڈوب نہ جاؤ

ان سادہ مگر دلکش مصرعوں میں بچپن کی معصوم دنیا پوری خوبصورتی کے ساتھ سامنے آ جاتی
ہے۔ ذکی احمد کی یہی خوبی ہے کہ وہ بچوں کی زبان میں، بچوں کے دل کی بات کہہ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہر گانوی اردو ادب اطفال کے ان روشن ناموں میں شامل ہیں جنہوں نے
اپنی پوری زندگی بچوں کے لیے معیاری اور سبق آموز ادب تخلیق کرنے میں صرف کردی۔ وہ گزشتہ کئی

دہائیوں سے مسلسل بچوں کے ذہن و دل کو خوبصورت خیالات سے روشناس کرا رہے ہیں۔ 1964ء ۱۱

سے ان کا قلم بچوں کی دنیا کو علم، خوشی اور تربیت کی روشنی دیتا آ رہا ہے۔ بچوں کے لیے ان کے سولہ ناول،
کہانیوں کے دس مجموعے، شکاریات پر ایک منفرد کتاب، ادب اطفال کی پہلی اینٹھولوجی اور متعدد نصابی
کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ ایک غیر معمولی ادبی سرمایہ ہے جو ان کی محنت، لگن اور بچوں سے محبت کا واضح
ثبوت پیش کرتا ہے۔ صرف تخلیقی ادب ہی نہیں بلکہ انہوں نے بچوں کے ادب پر تنقیدی اور تحقیقی کام بھی
بڑے خوبصورت انداز میں کیا۔ ”میر تقی میر: بچوں کے شاعر“، ”مرزا محمد رفیع سودا: بچوں کے
شاعر“، ”سعادت حسن منٹو: بچوں کے کہانی کار“، ”عزیز احمد: بچوں کے ناول نگار“ اور ”ایم اسلم: بچوں

کے ناول نگار، جیسی اہم کتابیں اس بات کی گواہ ہیں کہ وہ ادبِ اطفال کو سنجیدہ ادبی حیثیت دلانے میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ ان کی کہانیوں کی کتاب ”جیسے کویتسا“ کو 2012ء میں سہتیہ اکیڈمی، دہلی کی جانب سے انعام سے نوازا گیا، جو بھارت سرکار کا ایک نہایت باوقار ادبی اعزاز مانا جاتا ہے۔ یہ کامیابی نہ صرف اُن کے لیے بلکہ اردو ادبِ اطفال کے لیے بھی باعثِ فخر ہے۔ ڈاکٹر ہرگانوی نے بچوں کے لیے بے شمار نظمیں بھی لکھی ہیں، جن میں محبت، اخلاق، سچائی اور اچھی عادتوں کا خوبصورت پیغام ملتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ مختلف موضوعات پر مضامین بھی تحریر کرتے رہے ہیں تاکہ نئی نسل علم و شعور سے جڑی رہے۔

پروفیسر عبدالمنان طرزی نے بچوں کے لیے نہایت سادہ، دلکش اور آسان زبان میں ایسی نظمیں تخلیق کیں جو دل کو چھو لینے کے ساتھ ساتھ اچھی تربیت کا پیغام بھی دیتی ہیں۔ اُن کی دو معروف کتابیں ”پیارے نظمیں“ اور ”میٹھی نظمیں“ بچوں کے ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں لفظوں کی مٹھاس بھی ہے اور زندگی کی خوبصورت سچائیاں بھی۔ تقریباً نوے نظموں پر مشتمل اس شعری سرمایہ میں انہوں نے بچوں کے ننھے ذہنوں کے لیے علم، اخلاق، محبت اور اچھے کردار کی روشنی سمیٹ دی ہے۔ اُن کی شاعری صرف پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ بچوں کے دل و دماغ کو سنوارنے کے لیے بھی ہے۔

پروفیسر طرزی کی نظموں میں معصومیت کے ساتھ نصیحت کا ایسا خوبصورت انداز ملتا ہے جو بچوں کو بوجھ محسوس نہیں ہوتا بلکہ وہ خوشی خوشی اچھی باتیں سیکھتے چلے جاتے ہیں۔ کہیں محنت کا سبق ہے، کہیں سچائی کی اہمیت، کہیں والدین کی عزت کا پیغام اور کہیں اچھے انسان بننے کی ترغیب۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے نہ صرف بچوں کے آج کو خوبصورت بنانے کی کوشش کی بلکہ اُن کے روشن مستقبل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا کلام بچوں کے ادب میں ایک خوشبودار اور یادگار اضافہ مانا جاتا ہے۔

ان کی چابی کا کھلونا، قلم بھی ہے:

قلم نے ہم کو ہے علم بخشا
ہماری اس سے ہے علم دانی
قلم سے عظمت ہماری قائم
قلم سے پائی ہے سر بلندی
قلم سے پایا وقار ہم نے
ہماری اس سے ہے نام داری

(قلم)

شہد جمیل اردو ادب کی ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ انہوں نے غزل، نظم، ماہیہ، کہکرنی اور دوسری شعری اصناف میں اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا۔ ادب میں اُن کی سب سے نمایاں پہچان ”غزل

نما“ کے موجد کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تنقید کے میدان میں بھی اُن کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ بچوں کے ادب سے بھی اُن کا گہرا تعلق رہا ہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے نہایت دلچسپ، سبق آموز اور تجسس سے بھرپور نظمیں اور کہانیاں لکھیں، جنہیں بچوں نے بہت پسند کیا۔ اُن کی تحریروں میں تفریح کے ساتھ ساتھ اخلاقی پیغام اور مثبت سوچ بھی شامل رہتی ہے۔ شاہد جمیل کی بچوں کے لیے لکھی گئی آٹھ کہانیوں کا مجموعہ ”سرخ آنکھ“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کہانیوں میں سنسنی، تجسس اور معصوم ذہنوں کے لیے دلچسپ واقعات کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے، جو بچوں کو شروع سے آخر تک اپنے ساتھ باندھے رکھتا ہے۔

اسی طرح اُن کا ایک جاسوسی ناول ”آدم خور انسان“ ماہنامہ ”غنیچہ“ بجنور میں قسط وار شائع ہوتا رہا، جسے قارئین نے بے حد دلچسپی سے پڑھا۔ بعد میں یہ ناول کتابی شکل میں بھی منظر عام پر آیا اور بچوں و نوجوانوں میں مقبول ہوا۔ شاہد جمیل کی تحریروں کی خاص بات یہ ہے کہ وہ بچوں کے ذوق اور نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اُن کی کہانیوں میں دلچسپی بھی ہے، تخیل کی پرواز بھی، اور ایسی باتیں بھی جو بچوں کے ذہن کو مثبت انداز میں متاثر کرتی ہیں۔

ظفر کمالی کی شاعری بچوں کے دل و دماغ کو ایک نئی روشنی عطا کرتی ہے۔ اُن کی نظمیں صرف لفظوں کی خوبصورتی تک محدود نہیں رہتیں بلکہ بچوں کے اندر اچھے اخلاق، محبت، محنت اور انسانیت جیسے خوبصورت جذبات بھی پیدا کرتی ہیں۔ وہ نہایت سادہ مگر مؤثر انداز میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو سیدھے دل میں اتر جاتی ہیں۔ اُن کے کلام کی خاص بات یہ ہے کہ بچے نظم پڑھتے ہوئے لطف بھی محسوس کرتے ہیں اور زندگی کے اہم سبق بھی سیکھ لیتے ہیں۔ کہیں بھائی چارے کا پیغام ہے، کہیں نفرت سے بچنے کی تلقین، کہیں محنت کی عظمت بیان کی گئی ہے اور کہیں بلند حوصلوں کے ساتھ آگے بڑھنے کا درس۔

مثلاً ”بھائی چارا“، نظم میں وہ انسانوں کے درمیان محبت اور برابری کا خوبصورت پیغام دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک رنگ، ذات یا مذہب سے زیادہ اہم انسانیت ہے۔ یہی جذبہ بچوں کے دل میں اتحاد اور آپسی احترام پیدا کرتا ہے۔

اسی طرح ”نفرت“، نظم میں وہ بڑی سادگی سے سمجھاتے ہیں کہ نفرت انسان کے دل کو تاریک کر دیتی ہے اور گھروں کی خوشیاں چھین لیتی ہے۔ بچوں کو محبت اور امن کی راہ دکھانے کا یہ انداز نہایت مؤثر معلوم ہوتا ہے۔ ”کام کریں“، نظم میں محنت کی اہمیت کو اس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ بچے خود بخود عمل کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اُن کے اشعار یہ احساس دلاتے ہیں کہ عزت، راحت، کامیابی اور عظمت سب محنت کے راستے سے حاصل ہوتی ہیں۔ جبکہ ”حوصلوں کی اڑان“ میں بچوں کو بلند خواب دیکھنے اور ہمت نہ ہارنے کا پیغام دیا گیا ہے۔ شاعر یہ بتاتے ہیں کہ مضبوط ارادے رکھنے والے لوگ ہی آسمانوں کو چھوتے ہیں اور ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔

ظفر کمالی کی یہ نظمیں بچوں کے اندر نہ صرف زبان و بیان کا ذوق پیدا کرتی ہیں بلکہ اُن کے

کردار اور سوچ کو بھی خوبصورتی کے ساتھ سنوارتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا کلام بچوں کے ادب میں ایک خوشگوار اور روشن احساس کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ چند نظموں کے ٹکڑے ملاحظہ ہوں:

کوئی گورا ہو یا وہ کالا ہو
کوئی ادنیٰ ہو یا کہ اعلیٰ ہو
شیخ ہو برہمن ہو لالا ہو
چاہے سید ہو یا گوالا ہو
بھائی چارا بہت ضروری ہے

(بھائی چارا)

نفرتیں گھر تباہ کرتی ہیں
دل بشر کا سیاہ کرتی ہیں

(نفرت)

محنت سے ہی عزت ہے
محنت سے ہی راحت ہے
محنت سے ہی شہرت ہے
محنت سے ہی عظمت ہے
کام کریں ہم کام کریں

(کام کریں)

ناوک حمزہ پوری اُن ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں جنہوں نے بڑوں کے ادب کے ساتھ بچوں کے ادب کو بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال کیا۔ وہ مسلسل بچوں کے لیے لکھتے رہے اور اپنی تحریروں کے ذریعے نئی نسل کے دلوں میں ادب، اخلاق اور خوبصورت سوچ کی روشنی بکھیرتے رہے۔ غزل، نظم، رباعی، افسانہ، انشائیہ اور تنقید جیسے مختلف ادبی میدانوں میں اُن کی کئی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اُن کی تحریروں میں زبان کی سادگی، خیال کی گہرائی اور احساس کی مٹھاس نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی اُن کی تخلیقات میں تفریح کے ساتھ تربیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ بچوں کی نفسیات کو سمجھتے تھے، اسی لیے اُن کی نظمیں اور کہانیاں بچوں کے دل سے قریب محسوس ہوتی ہیں۔ اُن کے ادب میں محبت، سچائی، محنت، بھائی چارہ اور اچھے اخلاق کا خوبصورت پیغام ملتا ہے۔

ناوک حمزہ پوری کی ادبی خدمات اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ ادب کو صرف اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ نئی نسل کی بہتر تربیت کا ایک اہم وسیلہ سمجھتے تھے۔

”ناوک حمزہ پوری میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کی بنیاد پر بچوں کے لیے نثر

میں پہلا کتابچہ ”گل بکاؤلی“ کے نام سے لکھا جو ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد

ایک منظوم کتاب ”گلدستہ“ ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اسی سال ”چڑیا خانہ“ کے عنوان سے جانوروں پر تعارفی نظموں کا ایک کتاچہ بھی شائع ہوا۔ چوتھی کتاب ۱۹۸۸ء میں ”جانو پچانو“ کے نام سے منظومات ہی کی شائع ہوئی۔ بچوں کے لیے منظومات کی ان کی کئی کتابیں اور بھی شائع ہوئیں، جو یہ ہیں: روشنی (۲۰۰۸)، اللہ کے نام سے (۲۰۱۲)، اچھے بچے (۲۰۱۲)، اپنی ماں (۲۰۱۲) اور اسکول چلو (۲۰۱۲)۔

اس کے علاوہ ہادی اردو ریڈر کے ۶ حصے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئے۔ یہ کتابیں طلباء کی تدریسی ضروریات کے پیش نظر تحریر کی گئی ہیں۔ ۲۰۰۳ء میں اردو قواعد کے ۲ حصے اور سکندری اردو (قواعد اور کمپوزیشن) بھی شائع ہوئے۔ مریم اردو ریڈر کے ۸ حصے ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئے۔ اسی سال ”لغات“ کے نام سے ایک کتاب تذکیر و تانیث سے متعلق شائع ہوئی۔ ہادی اردو ریڈر میں ناوک حمزہ پوری نے اسمعیل میرٹھی کی طرح از اول تا آخر تمام اسباق، مضامین، کہانیاں، ڈرامے اور منظومات خود اپنی دی ہیں۔ یعنی یہ سبھی کتابیں تالیف نہ ہو کر تصنیف کا درجہ رکھتی ہیں۔“

(عطا عابدی، بہار میں بچوں ادب)

شبنم کمالی اردو ادب کی ان خوبصورت شخصیات میں شمار کیے جاتے ہیں جو خوش فکر شاعر، خوش گلو انسان اور حساس ادیب کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ ان کی شاعری میں نرمی، محبت اور دل کو چھو لینے والا احساس پایا جاتا ہے۔ بڑوں کے ادب کے ساتھ ساتھ انہوں نے بچوں کے لیے بھی نہایت پیاری اور سبق آموز تخلیقات پیش کیں۔ بچوں کے لیے ان کی تین اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جنہیں قارئین نے بے حد پسند کیا۔ نظموں کے دو مجموعے ”آؤ گیت گائیں“ اور ”گیت گاتے رہو“ بچوں کے ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان نظموں میں بچپن کی معصوم خوشیاں، اچھی باتیں اور زندگی کی خوبصورت قدریں نہایت سادہ اور دلکش انداز میں بیان کی گئی ہیں۔

شبنم کمالی کی نظموں کی خاص بات یہ ہے کہ وہ بچوں کے دل میں خوشی، امید اور محبت کے جذبات جگاتی ہیں۔ ان کے گیتوں میں زبان کی مٹھاس بھی ہے اور تربیت کا خوبصورت پہلو بھی، جس کی وجہ سے بچے انہیں دلچسپی سے پڑھتے اور گنگناتے ہیں۔ مئی ۲۰۰۸ء میں بچوں کے لیے ان کی کہانیوں کا مجموعہ ”شام وطن“ بھی شائع ہوا، جسے ڈاکٹر محمد ظفر صادق نے ترتیب دیا تھا۔ اس کتاب میں شامل کہانیاں بچوں کو وطن سے محبت، انسانیت، اچھے اخلاق اور خوبصورت سوچ کا پیغام دیتی ہیں۔ ان کی تخلیقات یہ ثابت کرتی ہیں کہ بچوں کے لیے لکھنا صرف تفریح فراہم کرنا نہیں بلکہ ان کے دل و دماغ کو اچھے خیالات اور مثبت جذباتوں سے روشن کرنا بھی ہے۔

ضیاء الرحمن غوثی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے بچوں کے ادب کو محض کہانیوں اور نظموں کی حد تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اسے ایک سنجیدہ ادبی اور تحقیقی موضوع کے طور پر بھی پیش

کیا۔ اُن کی تحریروں میں بچوں کی معصوم خواہشیں، پاکیزہ جذبات، اچھی تربیت اور اخلاقی اقدار بڑی خوبصورتی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ بچوں کی صحیح رہنمائی ہی ایک بہتر معاشرے کی بنیاد بن سکتی ہے۔ یہی جذبہ اُن کے معروف رسالہ ”مسرت“ کے ہر صفحے میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ”مسرت“ صرف بچوں کی دلچسپی کا رسالہ نہیں تھا بلکہ یہ نئی نسل کے اندر مطالعے کا شوق، اچھی عادتیں مثبت سوچ اور باکردار زندگی پیدا کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش تھی۔ ضیاء الرحمن غوثی نے ادب اطفال کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اس کی تحقیق اور تاریخ نویسی پر بھی خاص توجہ دی۔ انہوں نے اپنی ذاتی محنت، لگن اور خرچ سے چار سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ایک اہم تحقیقی کتاب ”بہار میں بچوں کا ادب (آزادی کے بعد)“ تیار کی اور شائع کروائی۔ یہ کام اُن کی علمی سنجیدگی اور ادب اطفال سے غیر معمولی وابستگی کا روشن ثبوت ہے۔ یہ کتاب بہار میں بچوں کے ادب کی تاریخ، وہاں کے ادیبوں، شاعروں، رسائل اور ادبی خدمات کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کے ذریعے آنے والی نسلوں کو نہ صرف رہنمائی ملتی ہے بلکہ یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ بچوں کا ادب کسی بھی معاشرے کی تہذیبی اور اخلاقی تعمیر میں کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ ضیاء الرحمن غوثی کی خدمات یہ ثابت کرتی ہیں کہ بچوں کے لیے لکھنا دراصل مستقبل کو سنوارنے کی ایک خوبصورت اور ذمہ دارانہ کوشش ہے۔

اسلم جمشید پوری اردو ادب کے معروف افسانہ نگار اور فکشن کے سنجیدہ ناقد کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے ادب کی دنیا میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ بڑوں کے ادب کے ساتھ ساتھ انہوں نے بچوں کے لیے بھی نہایت دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں لکھیں، جو بچوں کے دل و دماغ پر خوشگوار اثر چھوڑتی ہیں۔ بچوں کے لیے اُن کی کہانیوں کا ایک مجموعہ 1997ء میں شائع ہوا، جسے قارئین نے پسند کیا۔ اُن کی کہانیوں میں سادگی، دلچسپی اور انسانی احساسات کی خوبصورت آمیزش ملتی ہے، جس کی وجہ سے بچے آسانی سے اُن کی تحریروں سے جڑ جاتے ہیں۔

اسلم جمشید پوری کے کئی افسانوی مجموعے اور تنقیدی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ”افق کی مسکراہٹ“، ”لینڈر“ اور ”عید گاہ سے واپسی“ جیسے افسانوی مجموعے اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں، جبکہ ”اردو افسانہ: تعبیر و تنقید“ اور ”جدیدیت اور اردو افسانہ“ جیسی کتابیں اُن کی تنقیدی بصیرت اور ادبی فہم کو ظاہر کرتی ہیں۔ اُن کی تحریروں میں زندگی کے مختلف رنگ، سماجی حقیقتیں اور انسانی جذبات بڑی خوبصورتی سے پیش کیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا ادب صرف تفریح نہیں دیتا بلکہ سوچنے اور سمجھنے کا شعور بھی عطا کرتا ہے۔

عطا عابدی اردو ادب کی ایک فعال، سنجیدہ اور ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ شاعری، تنقید، مضامین نگاری اور بچوں کے ادب — ہر میدان میں اُن کی تخلیقی صلاحیتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے حمد، نعت، غزل، نظم، رباعی، ہائیکو اور تنقیدی ادب میں کئی اہم کتابیں پیش کیں، جنہیں ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اُن کے حمدیہ و لغتیہ مجموعوں میں ”آئینہ عقیدت“، ”عکس عقیدت“ اور ”افکار

عقیدت“ شامل ہیں، جبکہ غزلوں کے مجموعے ”بیاض“ اور ”نوشہ نوا“ اُن کے شعری ذوق کی خوبصورت مثال ہیں۔ ”زندگی، زندگی اور زندگی“ اُن کی نظموں کا اہم مجموعہ ہے اور ”در پچے سے“ میں رباعیات، قطعات، ہائیکو اور تہنیتی و تعزیتی نظمیں شامل ہیں۔ تنقیدی میدان میں بھی انہوں نے ”مطلّے سے آگے“ اور ”شعر اساس تنقید“ جیسی اہم کتابیں تحریر کیں۔ اس کے علاوہ ”سقوط ماسکو اور ترقی پسند ادب“ کے عنوان سے مکالمات و مذاکرات پر مشتمل ایک کتاب بھی شائع ہوئی، جو اُن کی فکری سنجیدگی کی عکاس ہے۔ بچوں کے ادب میں بھی عطا عابدی کی خدمات نہایت اہم ہیں۔ بچوں کے لیے اُن کی دو کتابیں ”مناظرے مذکر و مونث کے“ اور ”خوشبو خوشبو نظمیں اپنی“ شائع ہوئیں، جنہیں قارئین نے بے حد پسند کیا۔ ”مناظرے مذکر و مونث کے“ کہانیوں کا مجموعہ ہے، جس میں آٹھ دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں شامل ہیں، جیسے ”فیصلہ“، ”اختر کی پنسل“، ”سبق“، ”غور کا انجام“، ”کامیابی کی کنجی“ اور ”پہیلیوں کی محفل“ وغیرہ۔ ان کہانیوں میں بچوں کے لیے اخلاق، محنت، سچائی اور اچھی عادتوں کا خوبصورت پیغام موجود ہے۔ ”خوشبو خوشبو نظمیں اپنی“ بچوں کے لیے لکھی گئی اٹھائیس نظموں کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے۔ ان نظموں میں محبت، نصیحت، محنت، ہمت اور اچھے اخلاق کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ ”اے ماں“، ”ہم کو آگے جانا ہے“، ”بولو کون بہادر ہے“ اور ”محنت زندہ باد“ جیسی نظمیں بچوں کے اندر مثبت سوچ اور اچھے کردار کو اجاگر کرتی ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ عطا عابدی نے بچوں کے لیے کئی دلچسپ، معلوماتی اور اصلاحی مضامین و کالم بھی تحریر کیے، جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ اُن کی پوری ادبی کاوش اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ادب کو نئی نسل کی فکری اور اخلاقی تربیت کا ایک اہم ذریعہ سمجھتے ہیں۔

سلطان آزادی بچوں کے ادب سے وابستگی نہایت اہم اور قابل ذکر ہے۔ انہوں نے تحقیق و تنقید کے میدان میں اپنی الگ شناخت قائم کرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی دلچسپ اور سبق آموز کتابیں تحریر کیں۔ اُن کی تصانیف میں سنجیدگی، فکری پختگی اور ادبی شعور نمایاں نظر آتا ہے۔ ادب اطفال کے حوالے سے اُن کی خدمات اس لیے بھی اہم ہیں کہ انہوں نے بچوں کی ذہنی تربیت، اخلاقی اقدار اور سائنسی شعور کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ سلطان آزادی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں میں ”سائنچ کو آج نہیں“ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ یہ کہانیوں کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے جس میں سادگی، دلچسپی اور سبق آموزی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ کہانیوں کے کردار بچوں کے ماحول سے قریب محسوس ہوتے ہیں اور اُن کے ذریعے سچائی، دیانت داری اور اچھے اخلاق کا پیغام دیا گیا ہے۔ زبان نہایت آسان اور رواں ہے جس کی وجہ سے بچے ان کہانیوں سے جلد مانوس ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح، ”عظیم سائنسدانوں کی کہانیاں“ میں مشہور سائنسدانوں کی زندگی، جدوجہد اور کارناموں کو بچوں کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بچوں میں سائنسی مزاج پیدا کرنے اور انہیں علم و تحقیق کی طرف راغب کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مصنف نے خٹک معلومات کے بجائے واقعاتی انداز اختیار کیا ہے جس سے مطالعہ دلچسپ بن جاتا ہے۔ ”فنِ طباعت“ بھی اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ اس میں طباعت اور کتاب سازی کے مراحل کو

آسان پیرائے میں بیان کیا گیا ہے تاکہ بچے کتاب کی تیاری کے مختلف مرحلوں سے واقف ہو سکیں۔ یہ کتاب معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیمی اہمیت بھی رکھتی ہے۔ سلطان آزاد کی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ صرف سنجیدہ ادیب اور محقق ہی نہیں بلکہ نئی نسل کی فکری تربیت کے لیے بھی فکرمند تھے۔ ان کی تحریروں میں تفریح کے ساتھ علم، اخلاق اور شعور کی روشنی بھی شامل ہے، جو ادب اطفال کی اصل روح سمجھی جاتی ہے۔

ڈاکٹر احسان عالم کی 28 کتابیں منظر پر آچکی ہیں۔ زیادہ تر تنقیدی کتابیں ہیں۔ دو شعری مجموعے بھی ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے دو کتابیں ”بچوں کے سنگ“ اور ”آؤ بچو! تمہیں بتاؤں“ کے عنوان سے شائع ہو چکی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں بچوں کی نفسیات سے متعلق ہیں۔ بچوں کے لئے استاد کا مقام، ماں کا کردار، باپ کا کردار، بچے کیا کھائیں کیا نہ کھائیں، سوشل میڈیا کا استعمال بچے کم سے کم کریں، موبائل کے نقصانات، انٹرنیٹ اور گیمز کے نقصانات وغیرہ کو ان دونوں کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ بچوں کی حوصلہ افزائی کے لئے کچھ سائنسدانوں کے بچپن کا تذکرہ بڑے ہی خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے تاکہ ان کے زندگی بچوں کے لئے مشعل راہ بن سکیں۔

ثناء اللہ ثناء بچوں کے ادب سے گہری دلچسپی رکھنے والے ان قلم کاروں میں شامل ہیں جو نئی نسل کے لیے سادہ، دلنشین اور سبق آموز نظمیں تخلیق کر رہے ہیں۔ ان کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کا مجموعہ ”بچہ اور تلی“ اشاعت ہو گئی ہے، جس کا دیباچہ معروف ادیب حقانی القاسمی نے تحریر کیا ہے۔ اپنے دیباچے میں انہوں نے ثناء دو گھروں کی تخلیقی صلاحیتوں اور بچوں کے ادب کے لیے ان کی محنت کو سراہا ہے۔ اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں صرف نظمیں ہی نہیں بلکہ کئی خوبصورت منظوم کہانیاں اور ایک مکالماتی نظم بھی شامل ہے، جو بچوں کے لیے دلچسپی اور سیکھ دونوں کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ ”کوے اور انسان، بچوں کی ریل، چاچا نہرو، بچوں کی صبح و شام، سورج، دوستی، پھول سی تلی، کمپیوٹر اور معصوم شفا“ جیسی نظمیں بچوں کی دنیا، ان کی معصوم سوچ اور روزمرہ زندگی کے حسین پہلوؤں کو نہایت پیارے انداز میں پیش کرتی ہیں۔ اسی طرح ”غدار کی کا انجیام، لڑائی کا انجیام، احسان کا بدلہ“ اور ”مکاری کا انجیام“ جیسی منظوم کہانیوں میں بچوں کو اخلاقی سبق بڑی خوبصورتی اور آسان زبان میں دیا گیا ہے۔ ان نظموں میں نصیحت کا انداز بوجھل نہیں بلکہ دلچسپ اور دل کے قریب محسوس ہوتا ہے۔

ثناء اللہ ثناء کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی زبان نہایت سادہ، رواں اور بچوں کی سمجھ کے مطابق ہے۔ ان کی نظمیں بچوں کو صرف محظوظ ہی نہیں کرتیں بلکہ ان کے اندر دوستی، محبت، سچائی، ہمدردی اور اچھے اخلاق جیسے خوبصورت جذبات بھی پیدا کرتی ہیں۔

امان ذخیروی ایک بہترین استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سنجیدہ، باوقار اور خوش فکر شاعر بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں نیا پن، احساس کی تازگی اور موضوعات کا تنوع نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے شاعری کو نئے خیالات اور خوبصورت انداز بیان سے مالا مال کیا۔

انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1990ء کے آس پاس کیا اور پھر شاعری کی مختلف اصناف میں بھرپور طبع آزمائی کی۔ غزل، نظم اور دیگر شعری میدانوں میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں نے ادب دوستوں کو متاثر کیا۔ ان کے تین اہم شعری مجموعے ”پرنندوں کا سفر“، ”نوائے شبنم“ اور ”گلہائے آرزو“ منظر عام پر آچکے ہیں۔ ”پرنندوں کا سفر“ ہندی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان کتابوں کے بعد ان کا چوتھا مجموعہ ”آغوش میں چاند“ سامنے آیا، جو خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بچوں کی معصوم دنیا، ان کے خواب، احساسات اور خوبصورت خیالات کی عکاسی کرتی ہے۔

امان ذخیروی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ بچوں کے لیے لکھی جانے والی نظمیں صرف تفریح کا ذریعہ نہیں ہوتیں بلکہ ان کی ذہنی اور لسانی تربیت میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ جب بچے نظمیں پڑھتے، سنتے یا یاد کرتے ہیں تو انہیں نئے نئے الفاظ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ مشکل لفظوں کے معنی سمجھتے ہیں اور آہستہ آہستہ زبان و بیان پر ان کی گرفت مضبوط ہونے لگتی ہے۔

نظموں کی ایک خوبصورتی یہ بھی ہے کہ بچپن میں سیکھی ہوئی نظمیں انسان کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ یہی نظمیں بعد میں زندگی کے مختلف مرحلوں میں خوشگوار یادوں کی صورت میں ساتھ رہتی ہیں۔ امان ذخیروی کی شاعری بچوں کے دل میں زبان سے محبت، اچھے اخلاق اور خوبصورت احساسات پیدا کرنے کی ایک کامیاب کوشش معلوم ہوتی ہے۔

مجیر احمد آزاد (ڈاکٹر) افسانہ نگار کے طور پر اپنی مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ ان کے متعدد افسانوی مجموعے منظر عام پہ آچکے ہیں اور انہیں پذیرائی بھی ملی ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے میں ”آؤ کہانی سنتے ہیں“ بچوں کے لئے لکھی گئی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں گیارہ کہانیاں ہیں۔ خالد کی عید، خالہ کا گھر، دوستی، نیک کام، نصیحت، مراد کی سمجھ داری، نانی کی بکری، اچھی لڑکی، پنڈت گوپی ناتھ، آخری کوشش، مرجھائے پھول، شان ترنگا ہے، بلون والا لڑکا، انسانیت وغیرہ کہانیاں بچوں کی نفسیات، اس کی تربیت اور زبان سے دلچسپی کا اظہار یہ ہیں۔ ان کی کہانیوں میں ماجرا سازی سے بچوں میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ بچوں کے لیے ان کی کہانیاں ماہنامہ امنگ، بچوں کی دنیا، پیام تعلیم، زبان و ادب (بچوں کا)، درجہ نائنز وغیرہ رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

میں (ڈاکٹر منصور خوشتر) نے تہذیب و ثقافت سے اپنی گہری وابستگی کو برقرار رکھتے ہوئے بچوں کے لیے بھی نہایت خوبصورت اور معنی خیز نظمیں تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری شاعری میں بچوں کی معصوم دنیا کے ساتھ سماج کی سچی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میری نظمیں دل کو چھوتی بھی ہیں اور سوچنے پر مجبور بھی کرتی ہیں۔ ”آن لائن اسکول، سبزی والے، مجبور بوڑھی عورت، جاڑے کا موسم، عید کا تہوار، دیوالی، میرا دوست“ اور ”منصوبے“ جیسی نظموں میں زندگی کے مختلف رنگ بڑی سادگی اور دلکشی کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ کہیں بدلتے وقت کی جھلک ہے، کہیں تہواروں کی خوشبو، کہیں دوستی کا پیار اور کہیں انسانیت کا درد۔ اہل نظر سے میری ان نظموں کے بارے میں لکھا ہے کہ ان میں وہ چھوٹے

چھوٹے مناظر باریکی اور محبت سے پیش کئے گئے ہیں جن سے بچے آسانی سے اُن سے جڑ جاتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں جذبات کی سچائی، رشتوں کی مٹھاس اور معاشرتی حقیقتوں کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ میں نے اپنی نظموں کے ذریعے بچوں کو صرف تفریح فراہم نہیں کی بلکہ اُن کے دل میں ہمدردی، محبت، احترام اور اچھے اخلاق کے جذبات بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی خوبی شاعری کو بچوں کے ادب میں ایک الگ اور خوبصورت مقام عطا کرتی ہے۔

بہار میں ادب اطفال کی روایت اگرچہ بہت وسیع اور منظم صورت میں سامنے نہیں آ سکی، لیکن اس کے باوجود یہاں کے ادیبوں، شاعروں اور رسائل نے بچوں کے ادب کو زندہ رکھنے اور فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس سرزمین کے اہل قلم نے بچوں کے لیے ایسی نظمیں، کہانیاں اور کہانیوں تخلیق کیں جن میں تفریح کے ساتھ اخلاق، محبت، انسانیت، سچائی، محنت اور اچھے کردار کی تعلیم بھی شامل ہے۔ بہار کے بچوں کے رسائل جیسے وطن، نو بہار، طفل، مسرت، بچوں کا ڈائجسٹ، انوارِ صبح، اطفال ادب اور دیگر جرائد نے نئی نسل کے اندر مطالعے کا شوق پیدا کرنے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اسی طرح مظہر امام، علقمہ شبلی، ثوبان فاروقی، ذکی احمد، مناظر عاشق، ہرگانوی، عبدالمنان طرزی، شاہد جمیل، ظفر کمالی، ناوک حمزہ پوری، شبنم کمالی، ضیاء الرحمن غوثی، عطا عابدی، احسان عالم، ثناء اللہ ثناء، امان ذخیروی، مجیر احمد آزاد اور دیگر قلم کاروں نے اپنے منفرد انداز سے ادب اطفال کو نئی جہت عطا کی۔

ان ادیبوں کی تخلیقات میں بچوں کی معصوم دنیا، خواب، جذبات، تہذیب، قومی یکجہتی اور انسانی قدریں پوری خوبصورتی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ خاص طور پر یہ ادب بچوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنتا ہے اور انہیں ایک اچھا انسان بننے کی راہ دکھاتا ہے۔

آج کے دور میں جب موبائل، انٹرنیٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے بچوں کو کتابوں سے دور کر دیا ہے، ادب اطفال کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسکولوں، لائبریریوں اور ادبی اداروں میں بچوں کے ادب کو فروغ دیا جائے، نئی نسل کو اچھی کتابوں سے جوڑا جائے اور بچوں کے لیے معیاری ادب تخلیق کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ بچوں کا ادب صرف وقت گزاری یا تفریح نہیں بلکہ ایک بہتر، مہذب اور باکردار معاشرے کی تعمیر کی بنیاد ہے۔ بہار کے ادیبوں نے اس میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں، وہ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ادب اطفال میں اخلاقی و تربیتی اقدار کا تنقیدی جائزہ اکیسویں صدی کے تناظر میں

اردو ادب اطفال اردو زبان و ادب کا ایک نہایت اہم اور موثر شعبہ ہے جس کا بنیادی مقصد محض تفریح فراہم کرنا نہیں بلکہ بچوں کی ذہنی، اخلاقی اور سماجی تربیت کرنا بھی ہے۔ ادب اطفال دراصل ایک ایسا تخلیقی میدان ہے جہاں زبان کی سادگی، خیال کی معصومیت اور مقصد کی سنجیدگی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر ایک ایسی فضا تشکیل دیتے ہیں جو بچوں کی شخصیت سازی میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اس حوالے سے ماہرین تعلیم کا یہ قول نہایت اہم ہے کہ ”بچپن کی تربیت ہی مستقبل کی بنیاد ہوتی ہے“ [تعلیمی نفسیات، ص 45] جو اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ ادب اطفال کو ہلکی پھلکی تفریح کے درجے میں نہیں رکھا جاسکتا بلکہ یہ ایک سنجیدہ تعلیمی و اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ اسی تناظر میں اگر دیکھا جائے تو ادب اطفال نہ صرف فرد کی داخلی تربیت کرتا ہے بلکہ معاشرتی اقدار کے استحکام میں بھی بنیادی کردار ادا کرتا ہے کیونکہ بچہ اپنے ابتدائی تاثر اور سیکھنے کے مراحل میں جو کچھ قبول کرتا ہے وہی اس کی شخصیت کا مستقل حصہ بن جاتا ہے۔

اردو ادب اطفال کا ارتقائی سفر کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ابتدا سے ہی اخلاقی اور تربیتی پہلوؤں کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی نظموں میں جو سادگی، روانی، معصومیت پائی جاتی ہے وہ ادب اطفال کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ ان کی نظموں میں بچوں کو نہایت سادہ الفاظ میں محنت، دیانت اور نظم و ضبط کی تعلیم دی گئی ہے۔ ان کا یہ انداز اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ادب اطفال میں زبان اور خیال دونوں کو بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق ہونا چاہئے تاکہ وہ اسے آسانی سے سمجھ سکیں اور اس سے اثر قبول کر سکیں تاہم تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ان نظموں میں نصیحت کا عنصر غالب ہے جو بعض اوقات تخلیقی حسن کو محدود کر دیتا ہے۔

اس طرح ڈاکٹر ذاکر حسین نے ادب اطفال کے حوالے سے یہ نقطہ پیش کیا کہ تعلیم اور تربیت کو ایک مربوط عمل کے طور پر دیکھا جانا چاہئے۔ ان کے مطابق ”بچے کی تعلیم اس وقت موثر ہوتی ہے جب وہ اس کی فطری دلچسپی سے ہم آہنگ ہو“ [تعلیمی خطبات، ص 82] یہ نظریہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ادب اطفال میں اخلاقی اقدار کو براہ راست مسلط کرنے کی بجائے انہیں اس انداز میں پیش کیا جانا چاہئے کہ بچہ خود انہیں قبول کرے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے ادیبوں نے کہانی، مکالمہ اور کردار نگاری کے

ذریعہ اخلاقی تعلیم کو زیادہ موثر بنانے کی کوشش کی۔

کرشن چندر کی تحریروں اس تبدیلی کی بہترین مثال ہیں جہاں اخلاقی اقدار کو براہ راست نصیحت کی بجائے کہانی کے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کہانیوں میں انسانی ہمدردی، مساوات اور سماجی انصاف جیسے موضوعات کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کا یہ جملہ کہ ”انسان وہی ہے جو دوسرے انسان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھے“ [منتخب کہانیاں، ص 89] بچوں کے ذہن میں ایک گہرا اثر چھوڑتا ہے اور انہیں دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اگر ادب اطفال کو نفسیاتی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ بچے براہ راست نصیحت کے مقابلے میں کہانی اور کردار کے ذریعے زیادہ سیکھتے ہیں۔ جدید ماہرین نفسیات کے مطابق بچے تخیل اور مشاہدے کے ذریعے اپنی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس لیے ادب اطفال میں تخلیقی عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اکیسویں صدی میں اردو ادب اطفال کو جن چیلنجز کا سامنا ہے ان میں سب سے نمایاں چیلنج ڈیجیٹل میڈیا کا بڑھتا ہوا اثر ہے۔ آج کا بچہ موبائل، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے ذریعے دنیا سے جڑا ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کی دلچسپیاں اور ترجیحات بھی بدل گئی ہیں۔ اس صورت حال میں ادب اطفال کو اپنی پیش کش کے انداز میں جدت پیدا کرنی ہوگی۔ اگر ادب اطفال روایتی انداز پر قائم رہے گا تو وہ بچوں کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام ہو سکتا ہے اور کہا گیا ہے کہ ادب اگر زمانے کے ساتھ نہ چلے تو وہ ماضی کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے۔

اسی تناظر میں یہ ضروری ہے کہ ادب اطفال میں نئے موضوعات کو شامل کیا جائے جیسے سائنسی شعور، ماحولیاتی مسائل، عالمی ہم آہنگی اور ٹیکنالوجی کا مثبت استعمال۔ یہ موضوعات نہ صرف بچوں کی دلچسپی کو بڑھاتے ہیں بلکہ انہیں جدید دنیا کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ کرتے ہیں تاہم اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ جدیدیت کے نام پر اخلاقی اقدار کو نظر انداز نہ کیا جائے کیونکہ ادب اطفال کی اصل روح ہی اخلاقی تربیت میں مضمر ہے۔

تنقیدی اعتبار سے ایک اور اہم مسئلہ ادب اطفال میں تجارتی رجحانات کا بڑھنا ہے۔ موجودہ دور میں بہت سی ایسی کتابیں شائع ہو رہی ہیں جو محض رنگین تصاویر اور سطحی کہانیوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ یہ کتابیں وقتی طور پر بچوں کو متوجہ تو کرتی ہیں لیکن ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کرتی۔ اس کے برعکس وہ ادب جو فکری گہرائی، تخلیقی حسن اور اخلاقی پیغام کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے وہی حقیقی معنوں میں ادب اطفال کہلانے کا مستحق ہے۔

کردار نگاری کے حوالے سے بھی ادب اطفال میں نئے تجربات کی ضرورت ہے۔ ایسے کردار تخلیق کیے جانے چاہئیں جو حقیقی زندگی کے قریب ہوں اور جن کے ذریعے بچے اپنی زندگی کے مسائل کو سمجھ سکیں۔ جدید ادب اطفال میں ایسے کرداروں کی کمی محسوس کی جا رہی ہے جو بچوں کے لیے قابل

تقلید ہوں اور جن کے ذریعے وہ مثبت رویے سمجھ سکیں۔

مزید برآں اکیسویں صدی کے تناظر میں ادب اطفال میں صنفی مساوات، مذہبی رواداری اور ثقافتی ہم آہنگی جیسے موضوعات کو شامل کرنا بھی نہایت ضروری ہو گیا ہے۔ موجودہ دور کا بچہ ایک ایسے معاشرے میں پروان چڑھ رہا ہے جہاں مختلف ثقافتیں اور نظریات ایک ساتھ موجود ہیں۔ اس لیے ادب اطفال کو بھی اس تنوع کی عکاسی کرنی چاہئے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب اطفال نے اخلاقی و تربیتی اقدار کے فروغ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے لیکن موجودہ دور میں اسے نئے چیلنج کا سامنا ہے اگرچہ روایتی ادب اطفال اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے لیکن اس میں جدت اور تخلیقی تنوع پیدا کرنا ناگزیر ہو چکا ہے۔ ادب اطفال کو نہ صرف بچوں کی تفریح کا ذریعہ ہونا چاہئے بلکہ ان کی فکری اور اخلاقی تربیت کا بھی موثر ذریعہ بننا چاہئے۔

آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اردو ادب اطفال ایک زندہ متحرک روایت ہے جس میں مسلسل ارتقا کی صلاحیت موجود ہے اگر اس میں اخلاقی و تربیتی اقدار کو جدید اسلوب اور موضوعات کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا جائے تو یہ نہ صرف بچوں کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرے گا بلکہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں بھی نمایاں حصہ لے گا۔ یوں ادب اطفال مستقبل کی نسلوں کے لیے ایک مضبوط فکری اور اخلاقی بنیاد فراہم کر سکتا ہے جو کسی بھی معاشرے کی ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔

☆☆☆



محترم حقانی القاسمی اور ڈاکٹر زبیر ناز کے اعزاز یہ پروگرام میں اظہار خیال کرتے ہوئے حقانی القاسمی اور اسٹیج پر موجود ہیں دائیں سے ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، پروفیسر اسلم جشید پوری اور ڈاکٹر زبیر ناز۔

جدید اردو ادب اطفال اور خواتین سے وابستہ نئی توقعات

بچوں کے لیے لکھنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں! مگر جب خواتین نے بچوں کے لیے قلم سنبھالا تو نہ صرف لکھا بلکہ خوب لکھا۔ خواتین نے اردو ادب اطفال کو صرف الفاظ ہی نہیں دیئے بلکہ خواب دیے جو وہ ایک بچے کو سلاتے ہوئے کبھی لوری تو کبھی کہانیوں کی شکل میں سناتی چلی آئی ہیں۔ بچوں کی پلکوں پر سچے خوابوں میں وہ اپنے قلم سے حقیقت کے رنگ بھر رہی ہیں۔ ادب اطفال وہ ادب ہے جو بچوں کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو مد نظر رکھ کر لکھا جاتا ہے۔ بچہ کیا چاہتا ہے ایک ماں تب بھی سمجھ لیتی ہے جب وہ کچھ نہیں بولتا۔ وہ ماں ہو، دادی یا پھر نانی، خواتین بچے کے ساتھ زیادہ وقت گزارتی ہیں۔ بچے کے ہر لمحہ اور ہر پل کی ضرورت سے باخبر خواتین جب ادب اطفال تخلیق کرتی ہیں تو وہ ادب بچے کی نفسیات، احساسات، ضروریات اور اس کی ذہنی نشوونما میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اردو ادب اطفال کی کہکشاں میں خواتین قلم کار، ہمت، محنت اور لگن کے ساتھ بچوں کے حوصلوں کو اڑان دینے کے لیے محبت سے پُر ہنر رہی ہیں۔ بچوں کی اونچی اڑان کے لیے ان پروں کو مضبوط بنانا ہے تو خواتین کو عصر حاضر کی ضروریات سے باخبر ہونا ہوگا۔ جس کے لیے انھیں تعلیم یافتہ بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ خواتین جتنی زیادہ تعلیم یافتہ ہوں گی اتنا اچھا ادب تخلیق کر سکیں گی۔

ادب اطفال کسی بھی معاشرے کی نظریاتی، اخلاقی اور علمی تعمیر میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ ابتدائی دور کے ادب اطفال پر نظر ڈالیں تو روایتی انداز تحریر کا بنیادی مقصد اخلاقی اصلاحی اور مذہبی اقدار کی منتقلی تھا۔ نظم ہو یا نثر اس کا محور پریاں، جن، بھوت، شہزادے شہزادیاں اور گھر کے مختلف موضوعات ہوا کرتے تھے۔ ان تحریروں میں کردار اچھے یا پھر برے تھے۔ جہاں نیکی کی جیت اور بدی کو ہمیشہ ہارتے ہوئے پیش کیا جاتا تھا۔ اکیسویں صدی میں سائنس کی نئی نئی ایجادات اور ڈیجیٹل میڈیا کے فروغ نے بچوں کی نفسیات، پسندنا پسند کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ مغربی ادب اطفال پر اگر نظر ڈالیں تو وہاں ادب اور شعراء نے وقت بدلنے کے ساتھ بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ادب تخلیق کیا۔ اب جدید انداز تحریر کا بنیادی مقصد ذہنی تربیت، تجسس اور سائنسی فکر کو بیدار کرنا ہے۔

اردو ادب میں خواتین نے جب بچوں کے لیے لکھنا شروع کیا تو ان کی تحریروں کا بنیادی مقصد بچوں میں حب الوطنی، قومی یک جہتی، بزرگوں کا ادب و احترام وغیرہ جیسے اوصاف پیدا کرنا تھا۔

اس دور میں ادب اطفال میں خوابناک ماحول، طلسماتی فضا اور تخیلاتی دنیا کا جادو سرچڑھ کر بولتا تھا۔ لیلیٰ خواجہ بانو، حجاب امتیاز علی، صالحہ عابد حسین، بیگم قدسیہ زیدی وغیرہ نے کثیر تعداد میں دوسری زبانوں سے کہانیوں کو اردو زبان میں منتقل کیا۔ اس کے بعد کے دور میں رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، قراۃ العین حیدر، اشرف صبحی، اے آر خاتون، عطیہ پروین، واجدہ نسیم، جیلانی بانو، بانو سرتاج وغیرہ کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے ادب اطفال کی آبیاری میں نہایت اہم رول ادا کیا۔ ان کی تحریروں نے نہ صرف بچوں کی اخلاقی تربیت کی بلکہ اردو زبان و ادب سے ان کا رشتہ بھی مضبوط کیا۔ عصمت چغتائی نے جب بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں تو ان کی تخلیقات کا انداز روایتی اور ہندو نصائح پر مبنی نہیں بلکہ انھوں نے بچوں کو ان کی اصل نفسیات، شرارتوں، معصومانہ چالاکیوں کو جرات کے ساتھ پیش کیا۔ انھوں نے نہایت آسان اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہوئے ادب تخلیق کیا۔ رضیہ سجاد ظہیر نے کثیر تعداد میں دوسری زبانوں کی کہانیوں کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ ’ولی عہد‘ ان کی ایک طویل کہانی ہے جو ماہنامہ کھلونا میں فروری 1957 سے مئی 1957 تک قسط وار شائع ہوئی۔ ایسے ہی روسی مصنف لازار لاگن کے مشہور ناول The old genie Hottabych کا قراۃ العین نے اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ ناول کے اردو ترجمہ ’جن حسن عبدالرحمن‘ کو اردو ادب کے سائنس فکشن میں اولیت حاصل ہے۔ کشور ناہید نے نظم و نثر میں بچوں کے لیے نئے تجربے کیے۔ انھوں نے طبع زاد کہانیوں کے ساتھ روایتی کہانیاں بھی لکھیں۔ اردو ادب میں متعدد خواتین قلم کاروں نے اپنے قلم سے بچوں کی تربیت میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے کبھی ایک مشفق ماں تو کبھی ایک دوراندیش معلمہ بن کر نسل نو کی فکری تربیت کی ہے۔

اردو ادب اطفال کی ابتدائی کہانیاں اصلاحی، نصیحت آموز اور معلوماتی نوعیت کی تھیں۔ اکثر اردو ادب اطفال میں لڑکیوں کو نازک، دوسروں پر منحصر اور کسی شہزادے کی منتظر دکھایا جاتا تھا۔ بہادری اور مہم جوئی لڑکوں کے کرداروں میں نظر آتی رہی۔ لڑکوں کو ہمیشہ بہادر، مہم جو، ذہین اور مسائل حل کرنے والے کے طور پر پیش کیا گیا جبکہ لڑکیوں کے کرداروں کو گھر، باورچی خانہ اور گڑیوں کے کھیل تک محدود رکھا گیا۔ مانویہ طے کر دیا گیا ہو کہ یہ کام لڑکوں کا اور یہ کام لڑکیوں کا ہے۔ گڑیا اور گلابی رنگ لڑکیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تو لڑکوں کو نیلا رنگ اور گاڑیوں کا شوقین بنا کر پیش کیا گیا۔ ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں جو صنفی جانبداری کو پیش کرتی ہیں۔ داستانوں میں شہزادے مہم پر نکلتے ہیں، دنیا فتح کرتے ہیں اور مظلوم شہزادیاں بے بس، محلوں میں قید، جادو گروں کی شکار اور کسی نجات دہندہ کے انتظار میں بیٹھی دکھائی دیتی ہیں۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے وہ معاشرے کی جھلک ہی نہیں دکھاتا بلکہ سماج پر اثرات مرتب کرتا ہے۔ نتیجتاً لڑکے بیرونی ذمہ داریوں تک اور لڑکیاں خود کو گھریلو کاموں تک محدود کر لیتی ہیں۔ لڑکیوں کو مستقل کمزور اور ڈرپوک پیش کرنے یا کسی کی مدد کی محتاج دکھائے جانے سے حقیقی زندگی میں بھی ان کی خود اعتمادی کا گراف متاثر ہوا۔ دوسری جانب لڑکے بھی لاشعوری طور پر خود کو برتر اور لڑکیوں کو کمتر سمجھنے لگے۔ ایسا ادب پڑھتے ہوئے کئی نسلیں بڑی ہو گئیں جس کا اثر ان کی زندگی پر

پڑے بنانہ رہ سکا۔ صرف لڑکیاں ہی نہیں بلکہ لڑکے بھی نفسیاتی طور پر دباؤ کا شکار ہوئے جیسے بار بار یہ لکھا گیا کہ لڑکے نہیں روتے، تو وہ اپنے جذبات کا کھل کر اظہار تک نہیں کر پائے۔ اردو ادب کا ایک خاص حصہ بچوں کو روایتی سانچوں میں قید کرتا ہے جہاں ان کی صنف اُن کا مستقبل طے کرتی ہے۔ وقت اور ضرورت کے مطابق خواتین تخلیق کاروں نے روایتی صنفی کرداروں کے رول بدلنے پر کام شروع کیا۔ اگر ہم موجودہ جدید ادب اطفال کی بات کریں تو یہاں بچوں کو آزاد فضا فراہم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جہاں ان کی صنف نہیں بلکہ ان کی ذہانت ان کی محنت طے کرے گی کہ وہ کس قابل ہیں۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ خواتین کی کثیر تعداد ادب میں اپنی اہمیت اور موجودگی درج کر رہی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ صرف لکھ رہی ہیں یا وقت، حالات اور بچے کی نفسیاتی ضروریات کے مطابق موضوعات کا انتخاب بھی کر رہی ہیں؟ کیا وہ مہم جوئی، جاسوسی، حکمت، عقل و دانش، فلسفہ اور سائنس و ٹیکنالوجی کے موضوعات کو اپنی تخلیقات میں جگہ دے رہی ہیں؟ یا پھر آج بھی وہ گھریلو ماحول، خاندانی رشتے، احساس ہمدردی جیسے محدود دائرے میں ہی گھوم رہی ہیں؟ کیا اردو ادب اطفال میں خواتین قلم کاروں نے جے کے رولنگ کے ہیری پوٹر میں ہرمانی گرینجر Hermione Granger جیسا کوئی کردار تخلیق کیا، جو اپنی ذہانت اور علم کی بدولت لڑکوں کی رہنمائی کرتی ہے۔ شاید نہیں! اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ صنفی توازن اور لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش ضرور کرتی ہیں۔ وہ لڑکیوں کو پر اعتماد اور خود مختار دکھانے جیسے موضوعات کو قلم بند کر رہی ہیں۔ پھر بھی وہ خود کو نصیحتیں کرنے سے نہیں روک پاتیں۔ ان کی کہانیوں میں براہ راست نصیحتیں آج بھی موجود ہیں۔ وہ صنفی مساوات کا نعرہ تو بلند کرتی ہیں مگر ان کے تخلیق کیے گئے نسوانی کردار اکثر مضبوط فیصلے کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔

اردو ادب اطفال میں اب لڑکوں کو بھی حساس، روتے اور جذبات کا اظہار کرتے ہوئے دکھایا جانے لگا ہے۔ کہانیوں میں والدہ اور خواتین کرداروں کو سائنس دان، پائلٹ اور ڈاکٹر کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اسے خوش آئند ہی کہیں گے کہ اب کہانیوں کے مرکزی کرداروں میں لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر مہم جو اور ذہین دکھایا جانے لگا ہے۔ اب کہانیوں میں ماحول اور پس منظر میں بھی تبدیلیاں آرہی ہیں۔ کردار بھی حقیقت پسندانہ ہیں ساتھ ہی براہ راست نصیحت کرنے کی بجائے کہانی کو اکثر اس طرح بنا جاتا ہے کہ بچہ خود اچھے اور برے کا فیصلہ کرے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ خواتین قلم کاروں نے مادری جبلت کے باعث بچوں کے نازک جذبات اور نفسیات کو مردوں کے مقابلے زیادہ گہرائی سے سمجھ کر لکھا ہے۔ باوجود اس کے اردو ادب اطفال میں خواتین اب بھی 'مثالی خاندان' کا روایتی خاکہ ہی پیش کرتی ہیں۔ جہاں امی، ابو، دادا، دادی سب خوش و خرم زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی کہانیاں زیادہ تر پر امن گھریلو اسکول کے ماحول تک محدود ہوتی ہیں۔ خواتین اب بھی لڑکیوں کو پریوں جیسی خوبصورت، سیدھی سادی اور پیاری سی بچی کے روپ میں زیادہ پیش کرتی ہیں۔ عام طور پر خواتین کی کہانیوں کا اختتام انتہائی

خوشگوار ہوتا ہے۔ طلاق یافتہ یا ٹوٹے ہوئے خاندانوں کے بچوں کی نفسیاتی الجھنوں پر خواتین قلمکار، بچوں کے لیے لکھنے سے گریز کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بچوں کو موت کی تلخ حقیقت اور اس کے بعد کے سوگ جیسے گہرے فلسفیانہ و نفسیاتی موضوعات سے دور رکھتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ خواتین کی تحریروں میں بچوں کو صدمے سے باہر نکالنے کی نفسیاتی تربیت کا فقدان پایا جاتا ہے۔ بچوں کے لیے لکھنے والی خواتین قلمکاروں کی تحریروں میں موضوعات کا محدود ہونا اور ان کا چند مخصوص دائروں میں گھومنا ایک اہم علمی اور تخلیقی مسئلہ ہے۔ بچوں کے لیے لکھنے والی خواتین ابھی بھی دائروں سے باہر نکلنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ دنیا میں جہاں بچوں کا ادب سائنس فکشن اور پیچیدہ نفسیاتی موضوعات کا احاطہ کر رہا ہے۔ اردو ادب اطفال اب بھی اکثر چند روایتی موضوعات تک محدود نظر آتا ہے۔ بچوں کے لیے لکھنے والی پیشتر خواتین، بچوں کی بدلتی ہوئی نفسیات پر تحقیق نہیں کرتیں۔ قلم اٹھانے سے قبل ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آج کا بچہ ڈیجیٹل میڈیا کی وجہ سے بہت زیادہ بانبر ہے۔ باوجود اس کے خواتین قلمکار اکثر وہ لکھتی ہیں جو وہ بچوں کو سکھانا چاہتی ہیں، نہ کہ وہ جو بچے پڑھنا چاہتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں والدین بھی یہی چاہتے ہیں کہ کہانی کی کتابیں صرف تعلیمی یا روایتی اخلاقیات پر مبنی ہوں۔ اگر مصنف، بچوں کے حقیقی اور آج کے مسائل جیسے بلینگ، ذہنی دباؤ یا تنہائی پر لکھنا چاہے تو اسے اکثر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مشرقی معاشرہ اب بھی خواتین سے توقع رکھتا ہے کہ وہ صرف جذباتی، گھریلو یا اخلاقی موضوعات پر قلم اٹھائے لیکن ہمیں یہ قطعاً نہیں بھولنا چاہئے کہ تبدیلی لانے کے لیے جرات کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ باوجود اس کے یہ اطمینان بخش ہے کہ خواتین اپنی ادبی دنیا خود تخلیق کر رہی ہیں۔

پھر بھی اردو ادب اطفال میں جے کے رولنگ۔ J K Rowling جیسی ادیبہ کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے جس نے ہیری پوٹر سیریز لکھ کر دنیا کا مقبول ترین فینٹسی ادب تخلیق کیا۔ فینس فائیو اور سیکریٹ سیون جیسی سسپنس اور انڈسٹری سیریز لکھنے والی اینیڈ بلائٹن Enid Blyton اور دی ٹیل آف پیٹر ریبت لکھ کر جانوروں کے کرداروں کو لافانی بنانے والی بیٹرکس پوٹر Beatrix Potter جیسی ادبیات کا نہ جانے کب تک اردو ادب اطفال کو انتظار کرنا ہوگا۔ انتظار طویل ہو گیا ہے لیکن امید کے چراغ جل رہے ہیں۔

ادب اطفال اور افسر میرٹھی

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں سب سے مشکل کام بچوں کے ادب کی تخلیق ہے۔ کیونکہ بچے ہی نہ صرف اپنے خاندان بلکہ کسی بھی قوم و ملک کا مستقبل ہوتے ہیں اور ہر آنے والی خوش حالی اور ترقیات کی بنیاد ان ہی بچوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اسی بنا پر ہر ماں باپ اور اساتذہ کی خواہش و کوشش ہوتی ہے کہ ان کے بچے یا شاگرد کی ایسی تعلیم و تربیت ہو کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کا نام بھی روشن کرے۔ بچوں کو کمہار کی کچی مٹی کہا جاتا ہے کہ جس طرح کمہار کچی مٹی کو عمدہ سے عمدہ سانچے میں ڈھال دیتا ہے، اسی طرح یہ بچے بھی ہوتے ہیں، ان کے سر پرست انہیں جس روپ میں ڈھالنا چاہیں وہ باسانی ڈھال سکتے ہیں۔ بے شک بچے ہر قوم کا بیش قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ اس لیے انسانی فریضہ یہ ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اور ان کی نشوونما پر خصوصی توجہ دی جائے۔ قدرتی طور پر بچے میں تجسس بھرا ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کے بارے میں جاننا چاہتا ہے، اس کی کھوج لگانا چاہتا ہے اور ہر چیز کے تعلق سے وہ سوالات کرتا ہے۔ اب یہاں یہ سوال آ جاتا ہے کہ آخر ہم اس قوم کے معمار کے لیے کیسا ادب تیار کریں؟ کس نسخہ پر اس کی پرورش کریں جو ان کی اعلیٰ تربیت کے لیے معاون و مددگار ہو۔ ویسے تو بچوں کے ادب کے لیے مختلف صورتیں ہمارے سامنے ہیں مثلاً بچوں کی نصاب کی کتابیں، دوسرے چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی شکل میں، تیسرے بچوں کے لیے رسائل و جرائد وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کے ذریعے سے بچوں کو تعلیم و تربیت، عادات و اخلاق سے مزین کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری قرار پایا کہ بچوں کی شخصیت میں پاکیزگی، اعلیٰ اقدار اور ایک بہترین انسان بنانے کے لیے ان کے سامنے ایسا ادب پیش کریں جو بچوں کو ایک بہتر انسان بنانے میں معاون ثابت ہوں۔

اردو میں اس روایت کا آغاز سب سے پہلے فلق میرٹھی نے کیا۔ مولانا اسماعیل میرٹھی فلق میرٹھی کے دوستوں میں سے تھے مولانا اسماعیل میرٹھی ان نظموں سے نہایت متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنی نظمیں بھی اسی انداز پر لکھنا شروع کر دیں اور یوں بچوں کے لیے ایک اچھا ادب تیار ہونے لگا۔ اس روایت کو چارچاند لگانے والوں میں دیگر اہم نام مولانا محمد حسین آزاد، مولوی اسماعیل میرٹھی، منشی پیارے لال آشوب، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، شعیب ندرت میرٹھی، علامہ اقبال، چکلیست، تلوک چند محروم، ڈاکٹر ذاکر حسین، شفیع الدین نیر، کرشن چندر، قمرۃ العین حیدر وغیرہ کے نام نہایت اہمیت کے

حامل ہیں جنہوں نے اردو ادب اطفال کو وہ عروج و روشنی عطا کی جس کی ضیاء پاشیوں سے قوم و ملت کے نو نہالوں نے فیض یاب ہو کر اپنے ساتھ ساتھ ملک و قوم کا نام فخر سے بلند کیا اور ابھی یہ فیض جاری و ساری ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ لیکن ہم یہاں صرف ایک ایسے ہی اردو ادب اطفال کے روشن ستارے افسر میرٹھی کے حوالے سے بات کریں گے جنہوں نے اردو ادب اطفال کو ایک نئی بلندی اور انفرادیت عطا کیا۔

حامد اللہ افسر میرٹھی کا تعلق میرٹھ سے تھا اور یہ میرٹھ کے مشہور خاندان، مفتیان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ سے جا کر ملتا ہے۔ حامد اللہ افسر میرٹھی کے والد کا نام مفتی عصمت اللہ تھا۔ وہ اپنے دور کے عالم فاضل اور اپنے خاندان کے پہلے انگریزی داں تھے۔ حامد اللہ افسر میرٹھی کی تعلیم و تربیت میں سب سے بڑا ہاتھ ان کے والد کا تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنی نگرانی میں پوری کرائی۔ افسر میرٹھی کی حیات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی علم و ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ وہ اگرچہ کامیاب صحافی، عمدہ مترجم، نظریہ ساز، ناقد، مناظر فطرت کی عکاسی کرنے والے اور ننھے ننھے بچوں کی نفسیات سے واقف بچوں کے شاعر تھے۔ جن سے ہر میدان میں انہوں نے بہ اعتبار کیفیت اور کثرت اتنے کارنامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں کہ ان کا نام ادبی تاریخ میں روشن رکھنے کے لیے کافی ہے۔ تاہم میرٹھ میں جدید نظم اور جدید افسانے کے حوالے سے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ تذکرہ میرٹھ کے مصنف نور احمد میرٹھی اس سلسلے میں رقم طراز ہے:

”جدید نظم اور جدید افسانے کی تحریک کے علمبردار کی حیثیت سے انہیں (افسر میرٹھی) ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کے کلام میں قدرت سے عشق اور فلسفہ مشہور و مقبول ہیں۔“

حامد اللہ افسر میرٹھی کا پہلا مجموعہ ”پیام روح“ ہے۔ یہ الہ آباد سے ۱۹۲۷ء میں انڈین پریس میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا تھا۔ ان کا دوسرا مجموعہ ”جوئے رواں“ ہے جو ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ لکھنؤ سے ۱۹۵۴ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس مجموعے میں افسر میرٹھی کی منظومات اور غزلیات دونوں موجود ہیں۔

یوں تو افسر میرٹھی نے نہ صرف شاعری کی بیشتر اصناف پر کامیاب طبع آزمائی کی بلکہ فکشن اور تنقید کے حوالے سے بھی نمایاں خدمات انجام دیں لیکن ان کا اصل میدان نظم ہی ہے اور اس میں وہ نظیر اکبر آبادی، قلیق میرٹھی، مولانا محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور مولوی اسماعیل میرٹھی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ گویا جب افسر میرٹھی نے نظم گوئی کا سلسلہ شروع کیا تو ان کے سامنے فطری شاعری کے بہت سے عمدہ نمونے موجود تھے۔ جس میں شعرا نے فطرت کے مناظر کو سیدھے سادھے انداز میں بیان کر دیا تھا اور دلکشی کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔ افسر نے بھی اس اثر کو قبول کیا اور عمر بھر نیچرل شاعری کے عمدہ نمونے پیش کرتے رہے۔

افسر میرٹھی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو نہایت پاکیزہ اور بلند

خیالات سے لبریز کر دیا ہے جو واقعی اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ ان کا طرز بیان اس معنی میں سب سے جدا ہے کہ وہ بہت سلیس اور نہایت سادہ ہے۔ افسر میرٹھی کو مشکل سے مشکل الفاظ کو آسان سے آسان الفاظ میں ادا کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ یہی وجہ کہ ان کی نظموں کی زبان سادہ، سلیس اور نہایت آسان ہے اور انہوں نے اپنی بیشتر نظموں میں مقامی رنگ بھرنے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔ بچوں کے لیے امید افزا مضامین نظم کر کے افسر میرٹھی نے اردو شاعری کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اور اس طرح کے مضامین سے بچوں میں حوصلہ، اولوالعزمی اور استقامت پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے لیے ان کی نظم ”نشاط خیال“ کا یہ بند ملاحظہ کیجئے۔

مانا وہ چھپنے والا ہر دل میں چھپ جائے گا
لیکن ڈھونڈنے والا بھی ڈھونڈے گا اور پائے گا
میں تو نام کا مالی ہوں پھولوں کا رکھوا لا ہوں
جس نے بیل اُگائی ہے خود پروان چڑھائے گا
جس نے باغ اجاڑا ہے وہ خود پھول کھلائے گا

مناظر قدرت سے افسر میرٹھی نہایت دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ فطرت کے حسین مناظر کے شیدائی تھے۔ انہوں نے مناظر قدرت کے سلسلے میں جو نظمیں لکھی ہیں وہ منفرد ہیں۔ زبان کی شیرازہ بندی اور مناظر کی تصویر کشی افسر میرٹھی کے کمال فن کی آئینہ دار ہیں۔ بچے بھی مناظر قدرت سے لطف اندوزی کے ساتھ ساتھ نہایت متاثر ہوتے ہیں اور اس کا تجسس جاگ اٹھتا ہے۔ مناظر قدرت سے بھرپور ایسی ہی ایک نظم ’بہار‘ کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

آیا ہے بہار کا زمانہ
باغوں کے نکھار کا زمانہ
کلیاں کیا کیا چنگ رہی ہیں
ساری روئیں مہک رہی ہیں
ہلکی ہلکی یہ ان کی خوشبو
پھیلی ہے چمن میں ہر سو
دیکھو یہ ساون کی بہاریں
پڑتی ہیں ہر سمت پھواریں
ہرے بھرے پودوں کی قطاریں
بادل جس پر موتی واریں

جیسا میرا دلش ہے افسر ایسا کوئی دلش نہیں
افسر میرٹھی کی ایک اور حب الوطنی سے لبریز نظم ”بھارت کے گن گاتے ہیں“ بھی ملاحظہ

فرمائیں۔

دن جو بہار کے آتے ہیں

کیا کیا پھول کھلاتے ہیں

ہندوستان بنایا

یا گلستاں بنایا

کیا شکر ہوا الہی سب کچھ عطا کیا ہے

میرے وطن کو تو نے جنت بنا دیا ہے

یہ ہیں وہ حب الوطنی کے جذبات جو افسر میرٹھی ہر ہندوستانی بچے کے دل میں بھر دینا چاہتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہمارا ہندوستان جو گنگا جمنی تہذیب کا نمائندہ ہے، یہاں قدم قدم پر جو خوبصورتی پھیلی ہوئی ہے۔ جو یہاں کے مختلف رنگ ہیں، نظارے ہیں انہیں افسر میرٹھی اپنے دل کی آنکھوں سے دکھانا چاہتے ہیں۔ ایک اور منظر ملاحظہ کیجئے۔

باغوں نے پہنا

پھولوں کا گہنا

نہروں کا بہنا

وارفتہ رہنا

دنیا میں جنت میرا وطن ہے

بھوری گھٹائیں

لائی ہوئیں

باغوں میں جائیں

کلیاں کھلائیں

دنیا میں جنت میرا وطن ہے

کرشن کنہیا

رادھا کا رسیا

تھا اس زمیں کا

روشن ستارہ

دنیا میں جنت میرا وطن ہے

افسر میرٹھی نے اس نظم میں اپنے جادوئی قلم سے ایسے جذبات و احساسات پیش کیے ہیں جو نہ صرف بچوں کے دل میں اتر جاتے ہیں بلکہ ہر بڑے اور چھوٹے کے دل میں بس جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس نظم میں جو انہوں نے مناظر فطرت کی تصویر کشی ہے اس میں بچے تو کیا بڑے بھی حسین تصورات کی دنیا میں گم ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ افسر میرٹھی کا گہرا مشاہدہ بھی ہے۔ کیونکہ افسر میرٹھی کا بچپن دہرہ دون اور مسوری کی حسین وادیوں میں گزرا تھا اور یہی وجہ ہے کہ فطرت کی حسین تصویر کشی ان کی

دیگر نظموں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جیسے ان کی نظمیں ہیں ”بہار کے دن“ اور ”چاند“
 ”چاند“ نظم کا ایک بند دیکھئے۔

تم ندی پر جا کر دیکھو

جب ندی میں نہائے چاند

ڈبکی لگائے غوطے کھائے

ڈر ہے ڈوب نہ جائے چاند

بچوں کے حوالے سے ان کی ایک اور نظم ”لوری“ کو حیات جاوید حاصل ہے۔ صدیاں بیت گئیں لیکن یہ نظم آج بھی اپنا جادوئی اثر رکھتی ہے۔ آج کے موڈرن دور میں بھی اس لوری کی اہمیت برقرار ہے اور آج بھی مائیں اپنے بچوں کو سلانے کے لیے اس لوری کا سہارا لیتی ہیں اور بچے بھی اس لوری کے سحر میں گرفتار ہو کر نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ اس لوری میں افسر میرٹھی نے ایک ماں کے جذبات کو بڑے ہی دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ لوری کا ایک بند ملاحظہ کیجئے۔

سو جا آنکھ کے تارے سو جا

سو جا دل کے سہارے سو جا

سو جا راج ڈلارے سو جا

سو جا چاند ہمارے سو جا

سو جا سو جا پیارے سو جا

بچپن کے حوالے سے افسر میرٹھی کی ایک اور شہرہ آفاق نظم ”بچپن کے دن“ ہیں۔ اس نظم میں انہوں نے پورے بچپن کی تصویر آنکھوں کے سامنے اتار دی ہے۔ وہ بچپن کی بھولی بھالی شرارتیں، وہ معصومیت۔ اس نظم کو پڑھ کر سبھی کو اپنے بچپن کے دن یاد آ جاتے ہیں اور انسان کچھ لمحوں کے لیے ہر فکر سے آزاد، حال کی پریشانیوں اور مستقبل کے اندیشوں سے کوسوں دور اپنے سنہرے ماضی کی طرف لوٹ جاتا ہے اور اپنے بچپن کی بہت سی حسین یادوں میں کھو جاتا ہے۔

افسر میرٹھی کی ایک اور بہت خوبصورت نظم ہے جس کا عنوان ہے ”میری اماں“۔ یہ پوری نظم بہت ہی خوبصورت جذبات و احساسات کا مجسمہ ہے۔ اس نظم میں انہوں نے بتایا ہے کہ ماں کیا ہے اور بچوں کے لیے اس کی کیا اہمیت ہے۔ ماں کی مانتا اور اس کا سایہ بچے کے لیے کتنا اہم ہے۔ نظم کا بند ملاحظہ کیجئے۔

رات کو جو چودھویں کا چاند جب آیا نظر

گو د میں لے لوں جی چاہتا تھا دوڑ کر

پاس جب پہنچا تو مجھ پر راز اس کا کھل گیا

چاند کب تھا، چاند سا چہرہ تھا اماں جان کا

افسر میرٹھی کے حوالے سے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کی پوری شاعری ہی امید افزا

اور سبق آموز ہے اور یہ وہ شاعری ہے جو ملک و قوم کے لیے بہت ضروری ہے۔
 افسر میرٹھی بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے اور اپنی شاعری میں ایسے جذبات و احساسات بھر دیا کرتے تھے جو بچوں کے ذہن پر نقش ہو جائے۔ افسر میرٹھی کی ایک نظم ”کاغذ کی ناؤ“ ہے جس میں انہوں نے بچپن کے معصوم جذبات کی عکاسی بڑے ہی خوبصورت انداز میں کی ہے۔ اس نظم میں انہوں نے موسمِ برسات کا بڑا خوبصورت نقش کھینچا ہے کہ زبردست بارش برس رہی ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہے، گھروں تک میں پانی بھر چکا ہے۔ ایسے میں انہوں نے بچپن کی جو تصویر کھینچی ہے وہ کمال ہے کہ بچے کاغذ کی چھوٹی چھوٹی ناؤ بنا کر اس پانی میں تیراتے ہیں اور شاید یہ سبھی بچوں کی فطرت میں شامل ہوتا ہے۔ ”کاغذ کی ناؤ“ کا یہ بند دیکھیں۔

دیکھو اماں کیسی اچھی ہے میری کاغذ کی ناؤ

لے چلا ہے ساتھ اس کو مینہ کے پانی کا بہاؤ

بند کر دیتا نہ میں سب نالیوں کے منہ اگر

کس طرح پانی سے بھر جاتا بھلا پھر سارا گھر

علاوہ ازیں انہوں نے بچوں کے لیے اور بھی بہت سی خوبصورت نظمیں لکھیں۔ مثلاً ”حیات گاندھی“، ”ماہِ نو“، ”مکانوں کی کہانی“، ”جانوروں کی عقلِ مندی“، ”پندرہ اگست“، ”ہمارا جھنڈا“، ”آسان کا سایہ“، ”چار چاند“، ”پرچھائیاں“ اور ”لوہے کی چیل“ وغیرہ۔ ان کے علاوہ ان کی درسی کتابوں میں ”ماہِ نو“ بھی ہے۔ یہ نثری کتاب افسر میرٹھی نے رابندر ناتھ ٹیگور کی مشہور کتاب ”ششو“ کا ترجمہ کیا تھا۔ ”چار چاند“ اور ”پرچھائیاں“ بچوں کی آسان زبان میں لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔

محدود صفحات کی بنا پر ان سبھی نظموں پر کلام کی گنجائش نہیں بس اپنی بات ڈاکٹر فرحت خاتون کی کتاب ”میرٹھ میں اردو نظم نگاری کی روایت“ کے اس اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔ ڈاکٹر فرحت خاتون رقم طراز ہیں:

”افسر کی نظموں میں بلند آہنگی ہے۔ ان کے جذبات میں پاکیزگی، ان کے

افکار میں رفعت اور ان کے انداز بیان میں بے ساختگی اور برہنہگی ہے۔ ان کی

طرز ادا شگفتہ اور دلنشین ہے۔ وہ حالات کی صرف مصوری ہی نہیں کرتے بلکہ

تصویر بھی پیش کرتے ہیں جو ان کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ ایک ادیب شاعر اور

نقاد ہونے کی وجہ سے شاعری کی دنیا میں ان کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کی

سب سے بڑی خصوصیت ان کا وہ ادبی سرمایہ ہے جو انہوں نے بچوں کی

نفسیات کو سامنے رکھ کر لکھا.....“

[میرٹھ میں اردو نظم نگاری کی روایت، ڈاکٹر فرحت خاتون، ص 225، موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، 2022ء]



بچوں کا ادب اور اردو کے ممتاز ادیب

اردو ادب میں بچوں کے ادب کو ہمیشہ ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے، کیونکہ کسی بھی قوم کا مستقبل اس کے بچوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ بچے قوم کا سرمایہ اور آنے والے کل کے معمار ہوتے ہیں۔ ان کی بہتر تعلیم و تربیت ہی ایک اچھے معاشرے کی بنیاد بنتی ہے۔ بچے نرم مٹی کی مانند ہوتے ہیں، جنہیں جس سانچے میں ڈھالا جائے وہ ویسے ہی بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اہل علم و ادب نے بچوں کی ذہنی، اخلاقی اور فکری تربیت کے لیے ایسے ادب کی تخلیق کی جس میں تفریح کے ساتھ تربیت کا پہلو بھی نمایاں ہو۔ اردو میں اسی ادب کو ادب اطفال یا بچوں کا ادب کہا جاتا ہے۔

بچوں کے لیے ایسا ادب تخلیق کیا جاتا ہے جو ان کی عمر، ذہنی صلاحیت، نفسیات اور دلچسپیوں کے مطابق ہو۔ بچوں کا ادب صرف وقت گزاری یا تفریح کا ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ان کی شخصیت سازی میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قصے، کہانیاں، نظمیں، ڈرامے اور مضامین بچوں کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ یہی ادب بچوں کے اندر سچائی، ایمان داری، محنت، حب الوطنی، ہمدردی، انسان دوستی اور ذمہ داری جیسے اوصاف پیدا کرتا ہے۔ اس کے ذریعے ان میں اچھے اور برے کی پہچان پیدا ہوتی ہے، ان کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور ان کا ادبی ذوق بھی پروان چڑھتا ہے۔ بچوں کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ابتدائی سے انہیں ایسی کتابیں فراہم کی جائیں جو دلچسپ بھی ہوں اور ان کے علم و شعور میں اضافہ بھی کریں۔

اردو میں بچوں کے ادب کے ابتدائی نقوش امیر خسرو سے منسوب منظوم لغت ”خالق باری“، پہیلیوں، کہہ مکر نیوں اور دو سخنوں میں ملتے ہیں۔ اگرچہ بعض محققین نے ان تخلیقات کو غیر مستند قرار دیا ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان میں بچوں کی دلچسپی، ذہنی تفریح اور زبان سیکھنے کا سامان موجود ہے۔ بعد کے زمانے میں نظیر اکبر آبادی نے بچوں کے لیے ایسی نظمیں لکھیں جن میں معصومیت، سادگی اور فطری دلکشی نمایاں نظر آتی ہے۔ ”ایام طفلی“، ”معصوم بھولے بھالے“، ”گلہری کا بچہ“، ”ریچھ کا بچہ“ اور ”ہرن کا بچہ“ جیسی نظمیں بچوں کے ادب میں خاص مقام رکھتی ہیں۔ نظیر نے بچوں کی دنیا کو نہایت سادہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا، جس سے ان کی شاعری بچوں کے دل کے قریب ہو گئی۔

انیسویں صدی کے آخری دور میں بچوں کے ادب کی طرف باقاعدہ توجہ دی گئی۔ اس زمانے

میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولوی اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے ادب کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے بچوں کے لیے نظمیں، مضامین اور درسی کتابیں لکھیں۔ انہوں نے زبان کی آسانی اور اخلاقی تربیت دونوں کو اہمیت دی۔ بچوں کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے اپنی کتابوں میں تصویروں اور خاکوں کا استعمال بھی کیا، جو اس زمانے میں ایک نئی بات تھی۔ ان کی نظموں میں ’بے امتحان سر پر کھڑا‘، ’شب سرما‘، ’شب ابر‘، ’سلام علیک‘ اور ’جیسا چاہو سمجھ لو‘ خاص طور پر مشہور ہیں، جبکہ ’نصیحت کا کرن پھول‘، ’آئینہ صحت‘، ’دھوبی کپڑے دھور رہا ہے‘، ’لڑکا مدرسہ جاتا ہے‘، ’صبح کی ہوا خوری‘، ’مرغ‘ اور ’گہری جیسے مضامین بھی بچوں میں بے حد مقبول ہوئے۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور دلکشی کا ایسا امتزاج ملتا ہے جو بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

اسی دور میں منشی پیارے لال آشوب، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا الطاف حسین حالی نے بھی بچوں کے ادب کی ترقی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاحی کہانیوں اور آسان مضامین کے ذریعے بچوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کی۔ ان کی تحریروں میں صفائی، سچائی، تہذیب اور اچھے اخلاق کا درس نمایاں طور پر ملتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے بچوں کے ادب کو نہایت دلنشین اور سبق آموز انداز عطا کیا۔ ان کی نظموں میں اخلاقی تربیت، حب الوطنی، اتحاد و اتفاق اور سچائی کا درس ملتا ہے۔ حالی چاہتے تھے کہ بچے اچھے اخلاق اپنائیں اور ایک باکردار انسان بنیں۔ ان کی نظموں میں نصیحت ضرور ہے، لیکن وہ کہیں بھی بوجھ محسوس نہیں ہوتی۔ ’خدا کی شان‘، ’کہنا بڑوں کا مانو‘، ’جو امدی کا کام‘، ’میں کیا بونگا‘، ’سپاہی‘، ’چٹھی رساں‘، ’دھان بونا‘، ’مرغی اور اُس کے بچے‘، ’راست گوئی‘ اور ’امید‘ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ انہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ’مجالس النساء‘ کے نام سے ایک درسی کتاب بھی مرتب کی۔ اُن کی زبان نہایت سادہ، رواں اور دل میں اتر جانے والی ہے۔

اگر اردو بچوں کے ادب کی تاریخ میں کسی ایک شخصیت کو سب سے زیادہ اہمیت دے تو وہ مولوی اسماعیل میرٹھی ہیں۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دی۔ وہ بچوں کی نفسیات اور ذہنی سطح سے بخوبی واقف تھے، اسی لیے ان کی نظمیں بچوں کے دلوں میں فوراً جگہ بنا لیتی ہیں۔ انہوں نے ’اردو زبان کا قاعدہ‘ اور ’اردو کی پہلی کتاب‘ سمیت کئی درسی کتابیں مرتب کیں، جو بے حد مقبول ہوئیں اور آج بھی اپنی افادیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی نظموں کی سب سے بڑی خوبی ان کی سادگی، روانی اور لغت سگی ہے۔ ’جگنو اور بچہ‘، ’بارش کا پہلا قطرہ‘، ’گائے‘، ’ایک گدھا شیر بنا‘، ’پودا اور گھاس‘، ’پن چکی‘، ’اسلم کی بلی‘ اور ’ہمارا کتا‘ جیسی نظمیں بچوں میں آج بھی مقبول ہیں۔ انہوں نے روزمرہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر اخلاقی تربیت کا خوبصورت فریضہ انجام دیا۔

اسماعیل میرٹھی کے بعد علامہ محمد اقبال نے بچوں کے ادب کو نئی معنویت عطا کی۔ اقبال نے بچوں کے لیے ایسی نظمیں لکھیں جن میں اخلاقی تربیت، حب الوطنی، خودداری، ہمدردی اور انسان دوستی کا

پیغام ملتا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ نئی نسل سچائی، خلوص اور عظمت کر دار جیسی خوبیوں سے آراستہ ہو۔ اقبال کی نظموں کی زبان نہایت سادہ، رواں اور بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق ہے۔ ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، ایک مکڑا اور مکھی، ہمدردی، پرندے کی فریاد، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، 'نیا سوال'، ایک پرندہ اور جگنو، بچے کی دعا، ماں کا خواب اور ترانہ ہندی، ان کی مشہور و مقبول نظمیں ہیں۔ اقبال کی شاعری میں مقصدیت ضرور ہے، لیکن یہ مقصدیت ان کی نظموں کے حسن اور دلکشی کو کم نہیں ہونے دیتی۔ چلبست لکھنوی نے اپنی نظموں میں وطن کی محبت، ہندوستان کی تہذیب اور قدرتی مناظر کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ ان کے مجموعہ 'کلام' 'صبح وطن' میں بچوں کے لیے کئی اہم نظمیں شامل ہیں، جن میں 'ہمارا وطن'، 'خاک ہند'، 'وطن کو ہم وطن'، 'ہم کو مبارک'، 'گائے' اور 'پھول' مالا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی شاعری میں سادگی، روانی اور حب الوطنی کا جذبہ نمایاں ہے۔

تلوک چند محروم نے بھی بچوں کے ادب کو نئی وسعت عطا کی۔ انہوں نے بچوں کو محنت، صفائی، وقت کی پابندی، بھائی چارے اور اچھے اخلاق کا درس دیا۔ 'خدا کا شکر'، 'سویرے اٹھنا'، 'محنت'، 'وقت کی پابندی' اور 'نرم گفتاری' ان کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ ان کی زبان سادہ اور عام فہم ہے، جس کی وجہ سے بچے ان کی نظموں کو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں 'بہار طفلی'، 'اور' 'بچوں کی دنیا'، 'میں رنگ موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں۔ 'خدا کا شکر'، 'سویرے اٹھنا'، 'محنت'، 'صفائی'، 'ہم ہرگز جھوٹ نہ بولیں گے'، 'اچھا بچہ'، 'پہلے کام پیچھے آرام'، 'استاد کی چٹری'، 'وقت کی پابندی'، 'بہار اور نرم گفتاری' وغیرہ ان کی اہم نظمیں ہیں۔

افسر میرٹھی بچوں کے ادب میں صف اول کے ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ چونکہ وہ پیشے کے اعتبار سے معلم تھے، اس لیے بچوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے بچوں کے لیے اصلاحی اور اخلاقی نظمیں اور کہانیاں لکھیں۔ 'اسکول کی گھڑی'، 'صبح کی دعا'، 'چاند کا بچہ'، 'ہمارا چمن'، 'میاؤں'، 'میاؤں'، 'خضر کا کام کروں راہنما بن جاؤں' اور 'ماں کا پیارا' ان کی مشہور نظمیں ہیں، جبکہ 'چار چاند' اور 'جانوروں کی عقل مندی' ان کے دلچسپ کہانیوں کے مجموعے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین بچوں کو قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اہم خدمات انجام دیں اور 'پیام تعلیم' جیسے رسالے کو بچوں کے لیے مخصوص کیا۔ ان کی کہانیوں میں دلچسپی، سادگی اور اخلاقی تربیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ 'بوخاں کی بکری'، 'مرغی'، 'اجیر چلی'، 'کچھوا اور خرگوش' اور 'پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی' ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔ 'امانت'، 'اور' 'کھوٹا سکہ' ان کے اہم ڈرامے ہیں۔ 'امانت' کو اردو ادب میں بچوں کے لیے لکھا جانے والا پہلا باقاعدہ ڈرامہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ڈرامہ بچوں کی نفسیات، معصومیت اور اخلاقی تربیت کو سامنے رکھ کر تحریر کیا گیا۔

شیخ الدین نیر نے اپنی پوری زندگی بچوں کے ادب کے لیے وقف کر دی۔ انہوں نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں نظمیں، کہانیاں، ڈرامے اور معلوماتی مضامین لکھے۔ ان کی تحریروں میں سادگی،

”نفسی اور اخلاقی پیغام نمایاں ہے۔“ بچوں کا تحفہ، ”وطنی نظمیں“، ”اسلامی نظمیں“، ”اخلاقی نظمیں“، ”منی کا گیت“ اور ”بچوں کا کھلونا“ ان کے اہم شعری مجموعے ہیں، جبکہ ”تارہ کا ڈنڈا“، ”پرستان کی سیر“، ”ریڈیو کا بھوت“، ”بونے کا انصاف“، ”مکھن کا ڈبہ“، ”بڈھو کی بیوی“ اور ”ڈھول کا پول“ ان کی مشہور کہانیوں کے مجموعے ہیں۔

کرشن چندر نے بچوں کے ادب کو سائنس فکشن اور فینٹسی سے متعارف کرایا۔ انہوں نے بچوں کے لیے مزاحیہ، دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں، ناول اور ڈرامے لکھے۔ ”سونے کی بکری“، ”سونے کا سیب“، ”شیطان کا تحفہ“، ”بیوقوف امیر“، ”بیوقوف بڑھیا“ ان کی مشہور کہانیاں ہیں، جبکہ ”ستاروں کی سیر“، ”چڑیوں کی الف لیلہ“ اور ”الٹا درخت“ ان کے اہم ناول ہیں۔ ان کی تحریروں میں مزاح اور خیل بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ”گینڈ“ ان کا اہم ڈراما ہے۔

قرۃ العین حیدر نے بھی بچوں کے ادب میں اہم خدمات انجام دیں۔ انہوں نے بچوں کے لیے ایسی کہانیاں لکھیں جن میں دلچسپی، خیل اور سبق آموزی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ”بھیڑیے کے بچے“، ”شیر خان“، ”میاں ڈھنچے کے بچے“، ”بہادر اور ایک پرانی کہانی“ ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔ انہوں نے سائنس فکشن کے میدان میں بھی اہم کام کیا اور بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق نہایت سادہ اور دلکش زبان اختیار کی۔

اردو بچوں کے ادب کی ترقی میں پریم چند، سدرشن، امتیاز علی تاج، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، حفیظ جالندھری، عبدالغفار مدھولی، میرزا ادیب، سراج انور، اطہر پرویز جیسے ادیبوں کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ اسی طرح ”پیام تعلیم“، ”کھلونا“، ”سچلوری“، ”پھول“، ”نور“، ”نونہال“، ”بچوں کی دنیا“، ”غنچہ“، ”ٹانی“، ”چاند“ اور ”امنگ“ جیسے رسائل نے بچوں میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے اور ادب سے ان کا رشتہ مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو کا بچوں کا ادب نہ صرف تفریح فراہم کرتا ہے بلکہ بچوں کی ذہنی، اخلاقی اور فکری تربیت کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے بچوں کی نفسیات اور ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی تخلیقات پیش کیں جن میں سادگی، دلکشی، سبق آموزی اور ادبی حسن ایک ساتھ ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا بچوں کا ادب آج بھی اپنی تازگی، اثر انگیزی اور اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہے اور آنے والی نسلوں کے ذہن و دل کو روشن کر رہا ہے۔

ادب اطفال: ایک مطالعہ

بچوں کی تربیت کرنا، ان کے اخلاق و کردار کو سنوارنا، اخلاق رذیلہ سے بچا کر اخلاق فاضلہ سے ان کو آراستہ کرنا، والدین، اساتذہ اور دیگر سماج سے وابستہ افراد کے حقوق سے ان کو روشناس کرانا، حصول تعلیم کا ذوق ان میں اُجاگر کرنا وغیرہ یہ وہ تمام چیزیں ہیں جو ہر ایک فرد میں ہونی چاہئیں اگر کوئی شخص ان سے عاری ہے تو اس کے ذریعے ایک اچھے سماج کی تشکیل بہت مشکل ہے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بچے کو ابتدا سے ہی ان باتوں سے واقف کرایا جائے۔ بچہ کا ذہن ابتدا میں خالی ہوتا ہے، اس کا درست استعمال از حد ضروری ہے۔ بچے کے خالی ذہن میں شروع سے ہی اچھی باتیں ذہن نشین کرائی جائیں گی تو بچہ اس کو دہر پاد رکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ کچھ باتوں کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ غیر ضروری لہو لعب سے ان کو دور رکھنا، موبائل کا وقت بے وقت استعمال کرنا، گھر سے باہر ان کی نشست و برخاست پر نظر رکھنا وغیرہ یہ سب بھی بچوں کی تربیت کے لیے جزو لا ینفک ہے۔ جس طرح علاج معالجے کے دوران نقصان دہ اشیاء سے بچا جاتا ہے، صحت اور تندرستی کے لیے۔ اسی طرح بچوں کو قوم و ملت کا رہنما اگر بنانا ہے تو غیر ضروری مشاغل سے ان کو دور رکھنا ہوگا۔

ان ہی باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے دادی، نانی کی کہانیاں، امی جان کی لوریاں، اخلاق سے مملو قصے اور حکایتیں کتابوں میں لکھی ہوئی مل جاتی ہیں، کیونکہ بچوں کی تربیت کرنا کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے بلکہ انسان نے جب سے اس روئے زمین پر قدم رکھا ہے اسی دن سے بچے کے کردار کو سنوارنے کی ہر ممکن کوششیں کی جا رہی ہیں۔ کسی خاندان کا بچہ ہو تو اس کو اس خاندان کے مستقبل سمجھا جاتا ہے، کسی قوم و ملت اور ملک و مذہب سے اس کا تعلق ہو اس کا اس کو پیشوا اور رہنما بننا ہوتا ہے، لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اس میں قوم و ملت کی خدمت کا شعور، چھوٹوں کے لیے شفقت اور بڑوں کے آداب و احترام سے آگاہی ہو۔

اس کے تعلق سے ادب و شعر نے بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کو بچوں کے ادب یعنی ادب اطفال سے جانا جاتا ہے۔

اردو میں ادب اطفال کی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس کا آغاز زبانی روایات اور لوک کہا نیوں کے ذریعے سے ہوتا ہے لیکن اس کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے

شروع میں ہوتا ہے۔ ادب اطفال کا ابتدائی دور اندازاً میر اور سودا کے کلیات میں بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں سے ہوتا ہے جو جانور اور پرندوں کے اوپر لکھے گئے قصے ہیں۔

اس دور کے اندر بچوں کی تربیت کے لیے قصہ، کہانیاں اور لوریاں ایک اہم ذریعہ مانی جاتی تھیں۔ ادب اطفال کا باقاعدہ آغاز ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ”مراۃ العروس“ سے مانا جاتا ہے ان کے اس ناول نے خاص طور پر بچیوں کی اخلاقی و سماجی تربیت میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ کچھ ماہرین میرامن کی ”باغ و بہار“ کو بھی ادب اطفال میں ابتدائی داستان شمار کیا ہے لیکن اس بات سے کم ہی لوگ اتفاق کرتے ہیں اور خود نذیر احمد کا خیال ہے کہ باغ و بہار میں بچوں یا بچیوں کی تربیت جیسا کچھ بھی نہیں ہے، اس لیے ہی انہوں نے اپنی بچیوں کی تربیت کے لیے ”مراۃ العروس“ لکھی جو 1869ء میں شائع ہوئی۔ ”بنات العیش“ اور ”توبۃ النصح“ بھی ادب اطفال کا اہم حصہ ہیں۔

نذیر احمد کی ایک کتاب ”الاجتہاد“ ہے۔ یہ کتاب بالخصوص بچوں میں یہ بات ظاہر کرنے کے لیے لکھی گئی ہے کہ ہم مسلمان کیوں ہیں، کیا صرف اس لیے کہ ہم مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ مولوی نذیر احمد نے اس کتاب میں یہ دکھایا ہے کہ ہمارے مسلمان ہونے کی وجہ صرف یہ نہیں کہ ہم مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے بلکہ اصلی وجہ یہ ہے کہ اسلام سچا دین ہے، سب سے اچھا اور مکمل دین ہے، انسانی عقل کے مطابق ہے۔ اس کے اصولوں پر عمل کرنے سے انسان بہترین زندگی گزار سکتا ہے۔ اس کتاب میں ڈپٹی نذیر احمد نے بیان کا انداز بھی بڑا دلچسپ رکھا ہے۔ پوری کتاب سوال و جواب کے انداز میں ہے۔ ایک شخص سوال پوچھتا ہے، دوسرا جواب دیتا ہے۔ بات چیت کا بے تکلف انداز ہے اور بات بھی بڑی آسانی سے سمجھ میں آتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے بارے میں اگر یہ بات کہہ دی جائے تو بے جا نہ ہوگی کہ ڈپٹی نذیر احمد ناول نگاری کے ہی موجد نہیں بلکہ اردو میں ادب اطفال پر جو کتاب لکھی گئی ہے اس کا سہرا بھی ان کے ہی سر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد بھی کہا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کو ادب اطفال میں زریں دور سے جانا جاتا ہے جس میں بچوں کی اخلاقی اصلاح اور تعلیم پر سب سے زیادہ کام ہوا ہے۔ محمد حسین آزاد نے بچوں کے لیے نصابی کتابیں تصنیف کیں۔ مولانا الطاف حسین حالی نے ”برکھارت“ اور بہت سی نظمیں لکھیں۔

علامہ اقبال نے بچوں کے لیے شہرہ آفاق نظمیں لکھی ہیں جن کو انگریزی نظموں کا آزاد ترجمہ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں بچے کی دعا، ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، گائے اور بکری وغیرہ بچوں میں خودداری اور اخلاقیات بے دار کرنے کے بہترین ذریعہ ہیں۔

اسماعیل میرٹھی کا نام بچوں کے ادب میں سب سے زیادہ عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ یہ افسر میرٹھی نے بھی ادب اطفال میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور موجودہ دور میں پروفیسر یونس غازی اس روایت کو آگے بڑھانے میں ہمہ تن مصروف نظر آتے ہیں۔

ادب اطفال کی روایت کی بات کی جائے تو اردو میں اس کی روایت بہت توانا، قدیم اور بھر

پور ہے جس کا آغاز، لوریوں، کہانیوں اور منظوم پہیلیوں سے ہوتا ہے جس نے بعد میں باقاعدہ اردو جدید تعلیمی و اخلاقی ادب کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اردو ادب اطفال میں نظیر اکبر آبادی کو باقاعدہ بچوں کے ادب کا پہلا شاعر مانا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں مثلاً ”تل کے لڈو سے اس کی ابتدا ہوئی۔ اس سے قبل میر تقی میر، میر درد، مرزا سودا نے بھی بچوں کے لیے اخلاقی اور معلوماتی نظمیں اور کہانیاں لکھیں۔ ان کے دور کو اردو ادب اطفال میں کلاسیکی اور ابتدائی دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں بچوں کے رسائل نے ادب اطفال کو فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کیا ان میں سب سے نمایاں نام جامعہ ملیہ اسلامیہ سے شائع ہونے والا رسالہ ”پیام تعلیم“ ہے۔ ”کھلونا“ اور بعد میں کراچی سے شائع ہونے والا ”نوناہل“ ہیں۔ ان رسائل نے کئی نسلوں کی تربیت کی۔

ادب اطفال پر کام کرنے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے جس میں بچوں کی فکری اور سائنسی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے پر زور دیا جاتا رہا ہے، شفیع الدین نیر، کرشن چندر اور مظہر الحق علوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ عہد حاضر میں بچوں کا ادب صرف تفریح تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کا مقصد اور کام کرنے کے طور طریقے میں بھی تبدیلی آ رہی ہے۔ موجودہ وقت میں بچوں کی تربیت کرنا والدین اور اساتذہ کے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں رہا۔

اردو ادب اطفال کی خصوصیات کی اگر بات کریں تو بنیادی طور پر بچوں کی ذہنی، اخلاقی اور جذباتی نشوونما کے لیے جو مضامین اور نظمیں لکھی جائیں ان میں ان کا خاص خیال رکھا جانا چاہئے۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ بچوں کے خیال کو جلا بخشتا ہے اور انہیں تفریح کے ساتھ زندگی گزارنے کے مثبت اصول سکھاتا ہے۔

بچوں کا ادب بالکل سادہ اور عام فہم زبان میں لکھا جانا چاہئے۔ مقفی اور مسجع عبارت سے احتراز ہو، بچوں کے لیے کہانی یا نظمیں لکھتے وقت ان کی عمر کے مدارج کو ذہن میں رکھیں، روانی اور تسلسل ایسا ہو جو بچوں کے ذہنی سطح کے موافق ہوتا کہ وہ آسانی سے کہانی اور نظم کا مفہوم سمجھ سکیں۔

اخلاقی تربیت کا جو درس دیں وہ کہانی اور نظمیں ہوں۔ کہانیوں کے اندر اگر تجسسی کردار ہوں تو یہ بچوں کی سوچ کو جلا بخشتے میں معاون ہوتے ہیں۔ اس سے ذہن میں وسعت بھی پیدا ہوگی۔ اخلاقی پہلوؤں پر کہانیاں مرتب کی جائیں اور مثبت انداز اختیار کریں گے تو بچہ ایک اچھا سماجی فرد بن سکے گا۔ جھوٹ سے بچنا، وعدہ خلافی نہ کرنا، امانت میں خیانت نہ کرنا، بری عادت نہ ڈالنا، اساتذہ اور والدین کا ادب و احترام کرنا، بڑوں کی اطاعت و فرماں برداری کرنا، چھوٹوں پر شفقت اور ضرورت مندوں سے ہمدردی کرنا، وغیرہ یہ بچوں میں اچھے اقدار بے دار کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

موجودہ عہد تکنیکی اور چکا چونڈ کا ہے۔ جو چیز چمکتی ہے اس کی طرف بچہ لپکتا ہے تو ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ایسی رنگین اور تصاویری کتابیں اور خاکے تیار کیے جائیں جو سبق آموز ہوں اور بچہ

نہ صرف پڑھ کر تحصیل علم کرے بلکہ تصویر دیکھ کر بھی اس کو یہ بات سمجھ میں آجائے کہ اس چیز کا یہ نام ہے۔ Picture Books بھی موجودہ دور میں ادب اطفال کا ایک اہم حصہ بن چکی ہیں، کیونکہ رنگین اور خوبصورت خاکے بچوں کی بصری، حس اور دلچسپی کو بڑھاتے ہیں۔

ادب اطفال میں سیرت النبیؐ کی بنیادی باتیں، مذہبی عقائد، خدا کے وجود اور اس کی صفات، آسمانی کتب کی تعداد اور ان کے نام، کلمہ اور نماز وغیرہ کا نقش بچوں کے ذہن میں مرتسم کرنا ادب اطفال میں ایک اہم درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے پڑھنے اور یاد کرنے سے بنیادی خوبیاں بچے میں از خود پیدا ہو جائیں گی۔ اسی طرح حب الوطنی، قومی یکجہتی اور باہمی اتحاد کا درس دینا بھی ادب اطفال کا ایک حصہ ہے۔ بچے کو شروع سے ہی ایسا درس دیا جائے کہ وہ دوست و احباب، رشتہ داروں، ہمسایہ اور ہم وطنوں کے حقوق سے آگاہ ہو۔

آج کے وقت میں ہم آہنگی کی اشد ضرورت ہے۔ ہم آہنگی کا درس بھی ادب اطفال کا حصہ ہونا چاہئے کہ جب مختلف مذاہب کے افراد یکجا ہوں تو ایسی مجلسوں میں مذہبی باتوں سے بچنے کی کوشش کریں اور اگر باتیں ہو جائیں تو احترام ضروری ہے۔ کسی کے مذہب کو برا نہ کہئے اور جو فرد کسی غیر مذہب کے ماننے والے ہیں ان کو بھی ادب و احترام سے دیکھا جائے۔ غیبت اور غفلت سے بچنے کا درس بھی دیا جانا چاہئے۔



ادب نما کے پروگرام ”فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات“ میں آن لائن حصہ لیتے ہوئے کناڈا سے ڈاکٹر تقی عابدی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، پروفیسر صغیر افرامیم پروفیسر ریشما پروین، محترم عظیم اللہ ہاشمی، ڈاکٹر وحی اعظم، ڈاکٹر طالب اکرام وغیرہ

کہانیاں

دو بیٹیاں

بہت دن ہوئے جاپان میں ایک شکاری تھا، اسے اس قدر شکاری دھن تھی کہ کوئی دن ایسا نہ ہوتا تھا کہ وہ شکار نہ کھیلتا ہو، جب دیکھو تیرکمان ساتھ ہے۔

اس کے دو لڑکیاں تھیں۔ یہ دونوں لڑکیاں بدھ مذہب کی ماننے والی تھیں۔ مہاتما بدھ کا حکم ہے کہ جہاں تک ہو سکے کسی کی جان نہ لو، حیو ہتیا بدھ میں بڑا گناہ ہے۔

یوں تو ان لڑکیوں کا شکاری باپ بھی بودھ ہی تھا مگر وہ صرف اس لیے بودھ تھا کہ اس کے باپ دادا بودھ تھے۔ مذہب وزہب سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔

اس کی دونوں لڑکیاں بے شک سچی بودھ تھیں اور مہاتما بدھ کے بتائے ہوئے راستے سے بال برابر ادھر ادھر نہ ہوتی تھیں۔ ان لڑکیوں نے کئی دفعہ اپنے باپ سے کہا کہ شکار کرنا گناہ ہے۔ آپ شکار نہ کھیلا کیجئے، خواہ مخواہ کسی بے گناہ کی جان لینا کہاں کی بہادری ہے۔ زندگی خدا کا دیا ہوا ایک تحفہ ہے جو جانوروں کو بھی اسی طرح عطا ہوا ہے جس طرح انسانوں کو عطا ہوا ہے، پھر انسانوں کو کیا حق ہے کہ وہ جانوروں سے ان کی زندگی چھینیں۔

لیکن باپ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا، وہ اسی طرح شکار کو اپنی زندگی کا خاص مقصد بنا لئے رہا، لڑکیوں کے کیے کچھ نہ ہوا۔ وہ بے چاری اس خوف سے لرز جاتی تھیں کہ ان کے باپ کو اس پاپ کی سزا ضرور ملے گی۔

ایک دن ایک دوست ان کے شکاری باپ کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا ”میرے باغ کے اس طرف جو جھیل ہے اُس پر روز رات کو ایک سارس کا جوڑا آتا ہے۔، اس جوڑے کو اپنے تیروں کا نشانہ کیوں نہیں بناتے؟“

شکاری بولا: ”تم نے پہلے سے کیوں نہ بتایا،“ میں آج ہی رات کو ان کا شکار کھیلوں گا۔
بے بس لڑکیاں یہ سن کر سہم گئیں، بے چاری کیا کرتیں، روز روز کی ہٹا ان سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔
جب رات ہوئی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا تو شکاری تیرکمان لے کر جھیل پر پہنچ گیا اور سارس کے جوڑے کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر بعد دو سفید چیزیں جھیل کی طرف دھیرے دھیرے آتی ہوئی نظر آئیں۔ فوراً دو

تیر شکاری کی کما سے چلے اور ان سفید چیزوں کو زمین پر گرا دیا۔ شکاری دوڑا ہوا ان کے پاس پہنچا مگر یہ دیکھتے ہی وہ دل پکڑ کر رہ گیا کہ اس نے اپنی دونوں لڑکیوں کو اپنے تیروں سے مار ڈالا ہے۔ نیک لڑکیوں نے اپنی جان قربان کر کے ثابت کر دیا کہ زندگی کتنی مقدس ہے۔
غم کے مارے باپ نے تیر کمان کو توڑ کر پھینک دیا اور پھر عمر بھر کبھی شکار نہ کھلیا۔

☆☆☆



شعبہ اردو میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری۔ ساتھ میں موجود ہیں ایڈوکیٹ بدر محمود، آفاق احمد خاں، ڈاکٹر ارشد سیانوی، ڈاکٹر اکاوش ششہ، ڈاکٹر آصف علی دوہیر۔



ایک روزہ قومی سیمینار کے اختتامی اجلاس میں آفس انچارج محمد شمشاد پروفیسر ہما مسعود اور ڈاکٹر ریاض احمد سے ٹرافی لیتے ہوئے [اوپر] جب کہ نیچے کی تصویر میں سعید احمد سہارنپوری ڈاکٹر عبداللہ امتیاز (ممبئی) سے ٹرافی لیتے ہوئے۔

امیر مہدی
انگلینڈ

بیوقوف

اُسے جنگل تو نہیں کہا جاسکتا تھا مگر وہاں کافی درخت اور جھاڑیاں ضرور تھیں؛ اور ایک تالاب بھی تھا، کافی وسیع اور کشادہ۔ تالاب کے پہلو سے ایک پگڈنڈی جاتی تھی جو آگے جا کر شہر جانے والی شاہراہ سے مل جاتی تھی۔ اس شاہراہ کے دونوں جانب مہوے کے اونچے اونچے، فلک بوس درخت استادہ تھے جن پر میدانی پرندوں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔

جب پہاڑوں پر برف جمے لگتی، تو کثیر تعداد میں پہاڑوں سے منتقل ہونے والے پرندے (Migratory Birds) بھی اس علاقے میں آکر رہنے لگتے تھے، اور تالاب اور اُس کے آس پاس کا علاقہ ان منتقل ہونے والے مہاجر پرندوں کی کلکاریوں سے گونج اٹھتا تھا۔ تالاب کے آس پاس زمین کافی نرم رہتی تھی مگر جوں جوں پگڈنڈی شاہراہ کی جانب بڑھتی جاتی تھی، زمین خشک ہوتی جاتی تھی۔ موسم گرما میں زمین کی اوپری سطح پر پڑی سی جم جایا کرتی تھی اور زمین موشیوں کی آمد و رفت کے سبب کافی اوڑھ کھا بڑھی ہو گئی تھی؛ جگہ جگہ گڑھے اور دراڑیں وغیرہ بھی پڑ گئے تھے جو کہیں کہیں کافی گہرے اور مخدوش تھے۔ یہ گڑھے برسات کے موسم میں اور بھی مخدوش ہو جایا کرتے تھے جب ان میں پانی بھر جایا کرتا تھا اور زمین دلدلی ہو جاتی تھی، جہاں پیر رکھنا بھی مشکل ہوتا تھا۔ یہ ایک عجیب دنیا تھی۔

اس دنیا میں نہ جانے کتنی طرح اور کس کس وضع قطع کے کیڑے مکوڑے آباد تھے۔ وہ بھی ایک کیڑا تھا، معمولی کیڑا؛ اور اس کا تعلق کیڑوں کے ایک ایسے خاندان سے تھا جسے خدا نے پیروں کی نعمت سے محروم رکھا ہے اور جن کا نصیب رینگ رینگ کر چلنا ہے۔ اس کے آبا و اجداد اسی علاقے میں عرصہ دراز سے رہتے چلے آئے تھے۔ پشتوں سے کسی نے اس علاقے کو چھوڑ کر کہیں اور جا بسنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا اور نہ ایسی کوئی کوشش ہی کی تھی؛ سبھی یہیں پیدا ہوئے اور یہیں مر گئے۔

اور اب وہ بھی اپنی پیدائش سے لے کر ابھی تک اسی علاقے میں مہوے کے درخت کے قریب ایک چھپلے گڈھے میں رہتا چلا آ رہا تھا۔ اپنے آبا و اجداد کی طرح اس کے بھی پاؤں نہیں تھے، اور وہ بھی رینگ رینگ کر چلتا تھا۔ اسی سبب سے کبھی کبھی معمولی فاصلہ طے کرنے میں بھی کافی وقت لگ جاتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ یہ کیڑا رینگتے رینگتے مہوے کے درخت کے نزدیک پہنچ جاتا اور درخت کے

تنے پر چڑھنے کی کوشش کرتا۔ بہت جتن سے وہ کسی طرح اونچ اونچ درخت کے تنے پر چڑھ بھی جاتا، مگر پھر گرفت نہ ہونے کے سبب پھسل کر زمین پر آگرتا۔

اور پھر وہ دوبارہ کوشش کرتا اور پھر زمین پر آگرتا۔ کئی بار کی کوشش اسے تھکا دیتی، وہ ہمت ہار جاتا اور حسرت سے نیلے آسمان کی جانب دیکھنے لگتا؛ اور آسمان کی وسعتوں میں اڑتے خوبصورت پرندوں کو دیکھ کر اس کے منہ سے آہ نکل جاتی: "کاش میرے بھی پر ہوتے! کاش میں بھی آسمان میں اڑ سکتا!" وہ اپنے آپ سے اسی طرح کی باتیں کرنے لگتا، اور باتیں کرتے کرتے اداس ہو جاتا اور اپنے وجود کو کوئے لگتا۔

☆

زمہریر کا زمانہ تھا، ٹھنڈک اپنے شباب پر تھی۔ کڑا کے کی سردی پڑنا شروع ہو گئی تھی اور ہمیشہ کی طرح برف نے پہاڑوں کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ دودھیابرف اور اونچے پہاڑ، مگر موسم کی ناسازگاری کے سبب اب یہ خوبصورت پہاڑ پرندوں کے رہنے کے لائق نہیں رہ گئے تھے۔ ایسے میں نہ صرف گیارہ و سبزہ بلکہ اچھی خاصی جھاڑیاں اور درخت وغیرہ بھی برف کے نیچے دب گئے تھے، اور پرندوں کے لیے آب و دانہ تلاش کرنا "تلاش جوئے شیر" کے مانند ہو گیا تھا۔

حالات نے انہیں ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا، اور اس سبب سے منتقل ہونے والے پرندے (مہاجر پرندے) مثلاً: آسمانی اور شہابی بازوؤں اور سفید پوٹے والے سرخاب، کاسنی پروں اور نیلی آنکھوں والے ہنس، نارنجی گردن اور نیلی آنکھوں والے خوبصورت سارس، لال کٹھڑے والے خوبصورت طوطے، اور سریلی آواز اور پیلی منقار والی پہاڑی مینا اور نہ جانے کون کون سی وضع قطع والے طائر مجبوراً پہاڑوں سے ہجرت کر کے میدانی علاقوں میں آب و دانہ کی تلاش میں آگئے تھے۔ ان کی آمد نے میدانی علاقوں کو زندگی سے بھر دیا تھا، گویا بہار نے وقت سے پہلے ہی دستک دے دی ہو۔

دیگر میدانی علاقوں کی طرح ہی، اس تالاب اور اس کے آس پاس کا علاقہ بھی منتقل ہونے والے مہاجر پرندوں کی آمد سے گلزار ہو گیا تھا۔ ان منتقل ہونے والے مہاجر پرندوں نے علاقائی پرندوں کی مانند مہوے کے درختوں پر اپنے گھونسلے بھی بنا لیے تھے۔ وہ تمام دن کھیتوں، باغوں اور گھاس کے میدانوں میں دانہ چگتے اور تالاب سے مچھلیاں وغیرہ اپنی لمبی لمبی منقاروں میں دبا کر زندہ ہی نگل جاتے، اور شام ہوتے ہوتے مہوے کے درختوں پر آکر بے فکر ہو کر بسرا کرتے۔

☆

اس وقت سورج ڈوب رہا تھا اور شام کے سائے دھیرے دھیرے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ آسمان پر شفق پھولی ہوئی تھی؛ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہولی کھیلی گئی ہو، اور نیلے اور بے کراں آسمان پر یہاں وہاں سرخ اور سرمئی رنگ بکھرا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے پراسرار جھونکے بدن میں سنسنات پیدا کر رہے تھے۔ ایسے میں ایک پہاڑی سرمئی اور عنابی، ریشمی پروں اور پیلی منقار والی مینا بھی ابھی مہوے کی ایک گھنی شاخ پر رات گزارنے اور بسرا کرنے کے لیے آکر بیٹھی تھی کہ اس کی نظر اس ادنیٰ سے کیڑے پر

پڑی۔ وہ مہوے کے تنے پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور بار بار "لد" سے زمین پر آگرتا تھا۔ مینا اس کا تنے پر چڑھنا اور پھر زمین پر گرنا دلچسپی سے دیکھ رہی تھی، اور اس کی دلچسپی اس ادنیٰ سے کیڑے میں بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

بار بار کی کوشش سے آخر کیڑا تھک گیا اور حسرت سے آسمان کی جانب دیکھنے لگا، اور اس نے ایک آہ بھری۔ پھر اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا: "اے کاش۔۔۔!"

مینا کو اس کی باتیں سن کر اس کی حالت پر ترس آنے لگا۔ وہ کیڑے کی جانب متوجہ ہوئی اور اپنی بیٹھی آواز میں کیڑے سے کہا: "کیا تم درخت پر چڑھنا چاہتے ہو؟" کیڑے نے بے بسی سے مینا کی جانب دیکھا اور بہت ہی عاجزی سے آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا: "میں صرف اس مہوے کے درخت پر چڑھنا ہی نہیں چاہتا، میرا جی کرتا ہے میں بھی تمہاری طرح اڑوں اور آسمان کی وسعتوں میں دو دو دو تک سیر کروں، مگر قدرت نے مجھے تمہاری طرح پر نہیں دیے ہیں۔ کاش میں فضا میں پرواز کر سکتا، کاش میرے بھی پر ہوتے!"

مینا نے اپنے خوبصورت پروں کو ہلکی سی جنبش دی اور وہ اڑ کر کیڑے کے نزدیک پہنچ گئی؛ اور پھر اس نے اپنی منتظر میں ہلکے سے اس کیڑے کو دبایا اور دوبارہ آکر مہوے کی اسی ڈال پر بیٹھ گئی۔ مینا نے درخت کے ایک سبز پتے پر اس کیڑے کو لا کر چھوڑ دیا۔ کچھ دیر تک تو کیڑے کو یقین ہی نہیں آیا کہ ایک پل میں یہ کیا ہوا؟ وہ زمین سے درخت پر آگیا تھا اور ایک پل کو اس کا بدن ہوا میں اڑا اور لہرایا بھی تھا۔ اس کا دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہو گیا تھا، اس کی ایک عمر کی تنہا پوری ہو گئی تھی۔ اس نے مینا کو مشکور نگاہوں سے دیکھا اور اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ وہ رات اس کیڑے نے مہوے کے درخت کے اس سبز پتے پر آرام سے گزاری، مگر اس کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی؛ وہ اتنا جوش میں تھا کہ تمام رات سو نہیں سکا۔ اور پھر دن بدن ان کی دوستی اور گہری ہوتی گئی۔



اور پھر زمستان کا موسم گزر گیا، بسنت کی رُت آگئی۔ کوہساروں کی برف پگھلنا شروع ہو گئی، منتقل ہونے والے مہاجر پرندے جھنڈ کے جھنڈ میدانوں سے پہاڑوں کی جانب لوٹنے لگے۔ اور پھر اس سرمئی اور عنابی، ریشمی پروں اور پیلی منتقار والی پہاڑی مینا نے بھی وطن جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر اس خیال نے اس پر تنگنے والے کیڑے کو پریشان کر دیا؛ مینا پہاڑ پر واپس چلی جائے گی تو وہ تنہا رہ جائے گا، اور اسی طرح اس پچھلے گڈھے کے آس پاس ریگ ریگ کر زندگی بسر کرنا اس کا مقدر ہو جائے گا۔ وہ مایوس اور اداس رہنے لگا۔



دن ابھی پوری طرح چڑھا نہیں تھا، مگر ہواؤں میں حدت آچلی تھی؛ موسم گرمانے لگا تھا۔ سورج کی کرنیں تالاب کے پانی سے سیدھی آکر ٹکرا رہی تھیں، اور تالاب اور اس کے آس پاس کا درجہ

حرارت اوسط سے تجاوز کرنے لگا تھا۔ ایسے میں مینا سے گرمی اور تپش برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے لیے یہی مناسب تھا کہ وہ مہوے کے درخت پر آکر بیٹھ جائے اور ہرے پتوں کے درمیان دو پہر کا وقت آرام سے گزار دے۔ اس نے کیڑے کو اپنی خوبصورت پہلی منقار میں دبایا اور مہوے کے درخت پر آ بیٹھی؛ اور پھر آہستہ سے اس نے اس کیڑے کو ایک سبز اور شاداب پتے پر چھوڑ دیا، اور پھر روز کی طرح وہ اس کیڑے کو دور پہاڑوں کے قصے کہانیاں سناتے لگی، جو اس کا وطن تھے اور جہاں سے وہ شدید چاڑے اور برف کے سبب اڑ کر کچھ عرصے کے لیے اس تالاب کے کنارے آب و دانے کی تلاش میں آگئی تھی۔

مگر آج کیڑے کو مینا کی چچہاٹ اچھی نہیں لگ رہی تھی، وہ بجھا بجھا سا تھا۔ مینا کو اس کا یوں بجھا بجھا رہنا اکھرنے لگا۔ اس نے کیڑے سے اس کی اداسی کا سبب دریافت کیا۔ کیڑے نے بڑے ہی اٹ پٹے لہجے میں جواب دیا: "موسم گرم ہونے لگا ہے، سبھی مہاجر پرندے میدانوں سے پہاڑوں کو لوٹ رہے ہیں۔ تم بھی آج نہیں توکل اپنے وطن لوٹ جاؤ گی، اور میں پھر اکیلا رہ جاؤں گا۔"

کیڑے کی بات سن کر مینا سوچ میں پڑ گئی، اور کچھ دیر خالی خالی آنکھوں سے خلا میں گھورتی رہی، اور پھر آہستہ سے بولی: "کیا تم میرے ساتھ میرے وطن چلو گے؟" اب سوچنے کی باری کیڑے کی تھی، وہ پس و پیش میں پڑ گیا مگر پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مینا کے ساتھ پہاڑوں پر جا کر رہے گا۔ اس نے مینا سے کہا: "اگر تم لے چلو گی تو میں ضرور تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

مینا نے پھر سوال کیا: "کیا تمہیں اپنا وطن اور اپنے لوگ یاد نہیں آئیں گے؟ تم اچھی طرح سوچ لو اور پھر جواب دو، بعد میں مجھے الزام مت دینا۔" مینا نے کیڑے کی جانب دیکھ کر کہا۔ کیڑے نے ایک نظر اپنے آس پاس کے ماحول پر ڈالی اور پھر بولا: "یہاں ایسا کیا ہے، جس کے لیے میں یہاں رکوں؟ یہ چھٹلا گڈھا؟ ابھی برسات شروع ہو جائے گی اور یہ گڈھا پانی سے بھر جائے گا، اور پھر میرے لیے صبح شام کرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ اور اگر تم مجھے اپنے ساتھ پہاڑوں پر لے چلو گی تو۔۔۔"

"تو کیا؟" مینا مسکرائی۔

"تو یہاں کے ریگنے والے کیڑے میری قسمت پر رشک کریں گے۔" کیڑے نے اپنا جملہ

پورا کیا۔

اس رات کیڑا تمام رات سو نہیں سکا، رات آنکھوں میں گزر گئی۔ صبح وہ مینا کے ساتھ پرواز کرے گا۔۔۔ اور پھر وہ ہوگا اور سرمئی و عنابی، ریشمی پروں والی مینا۔۔۔ خوبصورت پہاڑ۔۔۔ سرد ہوائیں۔۔۔ اور لہلہاتے سبز اخروٹ کے درخت۔۔۔ اور بادام کے پیڑ۔۔۔ اور سیب و انار کے خوش رنگ باغات۔



ابھی سورج کی پہلی کرن نے زمین کی سرد پیشانی کو چوما بھی نہیں تھا اور نہ ہی مرغ نے بانگ ہی دی تھی، مگر کچھ ہی لمحوں میں صبح ہونے کے آثار نمودار ہونا چاہتے تھے۔ آسمان سفیدی مائل نظر

آنے لگا تھا۔ مینا نے کیڑے کو اپنی خوبصورت پہلی منقار میں آہستہ سے دبایا اور ان پہاڑوں کی جانب اڑ چلی جہاں سے وہ آئی تھی۔

اور پھر دریاؤں، میدانوں، شہروں، گاؤں اور جنگلوں سے ہوتی ہوئی، ایک لمبی پرواز کے بعد گھاٹیوں اور وادیوں سے گزرتی ہوئی، مینا اس کیڑے کو اپنی منقار میں دبائے ہوئے اس اونچے پہاڑ پر پہنچ گئی جو بہت خوبصورت تھا؛ اور جہاں بہت سارے سیب، سنترے، مومبی آلوچے، ناشپاتی اور انار کے خوش رنگ درخت تھے، اور پستے، اخروٹ، بادام، چروخی اور کاجو کے پیڑ بھی، جن میں سے ایک سیب کی سب سے اونچی شاخ پر مینا کا اپنا گھونسلہ تھا؛ نرم و نازک اخروٹ کی چھال سے بنا ہوا، آرام دہ اور گداز۔ اس نے کیڑے کو اسی نرم و گداز گھونسلے میں جا کر بہت ہی آہستہ سے چھوڑ دیا۔ کیڑے نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی اتنا لمبا اور تھکانے والا سفر نہیں کیا تھا، وہ کافی تھکا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں نیند سے خوابیدہ ہو رہی تھیں؛ وہ جلد ہی سو گیا۔



اور پھر صبح ہوئی پھر شام، پھر رات اور پھر صبح؛ اور پھر اپنی رفتار سے دن گزرنے لگے۔ ہر صبح مینا کیڑے کو اپنی پہلی، لمبی اور خوبصورت منقار میں دباتی اور نزدیک جھیل کے کنارے چھوڑ آتی، اور پھر شام گہرانے سے قبل اسی طرح منقار میں دبا کر سیب کے درخت پر اخروٹ کی چھال سے بنے گداز اور آرام دہ گھونسلے میں واپس لے آتی۔ کیڑا تمام دن جھیل کے کنارے ریگ ریگ کر چلتا، اپنے لیے کھانا تلاش کرتا اور خوبصورت نظاروں کا لطف لیتا۔ کبھی کبھی مینا کیڑے کو دور دراز کے علاقوں میں بھی لے جاتی اور باغ بچوں کی سیر کرواتی، اور وہ کیڑا مینا کی منقار کے سہارے فضا میں پرواز کرتا۔ اسے یوں لگتا وہ مینا کی منقار میں دبا ہوا میں نہیں اڑ رہا ہے، بلکہ اس کے خود کے پر ہیں اور وہ اپنے پروں سے کھلے ہوئے آسمان میں پرواز کر رہا ہے۔

کبھی کبھی اسے یہ بھی لگتا کہ وہ مینا سے بہتر اڑ سکتا ہے؛ مینا کو تو پرواز کے لیے اپنے ریشمی پروں کو حرکت دینی پڑتی ہے، مگر وہ تو بنا اپنے جسم کو حرکت دیے ہی فضا میں پرواز کر رہا ہوتا ہے۔ پرواز کرتے وقت اس کا جسم ہوا میں لہراتا بھی ہے، جب کہ مینا کو اپنے جسم کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ آہستہ آہستہ اسے مینا میں عیب نظر آنے لگے۔ اس کی سریلی اور میٹھی آواز اسے کرخت اور بھدی لگنے لگی، اس کے ریشمی پر اسے کھر درے لگنے لگے۔ اسے اپنا وطن یاد آنے لگا۔۔۔ وہ گڈھا اور اس کے اپنے۔۔۔ وہ ریگ ریگ کر چلنے والے کیڑے۔

اسے لگنے لگا یہ کبخت مینا ہی اسے اپنوں سے اتنی دور لے آئی، ورنہ وہ آج بھی اپنوں کے بیچ اس مہوے کے درخت کے نزدیک اس پھلے گڈھے میں آرام سے رہ رہا ہوتا۔ اسے مینا کی ہر بات بری لگنے لگی، وہ فراز راسی بات پر مینا سے جھگڑتا، اسے برا بھلا کہتا، اور اس دن کو کوستا جب اس نے مینا کے ساتھ اس بریلے پہاڑ پر آنے کا فیصلہ کیا تھا، جہاں ہر وقت ٹھنڈی ٹھنڈی بدن کو سہلانے والی ہوا چلتی رہتی ہے۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا کیڑے کے مزاج میں مزید تلخی آتی جا رہی تھی، اسے اب مینا کی کوئی بات بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس کا اٹھنا، اس کا بیٹھنا، اس کا بات کرنا؛ مگر مینا نے اپنے معمول میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آنے دی تھی۔ وہ اسی طرح حسب معمول ہر صبح کیڑے کو جھیل کے کنارے چھوڑ آتی اور شام ہونے سے قبل گھونسلے میں واپس لے آتی؛ اسے پہلے کی طرح ہی دور دراز باغ بچوں کی سیر کراتی اور پہلے کی طرح ہی اس کا خیال رکھتی، مگر وہ کیڑا اب بات بات پر اس سے جھگڑتا اور برا بھلا کہتا، کبھی کبھی کاٹ بھی لیتا۔ مینا دکھی رہنے لگی۔

اس رات کیڑے نے مینا کو بہت برا بھلا کہا اور اپنے زہریلے دانتوں سے اس کے بازو میں کاٹ بھی لیا۔ مینا کے لیے رات گھونسلے میں گزارنا محال ہو گیا، وہ گھونسلے سے اس رات اندھیرے میں ہی اڑ گئی، اور اس نے دوسرے باغ میں جا کر سنترے کی سوکھی ڈال پر تنہا رات گزار دی۔

دن بہ دن جھگڑے بڑھتے جا رہے تھے، مینا کا سکھ چین چھن چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کیڑے کو واپس لے جا کر اسی مہوے کے نزدیک اس پتھر کے گڈھے میں چھوڑ آئے گی، جہاں برسات کے دنوں میں پانی بھر جاتا ہے۔ مگر پھر اس کا معصوم اور حساس دل اسے ایسا کرنے سے منع کرنے لگا؛ اگر کیڑا بیوقوف اور نادان ہے تو وہ تو نادان نہیں ہے۔ پھر لوگ کیا کہیں گے؟ کتنی رسوائی ہوگی؟ اور اس نے کیڑے کو واپس لے جا کر چھوڑ آنے کا خیال دل سے نکال دیا۔ شاید اسے کیڑے سے محبت ہو گئی تھی، شاید اس نے کیڑے کو اپنا مقدر مان لیا تھا، جسے وہ چاہ کر بھی اپنے سے جدا نہیں کر سکتی تھی۔

☆

وہ اب بھی ساتھ رہتے ہیں۔ وہ کیڑا اس سرمئی اور عنابی، ریشمی پروں اور پیلی منقار والی مینا کو روز اپنی گندی، بازو اور بھدی زبان میں گالیاں دیتا ہے اور کبھی کبھی اپنے نوکیلے اور زہریلے دانتوں سے اس کے نازک جسم میں کاٹ بھی لیتا ہے؛ مگر مینا آنکھوں میں آنسو بھر کر سب سہ لیتی ہے، اور اسی طرح دونوں کے دن گزر رہے ہیں۔

رات کو مان لیا دل نے مقدر لیکن

رات کے ہاتھ پہ اب کوئی دیا چاہتا ہے

☆☆☆

۱۲ سے ۱۵ سال کے بچوں کی کہانی

ایمان کی دولت

بہت زمانہ پہلے کا ذکر ہے۔ عرب ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ بادشاہ ایمان والوں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اسے اللہ کا نام لینے والے بالکل پسند نہیں تھے۔ وہ اپنی رعایا پر بھی ظلم و ستم کیا کرتا تھا۔ اس کی سلطنت میں ایک بزرگ جادوگر تھا۔ وہ اس جادوگر کی بدولت بہت سے کام کرتا تھا۔ سلطنت کے انتظام میں وہ جادوگر کی مدد لیتا۔ ایک وقت آیا کہ وہ جادوگر خود کو مجبور و بے کس سمجھنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اب وہ چند دن کا مہمان ہے۔ کبھی بھی موت اسے دبوچ سکتی ہے۔ ایسے میں وہ بادشاہ کے حضور حاضر ہوا اور بولا۔

”بادشاہ سلامت۔۔۔ لگتا ہے میرا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔“

”میریں تمہارے دشمن۔۔۔“

”نہیں حضور۔۔۔ مرنا تو سب کو ہے۔۔۔“

”اچھا بتاؤ۔۔۔“ بادشاہ سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے جادوگر کو اپنے قریب بٹھایا۔

”آخر وقت میں تم کیا چاہتے ہو۔۔۔ بولو۔۔۔ میں سب کچھ دینے کو تیار ہوں۔۔۔ مگر تمہارے

جانے کا بہت دکھ ہوگا۔۔۔ میری سلطنت کے کئی ضروری کام تم سے چلتے تھے۔۔۔“

”اسی لئے تو کہتا ہوں۔۔۔ آپ کسی بچے کو میرے پاس بھیج دیں۔۔۔ میں اسے اپنا علم و ہنر

سکھا دوں گا۔۔۔ جادو کے ہر حربے میں اسے ماہر کر دوں گا۔ تاکہ وہ میری طرح آپ کے کام آ سکے۔“

بادشاہ کو دکھ تو بہت تھا مگر کیا کرتا؟ موت سے کس کو رستگاری ہے؟ اس نے ایک لڑکے کو جادو

گر کے پاس بھیجنا شروع کر دیا، تاکہ وہ جادوگر سے جادو کے ہر ہنر اور حربے سیکھ لے اور جادوگر کے بعد وہ

اس کے کام آ سکے۔ اس لڑکے نے جادوگر کے پاس جانا شروع کر دیا۔ راستے میں ایک عبادت

گزارا رہا پڑتا تھا۔ جو عیسائی کو مانتا تھا اور خدا کی وحدانیت کا قائل تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہر وقت

خدا کی عبادت میں لگا رہتا۔ لڑکا آتے جاتے اس کے پاس بھی کچھ وقت گزارنے لگا۔

”بابا۔۔۔ مجھے بھی کچھ سکھا دیں۔۔۔“

”اللہ ایک ہے۔۔۔ وہ ہی اس زمین و آسمان کا مالک ہے۔۔۔ سب کچھ اسی کا ہے۔“

”آپ کی باتوں میں ایک کشش ہے۔۔ آپ کے لہجے میں مٹھاس ہے۔۔“

”یہ سب اس کا کرم ہے۔“ راہب یہ کہتے ہوئے آسمان کی طرف نظر کرتا۔

بچے نے چالاکی سے دونوں کے یہاں جانا جاری رکھا۔ اس نے جادوگر کے تمام ہنر سیکھ لئے دوسری طرف بچہ راہب کی صحبت میں خدا پر ایمان کو مضبوط و مستحکم کرتا رہا۔ اسے بادشاہ کا اعتماد حاصل تھا بادشاہ بچے کی چالاکی اور ایمان سے بے خبر تھا۔ وہ تو حکومت کے کاموں میں مصروف تھا۔ اسے بوڑھے جادوگر کی باتوں پر بہت یقین اور بھروسہ تھا۔ جادوگر بھی بچے کے راہب سے علم دین سیکھنے کے عمل سے ناواقف تھا۔ ایک دن جادوگر کا انتقال ہو گیا۔ بادشاہ، وزیر اور تمام درباری اداس اور غمگین ہوئے۔ پوری شان و شوکت کے ساتھ جادوگر کو رخصت کیا گیا۔ کئی دن تک ریاست میں غم و اندوہ چھایا رہا۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ جس راستے پر وہ بچہ جاتا تھا۔ اس پر ایک خطرناک سانپ پھن پھیلائے کھڑا تھا۔ جس کی وجہ سے راستہ جام ہو گیا تھا۔ دونوں طرف لوگ ڈر کے مارے کھڑے تھے۔ کسی میں دوسری طرف جانے کی ہمت نہیں تھی۔ سب پریشان کھڑے تھے۔ ایسے میں ادھر سے اس بچے کا گذر ہوا۔ اس نے بھیڑ کھڑی دیکھی۔ لوگ اس کی طرف دوڑے اور بولے۔

”ہمیں اس مصیبت سے چھٹکارہ دلاؤ۔۔“

”میں کوشش کرتا ہوں۔“

لوگوں کو بچے سے امید تھی۔ وہ سب جانتے تھے کہ یہ بچہ جادوگر کا وارث ہے اور وہ، اس کے سبھی گز سیکھ چکا ہے۔ دوسری طرف بچہ بادشاہ کا بھی قریبی تھا۔ لوگوں کو امید تھی کہ یہ لڑکا ضرور کچھ ایسا کرے گا کہ ہمیں اس پریشانی سے چھٹکارا جائے گا۔

بچے نے لوگوں کی آنکھوں میں ڈر خوف پڑھ لیا تھا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ یہاں اس کا جادو کام نہیں آئے گا۔ مگر وہ یہ کہہ کر اپنی بے عزتی نہیں کرانا چاہتا تھا۔ بھیڑ کو اس سے بہت سی توقعات تھیں۔ وہ پریشان تھا کہ اسے راہب کی باتیں یاد آئیں۔ اللہ ایک ہے اور پوری دنیا کا مالک ہے۔ زمین و آسمان کے درمیان جو کچھ ہے سب اس کا ہے۔ اس نے اس اللہ سے گڑا گڑا کر دعا کی۔

”اے زمین و آسمان کے مالک۔! اے ساری دنیا کو چلانے والے۔!“

”اے اللہ۔! تو فیصلہ کر دے۔ راہب صحیح ہے یا جادوگر۔؟“

”اگر راہب صحیح ہے تو اس پتھر سے یہ سانپ مر جائے۔“

”اور اگر جادوگر اپنی جگہ ٹھیک ہے تو اس پتھر سے سانپ نہ مرے۔“

”تو مجھے صحیح راستہ دکھا۔۔“

لوگوں نے دیکھا وہ خطرناک سانپ، بچے کے پتھر کے وار سے چاروں خانے چپت ہو گیا ہے اور مر گیا ہے۔ بچے کی آنکھیں بند تھیں اور وہ منہ ہی منہ کچھ بدبواہی تھا۔ لوگوں نے بچے کی بے کار شروع کر دی۔ وہ اسے اور ماننے لگے۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ بچے کے پاس کوئی خاص علم ہے۔

ایک بار ایک اندھا شخص اس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔
 ”تم بہت علم والے ہو۔ میری آنکھیں دیکھنے لائق نہیں ہیں۔ تم دعا کر دو۔۔ میری بینائی واپس آ جائے۔۔“

”علم تو صرف اللہ کے پاس ہے۔“
 ”کچھ کرو۔۔ مجھے یقین ہے۔“

”میں بس اس سے دعا کر سکتا ہوں۔ بینائی واپس کرنا اس کے ہاتھ ہے۔“ لڑکے کا منہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

”میری ایک شرط ہے تم وعدہ کرو اگر تمہاری بینائی واپس آ جائے تو تم اللہ کی وحدانیت پر ایمان لے آؤ گے۔“

اس اندھے شخص نے اس کی شرط مان لی۔ اس لڑکے نے اللہ سے اس نابینا شخص کی بینائی کے لئے دعا کی۔ لڑکے کی آنکھیں بند تھیں اور وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ پڑھ رہا تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا، اس اندھے شخص کی آنکھوں کی روشنی واپس آ گئی تھی۔ اب وہ سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ اللہ کی توحید پر ایمان لے آیا۔

آخر کار وہ وقت آ گیا جس کا سب کو خوف تھا۔ بادشاہ کو ان تمام واقعات کا پتہ چل گیا۔ اس نے اندھے شخص کو (اب اس کی بینائی واپس آ گئی تھی۔) راہب کو اور اس لڑکے کو گرفتار کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ وہ سب بادشاہ کے حضور پیش کئے گئے۔ بادشاہ نے ان سے کہا۔

”تم اگر موت سے بچنا چاہتے ہو تو، توحید کا انکار کر دو۔ ورنہ تمہارا وہ حال کروں گا کہ دنیا دیکھے گی۔ اب بھی وقت ہے تم اپنے ایمان سے توبہ کر لو۔“

”اب تم کچھ بھی کر لو، ہم ایمان سے پھرنے والے نہیں۔“ لڑکا اور وہ سب ایک ساتھ بولے۔

بادشاہ کو طیش آ گیا۔ اس نے جلال میں نابینا شخص اور راہب کو آ رہے سے چیرنے کا حکم دیا۔ کچھ ہی دیر میں بادشاہ کے حکم پر عمل ہو گیا۔ ایسی موت پر لوگوں کی روح تک کانپ گئی۔ دیکھنے اور سننے والوں میں ڈر اور خوف سرایت کر گیا۔ ان کا جسم لرزنے لگا۔ مگر انہوں نے ایک لمحے کو یہ بھی سوچا کہ توحید پر ایمان لانے میں کوئی توبات ہے جو ان لوگوں نے ایسی خطرناک موت کو چنا۔

ادھر بادشاہ نے لڑکے سے ایمان چھوڑنے کو کہا۔

”تم اگر اس ایمان سے باز آ جاؤ تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ اور تمہیں؟ خوب ساری دولت، اعلیٰ عہدہ اور مکان دوں گا۔“ بادشاہ نے اسے لالچ دیا۔

”نہیں۔۔ میں ایمان سے پھرنے والا نہیں۔ چاہے تم کچھ بھی دو یا کچھ بھی بگاڑ لو۔۔“

بادشاہ کو لڑکے سے یہ امید نہیں تھی۔ وہ لڑکے کے جواب سے آگ بھولہ ہو گیا۔ اس نے اپنے

فوجیوں کو اسے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے کھائی میں گرا کر مارنے کا حکم دیا۔ فوجی اسے لے کر ایک اونچے پہاڑ پر پہنچے۔ وہاں پہنچ کر وہ اس لڑکے کو کھائی میں گرا نا ہی چاہتے تھے کہ لڑکے نے خدا کے حضور دعا کی۔
 ”اے اللہ! اگر تو سچا ہے تو مجھے بچالے اور دشمنوں کو نیست و نابود کر دے۔“

ابھی اس کی دعا پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ پہاڑ پر بہت تیز زلزلہ آیا۔ اسے پکڑ کر لانے والے تمام فوجی مارے گئے۔ وہ لڑکا زندہ رہا۔ بعد میں جب بادشاہ کو اس واقعے کا علم ہوا تو اسے بڑی حیرانی ہوئی مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور کچھ لوگوں کو حکم دیا کہ اسے سمندر میں لے جاؤ۔ بیچ سمندر میں اسے بہا دینا وہاں بھی اللہ کے حکم سے کشتی الٹ گئی اور اسے لے جانے والے ڈوب کر مر گئے۔ وہ لڑکا بچ گیا۔ یہ سن اور لڑکے کو زندہ دیکھ کر بادشاہ بہت فکر مند ہوا۔ لڑکے نے بادشاہ کی مشکل آسان کرنے کے لئے ایک ترکیب بتائی۔

”ایک کھلی جگہ سب کو جمع کر کے اللہ کا نام لے کر میرے تیر مارو میں مر جاؤں گا۔“
 بادشاہ نے ایسا ہی کرنے کا حکم دیا۔ ایک بڑے سے میدان میں عوام کو جمع کر کے اللہ کا نام لے کر تیر مارا گیا۔ تیر لڑکے کو لگا، جس سے وہ لڑکا وہیں شہید ہو گیا۔ مگر دیکھنے والے بہت سے لوگ ایمان لے آئے۔ بادشاہ کو لڑکے کے مارے جانے کی خوشی تو تھی مگر اسے لوگوں کا ایمان لانا ایک آنکھ نہیں بھایا۔ اس نے لوگوں کو ڈرایا اور خوب سمجھایا۔ مگر اسے کامیابی نہیں ملی۔ تب اس کے ذہن میں ایمان والوں کو سزا دینے کی ایک نئی ترکیب سمجھ میں آئی۔ اس نے ایک بڑی سی خندق کھدوائی اور اس میں زوردار آگ سلگائی۔ اور ایمان لانے والوں کو اس خندق میں ڈلو کر مار دیا۔

موت تو سب کو آتی ہے۔ سب سے بڑی چیز ایمان ہوتی ہے، موت اگر ایمان پر آئے تو زندگی کامیاب ہے۔ یہ بات جس کو سمجھ میں آگئی، وہ کامیابی کی منزل پر گامزن ہو گیا۔



دوروزہ عالمی سیمینار میں محترم نفیس احمد پیپر پڑھتے ہوئے، اسٹیج پر موجود ہیں ڈاکٹر آصف علی، پروفیسر پرگلیہ پاٹھک، ڈاکٹر پردیپ جین، پروفیسر اسلم جشید پوری، قاضی شہزین السالکین اور محترم امیر مہدی

"اونگیٹو"

* بابا جانی!

بابا جانی!

آج میں کئی دنوں سے بیمار ہوں لیکن مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر مجھے ہوا کیا ہے۔
امی جان ڈاکٹروں کے یہاں کا چکر لگا کر اب بہت زیادہ ہی پریشان ہو گئی ہیں۔
اور ایسے وقت میں اگر آپ یہاں ہوتے تو امی جان کو تھوڑی بہت مدد ضرور مل جاتی۔

ننا سارا دن گھر پر اکیلے بستر پر پڑی رہتی ہیں۔

ڈاکٹر نے انہیں مکمل بیڈ ریسٹ کے لئے کہا ہے۔

امی جان تو مجھے لے کر سارا سارا دن اسپتال میں ہوتی ہیں۔

کل تک مجھے دو بوتل خون چڑھایا جا چکا تھا۔

اور آج ایک بوتل گلوکوز چڑھایا گیا ہے۔

جنوری کی سلیری سے اب تک آپ نے تین بار میں کویت سے میرے علاج کے لئے

ڈھیروں روپے بھیجے ہیں۔

جس سے آپ کی محبتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بلڈ ٹیسٹ کے بعد اور اس کی رپورٹ دیکھنے کے بعد یہ باتیں میرے علم میں آئیں کہ میرا بلڈ

گروپ (O-) ہے۔

میں نے نیٹ پر بلڈ گروپ کے حوالے سیڈھیر ساری معلومات فراہم کی ہیں اونیگیٹو

گروپ کے حامل افراد کو 'یونیورسل بلڈ ڈونر' تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ یہ خون کا وہ گروپ ہے جو کسی بھی

دوسرے گروپ کے ضرورت مند شخص کو لگایا جاسکتا ہے اس لیے ایمر جنسی یا ہنگامی صورت حال میں 'اونگیٹو'

کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

ماہرین کے مطابق صرف آٹھ فیصد لوگوں میں (اونگیٹو) گروپ پایا جاتا ہے۔

انسانی بلڈ گروپس پر مشتمل ہیں جبکہ اے بی نیگیٹو سب سے زیادہ نایاب ہوتا ہے۔

اولڈ گروپ کے مالک افراد کسی کو بھی خون دے سکتے ہیں۔

اوپاز بیٹو خون کا گروپ رکھنے والے افراد تمام چاروں گروپس کو خون دے سکتے ہیں، مگر ایسے افراد کو جن کا گروپ پاز بیٹو ہوگا جیسے اوپاز بیٹو، اے پاز بیٹو، بی پاز بیٹو اور اے بی پاز بیٹو۔ اوٹیکٹو بلڈ گروپ میں خون کے سرخ خلیات تمام، سب گروپس کو منتقل کیے جاسکتے ہیں اور انہیں یونیورسل ڈونر مانا جاتا ہے، مزید برآں اوٹیکٹو بلڈ خون رکھنے والے نومولود بچے امراض سے دوسروں کے گروپس کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہوتے ہیں۔

اوبلڈ گروپ والوں کو صرف اوبلڈ گروپ کے مالک ہی خون دے سکتے ہیں۔
اوپاز بیٹو گروپ رکھنے والے افراد اوپاز بیٹو اور اوٹیکٹو بلڈ گروپس کے مالک افراد سے خون لے سکتے ہیں، جبکہ جن لوگوں کے خون کا گروپ اوٹیکٹو ہو، وہ صرف اوٹیکٹو خون ہی لے سکتے ہیں۔
آپ نے میرے علاج کے لئے ڈھیروں پیسے بھیجے ہیں لیکن امی ان پیسوں کو لے کر ادھر ادھر صرف بھٹک رہی ہیں لیکن اوٹیکٹو بلڈ کہیں بھی دستیاب نہیں ہیں.....
ایک شام امی تھکی تھکی سی جب گھر لوٹیں تو کافی پریشان تھیں....
میں ان کی پریشانی کی وجہ خوب اچھی طرح سے جانتا تھا لیکن میں خاموش تھا۔
امی کی آنکھوں میں نمی بھی تھی اور چہرے پر خوشی کی لکیریں صاف نمایاں تھیں۔
امی جان مجھ سے مخاطب تھیں اور میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کر یہ کہہ رہی تھیں.....
بیٹا، آپ کے بابا جانی کا بلڈ گروپ بھی (اوتیکٹو) ہے....
اپنے بابا جانی کو متح کر دیں کہ بابا جانی آپ انڈیا آجائیں....
بابا جانی، بابا جانی مجھے اب آپ کے پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ مجھے آپ کا خون چاہیے۔ آپ کے بھیجے ہوئے پیسوں سے (اوتیکٹو) خون نہیں مل رہا ہے۔ امی جان نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کے خون کا گروپ بھی (اوتیکٹو) ہے۔
بیٹے کا آخری جملہ پڑھنے کے بعد میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

☆☆☆



مولانا سید عمار حیدر شعبہ اردو میں منعقد سیمینار 'بمعنوان' 'کریلا کی ادبی اور عصری معنویت' پر اظہار خیال کرتے ہوئے۔ اسٹیج پر موجود صدر شعبہ اردو اور دیگر مقررین حضرات۔

ڈاکٹر ارشد اقبال
مراد آباد

چمکتی دنیا اور نانی کی کہانیاں

آیان کے کمرے میں روشنی تھی... بہت سی روشنی۔
دیوار پر لگی بڑی اسکرین رنگ بدل بدل کر آنکھوں کو لبھاتی تھی، میز پر رکھا کھلونا اپنی ہی دھن میں ہنستا تھا، اور موبائل کی نرم مگر مسلسل آواز جیسے اُسے بار بار پکارتی تھی۔
مگر آج... اس چمک میں کوئی کشش نہ تھی۔
آیان نے خاموشی سے موبائل بند کیا اور سر ہانے سے ٹیک لگا کر چھت کو دیکھنے لگا۔
دل میں ایک اُن کہی سی اُداسی تھی، جیسے شور کے ہجوم میں کہیں ایک گہرا سکوت سانس لے رہا ہو۔
”یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی... دل اتنا خالی کیوں ہے؟“
اُس نے آنکھیں موند لیں، اور تب یاد کی کسی نرم تہہ سے ایک مانوس آواز ابھری۔
”ایک تھا شہزادہ... جو جنگل میں راستہ بھول گیا تھا۔“
آیان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔
”نانی... اُس نے جیسے خود سے کہا۔“
وہ آہستہ آہستہ اُٹھا اور نانی کے کمرے کی طرف چل دیا، وہاں روشنی کم تھی، مگر سکون زیادہ۔ کھڑکی سے آتی ہوا پر دوں کو دھیرے دھیرے ہلا رہی تھی، اور فضا میں ایک مانوس سا ٹھہراؤ تھا، جیسے وقت بھی کچھ دیر کوڑک گیا ہو۔
”نانی... مجھے کہانی سنائیں ناں۔“ آیان نے دھیمی آواز میں کہا۔ نانی نے مسکرا کر اُسے اپنے پاس بٹھالیا۔ اُن کے ہاتھ کی نرمی میں ایک عجیب سا اطمینان تھا۔
”آج کون سی کہانی...؟ بیٹا؟“
”وہی... جس میں سچ ہوتا ہے“ آیان نے سر اُن کے کندھے سے ٹکا دیا۔ نانی نے اُس کے بالوں میں اُنکلیاں پھیرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
”ایک بچہ تھا... جو ایک دن ایک ایسی دنیا میں جا پہنچا جہاں ہر چیز چمکتی تھی“
آیان کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں، آواز مدہم ہوئی... اور پھر وہ ایک اور ہی دنیا میں کھڑا تھا، یہ دنیا روشن تھی، غیر معمولی حد تک روشن، درخت شیشے کی مانند چمک رہے تھے، آسمان رنگوں میں گھلتا

جار ہاتھا، اور زمین پر روشنی کے ذرے ایسے بکھرے تھے جیسے ستارے زمین پر اتر آئے ہوں، ہر طرف ہنسی تھی مگر اُس میں گرمی نہیں تھی۔

”خوش آمدید“! ایک چمکتا ہوا کھلونا، اُس کے سامنے آکر ٹھہرا۔

”یہ خوشیوں کی دنیا ہے، جہاں اداسی کا کوئی نام نہیں!“

آیان نے حیرت سے گرد و پیش دیکھا۔

وہ دوڑا، کھیلا، ہنسا... مگر کچھ ہی دیر میں اُس کے قدم دھیرے پڑ گئے۔ دل کے اندر وہی

خالی پن پھر سے جاگ اُٹھا، خاموش مگر گہرا۔

”یہ ہنسی... دل تک کیوں نہیں پہنچتی؟“ اُس نے آہستہ کہا، اُسی لمحے روشنی میں ایک ہلکی سی

دراڑ پڑی، چمک جیسے ماند ہونے لگی، آوازیں مدھم پڑ گئیں، اور فضا میں ایک انجانی سی خاموشی اتر آئی اور

پھر وہی مانوس، نرم آواز!

”بیٹا... سچی خوشی چمک میں نہیں، دل کے سکون میں ہوتی ہے“

”نانی!“ آیان نے بے ساختہ پکارا۔ اُس کی آواز جیسے اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے واپس کھینچنے

لگی، چمکتی دنیا دھند میں بدل گئی... رنگ تحلیل ہونے لگے اور اگلے ہی لمحے وہ نانی کے کمرے میں تھا۔ نانی

کے ہاتھ بدستور اُس کے سر پر تھے، اور اُن کی مسکراہٹ میں ایک خاموش یقین تھا۔

”کہانی ختم ہوگئی... بیٹا، اُنہوں نے آہستہ کہا۔ آیان نے آنکھیں کھولیں۔

دل اب ہلکا تھا، جیسے کوئی اُن دیکھا بوجھ اُتر گیا ہو۔

وہ نانی سے لپٹ گیا۔

”نانی وہ دنیا خوبصورت تھی، مگر سچی نہیں تھی۔ وہاں سب کچھ تھا مگر کچھ بھی نہیں تھا۔“

نانی نے اُس کے ماتھے کو چوما۔

”کیوں کہ سچائی ہمیشہ سادہ ہوتی ہے، بیٹا اور جو سادہ ہو، وہی دل میں اترتا ہے۔“

آیان مسکرا دیا۔

اب کمرے کی چمک اسے نہیں بلاتی تھی، نہ کھلونوں کی آواز اُسے بہکاتی تھی۔ اُس کے پاس

اب ایک کہانی تھی... ایک سچ... اور ایک سکون، جو صرف نانی کی نرم آواز میں ملتا تھا۔

چنٹو چلا سفید بنے!

بہت پہلے تالاب کے کنارے چنٹو نام کا ایک چوہا رہتا تھا۔ وہ اکثر اپنے بچوں کے ساتھ بل سے نکل کر تالاب کے کنارے بیٹھ جاتا تھا اور تالاب میں تیرتے بٹخ کے سفید سفید بچوں کو دیکھتا رہتا تھا اور سوچتا رہتا تھا کہ کاش میرے بچے بھی اتنے سفید اور خوبصورت ہوتے۔ ایک دن چنٹو نے دیکھا اپنے پنکھوں سے پانی اچھالتی ”تے“ ”تے“ ”تے“ کرتی بٹخ چلی آرہی ہے، جیسے ہی وہ چنٹو کے قریب آئی چنٹو نے کہا: ”پیاری بہنا آپ کتنی خوبصورت ہیں، دیکھنے میں کتنی پیاری لگتی ہیں، کیا آپ مجھے بتائیں گی کہ میرا رنگ آپ جیسا سفید کیسے ہو سکتا ہے؟“ یہ سن کر بٹخ ہنسی اور شان بے نیازی سے اپنی گردن اٹھا کر آگے بڑھ گئی۔ چنٹو کو بٹخ کا یہ رویہ ذرا بھی نہیں بھایا۔ وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

”یہ کتنی بد اخلاق ہے، کسی کی بات سننا بھی پسند نہیں کرتی۔“

اگلے روز جیسے ہی بٹخ چنٹو کے پاس سے تیرتی ہوئی گزری، اس نے بٹخ سے یہی سوال کیا۔ بٹخ بولی۔ ”بھائی! تم اپنے رنگ کو لے کر اتنے اداس کیوں ہو؟ سفید یا کالے رنگ سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ بس تمہارا دل کالا نہیں ہونا چاہئے۔ تم سچ بولو، کمزوروں کی مدد کرو۔ دوسروں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ۔ تب دیکھنا سب تم کو پسند کریں گے اور تمہارے گرویدہ ہو جائیں گے۔“

بٹخ کی یہ نصیحت چنٹو کو ذرا بھی اچھی نہیں لگی۔ اس کے شیطانی ذہن نے سوچا۔ بٹخ کو اپنی خوبصورتی پر بہت ناز ہے۔ اس لیے وہ مجھے سفید ہونے کا راز کبھی نہیں بتائے گی۔

لہذا چنٹو اگلے روز گائے بہنا کے پاس گیا اور اس سے بھی وہی سوال کیا جو بٹخ سے کیا تھا۔ گائے کو چنٹو کا یہ سوال نہایت ہی بے وقوفی کا لگا۔ اس نے چنٹو کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”چنٹو بھیا! اللہ کی بنائی ہوئی ہر چیز کی اپنی خوبصورتی ہوتی ہے۔ آپ کا کالا رنگ آپ کی خوبصورتی ہے۔ میرا سفید رنگ میری خوبصورتی ہے۔ رنگوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ دراصل ہمارے کام اچھے ہونے چاہئیں۔ ہماری سوچ اچھی ہونی چاہئے۔ یہی دوسروں کے فائدے کی چیزیں ہیں۔“

چنٹو کو گائے کی فلسفیانہ باتوں نے بہت ہی ناامید کر دیا۔ وہ نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔ بہت غورو

فکر کے کچھ دن بعد چنٹو کے دل میں ایک امید کی کرن جاگی۔ ان نے سوچا کیوں نہ ایک بار خرگوش بھائی سے یہ بات اور کر کے دیکھی جائے۔ ہو سکتا ہے وہ اس کا راز بتادیں۔

اگلے روز علی الصبح چنٹو نہادھو کر خرگوش بھائی کے گھر پہنچ گیا۔ خرگوش بھائی اس وقت ناشتہ کر رہے تھے۔ چنٹو کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا۔

”آؤ بھائی آؤ تمہارا استقبال ہے۔ لیجئے سیب کھائیے۔ بہت میٹھے سیب ہیں۔“

چنٹو نے بیٹھ کر خوب سیب کھائے اور پھر اپنی بات خرگوش کے گوش گزار کرتے ہوئے کہا۔

”میری بات ذرا غور سے سنئے۔ لٹخ اور گائے بہن نے میری بات کو نہ سنا کر اڑا دیا۔“ خرگوش بہت جلد چنٹو کی ذہنی کشمکش کو بھانپ گیا۔ اس نے سوچا ٹھیک ہے۔ میں چنٹو کو ایسا سبق سکھاتا ہوں جس کے بعد یہ کبھی کسی سے ایسی بے وقوفی کی باتیں نہیں کرے گا۔

خرگوش نے اپنی مونچھوں کو تاد دیتے ہوئے کہا۔

”یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میں تم کو آج ہی اپنے جیسے گورا کردوں گا۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔“

چنٹو خوشی خوشی خرگوش کے ساتھ ہولیا۔ دونوں تیزی سے شہناز چچی کی پکن کی نالی سے ان کے پکن میں گھس گئے۔ اتفاق سے وہاں ایک بھگو نے میں شکر کی چاشنی رکھی تھی۔ رات شہناز چچی نے صابر چچا کے لیے بوندی کے لٹو بنائے تھے جس کی کچھ چاشنی بچ گئی تھی۔ خرگوش نے چنٹو سے کہا۔

”دوست تمہارا کام ہو گیا۔ تم جلدی سے اس بھگو نے میں کو دجاؤ۔ شہناز چچی کے آنے سے پہلے۔“ چنٹو بھگو نے میں خوب اچھلا کودا۔ جب اس کے جسم پر اچھی طرح چاشنی چپک گئی تو خرگوش نے کہا۔

دوست چلو اب ہم کو بہت آگے جانا ہے۔ خرگوش تیزی سے اس کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں بہت ساری روٹی بھری تھی۔ صابر چچا روٹی کا کاروبار کرتے تھے۔ خرگوش نے چنٹو سے کہا۔

”جاؤ اس روٹی میں گھس جاؤ۔ اس میں خوب لوٹ لگاؤ۔ دیکھو کتنی نرم اور سفید روٹی ہے۔“

خوب مستی کر کے جب چنٹو روٹی سے نکلا تو وہ بالکل روٹی کا کالا لگ رہا تھا۔ خرگوش اس کو فوراً اپنے گھر لے گیا۔ گھر میں سامنے ہی شیشہ لگا تھا۔ چنٹو نے جیسے ہی شیشے میں خود کو دیکھا، اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ خوش ہو کر خرگوش کے گلے لگ کر کہنے لگا۔

”دوست تمہارا بہت بہت شکریہ! میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ اب لٹخ اور گائے بہن مجھے دیکھ کر جلا کریں گی“ یہ کہہ کر چنٹو تیزی سے اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

راستے میں جو بھی جانور اس کو دیکھتا حیرت زدہ ہو جاتا۔ انہوں نے ایسا عجیب و غریب جانور جنگل میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کوئے نے سب سے پہلے چنٹو کو دیکھا تو وہ ڈر کر کانٹوں کا ٹمکے کرنے لگا۔ جس کو سن کر کوئل، طوطا، مینا، ہنس، بندر سب نکل آئے اور حیرت سے چنٹو کو دیکھنے لگے۔

کوئے نے ڈرتے ڈرتے شاطر انداز میں کہا۔ بھائیو اور بہنو! یہ بہت خطرناک جانور

ہے۔ لگتا ہے دوسری دنیا سے آیا ہے۔ اس سے ہم سب کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ سارے جانور چنٹو کو مارنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ چنٹو چو... چو... کر کے رونے لگا اور کہنے لگا، ”بھائیو! میں کوئی خطرناک جانور نہیں ہوں۔ نہ ہی کسی دوسری دنیا سے آیا ہوں۔ میں تو اسی جنگل کا باسی ہوں۔ تمہارا چھوٹا بھائی چو با ہوں۔“

”جھوٹ بولتا ہے۔“ طوطے نے طوطہ چشتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ جب کہ چنٹو نے کئی بار پھل کی دوکان سے طوطے کو بیٹھے بیٹھے امرود لا کر کھلائے تھے۔

”رکو... رکو...! بھیڑ کو چیرتے ہوئے خرگوش نے آگے بڑھ کر کہا۔ یہ چو با ہے، ہمارے ہی جنگل کا جانور، اسے مت مارو۔“ سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

”پر یہ ایسا کیسے ہو گیا؟“ خرگوش نے ساری کہانی بہت مزے لے کر سب کو سنائی۔ سارے جانور چنٹو کی نا اچھی پر ہنستے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

چنٹو کو اپنی بے عزتی کا بہت احساس ہوا۔ وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ خرگوش نے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا اور اس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ گھبراہٹ میں۔ دوست بہت سے کام لو۔ میں تم کو لے جا کر نہلاتا ہوں۔ تم اصل حالت میں آ جاؤ گے۔ جب چنٹو نہا دھو کر اپنے صحیح رنگ و روپ میں آ گیا تو خرگوش نے محبت بھرے انداز میں چنٹو سے کہا۔

”دوست ہمیشہ یاد رکھنا جو چیز ہم کو اللہ رب العزت نے دی ہے، ہم کو اس کی قدر کرنی ہے، اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ کسی دوسرے کی اچھی چیز دیکھ کر اس سے حسد، جلن نہیں کرنی چاہئے۔ اس سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔ دنیا میں کالا گورا کچھ نہیں ہوتا۔ ہم تو جانور ہیں۔ اللہ نے تو دنیا میں انسان بھی گورے اور کالے بنائے ہیں۔ ہم کو کالے کاموں سے بچنا چاہئے اور اپنے اندر اچھے اوصاف پیدا کرنے چاہئیں جس سے دوسرے فیض یاب ہوں اور تمہارے کاموں کی روشنی دور تک اور دیر تک محسوس ہو۔ بزرگوں کا قول ہے کہ دنیا میں جام پیارا نہیں کام پیارا ہوتا ہے۔

چنٹو نے خرگوش کی گفتگو سن کر اپنے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا اور کہنے لگا میری مت ماری گئی تھی۔ میں نے شروع میں بلیغ بہن اور گائے بہن کی بات مان لی ہوتی تو آج سب کے سامنے اتنا ذلیل و خوار نہ ہونا پڑتا۔ میں اپنے کان پکڑ کر توبہ کرتا ہوں کسی کی اچھی چیز دیکھ کر کبھی نہیں لپچاؤں گا اور ایسی نادانی کبھی نہیں کروں گا۔ جو کچھ اللہ نے مجھے دیا ہے اس پر اس کا شکر ادا کروں گا اور خوش رہوں گا۔

نیکی کا بدلہ

جاوید ایک نیک ایماندار اور رحم دل لڑکا تھا۔ وہ دوسروں کی غم و خوشی میں شریک ہوتا تھا۔ ایک دن کی بات ہے کہ اس کی ماں نے اس کو کچھ پیسے دے کر کہا جاؤ بیٹا بازار سے تم یہ سودا خرید کر لے آؤ۔ وہ ہاتھ میں پیسے لے کر بازار چل دیا۔ اسے راستے میں ایک بوڑھی عورت بھیک مانگتی ہوئی ملی۔ وہ کہہ رہی تھی میں دودن سے بھوکی ہوں۔ کوئی مجھے اللہ کے واسطے کھانا کھلا دے، خدا اس کا بھلا کرے گا۔

یہ سنتے ہی اس کا دل تسبیح گیا۔ اس نے وہ سب پیسے بھوکی بھکارن کو دے دیے۔ بھکارن ہزاروں دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ اب وہ خوشی خوشی گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راستے میں اسے خیال آیا ماں نے تو پیسے مجھے بازار سے سودا خریدنے کے لیے دیے تھے اور میں نے یہ پیسے اس بھکارن کو دے دیے۔ اب ماں ڈانٹے گی۔ وہ مایوس کھڑا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر سامنے پڑی ایک لال رنگ کی تھیلی پر پڑی۔ اس نے دوڑ کر وہ تھیلی اٹھالی اور جب کھول کر دیکھا تو وہ نوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ لیکن ذہن میں اس خیال کے آتے ہی اس کی خوشی دوبارہ رنج میں بدل گئی کہ راستے میں پڑی ہوئی چیز پر ہمارا کوئی حق نہیں ہوتا۔ وہ تھیلی لے کر شہر قاضی کے پاس پہنچا۔ قاضی اس کی دیانت داری کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اسے پانچ روپے کا نوٹ انعام دیا۔ وہ ان پیسوں سے سودا خرید کر گھر پہنچا۔ ماں سے یہ سارا واقعہ بیان کیا۔ ماں نے خوش ہو کر اس کا ہاتھ چوم لیا۔

☆☆☆



بیاد جی حزی پروگرام ”شام غزل و داستان“ میں معروف غزل نگار محترم کلش تیواری کو ایم ایس ایم، اکیڈمی کی چیز پر سن محترمہ اسمتہ شرملا گلدستہ پیش کرتے ہوئے جبکہ دوسری تصویر میں معروف فنکار ساجد سیٹھی داستان پیش کرتے ہوئے۔

نظمیں

ہماری گائے

رب کا شکر ادا کر بھائی
 جس نے ہماری گائے بنائی
 گائے ہمارے حق میں نعمت
 دودھ ہے دیتی کھانے بنسپت
 بچھڑے اس کے بیل بنائے
 جو بھیت کے کام میں آئے
 کل جو گھاس چری تھی بن میں
 دودھ بنی اب گائے کے تھن میں
 دودھ وہی اور مٹھا مسکا
 دے نہ خدا تو کس کے بس کا
 داناؤ نکا بھوسی چوکر
 کھا لیتی ہے سب خوش ہو کر
 کھا کر تنکے اور ٹھیرے
 دودھ ہے دیتی شام سویرے
 کیا ہی غریب اور کیسی پیاری
 صبح ہوئی اور جنگل کو سدھاری
 پانی موجیں مار رہا ہے
 چرواہا چکا رہا ہے
 دوری میں جو دن ہے کاٹا
 بچے کو کس پیار سے چاٹا

اسلم کی بلی

اسلم کی بلی کو میں کرتا ہوں پیار
 صاف ستھری ہے بڑی ہے کھلاڑ
 گود میں لیتا ہوں تو کیا نرم ہے
 گائے کے مانند رواں نرم ہے
 کھینچ کر دم اب نہ ستاؤں گا میں
 گھر میں سے باہر نہ بھگاؤں گا میں
 اب نہ ڈرے گی وہ میری مار سے
 کھیلیں گے ہم دونوں بہت پیار سے
 ہم نے بڑے پیار سے پالا اسے
 کہتے ہیں سب چوہوں کی خالہ اسے

☆☆☆



داستان گو محترم ساجد سیفی کو گلہ سٹہ پیش کرتے ہوئے ایڈوکیٹ کوثر نسیم، پروفیسر اسلم جمشید پوری
 اور محترمہ اسمتنا شرما اور ساتھ میں موجود ہیں دیگر مہمانان۔

نیکی

اچھی خصلت ہے دوستو نیکی
 ایسی دنیا میں شے نہیں دیکھی
 وجہ عز و وقار ہے نیکی
 لطف پرور دگار ہے نیکی
 نیکیوں سے قرار ملتا ہے
 لطف فصل بہار ملتا ہے
 نیکیاں بے شمار کرتے رہو
 یہ عمل بار بار کرتے رہو
 نیکیاں ہیں نجات کا موجب
 یہ ہیں حسن حیات کا موجب
 ہو سکے تو بھلائی کرتے رہو
 جھولیاں نیکیوں سے بھرتے رہو
 نیکیاں راحتوں کی حامل ہیں
 نیکیاں زندگی کا حاصل ہیں
 نیکیاں جو کرے گا اے غازی
 جیت لے گا حیات کی بازی

☆☆☆

خلق کا پیکر

خلق کا پیکر تم بن جاؤ
 اور کسی کا دل نہ دکھاؤ
 جس نے کیا ہے تم کو پیدا
 اس کے آگے سر کو جھکاؤ
 علم و ہنر سے رکھو تعلق
 یہ بھی وہ بھی تم اپناؤ
 جن میں دیکھو حسنِ شرافت
 ایسوں کو تم پاس بٹھاؤ
 اشیا جتنی بھی ہیں نشلی
 ہر گز ان کے پاس نہ جاؤ
 دنیا کے بے کار ہیں دھندے
 دنیا سے تم دل نہ لگاؤ
 ایسا ہو اخلاق تمہارا
 دشمن کو بھی گلے سے لگاؤ

وقت کی سمجھو قدر و قیمت
 غفلت ہی میں یوں نہ گنواؤ
 کہتا ہوں میں بچوں تم سے
 پیار کے سانچے میں ڈھل جاؤ
 مان لو یہ فرقان کا کہنا
 محنت سے تم جی نہ چراؤ
 ☆☆☆



یوم اساتذہ کے موقع پر آن لائن ادب نما کے پروگرام میں شریک دانیس سے پروفیسر
 ارادھنا گپتا، پروفیسر اسلم جشید پوری، پروفیسر صغیر افرانیم، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر
 آصف علی، ڈاکٹر فرح ناز، پروفیسر ریشما پروین، پروفیسر جمال احمد صدیقی و دیگر

علم کی دولت

حاصل ہو جس کو علم کی دولت
کرتی ہے دنیا اس کی عزت
منہ سے نہ ایسی بات نکالو
جس سے کبھی ہو تم کو ندامت
دیر سے پوری ہو یا جلدی
رکتی نہیں ہے کوئی ضرورت
کبھی لٹائے سے نہ لٹے گی
علم کی دولت ہے وہ دولت
اس کا صلہ ملتا ہے یقینی
ضائع نہیں جاتی ہے محنت

☆☆☆

عزمِ نونہال

میں بچہ ہوں لیکن یہ دنیا کو دکھا دوں گا دنیائے جہالت کی ظلمت کو مٹا دوں گا
 ہر گام زمانے کو اک درس وفا دوں گا ہر گھر میں محبت کی ایک شمع جلا دوں گا
 کیا عظمت انساں ہے دنیا کو بتا دوں گا اخلاق و محبت کے آداب سکھا دوں گا
 ہر گھر کو بناؤں گا میں علم کا گہوارہ تعلیم کے زیور سے ہر گھر کو سجا دوں گا

☆☆☆



شعبہ اردو کے 2026ء میں سرکاری ملازمت پانے والے ہونہار طالب علم
 بانئیں سے محترم حشمت علی، محترمہ آسیہ میمونہ، محترمہ عظمیٰ سحر اور محترمہ شہناز پروین

مضامین

سلطانہ کا خواب: ایک تانیثی مطالعہ

رقیہ سخاوت حسین (1880-1932) کی لکھی کہانی ”سلطانہ کا خواب“ سائنس فکشن پڑھنی ہے۔ یہ کہانی پہلی مرتبہ انگریزی زبان میں لکھی گئی اور ”Sultana's Dream“ کے عنوان سے 1905ء میں ”انڈین لیڈر میگزین‘ مدراس‘ کے اوراق کی زینت بنی جبکہ رقیہ نے بنگالی زبان میں اس کا ترجمہ کیا اور 1908 میں دوبارہ کتابچہ کی شکل میں شائع کیا۔ اس کہانی میں رقیہ نے صدیوں سے مروجہ پدر سریت یا پدر شاہی نظام پر سخت تنقید کی تھی بلکہ مرد اساس سماج کی صنفی تفریق و تقسیم (Gender divide) اور عورت و مرد کو تفویض کیے گئے صنفی رول (Gender roles) کو چیلنج کیا تھا۔ اس کہانی کے توسط سے رقیہ نے سماج کے آگے عورت اور مرد کے ”تشکیل شدہ روایتی صنفی کردار“ کی تبدیلی کے ساتھ علم، قدرتی وسائل اور ٹکنالوجی کی ترقی پڑھنی ایک متبادل دنیا ”لیڈی لینڈ“ کا تصور پیش کیا۔ مذکورہ کہانی کی اشاعت پدر شاہی نظام کے خلاف احتجاج کا گویا ایک انقلابی بیانیہ ثابت ہوئی۔ اس کہانی کو ”جنوبی ایشیاء کا اولین تانیثی یوٹوپیا (Feminist Utopia) (۱) قرار دیا گیا۔ اگرچہ کہ ”سلطانہ کا خواب“ شائع ہوئے ایک سو بیس برس سے زائد کا عرصہ گزر چکا لیکن یہ کہانی جدید تانیثی افکار کے مختلف زاویوں کے ساتھ عصر حاضر میں بھی پھر پور معنویت رکھتی ہے۔ مابعد جدید دور میں خواتین کے موقف اور ان کی بااختیاری کے مباحث نیز روایتی صنفی رشتوں کی رد تشکیل کے پس منظر میں جہاں اس کہانی کا تانیثی تجربہ کچھ اہم پہلو سامنے لاتا ہے تو وہیں معیاری تحقیق کا طریقہ کار رقیہ سخاوت حسین جیسی بہادر اور باحوصلہ مسلم خاتون کی زندگی اور کارناموں کے کئی پوشیدہ جہات کو متعارف کرواتا ہے۔

رقیہ سخاوت حسین کا شمار جنوبی ایشیائی ممالک میں حقوق نسواں کی اولین علمبردار خواتین میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق بنگال (غیر منقسم ریاست بنگال) سے تھا۔ وہ عمق پر شخصیت کی مالک تھیں۔ وہ بیک وقت سماجی مصلح، حقوق نسواں کی جہد کار، تانیثی مفکر و مصنف، تعلیم نسواں کی مبلغ اور مفکر و دانشور خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے علاوہ مختلف النوع عملی اقدامات کے ذریعے ایک ایسے وقت میں پدر شاہی نظام کو چیلنج کیا تھا اور اس نظام سے عورت کی آزادی نیز اس کے حقوق کے لیے آواز بلند کی تھی جس وقت برصغیر کے مرد اساس سماج میں عورت بے شناخت، نہایت پسماندہ اور ثانوی موقف کی حامل تھی۔ رقیہ کے علمی، ادبی و سماجی کارنامے ہندوستان کی تاریخ کے اہم باب ہیں۔ باوجود اس کے انھیں

تاریخ میں وہ جگہ نہیں مل پائی جس کی وہ حقدار تھیں۔ محققین و ناقدین نے بہت عرصہ بعد ان کی طرف توجہ دی۔ ڈھاکہ میں بنگال اکیڈمی نے ”Begum Rokeya Rachanavali“ کے عنوان سے رقیہ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں نیز خطوط اور شاعری کو 1973ء میں شائع کروایا۔ اس کتاب کو نامور شاعر اور نقاد عبدالقادر نے دوبارہ 1999ء میں مرتب کیا۔ اس کتاب کی اشاعت سے رقیہ پر تحقیق کرنے والوں کے لیے مواد کی دستیابی ممکن ہو پائی۔ اس سے قبل شمس النہار محمود کی ”رقیہ جیونی“ (1935ء) اور مشفقہ محمود کی ایک مختصر کتاب (1965ء) شائع ہوئی تھیں لیکن وہ کتابیں صرف رقیہ کی سوانح پر مختصر سی معلومات فراہم کرتی ہیں۔ البتہ پچھلے چند برسوں کے دوراں رقیہ سخاوت حسین کی بنگالی تحریروں کو مطالعہ و تحقیق اور ترجمے کا حصہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں وہ نہ صرف بنگلہ دیش میں مقبول ہوئیں بلکہ انھیں عالمی سطح پر جنوبی ایشیاء کے حقوق نسواں کی پیشواؤں میں سے ایک کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ تاہم مسلم معاشرے میں انھیں ایک قابل، باحوصلہ خاتون اور حقوق نسواں کی جہد کار کی حیثیت سے وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی وہ مستحق تھیں۔ نوآبادیاتی ہندوستان میں تاریخ رقم کرنے والے افراد میں بھی ان کا نام شامل نہیں ہے۔ رقیہ کی بنگالی زبان میں لکھی تحریروں کا ترجمہ انگلش زبان میں چند برس قبل شائع ہوا ہے لیکن اردو زبان کے سرمایہ علم میں رقیہ کا نام نظر نہیں آتا سوائے دو ایک مختصر تعارفی مضامین کے۔ اسی طرح انگلش میں لکھی ان کی ایک نادر اور انقلابی تحریر ”Sultana's Dream“ بھی عرصہ تک اردو میں ترجمہ نہیں ہو پائی۔ البتہ چند برسوں قبل سیدہ عارفہ زہرہ نے اس کہانی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ کتاب ”مشعل“ پاکستان سے شائع ہوئی ہے۔ راقمہ نے 2024ء میں ”رقیہ سخاوت حسین اور سلطانہ کا خواب (تعارف و تانیثی تجزیہ)“ کے عنوان سے کتاب شائع کی جس میں ڈاکٹر صہبا جمال شاذلی نے کہانی کا اردو ترجمہ کیا۔

برصغیر ہند کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نوآبادیاتی دور ہو یا ماقبل نوآبادیاتی دور خواتین کو نا اہل اور کمزور جنس سمجھا گیا اور ہر سطح پر انھیں حاشیہ پذیر بنا کر ثانوی حیثیت دی گئی۔ خواتین کی تمام تر حصہ داریوں کو نظر انداز کیا گیا اور تاریخ میں ان کے کارناموں کی شمولیت سے سخت احتراز کیا گیا۔ رقیہ سخاوت حسین بھی نوآبادیاتی ہندوستان کی دیگر خواتین مصنفین کی طرح دہرے سطح پر ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ ایک تو بطور ”عورت“ اور دوسرے ”نوآبادیاتی فرد“ کی حیثیت سے وہ حاشیہ پر تھیں۔ بقول ممتاز مصنفہ سوسنی تھارو کے بموجب:

”ہندوستانی تاریخ میں مسلم خواتین کے کارناموں کی عدم شمولیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ رقیہ سخاوت حسین تین طرح سے ”ثانوی“ تھیں۔ یعنی ”عورت اور نوآبادیاتی فرد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک مسلمان بھی تھیں“۔ رقیہ کو ایک ”ذیلی معاشرے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے نظر انداز کر دیا گیا۔ رقیہ کو اپنے ملک (موجودہ بنگلہ دیش) میں بھی وہ مناسب توجہ نہیں ملی جس کی وہ مستحق

تھیں۔ گرچہ کہ 1980 کے بعد سے رقیہ کی تحریروں پر بات ہونے لگی ہے۔
لیکن وہ اس قرض کی اتنی بڑی مقدار سے میل نہیں کھاتے جو رقیہ کے کارناموں
کے حوالے سے ہم پر واجب ہیں۔“ (2)

جنوبی ایشیائی ممالک میں یوں تو صدیوں سے ذات پات، طبقے، مذہب، زبان اور نسلی امتیازات سے پیدا ہونے والی عدم مساوات کی سینکڑوں مثالیں تاریخ کا حصہ رہی ہیں لیکن جدید تحقیقات نے ثابت کیا کہ یہ سماجی عدم مساوات صدیوں سے چلے آرہے ”صنفی تفرقات (Gender discriminations)“ کی بناء پر کس طرح سے مزید پیچیدہ ہوتی چلی آرہی ہیں۔ صدیوں سے مروجہ صنفی رول پر مبنی روایات نے مردوں کے مقابلہ میں عورت کے موقف کو نہایت کمزور اور حاشیائی حیثیت عطا کی ہیں۔ دراصل جنوبی ایشیائی ممالک بالخصوص برصغیر میں عرصہ دراز سے پدرانہ نظام، اقدار اور صنفی امتیازات پر مبنی سخت سماجی اصول مروج رہے ہیں۔ جنہیں خواتین کے خلاف جرائم، قتل، دیوداسی، جوہر، بیوگی، کم عمری کی شادی، مادہ جنین کشی، نومولود لڑکی کا قتل، جہیز یا لین دین کی رسم، عورتوں کی کم خواندگی اور سخت پردہ یا خلوت کے نظام اور اس سے جڑی روایتوں کے حوالہ سے بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے اس نظام کے نتیجے میں تمام شعبہ ہائے حیات میں عورت و مرد کے موقف میں نمایاں صنفی فرق نظر آتا ہے۔ ماضی سے لے کر موجودہ دور میں دستیاب شواہد اور رپورٹس کا جائزہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ مختلف شعبوں میں تیز رفتار ترقی کے باوجود آج بھی صنفی فرق برقرار ہے۔

انیسویں صدی عالمی سطح پر تائیدیت کی تاریخ کے حوالہ سے اہم صدی قرار پاتی ہے گرچہ کہ اس سے قبل کی صدی میں خواتین کے حقوق سے متعلق شعور و بیداری آتی شروع ہو گئی تھی لیکن انیسویں صدی میں خواتین کے سیاسی و سماجی حقوق، ان کی پسماندگی اور ان سے جڑے مسائل کو خوب زیر بحث لایا گیا۔ یورپی ممالک میں تائیدی شعور فرانسیسی انقلاب کے بعد سے فروغ پاتا گیا۔ جبکہ اس صدی کے اختتام تک انگلینڈ، فرانس اور جرمنی میں تائیدی افکار کی خوب تشہیر ہونے لگی اور تائیدیت کی تحریک کو استحکام ملتا گیا۔ اسی لیے انیسویں صدی کو ”An age of Women“ کہا جاسکتا ہے۔ (3) جبکہ نو آبادیاتی ہندوستان میں بھی انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں سے سماجی اصلاح کی تحریک کے پس منظر میں ”عورت کے موقف“ پر سوال کیے جانے لگے، لیکن ابتدائی دور میں وہ سوال مرد سماجی مصلحین کی جانب سے اٹھائے گئے اور ان سوالوں کے پس منظر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی کہ بدلتے ہندوستانی سماج میں ”عورتوں کی اصلاح“ کتنی ضروری ہے اور انھیں کس طرح سے ”بہتر عورت“ بنایا جاسکتا ہے۔ اس دور کے سماجی مصلحین نے معاشرے کے پدرانہ ڈھانچے کو یکسر چیلنج نہیں کیا تھا اور نہ ہی صنفی روایات پر سوال اٹھائے تھے بلکہ انہوں نے اصلاح کے لیے صرف وہی مسائل اٹھائے تھے جن کی طرف انگریز یا جدید تعلیم یافتہ افراد ہندوستانی معاشرے میں انحطاط کے ثبوت کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ ان مباحث میں ”خواتین کے تشخص کی آوازیں“ بالکل پوشیدہ اور گم تھیں جب کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دور میں چند

ایک خواتین کے ادارے اور تنظیمیں بھی وجود میں آگئی تھیں لیکن ان کا کوئی مکمل طور پر آزاد نظر یہ نہیں تھا بلکہ ان میں بیشتر مرد مصلحین کے نظریات کی تائید کر رہی تھیں۔ جیسا کہ مصنفہ Geraldine Forbes کا خیال ہے ”ہندوستان کے تناظر میں دیکھا جائے تو ”Woman Question“ کی گونج سنائی دینے لگی لیکن وہ سوال یہ نہیں تھے کہ ”خواتین کیا چاہتی ہیں؟ بلکہ یہ دیکھنے کی کوشش کی جارہی تھی کہ“ خواتین کیسے جدید ہو سکتی ہیں۔“ (4)

انیسویں صدی میں سماجی اصلاح کے تحت خواتین کی تعلیم پر اہم بحث شروع ہوئی۔ لیکن یہ بحث خاص طور پر خواتین کو تعلیم دینے کی حکمت عملی اور اسے جو شکل اختیار کرنی چاہیے اس مقصد کے حوالے سے تھی۔ (5) نوآبادیاتی ہندوستان میں جہاں دیگر ہندوستانی خواتین کی تعلیم و اصلاح کی طرف توجہ دی جانے لگی وہیں کچھ وقفہ کے بعد مسلم معاشرہ بھی اس جانب متوجہ ہوا اور تعلیم نسواں پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ جبکہ نوآبادیاتی حکمرانوں کے لیے بھی خواتین کی تعلیم ایک اہم مسئلہ بنارہا۔ (6) لیکن وہ تمام مباحث مرد مرکوز، یک طرفہ اور ”نسائی حسیت“ سے بالکل مترا تھے۔ ان میں عرصہ تک کہیں بھی خواتین کی آواز شامل نہیں تھی۔ دراصل سماجی بیداری کے ابتدائی دور میں خواتین کو اظہار خیال کی آزادی یا کوئی ایسا پلیٹ فارم میسر نہیں تھا جہاں وہ کھل کر اپنے بنیادی حقوق کی بات رکھتیں یا اس پدرانہ نظام کے خلاف احتجاج کرتیں جس نے انھیں صدیوں سے تعلیم و ترقی سے دور بے شناخت و بے چہرہ رکھ چھوڑا تھا۔ وہ نظام جس نے سماج کو جس کی بنیاد پر ”مردانہ و زنانہ“ دو علیحدہ حصوں میں تقسیم کیا اور صنفی اصول و ضوابط کو بروئے کار لا کر عوامی و نجی دائروں (Public and private sphere) کو وسیع تر کر تارہا۔ اس صنفی تقسیم (Gender divide) نے عورت کو ”خلوت (Seclusion) اور زنان خانہ“ کا حصہ بنا کر مجہول و بیکار، بے عقل و جذباتی قرار دیا جبکہ مردوں کو ”عوامی دائرہ کار“ شہ سوار بنایا اور مرکزیت دے کر تمام ذرائع اس کے تصرف میں کر دیئے نیز اسے مالک کا درجہ عطا کیا۔

نوآبادیاتی ہندوستان کے اس سماجی پس منظر میں چند ایک خواتین نے حقوق نسواں کی بازیابی کے لیے بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ میدان عمل میں قدم رکھا۔ اس مقصد کے حصول میں ان کی ”تحریریں“ موثر ذریعہ ثابت ہوئیں۔ ان ابتدائی کوششوں کے نتیجے میں مردانہ اقدار پر مبنی سماجی حقیقتوں کی گود سے ایک نئی صبح کا جنم ہوا۔ راسخ العقیدہ، سماجی تعصب اور طبقاتی یا صنفی امتیازات کے سخت ترین دباؤ کے باوجود بیسویں صدی کے آغاز تک باشعور و باہمت خواتین میدان عمل میں آکھڑی ہوئی تھیں۔ اسی دوران مسلم خواتین نے بھی کامیابی کے ساتھ روایتی صنفی کرداروں کے برخلاف خود آگاہ افراد کے طور پر ابھر کر عوامی معاملات میں زیادہ سے زیادہ کردار ادا کرنے کا عزم کیا۔ (7) بیسویں صدی کے آغاز تک سیکڑوں سماجی و ثقافتی حد بندیوں کے باوجود نوآبادیاتی ہندوستان میں مسلم خواتین کی خاطر خواہ تحریریں منظر عام پر آنے لگی تھیں۔ خواتین کے جرائد کی اشاعت کے ساتھ ہی اس دور کے کئی معروف رسالوں میں ان کے مضامین بھی شائع ہونے لگے۔ مختصر کہانیوں، ناولوں، سوانح عمریوں، سفر ناموں اور شاعری کی شکل میں

ان کی شراکتیں قابل ذکر ہیں (8) بالکل ابتدائی دور کی مسلم خواتین میں سلطان جہاں بیگم نواب آف بھوپال، عطیہ بیگم فیضی، صفراہاویں مرزا، طیبہ بیگم، بشیر النساء، بشیر، محمدی بیگم، نذر سجاد حیدر، وحیدہ بیگم وغیرہ چند قابل ذکر ناموں کے علاوہ مزید مسلم خواتین کے نام لیے جاسکتے ہیں جنہوں نے حقوق نسواں کی حصول یابی کے لیے سماجی اور ادبی سطح پر پہلے اپنے قدم آگے بڑھائے۔ ان ہی میں رقیہ سخاوت حسین نہایت اہمیت کا حامل ایک نام ہے۔

رقیہ سخاوت حسین نے بیسویں صدی کے آغاز ہی سے پدر شاہی نظام کی مخالفت، سماجی روایات سے عورت کی آزادی اور تعلیم و معاشی حقوق کے لیے، اپنے علمی و ادبی اور سماجی کاموں کے ذریعے جہد مسلسل کا آغاز کیا۔ انہوں نے برصغیر کے سماجی تناظر اور تحقیقی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حقوق نسواں سے متعلق مسلم معاشرہ کے رویوں پر کئی اہم سوال اٹھائے۔ ”سلطانہ کا خواب“ رقیہ کی زندگی کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ اس کہانی کی اشاعت سے قبل بھی ان کی چند تحریریں منظر عام پر آئی تھیں لیکن مذکورہ کہانی کی اشاعت نے ان کی فکر اور عمل کی اونچی اڑان کے لیے گویا پتھر دے ڈالے۔ اس کہانی کے ذریعے انہوں نے ایک ایسی تصوراتی دنیا ”لیڈی لینڈ“ کا خاکہ پیش کیا جہاں غیر تعلیم یافتہ، پسماندہ اور محکوم ہندوستانی عورت کی شبیہ کے بالکل برعکس، عورتیں نہایت قابل اور باہنر و آزاد فرد کی طرح ہیں۔ تمام تر سیاسی بصیرت کے ساتھ عوامی دائرہ پر ان کی حکمرانی ہے۔ جدید تعلیم و ہنر مندانہ کاموں کے ذریعے وہ ملک کی ترقی میں اپنا بھرپور حصہ ادا کر رہی ہیں جبکہ ”لیڈی لینڈ“ کے مرد گھر کی حدود میں قید ہیں اور گھر بیو ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ”سلطانہ کا خواب“ کو پدر شاہی نظام کے خلاف ایک انتقام سمجھا گیا اور اسے نظر انداز کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ حالانکہ بیسویں صدی میں سماجی حقیقت نگاری کا رجحان ادبی تحریروں میں واضح تھا ایسے دور میں رقیہ سخاوت حسین کی کہانی بظاہر ”لیڈی لینڈ“ کا ایک غیر حقیقی تصور پیش کرتی محسوس ہوتی ہے، لیکن قابل غور نکتہ یہ ہے کہ رقیہ سخاوت حسین نے آخر کیوں برصغیر کی عورت کی پسماندگی کو پیش کرنے اور ان کے موقف کی تبدیلی کے لیے خواب کا سہارا لیا اور اس ”انقلابی بیانیہ“ کے ذریعے سماج میں عورت کے وجود کی اہمیت منوانے کی کوشش کی؟ اس نکتہ کو سمجھنے کے لیے رقیہ کے سماجی و خاندانی پس منظر پر نظر ڈالنا بھی ضروری محسوس ہوتا ہے۔

رقیہ سخاوت حسین کے سماجی و خاندانی حالات: رقیہ سخاوت حسین کے خاندانی پس منظر اور ان کے حالات زندگی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خاندان انیسویں صدی کے ہندوستان میں مسلم معاشرے کے حالات کا مکمل ترجمان ہے۔ انیسویں صدی میں بنگال کی ریاست ایک طرف قدیم تہذیب و ثقافت کی نمائندہ تھی تو دوسری جانب سماجی بیداری، سیاسی شعور، اصلاحی تحریکات کے آغاز اور جدید تعلیم و ادبی کاوشوں کی ابتداء کے حوالے سے نوآبادیاتی ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے مقابلے میں منفرد ریاست بھی تھی۔ اسی بنگال کی سرزمین ”پیرابند“ میں 1880ء کو رقیہ سخاوت حسین کا جنم ہوا۔ ان کے آباء واجداد سولہویں صدی میں ایران کے شہر تبریز سے ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے اور مختلف شہروں

میں قیام پذیر ہوئے۔ ان کے خاندان کے چند افراد نے مغلیہ حکومت میں فوج اور عدلیہ کی خدمات بھی انجام دیں۔ رقیہ کے والد ظہیر الدین محمد ابوالی حیدر صابر کا شمار بنگال کے متمول زمیندار افراد میں ہوتا تھا۔ انھوں نے چار شادیاں کی تھیں۔ راحت النساء صابرہ چوہدری ان کی چوتھی بیگم تھیں۔ ان ہی کے لڑکے سے رقیہ بیگم کی پیدائش ہوئی۔ رقیہ کی دو بہنیں اور تین بھائی تھے۔ ایک بھائی کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ رقیہ کی بڑی بہن کریم النساء اور دوسری بہن حمیرا تھیں۔ سب سے بڑے بھائی ابراہیم صابر اور بڑی بہن کریم النساء خانم چودھری دونوں کا رقیہ کی زندگی پر بڑا گہرا اثر تھا۔ ابراہیم صابر نے اپنی دونوں بہنوں کو انگریزی اور بنگالی زبان سکھائی۔ رقیہ کی بڑی بہن کریم النساء کی شادی چودہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی۔ انھیں بنگالی زبان پر عبور حاصل تھا۔ بعد کے برسوں میں وہ بنگالی زبان کی شاعرہ کی حیثیت سے نہایت مقبول ہوئیں۔

بنگال کے مسلم معاشرہ میں سخت روایتی پردہ کا نظام رائج تھا۔ لڑکیوں کی باقاعدہ یا رسمی تعلیم کا کوئی نظم نہیں تھا۔ سماجی رجحان کے مطابق ظہیر الدین صابر نے اپنے لڑکوں کی جدید تعلیم پر خاص توجہ دی لیکن انھوں نے اپنی لڑکیوں کو رسمی تعلیم سے دور رکھا۔ انھیں گھر پر بنیادی تعلیم دی گئی۔ ہندوستان کی دیگر ریاستوں کی طرح بنگال میں بھی لڑکیوں کی تعلیم پر کم توجہ، کثیر زوجگی نظام، خواتین کی ناخواندگی، کم عمری کی شادی اور روایتی پردہ کا سخت نظام رائج تھا۔ مزید برآں خاندانی سطح پر لڑکیوں و خواتین کے خلاف صنفی تعصبات اور امتیازی سلوک بھی عام طور پر مروج تھا۔ رقیہ کے والد نے گھر پر اپنی بیٹیوں کو صرف عربی زبان سیکھنے اور قرآن پڑھنے کی اجازت دی تھی۔ رقیہ سخاوت حسین چونکہ ذہین اور علم کی پیاسی تھیں لہذا انھوں نے جلد ہی بنگالی، انگریزی، اردو، فارسی اور عربی زبان میں مہارت حاصل کر لی۔ البتہ ان کے بھائی ابراہیم صابر نے رقیہ کی انگریزی سے دلچسپی دیکھتے ہوئے انھیں ادبی تحریروں سے متعارف کروایا اور ہر قدم پر ان کی رہنمائی کی۔ رقیہ کو اپنے بڑے بھائی سے بہت انسیت تھی۔ انھوں نے اپنا واحد ناول ”پدمارگ (1924) اپنے بڑے بھائی کے نام معنون کیا ہے۔

رقیہ سخاوت حسین کی شادی 1898 میں 38 سالہ خان بہادر سخاوت حسین سے انجام پائی۔ سخاوت حسین بھاگلپور (موجودہ ریاست بہار کا ایک ضلع) کے ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ انھوں نے انگلینڈ سے بیچلر آف ایگریکلچر کی ڈگری حاصل کی تھی اور انگلینڈ کی رائل ایگریکلچرل سوسائٹی کے ممبر بھی تھے۔ ان کی پہلی بیوی انتقال کر گئیں تو انھوں نے رقیہ سے دوسری شادی کی تھی۔ سخاوت حسین روشن خیال شخص تھے۔ دونوں کے درمیان عمر کا بڑا فرق ہونے کے باوجود انھوں نے رقیہ کی تمناؤں کا خاص خیال رکھا اور انھیں بنگالی اور انگریزی زبان کی کتابوں کی فراہمی کے ذریعے نہ صرف علمی و ادبی مہارت حاصل کرنے کی ترغیب دی بلکہ رقیہ کے ادبی اظہار کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی کی۔ کہانی ”سلطانہ کا خواب“ کے پہلے قاری بھی وہی تھے اور اس کی اشاعت کے ذمہ دار بھی وہی تھے۔ رقیہ نے اپنے شوہر کی ہمت افزائی کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور گھر پر کتابوں کا مسلسل مطالعہ جاری رکھا۔ جس کی وجہ سے ان میں سماجی، سیاسی

اور علمی و ادبی شعور بیدار ہوا، جبکہ مرداساس سماج کے متعلق مشاہدات اور تجربات نے ان میں ہندوستانی عورت بالخصوص مسلم عورت کی پسماندگی اور محکومیت کا شدید احساس جاگا۔

رقیہ سخاوت حسین کو اپنی ذاتی زندگی میں بہت دکھ جھیلنے پڑے۔ ان کی دونوں لڑکیاں پیدائش کے چند برس ہی زندہ رہیں پھر انتقال کر گئیں۔ خان بہادر سخاوت حسین اور رقیہ کا ساتھ بھی صرف دس برسوں پر محیط رہا۔ 1909 میں وہ بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ رقیہ کے والدین بھی جلد ہی انتقال کر گئے۔ چونکہ رقیہ ابتداء ہی سے تعلیم و ترقی نسواں کی سخت حامی تھیں اور خواتین کی پسماندگی کو ختم کرنے کی فکر مند تھیں لہذا انھوں نے اپنی نجی زندگی کے حادثات اور غموں کو پس پشت ڈال کر ایک عزم کے ساتھ میدان عمل میں قدم رکھا اور بھاگلپور میں لڑکیوں کے لیے ایک اسکول قائم کیا۔ لیکن سسرال کے افراد نے ان کی راہوں میں سیکڑوں مسائل کھڑے کیے۔ چنانچہ چند ماہ بعد ہی یعنی 1910 میں انھیں اسکول بند کرنا پڑا بلکہ انھوں نے بھاگلپور میں اپنا گھر بھی چھوڑ دیا اور کلکتہ چلی گئیں۔ تاہم سخت تکلیف دہ حالات کے باوجود انھوں نے اپنے عزم کو کمزور ہونے نہیں دیا بلکہ کلکتہ میں 16 مارچ 1911 کو ’’سخاوت میموریل گرلز اسکول‘‘ کے نام سے دوبارہ تعلیم نسواں کے فروغ کی شروعات کی۔ ابتدائی برسوں میں طالبات کی تعداد کم تھی لیکن رقیہ کی سخت محنت اور جستجو نے اسکول کو جلد ہی استحکام بخشا۔ اس دور کے کئی ایک سرکردہ لوگوں نے ان کے تعلیمی مشن کی حمایت کی۔ جس کے نتیجے میں چند برسوں میں وہ ہائی اسکول بن گیا۔ 1917ء میں، گورنر جنرل اور وائسرائے آف انڈیا کی اہلیہ لیڈی چیمسفورڈ نے بھی اس اسکول کا معائنہ کیا تھا اور رقیہ کی کوششوں کو سراہا تھا۔ (9)

رقیہ سخاوت حسین نے اسکول کے نصاب پر خاص توجہ دی تھی۔ اس دور میں تعلیم نسواں موضوع بحث تو تھی ساتھ میں لڑکیوں کے لیے خاص نصاب تعلیم پر بھی خوب مباحث ہوتے تھے۔ اس بات پر خاص توجہ مرکوز کی جاتی تھی کہ لڑکیوں کا تعلیمی نصاب لڑکوں سے مختلف ہو اور انھیں گھریلو امور میں ماہر بنانا ہو تاکہ لڑکیاں اپنے گھر اور سسرال میں کامیاب ’’خاتون خانہ‘‘ بن سکیں۔ تاہم اپنے وقت کی ان تمام دلیلوں اور مباحثوں کے برخلاف رقیہ نے اسکول کے نصاب کو جدید تر بنایا تھا اور مختلف زبانوں اور دیگر مضامین کی مہارت کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کو خود ملکشی بنانے کے ہنرمندانہ کورس بھی شامل کیے تھے۔ رقیہ کا خیال تھا کہ لڑکیوں کے لیے جسمانی طور پر تندرست اور مضبوط ہونا بھی بہت ضروری ہے، اس لیے انھوں نے اسکول میں جسمانی ورزش کو بھی لازم قرار دیا تھا۔ لڑکیوں کو مختلف عملی تربیت کے کورس کے ذریعے معاشی طور پر خود مختار بھی بنایا جاتا تھا۔ (10)

رقیہ نے صرف لڑکیوں کے اسکول کے قیام پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بڑی عمر کی خواتین میں اپنے کمزور موقف اور حقوق کے تئیں شعور بیداری کے مقصد سے 1916 میں ایک تنظیم ’’انجمن خواتین اسلام‘‘ (بنگال شاخ) کی شروعات کی۔ یہ تنظیم علی گڑھ میں 1914ء میں ’’انجمن خواتین اسلام‘‘ کے نام سے مسلم خواتین کی تعلیم و دیگر مسائل پر توجہ دینے کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔ اس تنظیم کی سرپرست سلطان

جہاں بیگم، نواب آف بھوپال تھیں اور ہندوستان بھر سے اس دور کی قابل اور فعال خواتین اس تنظیم سے وابستہ تھیں۔ ”بنگال شاخ“ کی ذمہ داری رقیہ نے سنبھالی تھی۔ اس تنظیم کے تحت انھوں نے غریب اور پسماندہ خواتین کی تعلیم و ہنر مندانہ تربیت پر توجہ مرکوز کی۔ ان کے علاوہ تنظیم نے ضرورت مند بیوہ خواتین کو پناہ بھی فراہم کی۔ رقیہ اپنا زیادہ تر وقت پسماندہ علاقوں میں رہنے والی خواتین کو پڑھنا، لکھنا سکھانے، ان کی صحت کی دیکھ بھال اور انھیں معاشی طور پر خود ملٹی بنانے میں صرف کرتی تھیں۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم پر والدین کو رضامند کرنے کے لیے گھر گھر کا دورہ کرتیں۔ ”انجمن خواتین اسلام“ کے علاوہ رقیہ دیگر انجمنوں سے بھی وابستہ رہیں۔ 1926 میں رقیہ نے کلکتہ میں منعقدہ ”بنگال ویمن ایجوکیشن کانفرنس“ کی صدارت بھی تھی، جبکہ علی گڑھ میں منعقدہ خواتین کی کانفرنس کی صدارت کا بھی انھیں موقع ملا۔ فرسودہ سماجی روایات سے خواتین کی آزادی، تعلیم اور معاشی ترقی سے متعلق مباحثوں اور کانفرنسوں میں وہ ہمیشہ سرگرم رہیں۔ رقیہ دراصل ایک کثیر الجہات شخصیت کی مالک تھیں۔ ان کی انقلابی فکر اور ادبی و سماجی کارناموں کی کائنات کافی وسیع تھی۔ انھوں نے اپنے دور کے مروجہ سخت سماجی اصولوں اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ”تعلیم و ترقی نسواں“ کا مشن آخری سانس تک جاری رکھا اور اپنی خدمات سے سیکڑوں خواتین میں خود آگاہی کا شعور بیدار کیا۔ انھیں اپنے مشن کو برصغیر کی تمام عورتوں خاص کر مسلم عورتوں تک پہنچانے کے لیے مزید کئی برسوں کی ضرورت تھی لیکن قدرت نے انھیں وہ موقع نہیں دیا۔ وہ صرف 52 برس ہی زندہ رہیں اور 9 دسمبر 1932 کو انتقال کر گئیں۔ ان کے انتقال کر جانے سے ایک روشن دماغ اور باحوصلہ مسلم خاتون کی کوششیں گرچہ ادھوری رہ گئیں لیکن ان کی مثالی زندگی اور ان کی انقلابی فکر خواتین کے لیے ہر قدم پر مشعل راہ کا کام کرتی رہی۔

رقیہ سخاوت حسین کے ادبی کارنامے:

رقیہ سخاوت حسین، بنگالی، انگریزی، اردو، عربی اور فارسی زبان جانتی تھیں، لیکن انہوں نے ادبی اظہار کے لیے بنگالی زبان کو فوقیت دی۔ انھوں نے انگریزی زبان میں صرف چند تحریروں کے علاوہ اپنا بڑا سرمایہ ادب بنگالی زبان میں ہی چھوڑا ہے۔ رقیہ نے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز 1902 میں بنگالی زبان میں لکھے مضمون بعنوان Pipasa (پاس) سے کیا۔ بعد میں ان کے کئی مضامین اور کہانیاں رسالوں کی زینت بنتے رہے۔ علاوہ ازیں ایک ناول پدمارگ (1924) اور عورتوں کی زندگی کے واقعات کے بیانیہ پر مبنی کتاب ابارودھ باسینی (Abarodh Basini 1928) بھی منظر عام پر آئی۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں عرض کیا گیا کہ بگلہ اکیڈمی نے ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں کو یکجا کیا اور ایک کتاب Rokya Rachnabali شائع کی۔

کہانی ”سلطانہ کا خواب“ کے علاوہ رقیہ کا ناول ”پدمارگ“ بھی حقوق نسواں کے متعلق ان کی انقلابی فکر کا غماز ہے۔ یہ ناول کسی خواب پر مبنی نہیں ہے بلکہ خواتین کی زندگی کی سچی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں انھوں نے مختلف مذاہب اور طبقات کی خواتین کے نجی حالات اور ان پر مردوں کے

کنٹرول اور حاکمیت کو موضوع بنایا ہے۔ ناول کی کہانی کو خواتین کے ادارے ”تاریخ بھون“ کے تناظر میں پیش کیا ہے جہاں مختلف خواتین برسرِ روزگار ہیں۔ ان کی زندگی کے واقعات اور تجربات کے بیانیہ کے ذریعے ہندوستانی عورت کی شدید پس ماندگی اور خود خواتین کی اپنے حقوق کے متعلق ناواقفیت کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کتاب کے آخر میں خواتین کے لیے جدید طرزِ تعلیم اور اصلاح کا بہترین ماڈل بھی پیش کیا۔ (11)

”موتی چور“ رقیہ سخاوت حسین کے بنگالی زبان میں مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول، 1904 جبکہ جلد دوم، 1922 میں شائع ہوئی۔ یہ مضامین پدرسری معاشرے میں خواتین کے موقف اور ان سے متعلق مسائل پر رقیہ کی گہری تنقیدی نظر اور وسیع فکر کے ترجمان ہیں۔ بلکہ ان مضامین کو ”سلطانہ کا خواب“ میں ”لیڈی لینڈ“ کے توسط سے پیش کیے گئے صنف پر مبنی معروضات کی توسیع اور تشریح بھی کہا جاسکتا ہے۔ خواتین کے ثانوی موقف اور سماج کے صنفی نظریات پر رقیہ نے جن بنیادی باتوں کی طرف ”سلطانہ کا خواب“ میں اشارے کیے تھے ان پر استدلال کے ساتھ توجیح و تشریح وہ بعد کے برسوں میں اپنے مختلف مضامین میں کرتی رہیں۔ انھوں نے مذکورہ مضامین میں نہ صرف مردوں اور پدر شاہی روایات کو تنقید کا نشانہ بنایا بلکہ خواتین کو ان کے ”روایتی صنفی کرداروں“ سے مطمئن ہونے اور انھیں قبول کر لینے کا ذمہ دار بھی ٹھہرایا۔ انہوں نے زور دیا کہ خواتین کے پاس خود کو باختیار بنانے کی صلاحیت موجود ہے۔ لہذا انھیں کسی اور کا انتظار نہیں کرنا چاہیے بلکہ خود آگے بڑھ کر اپنا مقام بنانا چاہیے۔ ”موتی چور“ کے مضامین میں وہ عورتوں کی ماتحت حیثیت کو غلامی سے مماثل قرار دیتی ہیں اور اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہیں کہ خواتین کے زیورات دراصل غلام عورت کی نشانی ہیں۔ (12)

موتی چور کے مضامین میں رقیہ سخاوت حسین نے اس دور کے مسلم معاشرے میں رائج ”پردہ اور خلوت“ کے سخت نظام کے متعلق کئی سوال اٹھائے ہیں۔ انھوں نے مذکورہ مضامین میں اپنا نظریہ واضح طور پر پیش کیا کہ پدر شاہی معاشرے میں مسلم خواتین ’ذہنی غلامی کا شکار ہیں اور مواقع کی کمی سے دوچار ہیں۔ رقیہ کے مطابق خواتین خود پردے اور خلوت کے درمیان اہم فرق کو جان کر اس مسئلے کو حل کر سکتی ہیں۔ انھوں نے خواتین کو بار بار تاکید کی کہ وہ مروجہ پدرانہ نظام پر سوال اٹھائیں جو کہ سراسر غیر اسلامی طرزِ معاشرت ہے۔ انھوں نے یہ دلیل بھی پیش کی کہ مذہبی متون کی تشریح ہمیشہ مردانہ ذہنیت کے ساتھ مرد ہی کرتے رہے جس کے نتیجے میں عورتوں پر مردوں کے کنٹرول کا نظام سماج میں مروج ہوتا چلا گیا۔ اسی غلط تشریح نے مردوں کو عورتوں کے ساتھ برا سلوک کرنے کا حوصلہ بخشا۔ رقیہ نے اس بات کا اعادہ بار بار کیا کہ خواتین کو ایسے تمام پدرانہ نظام کے تصورات کو چیلنج کرنے کی ضرورت ہے جو ان کی پس ماندہ حیثیت میں کلیدی رول ادا کرتے آئے ہیں۔ بنیادی طور پر رقیہ نے اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرے سے باضابطہ اور بارہا گویا خطاب کیا اور سماجی انصاف و صنفی مساوات کو موضوع بنایا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ سماج میں مثبت تبدیلی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب مرد اور عورت دونوں مل کر ساتھ

میں کام کریں بلکہ برطانوی راج سے آزادی بھی اسی وقت حاصل ہوگی جب خواتین کو بھی اس تحریک میں زیادہ سے زیادہ شامل کیا جائے گا۔ (13)

الغرض رقیہ سخاوت حسین کی تحریریں ان کے اپنے عہد کی دیگر مصنفین کے رجحانات سے بالکل مختلف، منفرد اور اپنے وقت کے دھارے سے کہیں آگے تھیں۔ ان کی انقلابی فکر اور جرات مندانہ ادبی اظہار کا مرکز عورت کا وجود اور اس سے جڑے سماجی و صنفی رویے و نظریات تھے۔ جن پر انھوں نے بے لاگ تنقید کی۔ ان کی تحریروں نے بلاشبہ سماجی تبدیلی اور خواتین میں شعور بیداری کا کام کیا۔ خواتین کو پدرسری نظام کی نا انصافیوں کے خلاف احتجاج کرنے اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے والی سماجی رکاوٹوں کو توڑنے کے لیے ذہنی اور عملی طور پر تیار کیا۔

سلطانہ کا خواب: ایک تائیشی مطالعہ:

”سلطانہ کا خواب“، فیمینسٹ یوٹوپیا“ کی ترجمان ایک مختصر کہانی ہے۔ رقیہ نے اس کہانی کو نو آبادیاتی ہندوستان کے تناظر میں ایک سلسلہ وار خواب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ زیر بحث کہانی میں رقیہ نے مرد اور عورت کے صنفی صفات پر مبنی ”اسٹیر یوٹائپ کردار“ کو بالکل الٹ کر پیش کیا اور ”لیڈی لینڈ“ کی شکل میں ایک ایسی متبادل دنیا کی تخلیق کی جہاں خواتین سماج کا دبا کچلا طبقہ نہیں بلکہ غالب صنف ہیں۔ انھیں مرکزیت حاصل ہے۔ لیڈی لینڈ کی تمام خواتین سماجی طور پر فعال ہیں اور سیاسی نظام پر حکمرانی بھی کرتی ہیں جبکہ مرد گھروں کے اندر خلوت تک محدود ہیں اور تمام گھر بیوا اور انجام دے رہے ہیں۔ لیڈی لینڈ فطرت کے نظاروں اور قدرتی وسائل سے سچی ایک خوبصورت باغ نماد نیا ہے۔ وہاں کا معاشرہ پرامن طریقے سے زندگی گزارتا ہے۔ علم اور سائنسی ایجادات کی کھوج میں مصروف ہے لیکن فطرت سے نہایت قریب ہے قدرتی وسائل کے استعمال کی اہمیت اور اس کے تحفظ کی ضرورت، بخوبی جانتا ہے۔ جنگ و جدل، حادثات اور آفات سماوی نیز ہر طرح کی قدرتی و انسانی آفات اور بیماریوں سے پاک ہے۔ اس بات کی تصدیق کے لیے ذیل کی چند سطور میں ”لیڈی لینڈ“ کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ کہانی میں بتایا گیا کہ ”یہ لیڈی لینڈ ہے۔ گناہ اور نقصان سے بری۔ یہاں تو فضیلت حکومت کرتی ہے۔ ہم دوسروں کی زمین حاصل کرنے کی لالچ نہیں رکھتے۔ ہم تو کسی ہیرے کے لیے بھی کبھی نہیں لڑتے چاہے وہ کوہ نور سے ہزار گنا زیادہ روشن ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہی ہم اس حاکم سے رنجش رکھتے ہیں۔ جس کے پاس تخت طاؤس ہو۔ ہم علم کے سمندر میں غوطہ لگا کر قیمتی پتھر پانے کی کوشش کرتے ہیں، جو قدرت نے ہمارے لیے محفوظ رکھا ہے۔ ہم قدرت کے تحفوں سے زیادہ سے زیادہ لطف لیتے ہیں“

لیڈی لینڈ کی خواتین نہ صرف تعلیم یافتہ ہیں بلکہ باصلاحیت و باہنر بھی ہیں۔ وہ کاشت کاری، باغبانی، دستکاری اور دیگر ہنر مندانہ کاموں کے ذریعے اپنے ملک کو ترقی کی طرف گامزن رکھے ہوئے ہیں۔ قدرتی وسائل کو برباد ہونے سے بچاتی ہیں بلکہ فطرت اور قدرتی وسائل کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ذراعت اور نئی ایجادات کے ذریعے لیڈی لینڈ کے تمام افراد کو ”سولر اوون، فلائنگ کارز، اور کلاؤڈ

کنڈینسز وغیرہ کے بہترین ذرائع فراہم کرتی ہیں۔ گویا ”لیڈی لینڈ“ کی خواتین، سیاسی، معاشی، تعلیمی اور سائنسی فضیلت سے مالا مال ہیں اور ریاست کے تمام امور بہتر طریقے سے سنبھالے ہوئی ہیں۔ جبکہ وہاں کے مردوں کو پردہ کے نظام کا حصہ بنا کر گھر بیٹوں کی ذمہ داری دی گئی ہے۔ رقیہ نے سلطانہ کے خواب کے سہارے صدیوں سے سماج میں رائج کام کی صنفی تقسیم (Gender devision of labour) کو یکسر بدل کر پیش کیا اور اس مفروضے کو رد کرنے کی کوشش کی کہ خواتین صرف نجی زندگی اور گھریلو امور کی انجام دہی کے ہی قابل ہیں۔

رقیہ نے مذکورہ کہانی میں دو کرداروں، سلطانہ اور سارہ کے درمیان ہونے والی گفتگو کے ذریعے ہندوستانی معاشرے میں صنف کے مروجہ تصور کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ”سلطانہ“ کا کردار عورت کے متعلق برصغیر میں سماج کے دقیانوسی تصور کی نمائندگی کرتا ہے اور ”سارہ“ عورت کی فہم و فراست اور اس کے مکمل شخص کا ترجمان کردار ہے۔ سلطانہ کے کردار کے ذریعے رقیہ نے بالواسطہ طریقہ سے مردانہ بالادستی والے ہندوستانی معاشرے کے نظریات، روایات، رسوم و رواج اور مذہبی احکامات کی غلط تشریح و ترویج پر طنز کیا ہے۔ دراصل یہ وہ عوامل رہے جو خواتین کو گھر کے نجی دائرہ میں محدود کرنے، تعلیم اور خود آگہی حاصل کرنے سے محروم کرنے اور سب سے بڑھ کر انہیں محکوم و مہجول بنانے میں صدیوں سے کلیدی رول ادا کرتے آئے ہیں۔ دوسری طرف رقیہ نے ”لیڈی لینڈ“ میں سارہ کے کردار کے ذریعے عورت کی خود اعتمادی اور خود انحصاری کے روشن خیال تصور کو پیش کیا تا کہ خواتین کو تعلیم اور معاشی آزادی حاصل کرنے کی طرف متوجہ کیا جاسکے نیز انہیں خود اپنی لامحدود صلاحیتوں پر یقین کرنے کی ترغیب دی جاسکے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ماضی میں خواتین کی کوئی شناخت یا آواز نہیں تھی اور نہ انہیں سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا اختیار حاصل تھا۔ ان کی قائدانہ صلاحیتوں سے انکار کیا گیا۔ علم و آگہی سے دور زنان خانوں کے اندر بند رہتے ہوئے خود ان کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئیں اور انہوں نے اپنے غیر فعال اور محکوم موقف کو قبول بھی کر لیا تھا۔ اس حوالے سے مذکورہ کہانی میں جب سارہ سلطانہ کو اپنے ساتھ لیڈی لینڈ کی سیر کرواتی ہے اور سلطانہ کو پتہ چلتا ہے کہ سارہ مرد زنان خانوں میں قید ہیں اور بیشتر افراد گھریلو ذمہ داریاں نبھاتے ہیں جبکہ خواتین سماجی و سیاسی کاموں میں مصروف ہیں تو سلطانہ لیڈی لینڈ کی خواتین کی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتی ہے۔

”لیڈی لینڈ“ کی تمام خواتین خود انحصار ہیں۔ محنتی اور اپنے کام کے شعبے کے لیے بہت زیادہ وقف اور پیشہ وارانہ صلاحیتوں کی مالک ہیں۔ یکساں طور پر، وہ گھر اور اپنے دفاتر میں نہایت مستعدی سے کام کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر خود سارہ گھر کی سجاوٹ سے لے کر کڑھائی، بُنائی اور سوئی کے کام میں ماہر ہے اور ساتھ میں ایک لیبارٹری میں روزگار سے وابستہ ہے۔ وہ معاشی طور پر مستحکم اور آزاد ہے۔ رقیہ نے سارہ کے کردار میں دراصل ایک ایسی تعلیم یافتہ اور باشعور و با اختیار عورت کی مثال پیش کی جو گھر اور سماج دونوں جگہ کام کرتے ہوئے مجموعی طور پر ملک کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کر سکتی ہے۔ کہانی میں کچھ اور

قابل نسائی کردار پیش کیے گئے ہیں۔ جیسے ”لیڈی لینڈ“ کی ملکہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے محبت کرتی ہے۔ اسے اس بات کا بھرپور احساس ہے کہ تعلیم نسواں کا فروغ از حد ضروری ہے، لہذا ملکہ ایک حکم نامہ بھی جاری کرتی ہے کہ اس کے ملک کی تمام خواتین تعلیم یافتہ ہونی چاہیے۔ اسی مناسبت سے ’لیڈی لینڈ‘ میں حکومت کی طرف سے لڑکیوں کے متعدد اسکول قائم کیے گئے اور ان کی تعلیم کی بھرپور حمایت کی گئی۔ جس کے نتیجے میں لیڈی لینڈ پر تعلیم نسواں کا خوب فروغ ہوا اور خواتین باختیار ہوتی چلی گئیں۔ ”لیڈی لینڈ“ میں خاتون سربراہ کے ذریعے چلائی جانے والی دو یونیورسٹیاں موجود ہیں، جہاں کی طالبات مختلف سائنسی تحقیقات اور ٹکنالوجی کی ایجادات میں مصروف رہتی ہیں۔ ایک یونیورسٹی کی طالبات نے ایسا ایک غبارہ ایجاد کیا تھا جس کے ذریعے وہ قدرتی ماحول سے اپنی ضرورت کے مطابق پانی کشید کر سکتی تھیں جبکہ دوسری یونیورسٹی کی طالبات نے اپنے تجربہ گاہ میں ایک آلہ ایجاد کیا جس کے ذریعے وہ جتنی چاہیں ششی توانائی سے حرارت جمع کر سکتی تھیں اور انھیں حسب ضرورت استعمال میں لاسکتی تھیں۔ اسی ٹکنالوجی کے ذریعے ”لیڈی لینڈ“ میں سماجی ترقی کا انحصار ہوتا ہے اور بعد ازاں کہانی میں اسی ٹکنالوجی کے ذریعے ملکی سلامتی کو بھی یقینی بنایا جاتا ہے۔ سارا بتاتی ہے کہ ماضی میں کبھی ”لیڈی لینڈ“ پر غیر ملکی حملہ ہوا تھا اور جب مرد سپاہی اپنے ملک کو غیر ملکی حملے سے بچانے میں ناکام رہے تو ”لیڈی لینڈ“ نے کس طرح اپنی دو ہزار طالبات کے ساتھ میدان جنگ کی طرف کوچ کیا تھا اور وہاں پہنچ کر اپنے ایجاد کردہ سائنسی آلات کے ذریعے مرکز سورج کی روشنی اور حرارت کی تمام شعاعوں کو دشمن کی طرف پھیر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں حملہ آوروں کو جنگ چھوڑ کر واپس لوٹ جانا پڑا۔ کسی جانی نقصان کے بغیر جنگ کا خاتمہ ہوا اور حملہ آور ملک کو شکست ہو گئی۔ سارا نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے بعد سے کسی نے لیڈی لینڈ پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح سے آگے سلطانہ سارا کے ساتھ خواب میں خواتین کی بنائی ہوئی کار میں ”لیڈی لینڈ“ کی سیر کرتی ہے اور مختلف شعبوں میں خواتین کی نمایاں کارکردگیوں کا مشاہدہ کرتی ہے۔ پھر خواب کے اختتام کے ساتھ ہی کہانی بھی ختم ہو جاتی ہے، لیکن برصغیر کے سماج میں مروج پدر شاہی نظام کے خلاف ایک خاتون کے احتجاج اور کئی سوالوں کے بڑے گہرے نقش چھوڑ جاتی ہے۔

”سلطانہ کا خواب“ کی عصری معنویت:-

عصر حاضر میں خواتین کے موقف اور صنفی مسائل کے تناظر میں مذکورہ کہانی پر غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ بیشتر جنوبی ایشیائی ممالک بالخصوص ہندوستان میں عورت کا موقف کم و بیش عصر حاضر میں بھی اسی طرح کا ہے جسے رقیہ سخاوت حسین نے تقریباً ایک سو بیس برس قبل اپنی کہانی میں پیش کیا تھا۔ دوسری طرف کہانی میں پدر شاہی نظام کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کے پس منظر میں پیش کردہ ایک تعلیم یافتہ، باشعور اور خود انحصار آزاد عورت کا کردار عصر حاضر کی ان خواتین کی نمائندگی کرتا ہے جو فرسودہ نظام سے نبرد آزما ہو کر اپنی شخصیت اور تشخص کو منور رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہانی آج بھی قاری سے رشتہ استوار کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ کہانی کی شروعات سلطانہ کے ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھنے

اور ”ہندوستانی عورت کی حالت“ کے بارے میں سوچنے کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ عمل اس دور کی عورتوں کی شبیہ کے بالکل برعکس ہے۔ وہ عورت جسے مرد اساس روایات اور نظریات نے ناقص العقل، بے شعور اور غیر فعال فرد باور کروادیا تھا اور خود خواتین کی سائیکسی بھی اس بات کو قبول کر چکی تھی کہ وہ سماجی و سیاسی ذمہ داری کے لیے نااہل ہے۔ لہذا، سلطانہ جب ”عورت کی حالت“ کے بارے میں سوچتی ہے تو وہ درحقیقت مرد اساس معاشرہ کے قائم کردہ پیٹرن کو توڑ رہی ہوتی ہے۔ دوسرے سخت پردہ کی روایات نے عورت کو باہر کی دنیا سے بالکل الگ کر رکھا تھا۔ عورت کا اعتماد اتنا متزلزل ہو چکا تھا کہ سلطانہ باہر چہل قدمی کے لیے نکلتے ہوئے بھی جھجک محسوس کرتی ہے۔ کہانی کے یہ سطور ملاحظہ کیجیے:

”میں نے کھلی کھڑکی سے دوبارہ چاند کی طرف دیکھا، اور سوچا کہ اس وقت باہر جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ کیونکہ سارے مرد ملازمین باہر گہری نیند سو رہے تھے اور میں سسٹر سارہ کے ساتھ خوشگوار چہل قدمی کر سکتی ہوں۔“

رقیہ کے لیے چہل قدمی اسی وقت ممکن ہے جب باہر کی دنیا سو رہی ہو۔ برصغیر کے سماجی ڈھانچے اور پدرانہ نظریات کی وجہ سے عورت پر ایسی تمام چیزوں پر پابندیاں عائد کی گئیں جو فطری آزادی اور بنیادی حقوق کے طور پر ملنے چاہیے تھے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ صدیوں سے مردانہ بالادستی نے تمام معاملات پر اپنی اجارہ داری قائم رکھی ہوئی ہے۔ جیسا کہ سارہ کہتی ہے:

”ہندوستان میں مرد مالک اور آقا ہے، اس نے تمام اختیارات اور مراعات اپنے پاس لے لی ہیں اور عورتوں کو زنانہ میں بند کر رکھا ہے۔“

سارہ کا یہ تبصرہ نہ صرف اس وقت کی بلکہ آج کے معاشرے کی بیشتر خواتین کے موقف کا ترجمان ہے۔ ملک میں تعلیم و معاشی ترقی کے باوجود مکمل طور پر عورت بااختیار نہیں ہو پائی ہے۔ ان پر مذہب یا تہذیبی ضوابط کے نام پر سیکڑوں پابندیاں عائد ہیں۔ عورت آج بھی فیصلہ ساز فرد نہیں بلکہ سماج میں ثانوی حیثیت کی مالک ہے۔

”لیڈی لینڈ“ پر سلطانہ جب چلتی ہے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ ”تم بہت مردانہ لگ رہی ہو“ کیونکہ وہ ”شرمیلی اور ڈرپوک“ ہے۔ یہ بیان اس ”اسٹیریو ٹائپ“ صنفی تصور کے بالکل برعکس ہے جو سماجی زندگی میں عورت اور مرد کی خصوصیات کے ساتھ جڑا ہوا ہے جبکہ لیڈی لینڈ میں وہ مردوں کی خصوصیات گرا دنی گئی ہیں۔ تانیثیت کے اولین مکتب فکر ”لبرل فیمنیزم“ میں مردانہ وزنانہ خصوصیات کے ساتھ سماج کے امتیازی عمل پر تنقید کی گئی اور اس نکتہ کو زیر بحث لایا گیا کہ وہ دراصل سماج کے تشکیل کردہ پیمانے ہیں۔ مساویانہ مواقع اور تربیت کے ذریعے لڑکا اور لڑکی دونوں میں یکساں فطری خصوصیات اور صلاحیتیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ رقیہ سخاوت حسین نے کہانی کے کرداروں کی نفسیات اور فطرت کی الٹ پلٹ کے ذریعے عملی طور پر وہی نکتہ پیش کرنے کی کوشش کی۔

”سلطانہ کا خواب“ میں مساویانہ سماجی و سیاسی حقوق پر بھی زور دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ”لبرل

فیمینزم کے مفکرین قانون سازی کے ذریعے خواتین کے لیے مساوات اور آزادی کی ضمانت دینے پر یقین رکھتی ہیں اسی طرح کی ایک مثال کہانی میں اس وقت دیکھنے کو ملتی ہے جب ملکہ نے "ایک حکم جاری کیا کہ اس کے ملک کی تمام خواتین کو تعلیم دی جائے"۔ حکم کے مطابق لیڈی لینڈ میں لڑکیوں کے متعدد اسکول قائم کیے گئے اور خواتین میں تعلیم کو فروغ دیا گیا۔ پردہ کے سخت نظام کو ختم کیا گیا۔ لڑکیاں آزادانہ تعلیم حاصل کر سکتی تھیں نیز کسی بھی لڑکی کو اکیس سال کی عمر سے پہلے شادی کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ان احکامات اور قوانین کے نتیجے میں جو سب سے اہم تبدیلی آئی وہ یہ کہ خواتین نے اعلیٰ تعلیم نہ صرف حاصل کی بلکہ سائنس اور ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کی اور نئی ایجادات نیز مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کو منوا کر دنیا میں اپنی شناخت بنائی۔ خود انحصار بن کر ملک کی ترقی کا اہم ذریعہ بنیں۔

”سلطانہ کا خواب“ میں ”ریڈیکل فیمینزم“ کے نظریات کا عکس بھی حد درجہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ قابل توجہ نکتہ یہ بھی ہے کہ بیسویں صدی کے وسط تک بھی ریڈیکل فیمینزم جیسے مکتب فکر کا کوئی تصور نہیں تھا نیز کسی مفکر نے پدرشاہی نظام کو عورت کی محکومیت کا ذمہ دار قرار دے کر سخت تنقید کی کوشش نہیں کی تھی۔ انیس سو ساٹھ کی دہائی میں شروع ہوئی تائیدیت کی دوسری لہر کو اس نظام فکر کا موجد مانا جاتا ہے۔ جبکہ رقیہ سخاوت حسین نے اس نظام فکر کے وجود میں آنے سے برسوں پہلے اس پدری نظام کو اپنی سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ عورت اور مرد کے کردار کی تبدیلی کے ساتھ ایک الگ دنیا کی تخلیق کرنا اور عورت و مرد کے درمیان ”طاقت کے رشتہ“ کو کمزور کرنا، عورت کو مرکزیت اور مرد کو حاشیہ پذیر کر دینا پدرشاہی نظام سے انکار یا خاتمہ کا گویا ایک اعلان تھا۔ بعد کے برسوں میں ان نکات پر ریڈیکل فیمینزم کے مفکرین نے خوب لکھا۔ زیر بحث کہانی میں ایسی کئی مثالیں ہیں۔ جیسے کہ جب دوسرے ملک سے تجارت کا سوال آتا ہے تو لیڈی لینڈ کی ملکہ بتاتی ہے کہ "ان ممالک کے ساتھ کوئی تجارت ممکن نہیں ہے جہاں عورتوں کو زنان خانوں میں رکھا گیا ہے" ملکہ نے یہ بھی بتایا کہ ان ممالک کے مردوں کے نیچے اخلاق کی بناء پر ان سے تجارتی رشتے استوار کرنا ممکن نہیں تھا۔ علاوہ ازیں زیر بحث کہانی میں عورت کے لیے مختص روایتی کاموں جیسے "بچوں کا خیال رکھنا، کھانا پکانا اور ہر طرح کا گھریلو کام کرنا" لیڈی لینڈ کے مردوں کے سپرد بھی کیا گیا ہے جبکہ "خواتین ملک پر حکومت کرتی ہیں اور کئی اہم عہدوں پر فائز ہیں۔ تمام سماجی معاملات میں ان کا دخل ہے۔ مذکورہ کہانی میں ایسے کئی ایک پہلو پیش کیے گئے ہیں جو صدیوں سے چلے آ رہے ہیں پدرانہ نظام کے خلاف احتجاج کے طور پر رقم ہوئے ہیں۔ جیسا کہ چچی سطور میں عرض کیا گیا کہ "ریڈیکل فیمینزم" کا مکتب فکر بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے بعد مغربی ممالک کے تائیدی مفکرین کے ذریعے وجود میں آیا جس میں پدری نظام اور کام کی جنسی و صنفی تقسیم کو عورت کی محکومیت کے ذمہ دار عوامل بتائے گئے لیکن رقیہ سخاوت حسین نے برسوں پہلے ہی اپنی کہانی میں ان نکات کو بڑی جرات کے ساتھ پیش کیا ہے۔

بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں تائیدی نظریات کے علاوہ مابعد جدید نظریات نے سماج پر اپنے اثرات مرتب کیے جس کے نتیجے میں فکر و عمل کے دائروں میں صدیوں سے چلی آ رہی مرکزیت کا

خاتمہ ہوا۔ قدیم موضوعات، تصورات اور نظریات کی ردِ تشکیل (Deconstruction) پر زور دیا اور حقائق کی تلاش کے لیے بین طبقاتی اپروچ (Intersectional approach) کی اہمیت واضح کی۔ ذیلی اور پس ماندہ طبقات کی ثقافت اور ان کی پیچیدگیوں پر توجہ دلائی۔ ان ہی تحریکات سے ”نسائی تہذیب و ثقافت“ کی اہمیت کو سمجھنے اور سمجھانے کی شروعات بھی ہوئی۔ عورت کو اپنے وجود اس کی اپنی نسوانی خصوصیات نیز صلاحیتوں پر خوش ہونے اور اس کی پسند و ناپسند کے آزادانہ اظہار کی اہمیت کی طرف توجہ مبذول کروائی گئی۔ یعنی عورت کی حقیقی آزادی کے لیے نہ صرف مردوں کی روایتی سوچ کو تبدیل کرنے بلکہ خود عورت کی سائیکس کو بدلنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ایک اور قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ کہانی ”سلطانہ کا خواب“ میں رقیہ نے مابعد جدید تائیدیت کے ان نظریات کو بھی پیش کیا ہے جو برسوں بعد مباحث کا حصہ بنے تھے۔ جیسا کہ زیرِ مطالعہ کہانی میں سلطانہ اکثر مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے کمزور جنس ہونے کا اعتراف کرتی ہے۔ مثال کے طور پر جب سارہ اس سے کہتی ہے کہ خواتین کو ”زنان خانہ“ میں بند رکھنا انصافی ہے تو وہ اپنی قید کا دفاع کرتی ہے اور کہتی ہے کہ:

”ہمارے لیے ’زنانہ‘ سے باہر آنا محفوظ نہیں ہے، کیونکہ ہم فطری طور پر کمزور ہیں۔“

سلطانہ ”لیڈی لینڈ“ میں ”زنان خانہ“ کو مردوں کی ’مناسب جگہ‘ ہونے کا سن کر حیران رہ جاتی ہے۔ دراصل سلطانہ کا کردار اس عورت کی ترجمانی کرتا ہے جو اس عرصہ دراز سے اس حقیقت کو قبول کرتی نظر آتی ہے کہ ”وہ ایک کمزور جنس ہے۔ اسے خود اپنی صلاحیتوں اور خود اعتمادی کا اندازہ نہیں ہے۔“ خود اعتمادی کے اسی فقدان کی طرف رقیہ سخاوت حسین نے خاص توجہ دلائی اور عورت کو بھی خود اس کے پس ماندہ موقف کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ جیسا کہ سخت پردہ کا نظام اور زنان خانوں میں عورتوں کو محکوم کرنے پر سارا نے سلطانہ سے سوال کر لیا کہ:

”تم کیوں خود کو بند کروانے پر راضی ہوئیں؟“ آگے وہ یہ بھی کہتی ہے:

”آپ نے اپنے آپ پر واجب الادا فرض کو نظر انداز کیا ہے اور آپ نے اپنے مفادات کے لیے آنکھیں بند کر کے اپنے فطری حقوق بھی کھو دیے ہیں۔“

دراصل رقیہ سخاوت حسین کا مقصد اس طرح کے سوالات اور مباحث کے ذریعے خواتین کی سائیکس کو بدلنا تھا۔ انھیں یہ احساس دلانا تھا کہ کسی بھی صورت میں خواتین خود کو شرمندہ نہ کریں اور نہ خود کو کمزور یا معذور سمجھیں جیسا کہ انھیں باور کروایا جاتا رہا ہے۔ عرصہ دراز سے سماج کا یہی نظریہ رہا کہ عورت جو کام کرتی ہے وہ غیر اہم اور غیر منفعت بخش کام ہے۔ وہ اقدار یا صفات جن کی عورت نمائندگی کرتی ہے۔ جیسے محبت، پیار، صبر اور سمجھوتہ جیسی صفات جذباتی اور کمزور ہیں۔ عصر حاضر میں تائیدی مقلدین عورت کی تمام ہنرمندانہ صلاحیتوں اور ان کے تمام طرح کے کام کی پذیرائی پر زور دیتے ہیں۔ جبکہ رقیہ نے اس کہانی میں خواتین کے کام یعنی ”کڑھائی اور بنائی“ کا جشن منائی ہیں اور ”لیڈی لینڈ“ میں مردوں کی جانب سے کیے جانے والے کام پر تنقید کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ”ہم ہمارے زنان خانہ کے ممبروں پر

کڑھائی کے ساتھ بھروسہ نہیں کرتے ہیں! "رقیہ ان مکالمات کے ذریعے مردوں کے مقابلے میں خواتین کے ہنرمندانہ کاموں کی پذیرائی کرتی ہیں اور سماج کو ان کی اہمیت سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں۔

کہانی "سلطانہ کا خواب" ماحولیاتی تائیدیت (ایکوفیمیزم) کے حوالہ سے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ عصر حاضر میں ماحولیات کی تباہی اور بربادی کو روکنے کی کوششیں عالمی و قومی سطح پر نہایت اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔ جبکہ تائیدی مفکرین کی جانب سے ماحولیات کے تحفظ میں خواتین کے منفعت بخش رول پر کافی مباحث بھی منظر عام پر آئے ہیں۔ عرصہ پہلے رقیہ نے اپنی کہانی کے ذریعے خواتین کو فطرت کے ذرائع اور اس کی زرخیزی کے ساتھ جوڑ کر دنیا کے سامنے ماحولیات کے تحفظ کا ایک اہم ماڈل رکھا۔ "لیڈی لینڈ" میں خواتین فطرت کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرتی ہیں اور قدرتی وسائل کے ذریعے روزمرہ زندگی کی بقا اور ملک کی ترقی کے فائدے کے لیے کام کرتی ہیں۔ اپنی کہانی کے ذریعے رقیہ نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ سائنس، خواتین اور ماحولیات کے درمیان ہم آہنگی کا نہایت اہم رشتہ ابتداء ہی سے قائم ہے۔ مثال کے طور پر سلطانہ کو سبز گھاس کا ایک ٹکڑا بھی ٹھنکی کشن کی طرح نظر آتا ہے۔ وہ گھاس پر چہل قدمی کرنے سے بھی منع کرتی ہے تاکہ پودے اس کے پاؤں سے روندے نہ جائیں۔ لیڈی لینڈ کے مکین فطری نظاروں کے درمیان رہنے کی وجہ سے کسی قسم کی وبائی بیماری کا شکار نہیں ہیں اور نہ ہی وہ مچھر کے کاٹنے سے متاثر ہوئے ہیں اور نہ جوانی میں ان کی موت واقع ہوتی ہے بلکہ وہ لمبی عمر پاتے ہیں۔ وہاں کی سرزمین سیلاب یا گرج چمک کے ساتھ تیز بارش سے کبھی تباہ نہیں ہوئی۔ رقیہ نے اس کہانی کے ذریعے مردوں کی جانب سے جنگ و جدل اور طاقت کے غلبہ نیز ترقی کے لیے قدرتی وسائل کی تباہی و بربادی کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ ہیں کہانی میں انھوں نے ایک اور اہم پہلو کو بھی موضوع بحث بنایا کہ پدرشاہی نظام نے خواتین کو جدید و سائنسی علوم سے نہ صرف دور رکھا بلکہ ان کو اپنی فہم و فراست سے دور رکھنے کے ہر ممکنہ کوشش کی۔ لیکن جب انھیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے مواقع نصیب ہوئے تو خواتین نے اپنی صلاحیتوں کو نکھارا اور نئی ایجادات کے ذریعے اپنے ملک کو تباہی و تاراجی سے بچالیا۔ جیسا کہ "لیڈی لینڈ" کی خواتین نے اپنی سائنسی ایجادات جیسے 'واٹر بیلون' اور 'شمسی توانائی کے ذخائر' اور دیگر تکنیکی آلات کے ذریعے ملک کی ترقی اور تحفظ میں اہم رول نبھاتی ہیں۔ لیڈی لینڈ میں سائنس کا تعلق ایسے گھریلو روزمرہ کے امور سے جوڑا گیا جو خواتین سے متعلق سمجھے جاتے ہیں جیسے کھانا پکانا، پانی کی فراہمی کو یقینی بنانا، شمسی توانائی کا استعمال وغیرہ۔ یعنی سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی کو خواتین کے لیے لازم اور روزمرہ کی زندگی سے مربوط بتایا گیا ہے۔ عصر حاضر میں سائنس و ٹکنالوجی کے مضامین (STEM) میں لڑکیوں کی شمولیت کو ضروری سمجھا جا رہا ہے نیز پالیسی کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔ رقیہ سخاوت حسین نے عرصہ قبل ہی اپنی کہانی میں خواتین کی ان تمام میدانوں میں نمائندگی کے فوائد کو بھرپور طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی۔

رقیہ سخاوت حسین نے زیر بحث کہانی کے ذریعے نہ صرف سائنس اور پدرانہ نظام کے درمیان قریبی تعلق پر تنقید کی بلکہ سائنس اور نوآبادیاتی طاقتوں کے درمیان جو پاور (طاقت و غلبے کے رشتے) کام

کرتا رہا اور کئی ممالک کو غلام بنایا گیا، انھیں بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ چونکہ سائنس اور ٹکنالوجی میں ہونے والی ترقی کا طویل عرصے سے فوجی اور سماجی طاقت کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ جس کی کئی ایک مثالیں عصر حاضر کی جنگوں کے نتیجے میں ہونے والی تباہی کی شکل میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ عرصہ پہلے برطانوی حکمرانوں نے سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی کو بنیاد بنا کر ہی ہندوستان کو نوآبادیاتی ملک میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس دور میں سائنس اور ٹکنالوجی کے غلط استعمال اور اس کے سماجی اثرات کی رقیہ بھی چشم دید گواہ تھیں۔ لہذا رقیہ نے سائنس اور ترقی کے درمیان پدر شاہی رشتے کے نقصان دہ تعلق اور تسلط پر خوب طنز کیا ہے۔ زیر بحث تمام نکات کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ”سلطانہ کا خواب“ برصغیر میں تانبیت کا ایک ایسا انقلابی بیانیہ ثابت ہوا جس کی بازگشت آج تک سنائی دیتی ہے۔

اختتامیہ:-

خواتین کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ برصغیر کی خواتین نے انیسویں صدی کی آخری دہائیوں سے دھیرے دھیرے ان تمام پدر شاہی اصولوں اور سماجی ڈھانچے کے خلاف بغاوت شروع کر دی تھی جس نے صدیوں سے ان کو زیر یا محکوم کر رکھا تھا۔ خواتین کے پست موقف کے متعلق سماج کی ذہن سازی اور خود خواتین کی شعور بیداری کے لیے ماحول اتنا سازگار نہیں تھا کہ خواتین تحریکات کے ذریعے احتجاج کا راستہ اپنائیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے جذبات، احساسات اور تجربات کو پیش کرنے کی شروعات کر دی تھی۔ اس مقصد کے لیے کئی خواتین میدان میں اتر آئیں اور سماجی کاموں کے علاوہ اپنی مادری زبانوں میں لکھنے کا سہارا لیا تاکہ مرد اساس معاشرہ کو ان کے مسائل سے واقف کروایا جاسکے۔ ابتدائی دور کی چند اہم جہد کار خواتین قلم کاروں میں جنھوں نے مرد اساس معاشرتی ڈھانچے کو چیلنج کیا ان میں رقیہ سخاوت حسین ایک اہم نام ہے۔ بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی انقلابی فکر اور بے باک ادبی اظہار نے انھیں اپنے عصر کی تمام خواتین قلم کاروں میں انفرادیت عطا کیا ہے۔

رقیہ سخاوت حسین کو خواتین کی تعلیم و ترقی اور سماجی تبدیلی کا آغاز کرنے میں مختلف رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن انھوں نے اپنی آخری سانس تک ہمت نہ ہاری۔ اپنے قلم اور عملی کارناموں کے ذریعے سخت محنت کرتی رہیں۔ رقیہ نے اپنی تحریروں میں خواتین کو نہ صرف پدرانہ غلبہ سے آزاد ہونے کی ترغیب دی بلکہ خود اپنی سوچ کے محدود دائروں سے باہر نکلنے کی صلاح بھی دی۔ اپنے حقوق کو پہچاننے اور دیے گئے مذہبی حقوق و قانونی مراعات کی تشریح و توضیح کے لیے خود خواتین کو آگے آنے کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کو معاشی خود انحصاری سے جوڑا اور ملک کی سیاسی و سماجی ترقی کا انھیں ایک اہم جز قرار دیا۔ رقیہ نے خواتین کی معاشی آزادی کے اہم نظریے کو پیش کیا اور سماج میں عورت کے ”حیاتیاتی وجود نہیں بلکہ عقلی وجود“ کی اہمیت سمجھانے کی کوشش کی۔

رقیہ سخاوت حسین کے عہد تک تانبیت یا تانبیتی نظریات کے مباحث یا خدوخال اتنے واضح

نہیں ہوئے تھے لیکن مذکورہ کہانی کے علاوہ رقیہ کی تحریروں کے جائزے سے ان کے ذہنی میلان اور فکر و سوچ کی اڑان کی بلندی اور وسعت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ”سلطانہ کا خواب“ نہ صرف بر صغیر بلکہ جنوبی ایشیاء میں تانیثی تحریک کا اولین انقلابی بیانیہ کہا جاسکتا ہے۔ مذکورہ کہانی ”جانب دارانہ صنفی تصور“ کے ساتھ غیر حقیقی محسوس ہوتے ہوئے بھی سماجی حقیقتوں سے قاری کا رشتہ کہیں نہ کہیں ہموار کر لیتی ہے۔ دراصل جس سماجی پس منظر میں یہ کہانی تخلیق کی گئی اس کو پیش نظر رکھ کر مطالعہ کیا جائے تو نہ صرف ماضی کے سماجی حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں بلکہ خواتین کے وجود سے جڑے سیکڑوں مسائل اور صنفی روایات کا منطقی رشتہ بھی عصر حاضر سے جڑ جاتا ہے۔ بظاہر یہ کہانی پہلی سطح پر غیر حقیقی محسوس ہوتی ہے لیکن تانیثی نقطہ نظر سے بغور مطالعہ کیا جائے تو کہانی دھیرے دھیرے ذہن میں جذب ہونے لگتی ہے اور پھر اپنا تاثر قائم کرتی ہے۔ کہانی کے بین السطور سے پدر شاہی سماج میں عورت کے پست موقف کی واضح جھلکیاں ذہن پر ابھرنے لگتی ہیں اور اس نظام کے خلاف رقیہ سخاوت حسین کی مزاحمت اور احتجاج کے سیکڑوں رنگ بکھیرنے لگتے ہیں اور پھر ان رنگوں کے دائرے وسیع ہو کر عصر حاضر تک آ ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ”سلطانہ کا خواب“ فی زمانہ جاری تانیثی مباحث کا ایک اہم باب محسوس ہوتا ہے اور تانیثیت کے جدید رجحانات کے ڈسکورس میں اس کہانی کا مطالعہ و تجزیہ ناگزیر قرار دیا جاسکتا ہے۔



References:- ماخذات

1. According to the literary encyclopedia "Feminist utopia" can be defined as a "narrative about a society that is free from the patriarchal subordination of women"
[https://www.litencyc.com/php/stopics.php?rec=true&UID=19546, accessed 18 January 2024.
2. Tharu. Susi. & Lalita, (1991). *Women writing in India* (Vol 1). The feminist press. New York. xvii.
3. Forbes. Geraldine. (1998). *Women in Modern India*. Cambridge University Press. p 11
4. ibid. p12
5. Minault. Gail. (1998). *Secluded Scholars: Women's Education and Muslim Social Reform in Colonial India*. Delhi: Oxford University Press

- 6.Hasan.Zoya, Menon.Ritu. (2005). *Educating Muslim Girls:A comparision of five Indian Cities*.New Delhi: Kali for Women.p 1
- 7.Kazi .Seema.(1999).*Muslim Women in India*. Minority Rights Group.UK.p 8
8. Minault.Gail. (1998). *Secluded Scholars: Women's Education and Muslim Social Reform in Colonial India*.Delhi: Oxford University Press.p 35
- 9.Hossain, Y. (1992). *The Begum's Dream: Rokeya Sakhawat Hossain and the Broadening of Muslim Women's Aspirations in Bengal. South Asia Research*, 12(1),
(<https://www.researchgate.net/publication/273898717>)
- 10.Susi .Tharu.& Lalita,(1991). *Women writing in India*(Vol 1). The feminist press. New York p 340 to 342
- 11.Barnita.Baghchi. "*Inside Tarini Bhavan: Rokheya Saqawat Hossain's Padmarag and the richness of south Asia's feminism in furthering unsecterian,gender -just development*" refered @
<http://igidr.ac.inpdfpublicationWP-2003-004.pdf>)
12. Susi .Tharu.& Lalita,(1991). *Women writing in India*(Vol 1). The feminist press. New York .p 341
- 13.<https://feminisminindia.com/2019/02/18/book-review-motichur-rokeya-begum/>
(Retrived on 2-1-2024)

اردو ادب کے فروغ میں علماء کا حصہ [علامہ شبلی کی سوانحی خدمات کے خصوصی حوالے سے]

اصلاحی مہمات ہوں یا آزادی کی تحریکات، معاشرتی و معاشی اصلاح کی کوششیں ہوں یا سماجی فلاح و بہبود کی تلگ و دو، تہذیب و ثقافت کی حفاظت کا سوال ہو یا زبان و ادب کے آغاز و ارتقاء کا مسئلہ، علماء نے یوں تو ان سبھی میں اہم کردار ادا کیا ہے تاہم اردو زبان و ادب کے فروغ میں علماء کا کردار بالخصوص قابل ذکر رہا ہے۔ اردو اور علماء کا عربی اور فارسی سے جو تعلق ہے اس کی بنیاد پر ان دونوں کو سکے کے دو روپ یا دوسرے الفاظ میں دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیا جاسکتا ہے۔ اردو زبان و ادب کی پوری تاریخ اور مستقبل کے امکانات اس پر شاہد ہیں۔ اردو زبان کے آغاز اور اسے مقبول عام بنانے میں قرآن کریم کے تراجم و تفاسیر، توضیحات احادیث مبارک، ملفوظات اولیاء، سیرت و سیر اور اسلامیات و اخلاقیات نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اردو کے ابتدائی عہد کی نثری خدمات ہوں یا شعری نمونے سبھی میں عموماً انہی موضوعات کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور کسی کو اس سے بھی انکار نہ ہوگا کہ اردو کا دور عروج بھی علماء کا رہن منت ہے کیونکہ اس سلسلے میں جن حضرات کے نام لیے جاتے ہیں ان میں بھی بڑی تعداد عالم دین حضرات ہی کی ہے اور میری رائے میں تو اب اس کا مستقبل بھی علماء اور مدارس ہی سے وابستہ ہے کیونکہ کسی زبان یا ادب کی بقا و ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے نئے قارئین پیدا ہوں اور اس کا ادب کسی بھی میڈیم سے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے تو اس سلسلے میں میرا تجربہ تو یہی ہے کہ اردو کے نئے قارئین پیدا کرنے نیز اردو کتب، رسائل، اخبارات اور دیگر اشتہاری کتابچوں وغیرہ کی کھپت کا سب سے بڑا ذریعہ علماء اور مدارس ہی ہیں۔ ثبوت کے لیے بہت سی مثالیں اور دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں جن کی بہر حال گنجائش نہیں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ آج کل اردو اساتذہ کے بچے عموماً اردو سے نا بلند ہیں۔ ان کے کارڈز بہتر دوسری زبانوں میں چھپتے ہیں۔ ان کے ڈرائنگ رومس اور گھروں میں اردو کی بجائے دوسری زبانوں کے بورڈ، تختیاں اور سینریاں نظر آتی ہیں۔ وہ اردو کتب کو لے کر کھلے عام چلنا عار سمجھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ کچھ اساتذہ تو خود کو دوسرے مضمون کا استاد بتاتے ہیں جب کہ علماء کے یہاں صورت برعکس ہے یعنی ان کا اوڑھنا بچھونا بھی اردو ہے۔ اسی طرح خالص ادبی کتب و رسائل کے مقابلے میں مذہبی اور نیم ادبی کتب و رسائل تعداد اور بکری دونوں کے اعتبار سے بہتر پوزیشن میں ہیں، مثال کے طور پر

میرے آبائی وطن رام پور سے میرے علم کے مطابق ادبی مجلہ صرف ”رضالا بھریری جرنل“ نکلتا ہے جس کی بمشکل تمام چند کاپیاں فروخت ہوتی ہوں گی جب کہ مذہبی نوعیت کے ماہنامہ ”نور“، ”بتول“، ذکر کی اور ”ضیاء وجیہ“ جیسے درجنوں رسائل نہ صرف شائع ہوتے ہیں بلکہ خاصی تعداد میں بکتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی حقیقت ہے کہ علماء ہی اردو میں پیشتر اصناف کے بانی و موجد رہے ہیں جن میں سے ایک صنف سوانح نگاری بھی ہے۔

اردو میں سوانحی ادب کی ابتدا کا سہرا دو عالموں مولانا حالی اور علامہ شبلی نعمانی کے سر ہے۔ حالی کی ”حیات سعدی“ اردو میں باقاعدہ پہلی سوانحی کتاب ہے جو 1881ء میں منظر عام پر آئی تھی جب کہ دوسری سوانحی کتاب علامہ شبلی کی ”المامون“ ہے جو 1889ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی تھی اس کے بعد حالی کی دوسری کتابیں یعنی ”یادگار غالب اور حیات جاوید“ نیز علامہ شبلی کی ”سیرۃ النعمان“، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم، سیرۃ النبی، اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، حیات خسرو، حیات سعدی، فردوسی، فیضی، نظامی گنجوی، حیات حافظ اور ”زیب النساء“ وغیرہ تیرہ کتابیں منظر عام پر آئیں جنہوں نے اردو میں سوانحی ادب کی راہ ہموار کی اور آگے چل کر انہی کی بنیاد پر سوانحی ادب کے اصول و ضوابط متعین ہوئے ہیں۔

المامون:

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا کہ شبلی نعمانی کے اس سلسلے کی پہلی کڑی ”المامون“ تھی جو 1889ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس میں انہوں نے پہلے عباسی خلیفہ مامون الرشید کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ اس میں انہوں نے مامون کی مداحی کے ساتھ اس کے معائب پر بھی روشنی ڈالی ہے مگر معائب کے معاملے میں کوئی نہ کوئی توضیح کی ہے تاکہ جو مقاصد انہوں نے اس سے حاصل کرنا چاہے ہیں وہ حاصل ہو سکیں اور قاری ہیرو کے معائب میں کھو کر اس راہ سے نہ ہٹ جائے۔

سیرۃ النعمان:

شبلی کی دوسری سوانحی کتاب ”سیرۃ النعمان“ ہے۔ سیرۃ النعمان میں انہوں نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات اور ان کے علمی مرتبے کو اجاگر کیا ہے۔

الفاروق:

”الفاروق“ شبلی کی اشاعت کے اعتبار سے تیسری اور تیاری کے اعتبار سے دوسری سوانحی کتاب تھی جس میں انہوں نے فاروق اعظم جیسی عظیم اور بے مثال شخصیت کو موضوع بنایا ہے۔

الغزالی:

شبلی کے سلسلہ ناموران اسلام میں ”الفاروق“ کے بعد ”الغزالی“ منظر عام پر آئی۔ اس میں انہوں نے امام غزالی کی شخصیت کے ساتھ ”علم کلام“ جو مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ہے اور ان کا ہتھم بالشان علم اور سرمایہ تازہ ہے پر روشنی ڈالی ہے۔

سوانح مولانا روم:

الغزالی کے بعد شبلی نے ”مولانا روم کی سوانح“ ترتیب دی جو اگست 1906ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ سلسلہ کلامیہ کی ایک کڑی ہے اور اس میں مولانا کو شبلی نے بحیثیت منکلم پیش کیا ہے یعنی انہیں زمرہ متکلمین میں شامل کیا ہے۔

سیرۃ النبی:

”سیرۃ النبی“ شبلی نعمانی کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری ہے۔ اس میں آپ نے ثابت کیا ہے کہ کس طرح آپ کی دعوت و ہدایت نے کس طرح انسان کو اندر سے بدل کر رکھ دیا تھا اور آپ نے کس طرح جاں بلب انسانیت میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔

اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر:

انگریز مورخوں نے اورنگ زیب کو متعصب اور تنگ نظر بالخصوص ہندوؤں کا دشمن ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ شبلی نے ان من گھڑت الزامات کی تردید کر کے اورنگ زیب کی اصل شخصیت واضح کی ہے۔

حیات خسرو:

”حیات خسرو“ میں شبلی نے حضرت امیر خسرو کی شخصیت کو موضوع بنایا ہے۔ اس میں انہوں نے خسرو کی موسیقی میں ایجادات اور مہارت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے ایجاد کردہ راگوں کی باقاعدہ فہرست پیش کر کے ان کے استاد کمالات کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔

حیات سعدی:

”حیات سعدی“ میں سعدی شیرازی کی شخصیت اور کارناموں کو پیش کیا ہے۔ یہ پہلی بار 1896ء میں منظر عام پر آئی تھی۔

فردوسی:

شبلی نے 1896ء میں ”فردوسی“ کے نام سے شاہنامہ اسلام کے مؤلف فردوسی کی شخصیت اور کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔

فیضی:

فیضی نے علم و فن کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس لیے شبلی کی نظر میں فیضی کی بڑی قدر و قیمت تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس کتاب میں فیضی کے کارناموں کو پیش کیا ہے۔

نظامی گنجوی:

اس میں انہوں نے مشہور عالم و فاضل اور شاعر نظامی گنجوی کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ نظامی اور فردوسی کی شاعری کا موازنہ بھی انہوں نے اس میں پیش کیا ہے۔

حیات حافظ:

”حیات حافظ“ کے نام سے انہوں نے حافظ شیرازی اور اس کے کارناموں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔

زیب النساء:

شہزادی زیب النساء کو بھی مورخوں نے مورد الزام ٹھہرایا ہے اور اس پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے تھے جب کہ وہ ایک بے مثال عالمہ اور کیتائے روزگار فاضلہ تھیں۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب جیسا عالم و فاضل ان کی لیاقت کی قدر کرتا تھا۔ چنانچہ شبلی نے ان بے بنیاد الزامات کی تردید کی اور ان کی حقیقی شخصیت کو عوام کے سامنے پیش کیا۔ اسے شبلی نے 1909ء میں مرتب کیا تھا۔

ان سوانحی کتابوں کے علاوہ علامہ شبلی کی ”موازنہ انیس و دہیر“، ”شعر العجم“، مقالات شبلی اور ”مضامین شبلی“ وغیرہ بھی منظر عام پر آئیں جن سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ہمہ جہت شخصیت اور ادب کی کئی اصناف پر قدرت کاملہ رکھتے تھے اور ان میں بہ آسانی شہرت کے جھنڈے گاڑ سکتے تھے لیکن آپ نے مشاہیر اسلام اور اسلامی تہذیب و روایات کے علم برداروں کے کارناموں کو منظر عام پر لانے کو اپنا مقصد حیات قرار دے دیا تھا۔ دراصل اس کی وجہ یہ تھی کہ شبلی کی پیدائش اس پر آشوب دور میں ہوئی تھی جس میں مغلیہ سلطنت کے نااہل جانشینوں نے اپنے اجداد کی ساری کمائی عیش و عشرت کی زندگی کی نذر کر کے اپنی عظمت اور شان و شوکت مٹی میں ملا دی تھی۔ نیز مسلم معاشرہ سیاسی انحطاط کی بدولت علمی، اخلاقی اور معاشی پستی کے گہرے غار میں جا گرا تھا جس کا فائدہ اٹھا کر دشمنان اسلام نے، اسلام اور اس کے متبعین پر طرح طرح کے بے بنیاد حملے کرنے شروع کر دیے تھے۔ دراصل فاتح اقوام کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد، زبان، تہذیب اور تمدن کی بہتری اور برتری کسی بھی طرح مفتوحین کے دل و دماغ پر مسلط کر دیں۔ چنانچہ سرزمین ہند پر اپنا تسلط قائم کرتے ہی انگریزوں نے بھی یہ مہم شروع کر دی۔ ان کی یہ مہم بہ ظاہر تو عام تھی لیکن بالخصوص اس کا ٹارگیٹ مسلم قوم تھی کیونکہ ایک تو انہوں نے ہندوستان کی زمام حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اور دوسرے اسلام اور عیسائیت کے درمیان پہلے سے کشمکش موجود تھی۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں کی تہذیبی و تمدنی زندگی اور عقائد کو اپنا نشانہ بنایا۔ انہوں نے اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کو کمتر ثابت کرنے کے لیے مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کر کے اپنی بہتان تراشیوں اور افتراء پر دازیوں کو اس قدر اچھا لاکہ خود مسلم تعلیم یافتہ طبقہ بھی اپنے بزرگوں کے عقائد اور تہذیب و تمدن کو اپنی پیشانی کا داغ سمجھ کر فاختہ بن گئے۔ آواز سے آواز ملا کر باتیں کرنے لگا۔ علامہ شبلی نے اس صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے:

”یورپ کے بے درد واقعہ نگاروں نے سلاطین اسلام کی غفلت شعاری، عیش پرستی اور سیہ کاری کے واقعات کو اس بلند آہنگی سے تمام عالم میں مشہور کیا ہے کہ ہمیں یقین آچلا اور تقلید پرست تو بالکل یورپ کے ہم آہنگ بن گئے۔“

[مقالات شبلی، جلد چہارم، ص 82]

علامہ شبلی کے نزدیک مسلم معاشرے کو احساس کمتری اور ذہنی غلامی کی دلدل سے نکالنے کی واحد صورت یہی تھی کہ انہیں تاریخ اسلام کے روشن باب کھول کر دکھائے جائیں اور انہیں یہ سمجھایا جائے کہ آج علم و تہذیب کی دنیا میں جو بھی ترقیاں ہو رہی ہیں ان کی پشت پر اسلامی علم و تہذیب کی روایات موجود ہیں۔ اسلام نے جتنی عظیم اور بلند قامت شخصیتیں ہر میدان میں پیدا کی ہیں ان کے نام اور کارنامے ہی بڑی سے بڑی قوم کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے اور اس کے متبعین کو شکست و محرومی کی دنیا سے نکال کر عظمت رفتہ کی بلندیوں تک پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مشاہیر اسلام پر قلم اٹھانے اور ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے کا عزم کیا۔ اس سلسلے میں تو ان کا عقیدہ یہ تھا:

”دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں، آگے بڑھتے جائیں
لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں پیچھے ہٹتے جائیں، یہاں
تک کہ صحابہ کی صف میں جا کر مل جائیں۔“ [حیات شبلی، ص 29]

علامہ شبلی کا یہ عقیدہ انتہائی راسخ تھا جس نے نہ صرف ان کی زندگی کو متاثر کیا بلکہ اسے ایک نئی انقلابی راہ پر ڈال دینا ہی ان کی تصنیفی و تالیفی کاموں کی بنیاد تھا اور اسی نے انہیں سوانح نگاری کے میدان میں طبع آزمائی پر مجبور کیا تھا۔

نامواران اسلام کی شخصیات اور کارناموں کو بیان کرنے میں شبلی نعمانی کا دوسرا بڑا مقصد اردو زبان و ادب کے دامن کو وسیع کرنا تھا کیونکہ انہیں بخوبی احساس ہو چکا تھا کہ آئندہ مسلمانوں کی زبان عربی و فارسی نہیں صرف اردو ہوگی۔ اس لیے ہمیں ہر حال میں اس کے دامن کو وسیع کرنا چاہئے۔ انہوں نے علماء کو بھی مشورہ دیا کہ وہ اب عربی و فارسی کی بجائے اردو میں تصنیف و تالیف کی خدمات انجام دیں۔ وقت کا یہی تقاضا ہے۔ وہ ”المامون“ کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:

”آج جو زبان [اردو] ہماری عام ضرورتوں کی لقیل ہے اس کے خزانے میں
قومی تاریخ کا جس قدر سرمایہ ہے ضرورت سے بہت کم ہے۔ ہندوستان کی
بہت سی تاریخیں لکھی گئیں اور مغلیہ اور تیوریہ کے کارنامے بڑی آب و تاب
سے دکھائے گئے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مجموعی تاریخ بھی ہماری قومی
تاریخ کا ایک بہت چھوٹا سا حصہ ہے۔ اسلام کو تیرہ سو برس سے کچھ اوپر
ہوئے۔ اس وسیع مدت میں اس کی فتوحات کہاں کہاں پہنچیں، کس کس کو اس
نے تاج و تخت دیا، کتنی سلطنتیں قائم کیں، کبھی بنو امیہ کو عروج ہوا، کبھی عباسیہ کا
ستارہ چمکا..... جن کو اردو زبان میں ڈھونڈنا چاہیں تو کہاں ڈھونڈیں۔“

[المامون، حصہ اول، ص 6-7]

چنانچہ انہوں نے نہ صرف دوسروں کو رغبت دلائی بلکہ خود بھی اس کا بیڑہ اٹھایا اور ”ہیروز آف
اسلام“ کے عنوان سے اسلامی تہذیب و روایات کے علم برداروں کے کارناموں کو بڑی دلکش اور ہنرمندی

کے ساتھ پیش کرنا شروع کر دیا اور اس پیش کش میں انہوں نے اپنے مقصد کو اس قدر حاوی رکھا کہ جس سے بعض مقامات پر فن بھی مجروح ہوا۔ یعنی بعض مقامات پر انہوں نے اپنے ہیرو کی بعض انسانی اور سیاسی لغزشوں کو غیر منطقی تاویلات کرنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ طاہر کہ جسے مامون نے بغاوت کے شہبے میں زہر دلوادیا تھا کے معاملے میں سامنے آتا ہے علامہ شبلی اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

طاہر جب خراسان کو روانہ ہوتے ہوئے مامون سے رخصت ہونے لگا تو مامون نے ایک خاص غلام کو اس کے ساتھ کر دیا جس کی نسبت طاہر کو یہ یقین دلایا کہ اس کی کارگزاریوں کا صلہ ہے مگر در پردہ غلام کو ہدایت کی تھی کہ اگر طاہر کے خیالات بغاوت کی طرف مائل دیکھے تو زہر دے دے۔“

[المامون، حصہ اول، ص 90]

اس کے بعد شبلی پورے یقین اور کامل وثوق کے ساتھ طاہر کو زہر دینے کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ہم کو اس میں شبہ نہیں کہ طاہر کو زہر دیا گیا اور خود مامون نے زہر دلوایا“

[المامون، حصہ اول، ص 91]

لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں یہ احساس ہوا کہ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے نقیب کا یہ کردار اچھا تاثر نہ ڈالے گا تو انہوں نے فوراً اس کی ایک تاویل پیش کی اور کہا:

”اگر مامون کی جگہ کوئی دوسرا بادشاہ ہوتا تو کیا کرتا۔“

[المامون، حصہ اول، ص 91]

اس کے بعد انہوں نے اپنی تاویل کو یقینی اور قطعی بنانے کے لیے ایک دلیل بھی پیش کی اور کہا:

”اگر اس نظیر کے لیے ہم دور نہ جائیں اور خود مامون کے نامور باپ ہارون رشید کی طرف نگاہیں اٹھائیں تو کیا ثابت ہوگا اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ایک خیالی الزام پر برا مکہ کا وہ فیاض خاندان جس کی نظیر سے کل تاریخ اسلامی خالی ہے، ایک لحظہ میں دنیا سے ناپید کر دیا، لیکن مامون نے جو کچھ کیا سیاست ملکی کے لحاظ سے اس کا ضروری فرض تھا۔“ [المامون، حصہ اول، ص 91]

گویا شبلی نعمانی نے ”اگر مامون کی جگہ کوئی دوسرا بادشاہ ہوتا تو کیا کرتا“ اور ”مامون نے جو کچھ کیا سیاست ملکی کے لحاظ سے اس کا ضروری فرض تھا“ کہہ کر مامون کی سیاسی لغزشوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے جسے بہر حال مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن ساتھ ہی اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے مامون اور اپنے دوسرے تمام ہیروز کی بہت سی ان لغزشوں اور کمزوریوں تک کو بیان کر دیا ہے جن سے وہ بے آسانی چشم پوشی کر سکتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر ہم مامون کے سلسلے میں اسی مذکورہ اقتباس کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ شبلی نے جہاں مامون کی کسی سیاسی لغزشوں کو حالات کا منطقی نتیجہ قرار

دینے کی کوشش کی ہے وہیں بالکل واضح اور دو ٹوک الفاظ میں یہ بھی کہا ہے کہ ”ہم کو اس میں کچھ شبہ نہیں کہ طاہر کو زہر دیا گیا اور خود مامون نے زہر دلویا“ حالانکہ وہ اس اعتراف سے بہ آسانی صرف نظر کر سکتے تھے مگر انہوں نے کھلے بندوں اس کا اقرار کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے ہیروز کے معائب پر نہ صرف گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ اسے برسر عام بیان کرنے کی جرأت بھی رکھتے ہیں اور یہی سوانح نگار کا اولین فرض ہے۔

☆☆☆



میرٹھ کے معروف شاعر ڈاکٹر ادنیٰ عشق آبادی کے شعری مجموعہ ”برگ آوارہ“ کا اجراء کرتے ہوئے شہر قاضی زین السالکین، محترم اسرار الحق اسرار، پروفیسر اسلم جمشید پوری، پروفیسر یونس غازی، محترم شاہد چودھری، ڈاکٹر شاداب علیم، محترم فیض محمود، محترم انوار الحق شاداں، محترمہ دانش غزل و ڈاکٹر ارشاد سیانوی۔



شعبہ اردو میں میرٹھ گزرائز کالج کی آمد پر کالج کی پرنسپل محترمہ فرزانہ بنت عاصم اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے

ڈراما ”دروازے کھول دو“ کی عصری معنویت کا تنقیدی جائزہ

کرشن چندر (1914-1977) نے جب ڈراما ”دروازے کھول دو“ لکھا تو اس وقت ہندوستان کے سامنے قومی یک جہتی، سماجی ہم آہنگی کی مستحکم اور فرقہ پرستی کی دیوار کو منہدم کرنے کا چیلنج درپیش تھا۔ تقسیم وطن کے بعد ہندوستان میں سماجی بھائی چارے کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے قومی سطح پر ایک ایسے مشن کی ضرورت تھی جو سماجی فلاح و بہبود اور رواداری کو قائم و دائم رکھنے میں معاون و مددگار ثابت ہو سکے۔ ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اس مشن کو فروغ کے لیے عوام و خواص سے اپیل کی کہ وہ سماج میں ایسے نظریات و خیالات کی تبلیغ کریں جس سے لوگوں کے دماغوں کے بند در پیچ کھل جائیں اور ہندوستان کے وسیع آنگن میں امن و بھائی چارے کا شجر پھلے اور پھولے۔ قومی سطح پر اس مشن کے فروغ میں اردو ادب نے اپنا کلیدی کردار ادا کیا۔ بہت سے اردو ادیبوں اور شاعروں نے اس مشن کے فروغ میں اپنا قلمی تعاون پیش کیا۔ ان میں ایک اہم نام کرشن چندر کا بھی ہے۔

کرشن چندر نے طالب علمی کے زمانے میں آزادی کی تحریک میں شانہ بشانہ حصہ لیا تھا۔ ابتدا میں وہ سوشلسٹ پارٹی سے منسلک تھے لیکن بعد میں نظریاتی طور پر اشتراکیت کے پرستار اور مبلغ بنے۔ انھوں نے اشتراکی نظریات کو اپنے افسانوں اور ناولوں میں پیش کیا۔ اس کے باوجود انھوں نے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی ایما پر ہندوستان کی آزادی کے پندرہ سال بعد ڈراما ”دروازے کھول دو“ تخلیق کیا۔ اس سے قبل کرشن چندر نے تقسیم وطن کے بعد پیدا شدہ حالات کو اپنے افسانوں میں احسن طریقے سے پیش کیا ہے۔ ”ہم وحشی ہیں“ میں کرشن چندر نے سماج کی تلخ حقیقت کو اس انداز میں پیش کیا جسے پڑھ کر قارئین کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ڈراما ”دروازے کھول دو“ کو پہلی بار مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے جون 1963 میں شائع کیا گیا۔ اس ڈرامے کو انجمن ترقی اردو، بمبئی کی طرف سے قومی یک جہتی کی تحریک کے سلسلے میں بڑی کامیابی کے ساتھ کھیلا گیا تھا۔ قومی ایکتا اور سماجی ہم آہنگی اس ڈرامے کی اساس ہے۔ ”دروازے کھول دو“ یک بائی ڈرامہ ہے۔ جسے قاری ایک ہی نشست میں پڑھ سکتا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے اس ڈرامے کو قومی یک جہتی سلسلے کی پہلی اور بڑی اہم کڑی قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس ڈرامے کی اشاعت، عنوان اور مواد کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا:

”دروازے کھول دو“ جیسا اس کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے، قومی یک جہتی کے مسئلے کو سیاسی اور جذباتی سطح سے ہٹا کر ایک بنیادی انسانیت اور عقلیت کی سطح پر لے آیا ہے۔ لیکن کرشن چندر لیکچر نہیں دیتا، تبلیغ نہیں کرتا۔ صرف تعصبات کے بھاری بھرکم غباروں میں جن چھبا کر ان کی ہوائ نکال دیتا ہے۔ ان کا کھوکھلا پن عیاں کر دیتا ہے۔ یہ تعصبات وہ بھی ہیں، جو جنوب اور شمال کے درمیان وندھا چل بنے کھڑے ہیں۔ یہ تعصبات ہی ہیں جن کی وجہ سے ہندوستانی قومی احساس کی تشکیل پوری طور سے نہیں ہو سکی اور اس نے ان کا بھانڈا پھوڑ کر ان کی بے بنیاد حیثیت کو ظاہر کر کے کرشن چندر نے بہت بڑا کام کیا ہے۔“^۱

کرشن چندر نے ”دروازے کھول دو“ کے ”اختتامیہ“ پر پنڈت جواہر لال نہرو کی قومی یک جہتی کی تحریک اور اس ڈرامے کی اہمیت، افادیت اور معنویت کے بارے میں لکھا:

”ہمارے ملک میں اس سے پہلے بھی قومی ایکتا کی بڑی تحریکیں چل چکی ہیں۔ ایک تحریک اشوک کے زمانے میں چلی۔ دوسری اکبر کے زمانے میں۔ تیسری جواہر لال نہرو کے زمانے میں شروع ہو رہی ہے۔ پہلے دو دور ہندوستان کی تاریخ کے زریں دور سمجھے جاتے ہیں۔ اور اگر اس بار بھی یہ تحریک کامیاب ہوئی تو نہ صرف موجودہ نسل بلکہ آنے والی نسلیں بھی اس سے بہت فائدہ اٹھا سکیں گی۔ اس لیے موجودہ تحریک کے حامیوں کو تاریخ کی روشنی میں گذشتہ دونوں تحریکوں کو پرکھنا چاہیے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کیوں کہ اس مسئلے پر سوچ بوجھ رکھنے والے لوگ مختلف رائیں رکھتے ہیں۔“^۲

ڈراما ”دروازے کھول دو“ میں چھوٹے بڑے بیس کردار ہیں۔ لیکن ڈرامے کے چودہ کرداروں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ڈرامے کے مرکزی کرداروں میں پنڈت رام دیال، مکمل کانت، کریم اللہ، مرزا ارشاد حسین، لالہ آفتاب رائے، ہمیش نرائن ماتھر عرف مٹن، مس ایزا ایلا کوئیلو، ڈاکٹر ایڈورڈ کوئیلو، انکل رام بھروسے، کچھو، ویلو اور رنگا چاری اہمیت کے حامل ہیں۔

پنڈت رام دیال دہلی میں واقع ”مکمل گنج“ پارٹمنٹ کا مالک ہے۔ اس کا کام بلڈنگ کے خالی کمروں کو کرائے پر دینا ہے۔ پنڈت رام دیال نے یہ عہدہ کر رکھا ہے کہ وہ اپنی بلڈنگ صرف اور صرف ہندو مذہب کے لوگوں کو کرائے پر دیگا۔ لیکن ان کا بیٹا مکمل کانت اپنے والد کے برعکس آزاد خیال، لبرل اور سیکولر مزاج کا مالک ہے۔ اس کی نظر میں انسانیت کا مذہب سب سے بڑا مذہب ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ رام دیال کا بیٹا مرزا ارشاد حسین مسلمان، مکمل گنج میں بڑھئی کا کام کرنے والا شخص اور بلڈنگ میں بجلی کا کنکشن دینے والا عیسائی انجینئر ڈی سوزا، رنگ روغن اور پتائی کا کام کرنے والا مدراسی ہے۔ اس کے باوجود رام دیال کے دل میں غیر مذہبی لوگوں کے لیے کوئی عزت و احترام نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ

اس کی بلڈنگ میں وہ لوگ رہیں جو ہندو مذہب کے پیروکار ہوں، روزانہ مندر جا کر پوجا پٹھ کرتے ہوں، ماتھے پر تلک لگاتے ہوں اور ماس مچھلی سے کوسوں دور رہتے ہوں۔

ڈرامے کی ابتدا میں رام دیال کی بلڈنگ میں ہندوستان کا مشہور ماہر کینسر ڈاکٹر کریم اللہ، کرپا رام رام بھار دواج کے فرضی نام سے رہنے آتا ہے۔ لیکن کریم اللہ کے کم سن بچے نے عین وقت پر ان کا پردہ چاک کر دیا کہ وہ ہندو نہیں بلکہ مسلمان ہے۔ اس بات پر رام دیال بگڑ جاتا ہے کہ کریم اللہ اور اس کی بیوی ان کی بلڈنگ میں نام بدل کر کیوں کر داخل ہوئے۔ وہ انھیں اپنی بلڈنگ سے چلے جانے کے لیے کہتا ہے۔ اس دوران ان دونوں میں گرم مباحثہ ہوتا ہے۔ مکمل کانت، کریم اللہ سے ہم دردی کا اظہار کرتا ہے۔ کریم اللہ کی بیوی پنڈت رام دیال سے کہتی ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ کناڈا سے پنڈت جواہر لال نہرو کی ایما پر ہندوستان واپس آئی ہے۔ لیکن ان باتوں کا رام دیال پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بس وہ تو اس بات پر بضد ہے کہ ایک مسلمان کو میں اپنی بلڈنگ کرائے پر نہیں دیگا۔ وہ ان لوگوں کو اردو بازار، جامع مسجد کے چوک، خدا بخش کے محلے میں جانے کا مشورہ دیتا ہے۔ اس موقع پر کریم اللہ اور اس کی بیوی کا مکالمہ ملاحظہ کیجیے جس میں انھوں نے پنڈت رام دیال سے قومی یک جہتی، ملک کی ترقی، فلاح و بہبود کے لیے کچھ کر گزرنے کے جذبے کا اظہار کیا ہے:

”عورت: چار ہزار میل کی مسافت طے کر کے جب ہم اپنے وطن لوٹے تو ہمارے دل میں نئے ارادے تھے اور نئے دلو لے تھے۔ ہم ایک نئی لگن اور نیا حوصلہ لے کر آئے تھے۔ (شوہر کی طرف اشارہ کر کے) اگر یہ کسی طرح کینسر کا علاج دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ان کے علاج سے صرف مسلمانوں کا کینسر ٹھیک نہیں ہوگا۔ ان کے علاج سے تو ہندو کا ناسور بھی ٹھیک ہوگا اور سکھ کا اور عیسائی کا بھی، کیوں کہ علم اور سائنس اپنے حدود و اربعہ میں رنگ و نسل اور قوم کی کسی تفریق کو باقی نہیں رکھتے۔ تو پھر خدا کی اس زمین پر یہ تفریق کیوں کر باقی رکھتے ہو۔

کریم اللہ: پنڈت رام دیال! یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ ایک انسان چار اینٹوں کی چھت کے لیے اپنا نام، اپنا مذہب، اپنی تہذیب بدلنے کے لیے مجبور کر دیا جائے۔ اس سے زیادہ بھیا نک اور خوف ناک بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آخر میں تمھارا بھائی ہوں۔ اسی عالم خاک و باد سے میری نمود ہوئی ہے۔ اسی دیس کے آم اور املی کے پیڑ تلے میں تمھارے ساتھ کھیلا ہوں۔ اسی وطن میں میری جڑیں ہیں۔ میں یہی رہنا چاہتا ہوں۔ یہیں رہ کر اپنی مادر وطن کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ آخر میں جاؤں تو کہاں جاؤں۔“

ایجنٹ لچھو پشاوڑ کے ہندو لالہ آفتاب رائے اور اس کی شریک حیات اقبال دہی کے ساتھ

پنڈت رام دیال کی بلڈنگ میں کرائے پر کمرے کے واسطے لے کر آتا ہے۔ انھیں مکمل کچن کے سات بالائی کمرے پسند آ جاتے ہیں۔ لالہ آفتاب رائے کا نام اور لباس پٹھانوں جیسا ہے۔ وہ سر پر پٹھانوں جیسی گپڑی اور شلواریں پہنتا ہے۔ اس کی بول چال، خان پان میں بھی پٹھانیت کے دیدار جا بجا ہوتے ہیں۔ وہ سات بیویوں کا شوہر دھرم کرم کا پابند، شراب و کباب، قوالی اور مچرے کا شوقین ہے۔ جب پنڈت رام دیال کو یہ سب باتیں معلوم ہوتی ہیں تو وہ لالہ آفتاب رائے کو اپنے کمرے کرائے پر دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس بات پر مکمل کانت اور رام دیال میں تیکھی بحث ہوتی ہے۔ مکمل کانت اپنے والد کو سمجھاتا ہے کہ اب ہندوستان بدل رہا ہے ساتھ یہاں پر اب مذہبی پابندیاں بھی ٹوٹ رہی ہیں۔ اس لیے آپ اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے تمام مذاہب کے لوگوں کے لیے کھول دیجیے۔ مکمل کانت کی تمام حجتوں اور ویلیوں کا اثر رام دیال پر نہیں ہوتا۔

غضب تو تب ہو گیا جب مرزا ارشاد حسین اپنے بچپن کے دوست مہیش نرائن ماتھر عرف من میاں کو ایک فلیٹ دلانے کے لیے پنڈت رام دیال کے پاس لاتے ہیں۔ دراصل پنڈت مہیش نرائن ماتھر کی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی تھی اور انھیں اردو زبان و ادب سے بھی والہانہ شغف تھا۔ لوگ انھیں پیار سے من میاں پکارتے تھے۔ من میاں لکھنؤ سے دہلی میں تمباکو کا کاروبار کرنے آئے ہیں۔ اس لیے انھیں کرائے پر ایک عدد فلیٹ کی ضرورت ہے۔ لیکن من میاں رام دیال سے گفتگو اردو زبان میں کرتے ہیں۔ وہ بات بات پر خدا کی قسم کھاتے ہیں۔ رام دیال اردو زبان کے الفاظ سن کر یہ تصور کرتے ہیں کہ من میاں ہندو نہیں بلکہ مسلمان ہے۔ اس درمیان رام دیال کا بیٹا مکمل کانت دونوں کی گفتگو سننے کے بعد مداخلت کرتا ہے اور اپنے والد کی تنگ نظری اور کندہ نائراش ذہنیت پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے:

”آخر آپ اس بلڈنگ میں رکھیں گے تو کسے رکھیں گے؟ ایک بیوی والا مسلمان آپ نہیں رکھیں گے؟ اردو بولنے والا آپ کو پسند نہیں۔ قوالی سننے والا آپ کو پسند نہیں۔ ماس مچھی کھانے والا آپ نہیں چاہتے۔ پیاز اور لہسن والا آپ نہیں چاہتے۔ پنجابی کو آپ نہیں رکھیں گے۔ بنگالی کو آپ نہیں رکھیں گے۔ ملیالی کو آپ نہیں رکھیں گے۔ آخر آپ رکھیں گے تو کس کو رکھیں گے اس گھر میں۔ آدھا ہندوستان تو جات باہر کر دیا آپ نے!“

مکمل کچن میں مدراس سے ایک بال برہم چاری سیٹھ ویلیو رہنے کو آتا ہے۔ ویلیو سیٹھ نے اپنے ماتھے پر تنگ لگایا ہوا ہے۔ اسے اپنے مذہبی رسومات سے سچی محبت ہے۔ وہ مدراسی ہوٹل کا مالک ہے۔ اسے رام دیال کے تمام کمرے اپنے ملازمین کے لیے چاہئیں۔ رام دیال کے ملازمین میں سے ایک ملازم ویلیو سیٹھ کو پہچان لیتا ہے اور اس سے اپنی زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ جیسے ہی رام دیال کو معلوم ہوتا ہے کہ سیٹھ ویلیو ایک چمار کا بیٹا یعنی ہری جن ہے تو اس سے دو قدم پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنے نوکر سے کہتا ہے کہ اس کے لیے غسل خانے میں پانی بھر دے تاکہ وہ نہا کر پاک ہو جائے۔ ویلیو سیٹھ اسے لاکھ سمجھاتا

ہے کہ اس کے تمام باورچی براہمن ہیں وہ خود روز مندر جاتا ہے، اس نے کسی پرانی عورت کو ہاتھ نہیں لگایا ہے، وہ اپنے کام میں ایمان داری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ لیکن رام دیال اسے اپنی بلڈنگ میں رکھنے کو راضی نہیں ہے۔ اس بار بھی مکمل کانت اپنے والد سے خوب ناراض ہوتا ہے۔ اس موقع پر رام دیال، ویلیو سیٹھ اور مکمل کانت کے درمیان ہوئی گفتگو کو غور سے پڑھیے اور اندازہ لگائیے کہ قومی یک جہتی اور سماجی مساوات کی ہمیں کیوں اشد ضرورت ہے:

”رام دیال: ہری جن... میں نے اس کو چھو لیا ہے۔ اور اب میں گندا ہو گیا ہوں۔ اب مجھے اشانان کے لیے جانا پڑے گا۔

مکمل کانت: وہ خود کیسی گندگی ذہنیت ہوگی جو کسی انسان کو چھو لینے سے ناپاک ہو جاتی ہے اور ہر وقت نہانے پر آمادہ رہتی ہے۔ اس ذہنیت کو گنگا جی میں ڈبو دینا چاہیے۔ ہمیشہ کے لیے۔

رام دیال: بیٹے، کیا سمجھتے نہیں ہو۔ یہ آدمی ہری جن ہے۔ ہری جن یعنی اچھوت یعنی بچ، شودر۔

ویلیو: (ایک اُداس ہو کر گہری گٹھرتا سے) تم بچ بولتا ہو؟ ہاں میں ہری جن (سینے پر ہاتھ رکھ کر) میں ہری جن!! تمہارے گھر کی جھاڑو! سڑک کا پتھر! بجار کا قلی! ریل کا پھیلا! کارخانے کا ہات! کھیت کا بل! مگر میرے بغیر تم ایک دن جندہ نہیں رہ سکتا!!! پھر تم مجھ سے کیوں نفرت کرتا؟

مکمل کانت: اس لیے کہ تم ہمارے ظلم کی ڈھال، حلق کا لقمہ اور تہذیب کا آنسو بھی ہو۔ پانچ ہزار سال سے ہم تمہیں کھاتے، نگلتے اور اُگلنے چلے آ رہے ہیں۔ اگر ہم تمہارے احسان کا اقرار کر لیں تو تمہیں کھائیں کیسے؟

ویلیو: اس گھر کے اندر انسان رہتا ہے کہ مگر چھ! ھ

ڈراما دروازے کھول دو کا آخری منظر بہت ہی عبرت ناک ہے۔ کرشن چندر نے ڈرامے کے آخر میں اپنے فن کو عروج عطا کیا ہے۔ جب رام دیال کو ہارٹ اٹیک آتا ہے تو اس کی جان بچانے والا ایک عیسائی ڈاکٹر ایڈورڈ کوئیلو ہے۔ پہلے تو رام دیال نے عیسائی ہونے کے سبب ڈاکٹر ایڈورڈ کوئیلو کو کمرہ کرائے پر نہیں دیا۔ اس موقع پر رام دیال اور ڈاکٹر ایڈورڈ کے درمیان تیکھی بحث ہوتی ہے۔ اسی بحث میں رام دیال ہارٹ اٹیک کا شکار ہو جاتا ہے۔ مکمل کانت کی منت و سماجت کے باعث ڈاکٹر ایڈورڈ رام دیال کا علاج کرتا ہے۔ یہ علاج رام دیال کی دقیانوسی خیالات میں ایک نئی روح پھونک دیتا ہے اور رام دیال کی آنکھوں پر پڑا ہوا فرقہ پرستی کا پردہ ہٹ جاتا ہے۔ رام دیال کہتا ہے کہ جیسے ہر قوم اور ہر دیش کی آتما ہوتی ہے ویسے ہی ہر بلڈنگ کی بھی آتما ہوتی ہے۔ آتما نے اس سے کہا کہ اس راستے پر چل کر نہ تم کبھی منزل کو پہنچ سکو گے نہ میں، کیوں کہ یہ راستا پرانا ہو گیا ہے، یہ راستا کہیں نہیں جاتا۔ وہی لوگ آگے جاتے

ہیں جو اپنے گھر کے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔ اس لیے میں واپس آ گیا۔
 ڈراما ’دروازے کھول دو‘ کا اختتام بہت ہی خوش آئند ہے۔ کرشن چندر نے رام دیال کے
 منہ سے وہ مکالمے ادا کرائے ہیں جو قومی یک جہتی اور سماجی اخوت کے فروغ کے لیے سودمند اور کارآمد
 ثابت ہوتے ہیں۔ بارٹ اٹیک سے نجات ملنے کے بعد رام دیال کے ذہن میں اچانک تبدیلی آ جاتی
 ہے۔ اس نے تہیہ کیا کہ اب وہ کسی بھی مذہب کے آدمی کو مکمل کج میں رہنے کی اجازت بہ خوشی دے گا۔ رام
 دیال نے مکمل کج کی چابیوں کا گچھا اپنے بیٹے مکمل کانت کے سپرد کر دیا۔ ڈرامے کا سبق آموز اقتباس
 ملاحظہ کیجیے جس میں مذکورہ بالا باتیں رقم کی گئی ہیں:

”اس بلڈنگ کا نقشہ ایک بنگالی انجینئر نے بنایا ہے۔ راجستھانی مزدوروں نے
 اس میں اینٹیں لگائی ہیں۔ ملیالیوں نے اس کو رنگ روغن دیا ہے۔ پنجابی بڑھئی
 نے اس کے دروازے اور کھڑکیاں بنائی ہیں۔ عبدالستار نے اس میں موسیک کا
 فرش بچھایا ہے۔ ڈی سوز اس میں بجلی لائے گا۔ اور ڈیوڈ ابراہام پانی کے تل
 لگائے گا اور رستم نصر واں سنٹری فیننگ کرے گا۔ یہ گھر جسے ہندو، مسلمان، سکھ
 ، عیسائی، پارسی، یہودی نے مل کر بنایا ہے اگر وہ سب مل کر اس گھر میں نہیں
 رہیں گے تو یہ گھر کیسے آباد ہوگا اور کیسے ترقی کرے گا اور کیسے اس کا جھنڈا آسمان
 پر بلند ہوگا۔ اس لیے میں واپس آ گیا ہوں اور تمہیں یہ چاہیاں دیتا ہوں۔ مکمل!
 اب اس گھر کے سارے دروازے کھول دو۔ اور اس کے سارے بیٹوں کا بلا
 لو۔ کریم اللہ سائنس داں کو اور آفتاب رائے کو اور رنگا چاری کو ایڈورڈ کو نیلو کو اور
 سردار گردیال سنگھ کو اور جس کسی نے ایک اینٹ بھی اس گھر کو دی ہے یہ گھر
 اسی کا ہے اور جس کسی اس کے صحن میں کھڑے ہو کر انسان اور اس کی امید اور
 اس کی حسرت اور اس کے دکھ اور اس کی مسرت اور مستقبل سے پیار کیا ہے یہ گھر
 اس کا۔ اب یہ گھر اکیلے پنڈت رام دیال کا نہیں، یہ گھر تم سب کا ہے۔“

کرشن چندر نے ڈراما ’دروازے کھول دو‘ میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا پیارا ملک
 ہندوستان بھی ایک گھر کی مانند ہے۔ اس میں بسنے والی تمام قومیں پھولوں کا حسین گل دستہ ہیں۔ ہندوستان کی
 ترقی میں یہاں کے لوگوں کا برابر کا حصہ ہے۔ کرشن چندر نے اس ڈرامے کے ذریعے بھائی چارے کے
 پیغام کو عام کیا ہے۔ پنڈت رام دیال کے دل و دماغ سے تعصب و تفریق کی گردوغبار کو ایک ڈاکٹر کے
 ذریعے صاف کرایا گیا۔ کسی مرتے ہوئے انسان کی جان بچانا ڈاکٹر کا اولین فرض ہوتا ہے۔ کرشن چندر
 نے ڈاکٹر کریم اللہ اور ڈاکٹر ایڈورڈ کو نیلو کے کرداروں سے یہ بات کہلوائی ہے کہ ڈاکٹر کسی مذہب اور کسی
 خاص طبقے کا نمائندہ نہیں ہوتا وہ ملک کی امانت ہوتا ہے۔ ان کا پیشہ ایک مقدس پیشہ ہوتا ہے۔ اگر ڈاکٹر
 کے در پر دشمن بھی علاج کرانے جائے گا تو اسے دشمنی طاق پر رکھ کر اس کا علاج کرنا ہوگا۔ پنڈت رام

دیال کا علاج ایک عیسائی ڈاکٹر کرتا ہے جس کے چھوٹے سے وہ ناپاک ہو جاتا ہے۔ اس ڈرامے کو لکھے ہوئے پچاس سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن دورِ حاضر میں اس ڈرامے کی معنویت و افادیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ اگر ہم دورِ حاضر میں ملک کے حالات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی تفریق اور نفرت نے سماج کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ جس وجہ سے قومی یک جہتی اور قومی سالمیت کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ کرشن چندر نے آزادی سے پہلے کا بھی ہندوستان دیکھا تھا اور آزادی کے بعد کا بھی۔ انھوں نے فرقہ وارانہ نظریات کی ہمیشہ اپنے فکشن میں تردید کی ہے۔ انھوں نے ہم وحشی ہیں، پٹنیا اور ایکسپریس، امرتسر آزادی سے پہلے، امرتسر آزادی کے بعد وغیرہ افسانوں میں سماج کو آئینہ دکھایا ہے۔

کرشن چندر نے اس ڈرامے میں قومی مفاد کو فوقیت دی ہے۔ ان کی نظر میں ہندوستان کی ترقی کا اصل ہیرو وہ شخص ہے جو اپنے رہنماؤں کی ایک اپیل پر اپنے اچھے خاصے کیرئیر کو خیر باد کہہ کر واپس ہندوستان لوٹ آیا ہے۔ کرشن چندر کو ایسے لوگوں سے محبت اور انسیت ہے جو ہندو ہو کر اردو زبان سے رغبت رکھتے ہیں۔ ”دروازے کھول دو“ کے کردار ہمیشہ نرائن ماتھر میں ہمیں کرشن چندر کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جب 7 جولائی 1961 کو کرشن چندر کا نکاح سلمیٰ صدیقی سے ہوا تو انھوں نے اپنا نام کرشن چندر سے بدل کر ”وقار ملک“ رکھا۔ اس ڈرامے میں صرف مذہبی دیواریں ہی منہدم نہیں کی گئیں بلکہ علاقائیت اور لسانی دیواروں کو بھی دھکا دیا گیا ہے۔ کرشن چندر کی نظر میں ہندوستان کا قومی بھائی چارہ ہماری سب سے بڑی طاقت، پہچان اور ورثہ ہے۔ وہ اس باریک اور انہم نکتے کو سمجھاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”تمام کلچر، مذہبی، لسانی اور قومیاتی اختلافات کے باوجود، اس ملک میں قومی یگانگت اور وحدت کا ایک گہرا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ احساس اوپر کی مختلف لہروں کی بل چل اور شور و غل کے باوجود اندر سے سمندر کی طرح گہرا اور شانت اور اتھاہ ہے۔ یہ احساس کہ ہم بنگالی اور ملیالی ہونے کے باوجود ہندوستانی ہیں۔ ہندو اور مسلمان ہونے کے باوجود ہندوستانی ہیں۔ تامل اور مراٹھی میں گفتگو کرنے کے باوجود ہندوستانی ہیں۔ بھاگنڑا اور مئی پوری ناپنے کے باوجود ہندوستانی ہیں۔ بلکہ ان تمام عناصر کو لے کر ہندوستانی ہیں اور ہندوستان وہ ہے جس کی تشکیل میں ان تمام عناصر نے ایک اہم خوب صورت کردار کیا ہے۔ ہندوستان صرف دہلی نہیں ہے، وہ مدراس بھی ہے۔ وہ صرف مدورا کا مندر نہیں ہے، وہ دہلی کی جامع مسجد بھی ہے۔ وہ صرف دھرو پد نہیں، خیال بھی ہے۔ وہ صرف مہاکوی کالی داس ہی نہیں، کبیر، غالب، ٹیگور، بھارتی اور ولا تھول بھی ہے۔ یہ احساس یگانگت و یکجائی ہندوستان کے گوشے گوشے میں موجود

ہے۔“^۸

بہر کیف! کرشن چندر نے بھلے ہی اس ڈرامے کو آزادی کے پندرہ سال بعد لکھا ہو لیکن اس کی قرأت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ڈرامے کی دورِ حاضر میں زیادہ معنویت ہے۔ اس ڈرامے میں کرشن چندر نے اشتراکیت کا پرچار نہیں کیا بلکہ قومی یک جہتی، سماجی ہم آہنگی اور سیکولر خیالات کو فروغ دینے کے علاوہ نفرتی خیالات و نظریات پر شدید وار کیا ہے۔ یہ ڈراما بیسویں صدی کی آخری چار دہائیوں اور اکیسویں صدی کی ابتدائی ربع صدی کے سماجی حالات کی صحیح ترجمانی اور نمایندگی کرتا ہے۔ کرشن چندر نے ”دروازے کھول دو“ میں اپنے تمام تجربات و مشاہدات کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ انھوں نے اس ڈرامے کے ذریعے معاشرے میں پھیلی نفرت کو محبت سے مٹانے کا درس دیا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ کوئی عام ڈراما نہیں بلکہ اسے پڑھ کر دل میں نفرتی جذبات کو جڑ سے ختم کرنے کا سلاطم ٹھائے مارتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ڈرامے کو اسکول، کالج اور یونیورسٹی نصاب میں ضرور شامل کیا جانا چاہیے تاکہ بچوں کو ابتدا سے ہی قومی بھائی چارے کو فروغ دینے والے ادب سے ہم کنار ہونے کا موقع ملے۔ اس طرح کے اقدامات سے ہم نئی نسل کے ذریعے ایک صالح معاشرے کی بنیادوں میں سیکولر مزاجی کا بیج بو کر بند دروازوں کے پٹوں کو ہمیشہ کے لیے کھول سکتے ہیں۔ یہی اس ڈرامے کی کامیابی کا راز اور معنویت کا مسلم ثبوت ثابت ہو سکتا ہے۔

حواشی:

- ۱۔ ڈراما ’دروازے کھول دو‘، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اکتوبر 2013ء، ص 58
- ۲۔ ایضاً، ص 59
- ۳۔ ایضاً، ص 14
- ۴۔ ایضاً، ص 19
- ۵۔ ایضاً، ص 35
- ۶۔ ایضاً، ص 48-49
- ۷۔ کرشن چندر (مونیوگراف) ہندو کشور و کریم، اردو اکادمی، دہلی، 2014ء، ص 42
- ۸۔ ایضاً، ص 63

شورش کاشمیری کی صحافت: شخصی اسلوب اور فکری جہات کا تحقیقی مطالعہ

شورش کاشمیری نے صحافت کی باضابطہ کوئی پڑھائی نہیں کی بلکہ انہوں نے صحافت کے بارے میں جو کچھ سیکھا مطالعہ اور ان صحافیوں کی صحبت سے سیکھا، جن سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ شورش کاشمیری کے دل میں صحافت کا شوق ”مولوی سراج الدین احمد“ کے ”زمیندار“، لاہور [1930-1945]، اخبار سے پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں آغا شورش کاشمیری خود رقم طراز ہیں:

”اخبار نویسی کا ذوق تو ”زمیندار“ سے پیدا ہوا میں نے صحافت میں جو کچھ سیکھا۔ کسی نے میری ذاتی رہنمائی نہیں کی۔ بہر حال میری طبیعت پر جن اخبار نویسوں نے شخصی روابط کی بنا پر گہرا اثر ڈالا ان میں ظفر علی خان سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ ہر نوعی مطالعہ کی فہرست کی ضرورت کا احساس مجھے مولانا غلام رسول مہر کی صحبت سے ہوا۔ مہاشہ کرشن سے بے نیازی سیکھی۔ سالک سے محفل آرائی ابوالکلام نے مجھ میں استقامت پیدا کی۔ حمید نظامی نے خود اعتمادی، صحافت کی عمر چھتیس سال ہو چکی ہے لیکن کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا اس نے میرے قلم کا ایک شوہنہ بھی خرید لیا ہوا۔“

اس اقتباس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ شورش کو صحافت کی طرف لانے میں مولانا ظفر علی خان کا اہم رول رہا ہے۔ ان کو اخبار نویسی کا ذوق ”زمیندار“ سے پیدا ہوا، اور انہوں نے صحافت میں جو کچھ سیکھا، وہ ان کے ذاتی تجربات کا نتیجہ تھا، کسی نے ان کی رہنمائی نہیں کی۔ تاہم، شخصی روابط کے ذریعے جن شخصیات نے ان کی صحافت پر گہرا اثر ڈالا، ان میں ظفر علی خان نمایاں ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے مطالعے کی اہمیت کا احساس دلایا، مہاشہ کرشن نے بے نیازی سکھائی، سالک نے محفل آرائی کا فن دیا، ابوالکلام نے استقامت پیدا کی، اور حمید نظامی نے خود اعتمادی بخشی۔ ۶۳ سالہ صحافتی زندگی میں ان کا قلم کوئی خرید نہ سکا، اور یہی شورش کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ شورش کاشمیری نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ ”سیاست“ سے کیا۔ مگر صحافت کا باضابطہ آغاز شورش نے ”زمیندار“ اخبار سے کیا۔ اس کے بارے میں وہ رقم طراز ہے:

”پہلے میں ”سیاست“ میں لکھتا رہا لیکن باقاعدہ آغاز ”زمیندار“ سے کیا۔ علامہ

تاجور نجیب آبادی کے ”شاہکار“ کا ایڈیٹر رہا۔ پھر روزنامہ ”آزاد“ کا مدیر ہو گیا۔ حافظ علی بہادر اپنے اخبار ”الہلال“ بمبئی کی ایڈیٹری پر اصرار کرتے رہے، لاہور کب چھوٹا تھا، یہاں سے افتتاحیہ لکھ کر بھیجتا رہا۔^۲

علاوہ ازیں تاجور نجیب آبادی کے رسالہ ”شاہکار“، مولانا ابوالکلام آزاد کا ”الہلال“ اور مجلس احرار کے اخبار ”آزاد“ سے وابستہ رہے اور ان اخباروں میں سے وہ چند کے مدیر بھی رہے۔

شورش کاشمیری صحافت کی پرانی روایت کے علمبردار تھے اور ان کی صحافت کو شخصی صحافت، تنہا نگار صحافت یا سولو جرنلزم کہا جاسکتا ہے۔ اس بات کا مطلب یہ ہے کہ ان کا تعلق اس صحافتی روایت سے تھا جس میں صحافی کی اپنی شخصیت، تجربات، خیالات اور مشاہدات اس کی تحریر پر نمایاں اثر ڈالتے ہیں۔ وہ جدید دور کے بڑے میڈیا اداروں یا مشینی صحافت کے نمائندہ نہیں تھے بلکہ ان کی صحافت زیادہ ذاتی نوعیت کی تھی، جہاں ان کا اپنا تجربہ، ان کا اصولی نقطہ نظر اور ان کی حقیقت پسندی نمایاں ہوتی تھی۔ انہیں صحافت کی پرانی روایت کا علمبردار اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ تحقیق، سچائی کی تلاش، دیانت داری اور ہر قسم کے دباؤ سے آزادی جیسے بنیادی اصولوں پر کاربند تھے۔ ان کی تحریریں ان کے ذاتی تجربات پر مبنی ضرور ہوتیں، مگر ان میں ہمیشہ سچائی اور عوامی مفاد کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اس دور میں میڈیا کا دائرہ محدود تھا اور صحافت کا مقصد عوامی شعور کو اجاگر کرنا تھا، اسی لیے شورش کاشمیری کی صحافت کو ”پرانا“ یا کلاسیکی انداز کی صحافت کہا جاتا ہے۔ ان کی صحافت کو شخصی یا سولو جرنلزم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے مضامین اور کالم مکمل طور پر خود لکھتے تھے اور اسی بنیاد پر اپنی ذاتی رائے اور تجزیہ پیش کرتے تھے۔ وہ کسی ٹیم یا ادارے کے تابع نہیں تھے بلکہ ایک منفرد صحافتی آواز کے طور پر سامنے آئے۔ اس طرز صحافت میں صحافی اپنی انفرادی سوچ اور تجربے کے ذریعے معاشرتی، سیاسی اور قومی مسائل کو بیان کرتا ہے اور یہی انداز شورش کاشمیری کے صحافتی اسلوب کی بنیادی خصوصیت تھا۔ ان کی جرات، انفرادی تجزیہ اور حقیقت پسندی ان کی شخصیت اور ان کی صحافت دونوں کو نمایاں کرتی ہے۔ یوں شورش کاشمیری نے نہ صرف پرانی صحافتی روایت کو زندہ رکھا بلکہ ایک ایسا انفرادی اسلوب بھی متعارف کرایا جس میں ذاتی نقطہ نظر کو مرکزی مقام حاصل تھا۔ صحافت میں ”شخصی صحافت“ کے لفظ کا استعمال مسکین حجازی نے کیا۔ وہ اپنی کتاب صحافتی زبان میں شخصی صحافت کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

”پہلے نامور اہل علم اور اہل قلم اہم مقاصد کی تکمیل کے لئے اخبار جاری کرتے تھے۔ اور اخباروں میں ان کی اپنی تحریروں ہی کو غالب حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ اگر کسی صحافی کی شخصیت کو اخبار سے علیحدہ کر دیا جاتا تو اخبار بے روح اور بے اثر ہو جاتا کم و بیش ہر ملک میں شخصی صحافت کا دور دورہ رہا ہے۔ ہمارے ہاں محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت کا نمونہ ہے۔ اس قسم کی صحافت میں ایسی انفرادیت ہوتی تھی جو ادب کے لئے مخصوص

ہے۔^۳

اب اگر شورش کی صحافت کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ آغا صاحب کی صحافت کو شخصی صحافت قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ ان کے ہفتہ روزہ اخبار چٹان میں ان کی شخصیت کی گہری چھاپ نمایاں تھی۔ انہوں نے یہ اخبار کسی تجارتی مقصد یا مالی فائدے کے لیے نہیں نکالا تھا، بلکہ ان کا بنیادی مقصد احیائے اسلام کی تحریک کو فروغ دینا تھا۔ چٹان میں شائع ہونے والی زیادہ تر تحریریں خود شورش کی لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔

جب ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے تنہا نگار صحافت پر لکھا تو انہوں نے اس کی مثالیں پیش کرتے ہوئے چند اہم رسائل و اخبارات کا ذکر کیا، جن میں گاندھی جی کا ہفتہ روزہ "ہری جن"، خوبہ حسن نظامی کا "منادی"، کمیونسٹ رہنما ایم۔ ایس۔ رائے کا "انڈین نٹ انڈیا"، علامہ عنایت اللہ المشرقی کا "الاصلاح" اور شورش کا شمیری کا "چٹان" شامل تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اسی مقام پر شورش کے متعلق لکھا کہ:

مرحوم ادارے بھی لکھتے۔ شذرات بھی قلم بند کرتے۔ نظمیں بھی دیتے۔ مختلف قلمی ناموں سے کالم نویسی بھی فرماتے۔ ماضی کی یادوں پر مضامین بھی لکھتے اور گہرے مطالعہ کے دوران میں جو اقتباسات دلچسپ نظر آتے وہ بھی درج کر

دیتے۔^۴

شورش کا شمیری کی صحافت ایک ہمہ جہت اور وسیع میدانِ فکری تھی، جہاں الفاظ نہ صرف خبر بن کر کاغذ پر اترتے بلکہ جذبات کی آگ میں تپ کر تلوار کی کاٹ بھی رکھتے۔ ان کی تحریر میں ایک ایسا باکپن تھا کہ ادارے لکھتے تو گویا ایک منشور ترتیب دے رہے ہوں، شذرات قلم بند کرتے تو جیسے کسی محفل میں برجستہ جملے اچھال رہے ہوں۔

یہی رنگ ان کی شاعری میں بھی جھلکتا تھا۔ وہ صرف شاعر نہ تھے، بلکہ ایک مصلح بھی تھے جو اپنے مصرعوں میں سماج کی نبض ٹٹول کر اس کا علاج تجویز کرتے۔ مختلف قلمی ناموں سے کالم نویسی فرماتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ایک ہی فرد کئی زاویوں سے حقیقت کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ ماضی کی یادوں پر مضامین لکھتے تو تاریخ گویا کسی چشم دید گواہ کے لبوں سے بیان ہو رہی ہو۔

ان کا مطالعہ وسیع تھا، اور جب کسی کتاب میں کوئی اقتباس دل کو چھو جاتا تو اسے صرف نقل نہ کرتے بلکہ اپنے مخصوص اسلوب میں اسے مزید نکھار دیتے۔ ان کے لیے صحافت محض خبر رسانی نہ تھی بلکہ ایک فکری تحریک تھی، ایک جہادِ قلم تھا، ایک ایسا ادب تھا جو نہ صرف دل و دماغ کو جھنجھوڑے بلکہ روح کو بھی جلا بخشنے۔

شورش کا شمیری کا طرزِ تحریر درحقیقت وہ چراغ تھا جس کی روشنی میں الفاظ نہ صرف جملے بننے بلکہ ایک عہد کا نوحہ بھی رقم کرتے اور ایک نئی صبح کی نوید بھی سناتے۔ ان کی صحافت، ان کی نثر، ان کی

شاعری سبھی اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ الفاظ کے سلطان تھے، جنہوں نے صحافت کو محض پیشہ نہیں، بلکہ ایک عظیم مشن کی صورت میں اپنایا۔

ہفت روزہ چٹان ایک ایسا جریدہ تھا جس کی ہر اشاعت میں ایک منفرد تحریری رنگ جھلکتا تھا، اور اس رنگ کی سب سے نمایاں جھلک شورش کاشمیری کے قلم سے پھوٹی تھی۔ ہر شمارہ جیسے شورش کی فکر، ان کی جولانی طبع اور ان کے بے باک قلم کی عکاسی کرتا تھا۔ اگر کسی کو اس بات پر شبہ ہو کہ چٹان کے ہر شمارے میں زیادہ تر تحریریں شورش کاشمیری کی ہی ہوا کرتی تھیں تو اسے محض ایک شمارہ دیکھ لینا کافی ہوگا۔ الفاظ، خیالات، اندازِ بیاں سب میں شورش کی مہک نمایاں ہوتی تھی۔

یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ جب شورش کاشمیری جیل میں ہوتے تھے، تب بھی چٹان میں ان کی تحریریں چھپتی رہتی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ قید و بند بھی ان کی فکری پرواز کو روک نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک ایسے قلندرِ صفت صحافی تھے جن کے خیالات کی ندرت اور الفاظ کی جادوگری ہر شمارے میں نمایاں دکھائی دیتی تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ ایک تنہا شخص اس قدر ضخیم، جاندار اور بے خوف صحافت کو کیسے نبھاتا تھا؟ ان کے قلم کی روانی، سوچ کی وسعت اور الفاظ کی کاٹ نے انہیں دیگر صحافیوں سے ممتاز کر دیا تھا۔

شورش کی زندگی میں اگرچہ چٹان کے صفحات پر دیگر قابل اور ممتاز لکھاریوں کی تحریریں بھی شامل ہوتی تھیں، مگر جریدے کا اصل رنگ و روپ شورش کی تحریروں سے ہی مکمل ہوتا تھا۔ ان کی تحریریں کسی صحافیانہ معمول کی تکمیل نہیں ہوتی تھیں، بلکہ وہ ایک فکری تحریک، ایک نظریاتی جہاد اور ایک قومی شعور کی بیداری کا ذریعہ تھیں۔ ان کے الفاظ میں بلا کی کشش تھی، ایسا لگتا تھا کہ وہ محض سیاسی سے نہیں بلکہ اپنے خونِ جگر سے لفظ تراشتے تھے۔

مسیحود شورش نے بھی چٹان کی اسی روایت کو برقرار رکھا اور آج بھی چٹان کے صفحات پر شورش کاشمیری کی کوئی نہ کوئی تحریر شامل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شورش کی تحریروں کی معنویت اور ان کی گونج آج بھی اسی شدت سے قائم ہے۔ چٹان محض ایک ہفت روزہ جریدہ نہیں تھا بلکہ ایک تحریک، ایک نظریہ اور ایک عہد کی کہانی تھا، جس کا سب سے مضبوط اور پراثر حوالہ شورش کاشمیری کا قلم تھا۔

یہی وہ پہلو تھا جس نے قارئین کو ورطہٴ حیرت میں ڈال رکھا تھا کہ آخر ایک شخص اتنا زیادہ، اتنا عمدہ اور اتنا با مقصد کیسے لکھ سکتا ہے؟ ان کے الفاظ محض خیالات نہیں تھے، وہ ایک مشن تھا، ایک جہاد تھا، ایک تحریک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شورش کاشمیری کا نام آج بھی صحافت کے درخشندہ ستاروں میں چمک رہا ہے، اور چٹان کی ورق گردانی کرنے والے آج بھی ان کی تحریروں میں وہی قوت، وہی سچائی اور وہی بے باکی پاتے ہیں، جو انہیں ماضی میں حاصل تھی۔

شورش کاشمیری کی صحافت کو ”مجلاقی صحافت“ کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے کیونکہ ہفتہ وار یا روزنامہ اخبار کی صحافت بھی اسی قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اپنی کتاب ”فن

صحافت "میں مجلاتی صحافت کے لیے جن اوصاف کا ہونا ضروری ہے، ان کا ذکر یوں کیا ہے:

اعلیٰ ذہنی تہذیب و تحسین، اعلیٰ فنی تربیت اور اخلاقی تعلیم
اعلیٰ ذہنی تہذیب و تحسین سے مراد یہ ہے کہ علم و ادب عمرانی علوم میں گہرا مطالعہ ہوا اور ایک
ادھ غیر ملکی زبان میں بھی دسترس حاصل ہو۔ اعلیٰ فنی تربیت میں یہ چیزیں شامل ہیں۔ کسی مواد کو نئے قالب
میں ڈھالنے اور اختصار سے پیش کرنے کا فن طباعت کے مختلف طریقوں سے آگہی۔ فوٹو گرافی میں
دسترس، طباعت کے فن سے واقفیت:

”اخلاقی تعلیم میں عوامی بہبود اور صحافتی اخلاقیات سے واقفیت کے عناصر شامل

ہیں۔ ۵

اس کے علاوہ، انہوں نے کچھ عمومی اور خصوصی اوصاف کا ذکر کیا ہے، جن میں قارئین کی نفیس
شناسی، قوت فیصلہ، تصور کی صلاحیت، مقررہ وقت پر کام کرنے کی قابلیت، لکھنے والوں سے رابطہ، ابلاغ کا
فن، زبان پر عبور، ڈیزائن کے اصولوں سے آگاہی اور پروڈکشن کے عمل سے واقفیت شامل ہیں۔
ان تمام اوصاف پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کچھ کا تعلق فن صحافت سے
ہے، جیسے ڈیزائن، پروڈکشن اور طباعت کے فن سے آگاہی، جبکہ کچھ اوصاف ایڈیٹر کی ان صلاحیتوں سے
متعلق ہیں جو درحقیقت اسے ایک بہترین مدیر بناتی ہیں۔ مثلاً اعلیٰ ذہنی تہذیب، علم و ادب اور دیگر عمرانی
علوم سے آگاہی، زبان پر عبور اور ابلاغ کا فن وغیرہ۔

شورش کاشمیری کی مجلاتی صحافت ایک منفرد اور گہری نوعیت کی صحافت تھی، جس میں نہ صرف
سیاسی و سماجی مسائل پر تفصیلی گفتگو کی جاتی تھی، بلکہ ان مسائل کے پس منظر، اثرات، اور ان کے ممکنہ نتائج
پر بھی سلیقے سے تجزیہ کیا جاتا تھا۔ ان کا صحافتی اسلوب زیادہ تر تحقیقی، فلسفیانہ اور ادبی ہوتا تھا، جو قارئین کو
سوچنے پر مجبور کرتا تھا۔

شورش کاشمیری نے مجلاتی صحافت میں اسلوب کی تخلیقی نوعیت کو متعارف کرایا، جس میں
خبریں دینے کے بجائے ان پر تبصرے اور گہرے تجزیے کیے جاتے تھے۔ ان کی تحریریں محض معلوماتی نہیں
ہوتی تھیں، بلکہ وہ قارئین کو فکری سطح پر متاثر کرتی تھیں۔ انہوں نے صحافت کو محض خبر دینے کی ایک مشین
سے آگے بڑھا کر ایک آراء اور تجزیے کا ذریعہ بنایا۔

شورش کاشمیری کی تحریروں میں ادب، تاریخ اور فلسفہ کا انوکھا امتزاج پایا جاتا تھا۔ ان کے
کالمز اور مضامین نے پاکستانی صحافت میں ایک نیا رجحان پیدا کیا، جس میں خبروں کے پس پردہ کی
کہانیوں پر زیادہ زور دیا گیا۔ ان کا یہ اسلوب آج بھی مجلاتی صحافت میں ایک معیار کی حیثیت رکھتا ہے۔
شورش کاشمیری کی صحافتی تربیت کا سہرا بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان کے سر جاتا ہے۔
”زمیندار“ کا دفتر محض ایک اخبار کا ادارہ نہیں تھا بلکہ صحافت کا ایک ایسا تربیتی مرکز تھا جہاں سے کئی نامور
صحافیوں نے اپنی فنی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔

خود دشواری نے بھی مختلف مواقع پر اس فرق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آج کے مدینا اہل یاکم تر ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ صحافتی اقدار میں تبدیلی آچکی

مدیر سے لے کر اخبار فروخت کرنے والے تک، سب کا بنیادی ہدف اشاعت کو بڑھانا ہوتا ہے۔ مدیر کا کام اکثر پس پردہ رہ کر ہوتا ہے، وہ ایک نغمہ سرا کی مانند ہوتا ہے جس کی آواز تو سنائی دیتی ہے، مگر اس کی شخصیت، کردار اور افعال زیادہ تر نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اخباری رائے میں اثر پذیری کا عنصر کم ہو جاتا ہے۔

”اخبارات اپنی اپنی ذاتی پالیسیوں اور پارٹی کے پابندیوں کے علاوہ بھی دوسرے کئی افراد و اشخاص اور انجمنوں کے زیر اثر آ جاتے ہیں۔ صاحب ثروت اور باختیار لوگ اپنے نظریات چھپوا کر انفرادی یا اجتماعی سطح پر لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اخبارات کی اپنی مالی مصالحتیں ہوتی ہیں۔ کہ وہ غیر جانب داری اور صاف گوئی کا نعرہ لگاتے ہوئے بھی بعض حالات میں

بے شک، پرانے زمانے کے صحافی بھی اپنے نظریات کو فروغ دینے کے لیے پروپیگنڈا کرتے تھے، مگر ان کا پروپیگنڈا قومی ترقی اور فکری بیداری پر مبنی ہوتا تھا۔ اس دور کے صحافی محض خبر رسانی تک محدود نہیں تھے بلکہ سیاسی رہنما بھی ہوتے تھے، جن کا مقصد صرف صحافتی سرگرمیوں تک محدود نہیں تھا بلکہ عملی سیاست میں بھی اس کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی ترجیح دولت کمانا نہیں بلکہ اپنے نظریات کی ترویج اور قومی خدمت تھی، اسی لیے وہ کسی ادارے یا فرد کے زیر اثر نہیں ہوتے تھے۔ وہ ہر بات آزادی سے کہنے کا حوصلہ رکھتے تھے، چاہے اس کے نتیجے میں انہیں نقصانات ہی کیوں نہ اٹھانے پڑیں، لیکن وہ اپنے نظریات کو کسی مصلحت یا مفاد پر قربان نہیں کرتے تھے۔

مزید برآں، ان کے اخبار میں ان کی شخصیت کی جھلک نمایاں ہوتی تھی، اور قارئین بخوبی جانتے تھے کہ کون سی بات کس مقدمہ کے تحت کہی جا رہی ہے۔ یہی سیاقی نہیں عوام میں مقبول بناتی تھی، اور

ان کے قارئین ان کے نظریات کے حامی اور وفادار بن جاتے تھے۔ ان کی بے باکی اور حق گوئی تحریکوں کو جنم دیتی اور رائے عامہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی تھی۔ مقصد کی یہی لگن، جرات، بے غرضی اور اخلاقی استقامت انہیں عوام میں غیر معمولی مقبولیت بخشتی تھی۔

اسی مضبوط عوامی حمایت کے بل پر یہ صحافی، جابر حکمرانوں کے سامنے ڈٹ جاتے تھے۔ آغا شورش کاشمیری نے صحافت کا یہ انداز اور نظریہ مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالکلام آزاد سے حاصل کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے دور کے اخباری رجحانات پر نکتہ چینی کرتے رہے اور آزادی اظہار پر کسی قسم کی مصلحت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ اپنے ہم عصروں سے سوال کرتے تھے کہ:

”کیا قلم کا پیشہ بھی عام پیشوں کی طرح ہے؟ کیا ایک جج سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ سرکاری خزانے سے تنخواہ پانے کے باعث اس کا ہر فیصلہ حکومت کی منشا کے مطابق ہو اور قانون و انصاف کو سرکار کی منشا کے تابع کر دے۔ ظاہر ہے کہ بالکل نہیں! اگر ایک جج انصاف کو اغراض و مفادات کے ہاتھ ہبہ کر دیتا ہے تو نہ صرف وہ خدا و ضمیر کے نزدیک مجرم ہے بلکہ عاقبت میں بھی اس کے لئے سخت گرفت ہے وہ انسانی سوسائٹی کو اپنے فیصلوں سے ان لوگوں کے حوالے کرتا ہے۔ جن کا وجود جرم و معصیت کا سرچشمہ ہے۔ خدا نے انسانوں کو بعض فضائل و ارمغان کے طور پر دیئے ہیں۔ کفران نعمت کا لفظ تو آپ نے سنا ہوگا۔

افسوس کہ قلم کاروں کی جدید پوداں سے نا آشنا ہے۔^۹

یہ اقتباس نہ صرف ہمیں نئے اردو صحافیوں کے طرزِ عمل سے روشناس کراتا ہے بلکہ اس حقیقت کو بھی اجاگر کرتا ہے کہ شورش کاشمیری کی نظر میں مدیر کی حیثیت ایک منصف کی مانند ہے، جس پر ہر حال میں عدل و انصاف لازم ہے، چاہے وہ کسی حکومتی ادارے سے ہی کیوں نہ وابستہ ہو۔ ان کے نزدیک صحافت محض ایک پیشہ نہیں، بلکہ قدرت کا عطا کردہ ایک انمول تحفہ ہے، جس کا حساب آخرت میں بھی دینا ہوگا۔ اسی لیے مدیر کو اپنی اس عظیم ذمہ داری سے غافل نہیں ہونا چاہیے، کہ اس غفلت کا شمار گناہ میں ہوگا۔ مگر افسوس کہ آج کی صحافت اسی نیکی کو ضائع کرنے کی راہ پر گامزن ہے، اور اس کے مقدس منصب کو مصلحتوں کی نذر کیا جا رہا ہے۔ شورش کاشمیری موجودہ دور کے صحافیوں سے نالاں ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ:

”صحافی جو رواستبداد کے ہیں پردہ دار اب تک۔“^{۱۰}

آغا شورش کاشمیری کے نزدیک صحافی جو رواستبداد کے اس لئے پردہ دار ہیں کہ پاکستان کی صحافت کی تاریخ میں خوشامد اور اقتدار پرستی راہ پا گئی ہے۔ شورش کاشمیری پاکستان کی صحافت میں ان عناصر کی نشاندہی اس طرح کرتے ہیں:

”ہمارے یہاں قومی زندگی میں ایک چیز بڑی تیزی سے داخل ہو کر ایک قسم کا

آرٹ ہوگئی ہے کہ اس تیزی سے انسان جو تے نہیں اتارتا جس پھرتی سے ہمارے ہاں کے بعض بلکہ بیشتر اخبار کا تبادلہ لیتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو طاقت کے افق پر طلوع ہوتا ہے ان کے لئے مرجع ارادت ہو جاتا۔ اور ہر وہ شخص جو ڈوب جائے ان کے ہاں معتب و مغضوب ہونے میں دیر نہیں لگتی، توازن ان کے ہاں بالکل نہیں، یہی وجہ ہے کہ ملک و قوم کے بعض سانحوں میں ملک کے بیشتر بلکہ ۸۹ فیصد اخباروں کا بھی حصہ ہے اور وہ ان حادثوں کے ظہور میں برابر شریک ہیں۔ اس ذہنیت کے قلیل الاشاعت و کثیر الاشاعت روزناموں نے کس دور میں اپنے علاقوں میں خوشامد کے چراغ نہیں جلائے؟ کس دور کی حکومت سے سربراہ سے ان کا ناٹہ نہیں رہا۔ ۱۱

یہ بات صرف آغا شورش کاشمیری ہی کہہ سکتے ہیں، اور شاید وہ ایسا کہنے میں حق بجانب بھی ہیں، کیونکہ ان کے دامن پر خوشامد یا اقتدار پرستی کا کوئی داغ نہیں۔ انہوں نے ہر دور میں حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سچائی بیان کی، چاہے اس کے نتیجے میں انہیں حکومتی عتاب کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑا۔ مگر حق گوئی اور بے باکی سے انہوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اور یہی وہ جو ہر ہے جو آج تک پاکستان میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے نہیں آیا۔

پاکستان میں جمہوریت ہمیشہ نام کی رہی ہے، جبکہ حقیقت میں یہ "منتخب آمریت" کا ہی ایک روپ تھی۔ اس کی سب سے بڑی دلیل ہمارے ہاں بننے والے دساتیر ہیں، جن میں ہر دور میں اختیارات کا محور و مرکز ایک ہی فرد کو بنایا گیا، چاہے وہ عوام کا منتخب نمائندہ ہی کیوں نہ ہو۔ مگر طاقت کا ایک نقطے پر ارتکاز، جمہوری حکومت کو بھی آمریت کے دائرے میں لے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں حکومتیں جمہوریت کے نام پر قائم ہوئیں، مگر اپنے عمل سے آمریت کی مثال ثابت ہوئیں۔

شورش کاشمیری نے ہر دور کی آمریت کے خلاف اپنے قلم کی آبرو کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے نہ صرف فوجی آمریت کے خلاف لکھا، بلکہ جمہوری آمریت کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کی صحافت کا نظریہ وہی تھا جو ان کی سیاست کا تھا۔ یعنی "اسلام کی احیا اور عوام کی فلاح"۔ انہوں نے اپنے نظریے کے خلاف کھڑی قوتوں کا ہمیشہ جرات و بہادری سے مقابلہ کیا، اپنا فکری حلقہ پیدا کیا، تحریکیں چلائیں، اور حکومتوں کے خلاف جدوجہد کی، مگر ان کی ہر کوشش کا مقصد درحقیقت دعوت و تبلیغ اسلام تھا۔

بحیثیت صحافی، شورش کاشمیری نے ملک و قوم کو درپیش ہر اہم مسئلے پر قلم اٹھایا۔ چاہے وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، سیاسی ہو یا سماجی، تعلیمی ہو یا تہذیبی، مذہبی ہو یا ثقافتی، صحافتی ہو یا ادبی۔ ان کا قلم ہمیشہ حق کی ترجمانی کرتا رہا۔

حوالہ جات

- ۱۔ رسالہ چٹان شورش کاشمیری نمبر صفحہ نمبر ۵، جلد ۹۲ شمارہ ۳۴، ۴۴ یکم نومبر ۶۷۹۱
- ۲۔ رسالہ چٹان شورش کاشمیری نمبر صفحہ نمبر ۵، جلد ۹۲ شمارہ ۳۴، ۴۴ یکم نومبر ۶۷۹۱
- ۳۔ صحافتی زبان مسکین حجازی صفحہ نمبر ۴۲
- ۴۔ وے صورتیں الہی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، صفحہ نمبر ۸۰۲
- ۵۔ فن صحافت، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، صفحہ نمبر ۵۰۲، ۶۰۲، مرکزی اردو بورڈ لاہور، ۶۶۹۱
- ۶۔ شورش کاشمیری، مرتبہ انور عارف، صفحہ نمبر ۳۱۱، ۳۱۱
- ۷۔ پروپگنڈا، ابتدائیہ، صفحہ نمبر ۹، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
- ۸۔ پروپگنڈا، ابتدائیہ، صفحہ نمبر ۹، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
- ۹۔ ہفت روز چٹان، ایڈیٹر اور اخبار، شورش کاشمیری،

☆☆☆

اردو طنز و مزاح کی روایت میں میل کا پتھر: پطرس بخاری

قدرت نے انسان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ ہنسنا ہنسنا بھی ایک ایسی ہی عظیم نعمت ہے جو انسان کو خواہ کم وقت کے لیے ہی سہی لیکن ہر غم سے بے نیاز ہو کر جب وہ ہنستا ہے تو یہ ہنسی دوسروں کے لیے بھی راحت بخش اور امید افزاں ثابت ہوتی ہے۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کا حل اس کے پردے سے نکل آتا ہے۔ کیونکہ ہنسی وہ چیز ہے کہ انسان ایک لمحے کے لیے ہر تکلیف و پریشانی بھول جاتا ہے اور اسی خوش گوار موڈ میں وہ بڑے بڑے فیصلے کر جاتا ہے۔ مثلاً بہت سے افراد بڑے غصیلے ہوتے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر غصہ آنا ان کی فطرت میں شامل ہوتا ہے اور یہ افراد کسی جائز کام کے لیے بھی ہزاروں نخرے دکھاتے ہیں، لیکن ایسے افراد موڈی بھی ہوتے ہیں اور یہی افراد جب خوش ہوتے ہیں تو بڑے سے بڑے مسئلے کا حل بھی چنگیوں میں نکال دیتے ہیں اور اپنے لواحقین کی ضرورتوں اور خواہشوں کو خندہ پیشانی سے شرف قبولیت بخش دیتے ہیں۔ یہی ہے ہنسی و فرحت و انبساط کا کمال۔ ہنسی دوسروں کی کمزوریوں یا اپنی کوتاہیوں کے سبب وجود میں آتی ہے، مثلاً کسی نے کوئی مضحکہ خیز حرکت کی یا کوئی اچانک گر پڑا تو ہم ہنس دیتے ہیں لیکن اگر کوئی گر پڑا اور اس کی جان چلی گئی تو پھر یہی ہنسی رنج میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

بلاشبہ ہنسنا ہنسنا انسانی فطرت میں شامل ہوتا ہے اور ہنسی کے ذریعے خوشیوں کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔ اسی لیے ہمیشہ سے اس کی ضرورت رہی ہے اور ہر دور میں ہنسنے ہنسانے کے نئے نئے طریقے ایجاد ہوتے رہے ہیں اور جب ہنسنے ہنسانے کے لیے ادب کا سہارا لیا جائے تو وہ ظرافت کہلاتا ہے۔ اردو طنز و مزاح نگاروں نے ظریفانہ ادب میں بلا کی نفاست پیدا کی اور ایسے اعلیٰ درجے کا ظریفانہ ادب تخلیق کیا جس نے نہ صرف قاری کے ہونٹوں پر تبسم بکھیرا بلکہ برائی کے خلاف قاری کے دل میں نفرت بھی پیدا کی۔ کیونکہ ظرافت کے پردے میں کہی گئی بات کسی بھی سنجیدہ نصیحت سے زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہے۔

طنز و مزاح کا مقصد کسی کی دل آزاری کرنا یا کسی کا مذاق اڑانا ہرگز نہیں ہوتا بلکہ اس میں تنقید کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یہ فن جس چیز کو اپنے طنز کا موضوع بناتا ہے وہ اسے ناپسند کرنے کی وجہ سے تبدیل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے اور مزاح کا تعلق ہنسی سے ضرور ہوتا ہے مگر اس کے اندر بھی ہمدردی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ طنز نگار کے قلم کا سب سے بڑا کمال یہ ہوتا ہے کہ اس میں نشتریت کا عنصر واضح

ہوتا ہے۔ طنز نگار جس چیز کو ہدف طنز بناتا ہے یا اس کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھتا ہے تو وہ تمللا اٹھتا ہے۔ وہ اپنے سماج میں پنپ رہی خرابیوں اور خامیوں پر اپنے طنز کے تیز اور تیکھے تیر اس سلیقے سے چلاتا ہے کہ سوسائٹی کی انتہائی گھناؤنی شکل کو ہمارے سامنے بے نقاب کر کے رکھ دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ معاشرے میں موجود حماقتوں، کمزوریوں اور نا انصافیوں کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، ان سے نفرت کرتا ہے اور پورے خلوص و ہمدردی کے ساتھ انہیں دور کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ طنز نگار کی نظر بہت تیز اور انداز بیان بے باک ہوتا ہے۔ وہ اپنے فن کے ذریعے سماج میں بڑھتی جا رہی دھاندلیوں، حق تلفیوں و محرمیوں کے خلاف نفرت کا اظہار کرتا ہے اور اپنی اس کیفیت کو بیان کرتا ہے جو معاشرے میں ہر سو پھیلی براہیوں کے سبب اس کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ طنز نگار ان تمام خامیوں کو اپنے فن کے ذریعے منظر عام پر لا کر قارئین کو اس جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ان نا ہمواریوں پر اپنے طنز کے تلخ اور تیکھے وار اور سماج کو ہر طرح کی گندگی سے پاک صاف بنانے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ ایک کامیاب طنز نگار کی خوبی یہ ہے کہ حقائق کی تختیوں کو پیش کرتے وقت وہ اپنے قلم کو ہر طرح کے نقائص و عیوب سے پاک رکھتا ہے۔ حق گوئی کو اہمیت دیتا ہے مگر حقیقت کی سنجیدگی کا احساس ہونے کے باوجود بھی وہ خشک کلامی سے کام نہیں لیتا۔

جہاں تک بات ہے مزاح کی تو مزاح کے لیے انگریزی ادب میں umour لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے جو ایک لاطینی لفظ ہے اور اس کے معنی رطوبت کے ہیں۔ اردو میں ظرافت و سبغ معنوں میں استعمال کی جاتی ہے اس کے اندر مبالغہ، مشغلہ، چٹکی، رنجش، لطیفہ وغیرہ سب کچھ آتا ہے۔ کیونکہ اس کا سر چشمہ ہنسی کے چشمے سے پھونٹا ہے۔ جو ایک طرح کے ہمدردانہ جذبے کے تحت وجود میں آتی ہے اور دوسروں کو بھی پورے خلوص کے ساتھ اس میں شامل کر لیتی ہے۔ مزاح بھی طنز ہی کی طرح سماج میں پھیلی بے اعتدالیوں اور نا ہمواریوں سے وجود میں آتا ہے لیکن اس کا بنیادی عنصر نشتریت کا نہیں بلکہ خوش گوار احساس کا ہوتا ہے۔ مزاح سوسائٹی میں پھیلی مضحکہ خیز صورتوں اور بے ڈھنگے پہلوؤں سے وجود میں آتا ہے جس میں طنز کی حقارت یا برہمی نہیں ہوتی بلکہ اس میں واضح عنصر ملائمت اور ہمدردی کا ہوتا ہے۔ مزاح نگار جن عیب و نقائص کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے انہیں وہ مزاح کی چاشنی میں ڈبو کر خوش دلی سے پیش کرتا ہے۔

مزاح دراصل انسانی زندگی اور سماجی گونا گوں مسائل کا سنجیدگی سے جائزہ لیتا ہے اور پھر اس کو پوری ہمدردی کے ساتھ ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔ کیونکہ کائنات کے سنجیدہ مسائل کہیں انسان کو بالکل ہی ایک مشین بنا کر اسے ہر احساس لطیف سے عاری نہ کر دے اس لیے قدرت نے ہنسی جیسی نعمت کو اس کی فطرت میں شامل کر لیا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مزاح ہمیں بے تحاشا اور منہ زور آرزوؤں کو ہنس کر قابو میں کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور زندگی کی محرمیوں اور لا حاصل چیزوں کے احساس کو قدر خوش گوار طریقے سے کم کرتی ہے اور انسان کو یاسیت اور نا امید کی جیسی خوف ناک ذہنی بیماریوں سے بڑی عمدگی کے ساتھ نہ صرف بچا لیتی ہے بلکہ ان محرمیوں کو تنقیدانہ نظریے سے دیکھتے ہوئے ان پر ہنسنے کا حوصلہ بھی عطا

کرتی ہے۔

لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ طنز اور مزاح الگ الگ مکمل اور بھرپور خصوصیات کے حامل ہونے کے باوجود بھی تب تک کامیاب اور با اثر معلوم نہیں ہوتے جب تک ان کا استعمال ایک ہی مقصد کے لیے ساتھ ساتھ نہ لیا جائے۔ طنز و ظرافت آپس میں مل کر ہی ذہن و دل کو تازگی اور روح کو فرحت بخشتے ہیں۔

طنز و مزاح کی تاریخ اردو ادب میں زیادہ قدیم نہیں ہے اور نثری تصانیف میں سب سے قبل ملا وجہی کی ”سب رس“ کو بلند مقام حاصل ہے۔ کیونکہ اس میں طنز و مزاح کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ اسی طرح غالب کے خطوط میں بھی طنز و مزاح نگاری کے اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں۔ اسی دور میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں ”توتیہ النصح“ اور ”ابن الوقت“ میں بھی طنز و مزاح کے اچھے نمونے دکھائی پڑتے ہیں۔ لیکن طنز و مزاح کا باقاعدہ آغاز 1877ء میں منشی سجاد حسین کے اخبار ”ودھ پنچ“ سے ہوتا ہے۔ اس اخبار نے طنز و مزاح کا بہترین ذخیرہ پیدا کیا اور اس کے لکھنے والوں میں رتن ناتھ سرشار، مرزا مجھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تر بھون ناتھ جگر، نواب سید محمد آزا، مولوی احمد علی، محفوظ علی بدایونی، خواجہ حسن نظامی، سلطان حیدر جوش، مولانا ظفر علی خاں، مہدی افادی، قاضی عبدالغفار اور ملار موزی وغیرہ نے طنز و مزاح کو نئی بلندیوں سے روشناس کرایا۔

بعد ازاں طنز و مزاح نگاری کے جدید دور کا آغاز شروع ہوتا ہے۔ ان میں فرحت اللہ بیگ، مرزا عظیم بیگ چغتائی ابوالکلام، امتیاز علی تاج، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، شفیق الرحمن، عبدالماجد دریا آبادی، کرشن چندر، رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کے نام نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ مقالے کے محدود صفحات کی بنا اور طوالت کے خوف سے یہاں صرف ایک ایسے طنز و مزاح نگار جنہوں نے کم لکھا لیکن خوب لکھا یعنی پطرس بخاری کے حوالے سے بات کریں گے۔ ان کا ہر مضمون اپنے آپ میں ایک انتخاب ہے۔

سید احمد شاہ بخاری نام تھا اور پطرس بخاری کے قلمی نام سے لکھتے تھے، لاہور کے گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔ بعد میں آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر رہے۔ تقسیم ملک کے بعد اقوام متحدہ سے منسلک ہوئے اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔ انہوں بہت کم لکھا ہے یعنی صرف ایک کتاب ”مضامین پطرس“ جس میں ان کے محض دس مضمون شامل ہیں۔ لیکن یہ مضامین اردو مزاح نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور پطرس بخاری کا نام زندہ رکھنے کے لیے پطرس بخاری کی صرف یہ کتاب ہی کافی ہے۔

پطرس بخاری کا نام اردو مزاح نگاری کی دنیا میں ایک بہت ہی اہم مرتبے کا حامل ہے۔ ان کے یہاں کردار سے لے کر موضوعات اور واقعہ نگاری سے لے کر لفظیات تک ہر چیز میں ایک خاص قسم کی وسعت و انفرادیت جلوہ گر ہے۔ انہوں نے اردو کی طنز و مزاح نگاری کی روایت میں ایک نئے اسلوب اور انداز پیدا کیا ہے۔ خوش طبعی اور زندہ دلی ان کے فن کی جان ہے جس میں دو دور تک کہیں سطحیت یا پھلکڑ

پن کا شبہ نظر نہیں آتا۔ ان کی طبیعت میں بھہراؤ اور قلم بھی محتاط ہے جس سے ان کی طنز و مزاح نگاری میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ اور سلیقہ در آیا ہے۔ ان کا ادبی سرمایہ مختصر ہے مگر ادبیت اور معیار کے اعتبار سے اتنا جامع و اعلیٰ ہے کہ ان کے فن کی عظمت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ عام اور سادہ سی باتوں کو بھی با مزاح بنا کر پیش کرتے ہیں اور بے معنی باتوں کو بھی با معنی بنا دیتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو ایک مخصوص زاویے سے دیکھتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی مزاح کے پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ ان کا مضمون ”کتے، کا ایک اقتباس دیکھئے۔ جوان کے ظریفانہ اسلوب کی بہترین مثال ہے:

”اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے، بعض تو دو غزلے، سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے نہیں آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ آرڈر آرڈر پکارا لیکن ایسے موقعوں پر دھیان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھئے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضرور مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے۔ یہ گھروں کے درمیان آکر سوتوں کو ستانا کونسی شرافت ہے اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں سے ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون اور کوٹ کو دیکھ کر ہی بھونکنے لگ جاتے ہیں۔“

پطرس بخاری کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ پطرس اردو طنز و مزاح میں ایک نئے اسلوب کے خالق ہیں۔ ان کا اسلوب شوخی، شائستگی اور ظرافت کا حسین موقع ہے۔ مضامین پطرس کے مطالعے سے ان کی ذہنی طباعی، انسانی نفسیات پر ان کی بھرپور گرفت، زبردست قوت مشاہدہ اور تخیل کی بلند پروازی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں کسی قسم کی بناوٹ یا تصنع نہیں بلکہ فطری پن کا احساس ہوتا ہے۔ وہ واقعات اور کرداروں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس میں مزاح کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے مزاح میں تمسخر اور مضحکہ کا دخل نہیں ہے۔ انہوں نے بڑی ہمدردی کے ساتھ زندگی کے مزاح انگیز پہلوؤں کی عکاسی کی ہے اور قارئین کے لیے شائستہ مزاح کا سامان فراہم کیا ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین میں انسانی نفسیات کی گہری کھلتی نظر آتی ہیں۔ ان کی ظرافت میں تجربات اور مشاہدات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ وہ انسانی کرداروں کا نہایت گہرائی سے نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی جزئیات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔

پطرس بخاری نے یوں تو بہت کم لکھا اور چند مضامین بھی تحریر کیے مگر وہ اپنے انداز بیان اور طرز تحریر کی بنا پر اتنے زیادہ پسند کیے گئے کہ وہ مضامین پطرس بخاری کی کی شناخت بن گئے۔ ان مضامین کے سبب جتنی شہرت پطرس کو نصیب ہوئی وہ دوسرے فن کاروں کے حصے میں بہت کم آتی ہے۔ انہوں نے جدید طنز و ظرافت کے دامن میں ایک خاص وسعت پیدا کی۔ یوں تو انہوں نے اپنی تحریروں میں طنز و

مزاح کے تمام حربوں کا بخوبی استعمال کیا ہے اور مبالغہ، موازنہ، واقعہ، کردار، اسٹائل کی رنگینی سے مزاح پیدا کرنے کی بہترین کوشش کی ہے مگر واقعہ نگاری اور کردار نگاری پر انہیں ملکہ حاصل ہے۔ پطرس کو اپنے ما حول اور کردار سے خاص لگاؤ ہے اس لیے وہ حالات و کردار میں موجود مضحکہ خیز پہلوؤں کو بھی پوری ہمدردی اور خلوص کے ساتھ مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ پطرس کی خاص خوبی یہ ہے وہ صرف تماشائی بن کر مذاق کا سہارا نہیں لیتے بلکہ تماشائے مبتلا ہو کر خود کو ہی اپنی مزاح کا نشانہ بناتے اور قارئین کو خوب ہنساتے اور گلداتے ہیں۔ ان کے ایک مضمون کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

”گیدڑ کی جب موت آئی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے، ہماری جوشامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپاشنکر جی برہمچاری سے برسمیل تذکرہ کر بیٹھے کہ لالہ جی امتحان کے دن قریب آئے جاتے ہیں۔ آپ سحر خیز ہیں ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجئے۔ وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے لفظوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اٹھتے ہی انہوں نے الیٹور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کی، کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالم خواب ہے، ابھی سے کیا فکر، جاگیں گے تو لا حول پڑھیں گے لیکن یہ گولہ باری تیز، لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی اور صاحب جب کمرے کے چوبی دروازے لرزنے لگے، صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلیترنگ کے ساتھ بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کلینڈر پینڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائم ہونا ہی پڑا۔“

پطرس کی کردار نگاری بہت زبردست ہے۔ وہ فن مزاح کی صناعی کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کے کردار بتدریج ارتقا کے مراحل طے کرتے ہیں اور اپنے حرکت و عمل سے ہمیں مسکرانے اور بعض اوقات قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پطرس کے زیادہ تر مضامین کا مرکزی کردار واحد متکلم ہے۔ واحد متکلم کردار کے استعمال سے مضامین کے بیان کردہ واقعات میں خود مصنف کے شامل ہونے اور واقعات کے حقیقی ہونے کا گمان گذرتا ہے۔ اس سے واقعات میں اتنا فطری پن پیدا ہو جاتا ہے کہ گویا سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

پطرس کو انگریزی ادب کا گہرا علم تھا۔ وہ لاہور میں انگریزی زبان کے پروفیسر بھی رہ چکے تھے۔ ان کے قلم میں موجود لطافتیں اور رعنائیاں مغربی علوم کی ہی دین ہیں۔ انہیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ کسی چیز پر کب اور کتنا ہنسنا چاہئے۔ کیا بیان کرنا چاہئے اور کس چیز سے دامن بچا کر گزر جانا چاہئے یہی وجہ ہے کہ ان کی مزاح نگاری ایک صحت مندانہ کیفیت کی حامل نظر آتی ہے۔ دراصل پطرس مغربی رنگ سے متاثر ضرور نظر آتے ہیں مگر ان کے یہاں مقامی رنگ بھی اپنی پوری آب و تاب اور توانائی کے ساتھ کھلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے فن میں نشتریت اور تخریب کے مقابلے میں مسرت و طمانیت کو اہمیت دیتے ہیں اور حربوں کو گلے سے لگانے کا حوصلہ رکھتے ہیں جو ان کی وسیع القلمی اور کشادہ ذہن کی خ

بصورت عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے تمام مضامین مثلاً ”سویرے جوکل آنکھ میری کھلی، مرید پور کا پیر، وغیرہ ان کے فن کی معراج معلوم ہوتے ہیں۔

پطرس نے اپنے عہد میں برتے جانے والے موضوعات سے پرہیز کرتے ہوئے اپنے قلم کا رخ عوامی اور آفاقی مسائل کی جانب موڑا۔ انہوں نے ان مضامین کو بہت ہی عمدگی کے ساتھ سادہ اور شگفتہ انداز میں بیان کیا۔ ان کے اسلوب میں نہ تو کسی طرح کا الجھاؤ ہے اور نہ ہی حقیقی دنیا سے دور مائیں عناصر کی کارفرمائی بلکہ وہ بہت ہی خلوص اور روانگی کے ساتھ حقیقی زندگی کے مسائل سے قاری کو رو بہ رو کراتے چلے جاتے ہیں۔ وہ فن کی نزاکتوں کے ساتھ فن کی باریکیوں کا بھی گہرا شعور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختصر اور منتخب تحریروں کے باوجود بھی انہیں طنز و مزاح نگاری کی روایت میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ ان کی طنز و مزاح نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

”پطرس جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، اردو نثر میں اس خالص مزاح کے سب سے بڑے علمبردار ہیں اور اگرچہ ان کے سوچنے کا انداز اور مزاح نگاری کے حربوں کا استعمال انگریزی اثرات کا غماز ہے لیکن یہ اثرات اتنے بالواسطہ ہیں اور انہوں نے اپنے معاشرے کے پس منظر کو اس درجہ ملحوظ رکھا ہے کہ ان کی نگارشات خالص تخلیقی ادب کا درجہ اختیار کر گئی ہیں۔“

پطرس بخاری اردو کے ایسے بلند پایہ اور مایہ ناز مزاح نگار ہیں۔ وہ اپنے مضامین کی شگفتگی، برجستگی، روانی اور توانائی کی وجہ سے اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں نہایت بلند مقام پر فائز ہیں۔ وہ مشرقی ادب کے ساتھ ساتھ مغربی ادب اور طرز فکر سے بھی بخوبی واقف تھے جس کی جھلک ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ پطرس کی تحریروں میں یوں تو مزاح کا رنگ گہرا ہے لیکن ان کے بعض مضامین میں اعلیٰ معیار کا طنز بھی ملتا ہے۔ وہ دوسروں پر طنز کے تیر چلانے کی بجائے خود کو ہی تختہ مشق بناتے ہیں اور قاری کو ہنسنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ جہاں کہیں انہوں نے طنز کا سہارا لیا ہے، وہاں اس کی کاٹ بھی زبردست ہے۔ وہ طنز کو مزاح کی شیرینی میں اس خوبی سے پیش کرتے ہیں کہ طنز کی نخی زیر لب تبسم میں بدل جاتی ہے۔ ”کتے“ اور ”لاہور کا جغرافیہ“ ان کے لطیف طنز کی عمدہ مثالیں ہیں۔ پطرس نے ”کتے“ مضمون میں گلی کے آوارہ یعنی دیسی کتوں اور صاحب لوگوں کے بنگلوں پر رہنے والے ولایتی کتوں کا نہایت ہی دلچسپ موازنہ کیا ہے۔ دیسی کتوں کی بدتمیزی اور بداخلاقی اور ولایتی کتوں کی شائستگی کو ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”خدا کی قسم ان کے کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عیش عیش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جوں ہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے، کتے نے برآمدے ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی ”خ“ کردی اور منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز

میں پھر ”بخ“ کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری، موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ، نہ سر، نہ سر نہ پیر تان پہ تان لگائے جاتے ہیں۔ بے تالے کہیں کے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں، نہ وقت پہچانتے ہیں، بس گلے بازی کیے جاتے ہیں۔“

”کتے“ نہ صرف پطرس بخاری کا بلکہ اردو طنز و مزاح کا ادبی شاہکار ہے۔ اس میں شوخی، شگفتگی اور طنز و مزاح کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ پورے مضمون میں دل چسپی کا عنصر موجود ہے۔ اس کی پہلی سطر سے آخری سطر تک قاری کی توجہ اور کشش میں کہیں کوئی کمی نہیں آتی۔ اسی مضمون کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے:

”علم الحوائج انات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوتریوں سے پوچھا، خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے، دودھ دیتی ہے، بکری کو لیجئے دودھ دیتی ہے اور بیگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگا کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب اگر وفاداری اسی کا نام ہے کہ شام سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگا تا بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انہوں نے باہر سڑک پر آ کر ”طرح“ کا ایک مصرعہ دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کی بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنے مشق استاد کو جو غصہ آیا ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر نکلے اور بھٹا کے پوری غزل مقطع تہ کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے، سہ غزلے لکھ لائے تھے۔“

مختصر یہ کہ پطرس بخاری کی مزاح نگاری کا کمال اور خوبی یہ ہے کہ وہ عام کرداروں یا مناظر کو لفظوں کے حصار میں اس طرح قید کرتے ہیں کہ بد صورتی بھی خوبصورتی میں بدل جاتی ہے اور آدمی اسے بار بار دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ انسانی فکر و شعور کے تمام پہلوؤں پر جملوں کی ساخت اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ تحریر دلکش اور شگفتہ ہو جاتی ہے۔ پطرس بخاری کی تحریروں کی یہی وہ منفرد خصوصیات ہیں جو انہیں اپنے ہم عصروں میں بلند قد کا حامل بناتی ہیں۔ اردو ادب کے وسیع سرمائے میں پطرس کے مضامین کی تعداد اگرچہ بہت کم ہے لیکن فکری و فنی خصوصیات کے باعث اردو طنز و مزاح نگاری میں بلند پایہ ادبی مقام کے مستحق ہیں۔ اردو کے اس بلند پایہ طنز و مزاح نگار کا انتقال 1958ء میں نیویارک میں ہوا۔ مختصر یہ کہ پطرس بخاری کے قلم نے مزاح نگاری کے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام

دیے کہ قاری انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ وہ بات میں سے بات پیدا کرنا خوب جانتے ہیں۔ حاضر جوابی، خوش اسلوبی، شگفتہ طنز اور اپنے خیالات کی نیرنگی سے وہ ایسے ایسے جملے تراش دیتے ہیں کہ قاری ان سے خوب محظوظ ہوتا ہے۔ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اسے اپنے قلم کی نفاست سے سنوار کر اس قدر دلچسپ اور قابل قدر بنا دیتے ہیں کہ قاری کو ان کے فن کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ مختصر اور کم لکھنے کے باوجود انہوں نے اردو نثر میں طنز و مزاح نگاری کو ایک ادبی اور منفرد حیثیت عطا کی اور اس فن کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

پطرس بخاری کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ان کے قلم میں بے پائی کی اور حقیقت نگاری عروج پر نظر آتی ہے۔ انہوں نے ادبی موضوعات کے علاوہ بھی سیاسی اور معاشرتی پہلوؤں سے وابستہ مختلف گوشوں کو اپنے فن کا موضوع بنایا اور عالمانہ و مہذبانہ انداز گفتگو کو اپنایا۔ ان کی نظر سماج اور انسانی زندگی کے مختلف مسائل و حالات پر بہت گہری تھی۔ انہوں نے سماجی تمدن کا گہرائی سے جائزہ لیا اور پر مزاح انداز میں اپنے خیالات کو پیش کیا۔ پطرس بخاری خیال کی ندرت سے ظرافت پیدا کرتے ہیں یعنی خیال کا اچھوتا پن، کوئی ایسا واقعہ یا حاشہ جو قاری کو ہنسنے پر مجبور کر دے یا پھر کوئی ایسی بات جسے سن کر قاری کے ذہن کو گدگدانے لگے اور وہ اپنی ہنسی نہ روک پائے یہی وہ طریقے ہیں جسے پطرس بخاری نے اختیار کیا تھا۔



شعبہ اردو کے پریم چند سیمینار ہال میں منعقد دورہ پریم چند عالمی سیمینار میں پروفیسر پرگیہ پاٹھک اظہار خیال کرتے ہوئے اور اسٹیج پر موجود بائیں سے محترم امیر مہدی (انگلینڈ)، شہر قاضی زین السالکین، صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر پردیپ جین اور شعبے کے استاد ڈاکٹر آصف علی۔

علم شخصیت نکھارتا ہے

سعادت ہے، ہنساوت ہے، عبادت ہے علم
دولت ہے، بصیرت ہے، طاقت ہے علم

تمام مذہبی معاشروں میں علم کی ضرورت کو ہر دور میں محسوس کیا جاتا رہا ہے کیونکہ علم کے عمل سے ہی انسان اپنے آپ کو سمجھتا ہے اور انسانی شعور بیدار ہوتا ہے۔ رہنے، کھانے، پہننے، گفتگو کرنے وغیرہ میں علم کی مدد سے ہی کامیابی حاصل ہوتی ہے اور نسل در نسل ادبی، ثقافتی، علمی ورثہ منتقل ہوتا ہے۔ علم ہی وہ خزانہ ہے جس کے ذریعہ انسان کی ذہنی، جسمانی اور اخلاقی تربیت ہوتی ہے اور اس کی شخصیت معاشرے میں کھل کر سامنے آتی ہے۔

سب سے پہلے اگر ہم علم کی بات کریں تو آج سے 1400 سال قبل ماضی میں جھانک کر دیکھتے ہیں کہ جب معاشرہ تو تھا انسانوں کا، قانون تو تھا لیکن جنگوں کا اور انسان تباہی کے راستے پر گامزن تھا۔ اُس وقت خداوند تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور سرکارِ دو عالم کو اِس دنیا میں بھیجا گیا جن کی تعلیم و تربیت کی بدولت اس معاشرے نے پلٹا کھایا کہ وہی لوگ تھے، وہی جگہ تھی مگر طرزِ زندگی تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ معاشرہ جو برباد ہونے والا تھا اب امن اور سکون کی علامت بن گیا تھا کیونکہ علم نے جینے کا سلیقہ سکھا دیا تھا۔

یہی وہ علم ہے جس کی وجہ سے ہم انسان ”اشرف المخلوقات“ سے نوازے گئے، یہی وہ علم ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے آدم کو کچھ چیزوں کے نام سکھائے اور فرشتوں کو نہیں بتائے گئے اور فرشتوں کے سامنے وہ چیزیں جب پیش کی گئیں تو فرشتوں نے عرض کیا کہ ہم ان چیزوں کا نام نہیں بتا سکتے کیونکہ ہمیں ان چیزوں کا علم نہیں دیا گیا پھر خدا تعالیٰ نے آدم سے کہا کہ تم ان چیزوں کے نام بتاؤ آدم کو کیونکہ سب کا علم دیا گیا تھا تو آپ نے ایک ایک چیز کا نام بتایا تب خدا تعالیٰ نے فرشتوں کو فرمایا کہ میرے اِس شاہکار کو سجدہ کرو اور فرشتوں کی پیشانیاں آدم کے آگے سجدے میں جھک گئیں تو فرشتوں کی پیشانیوں کے جھکنے کا سبب حضرت آدم کا ان اسماء کو جانا تھا جن سے فرشتے ناواقف تھے۔

علم کے سبب سے انسان کو اللہ نے اُس کے مشارکات سے بھی امتیاز کیا اور دیگر مخلوقات سے

بھی اُس کو متاثر کر دیا۔ سبھی تو اسلام کی تعلیمات کا آغاز بھی لفظ اُقرآء سے ہوا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت سے علم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

”جب کوئی شخص گھر سے علم کی تلاش میں نکلتا ہے تو وہ راہِ خدا میں ہوتا ہے جب تک وہ پلٹ نہ آئے۔“

علم کیونکہ ایک روشنی ہے، ایک نور ہے، ایک کاوش ہے، ایک احترام ہے۔ اس علم کی بدولت عرب کی تہذیبی ریت پر حضرت بلال نے احدا حد کا نارہ بلند کیا کیونکہ علم ایک ایسا خزانہ ہے جو انسان کی شخصیت کو نکھارتا ہے۔ اگر میں دوسرے رخ سے بات کروں تو ہٹلے کہتا تھا:

”تم مجھے پڑھی لکھی ماں دو میں تمہیں پڑھی لکھی قوم دوں گا۔“ کیونکہ وہ جانتا تھا انسان کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہوتی ہے جہاں سے تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، جہاں سے انسان بولنا سیکھتا ہے، جہاں سے انسان چلنا سیکھتا ہے اور پھر اپنے اساتذہ اکرام کی زیر سرپرستی آ کے علم حاصل کر کے اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کر دیتا ہے۔

یہی علم جب اقبال کے پاس آیا تو وہ ڈاکٹر محمد اقبال بن گئے، علم کے میدان کے سپاہی جب قوم کے رہنما بنتے ہیں تو سرسید احمد خاں بن کر قوم کی رہنمائی کر کے جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں، علم کے میدان کے سپاہی جب IT کے میدان میں اترتے ہیں تو کسان کا بیٹا Billgate ہو یا غربت و افلاس کا سامنا کرنے والی میڈم کیوری، ہومسیتوں سے لڑ کر جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں، علم کے میدان کے سپاہی جب Edward Jenner اور Alexander flaminging بنتے ہیں تو antibiotics اور vaccination کی ایجاد کر کے زندگیاں بچا کر جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں، علم کے میدان کے سپاہی سائنس میں Newton اور گراہم نیل بنتے ہیں تو دوسروں کے کام آ کر جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں، علم کے میدان کے سپاہی جب کچھ کرنے کی ٹھان لیتے ہیں اور موسیقی میں آتے ہیں تو استاد نصرت فتح علی خان اور راحت فتح علی خان سے لیکر اے۔ آر۔ رحمان بنتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں:

علم نے خونِ رگ جاں دیا اور نہ مرا
علم نے زہر کا پیالا پیا اور نہ مرا
علم سقراط کی آواز ہے عیسیٰ کا لہو
علم سیارہ و گہوارہ و انجام و نمود
علم بیٹے کی نئی قبر پر ماں کے آنسو
علم عباسِ علمبردار کے زخمی بازو
علم طالب کو طلب سے ہی سلا دیتا ہے
اور جہل کو ابو جہل بنادیتا ہے۔۔

اگر ہم معاشرے میں تعلیم یافتہ شخصیات کی بات کریں تو معاشرہ بھی ایسی شخصیات سے متاثر

ہوتا ہے اور ان کے قول و عمل کو دیکھتا ہے پرکھتا ہے اور ان کو اپنا رہنما منظور کرتا ہے کیونکہ علم سے ہی شخصیت متاثر ہوتی ہے۔ ایک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والا ہمیشہ کے لئے پر خلوص انسان بن جاتا ہے کیونکہ علم ہی سکھاتا ہے کہ متاثر کن شخصیت کیسے بنا جاسکتا ہے اور ایک عالم تب تک متاثر کن شخصیت نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے عمل میں مخلص نہ ہو۔

انسان کی شخصیت کو نکھارنے اور متاثر بنانے میں عاجزی اور انکساری ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ انسان جب سامنے والے کو دیکھتا ہے تو وہ دوسروں کا احترام کرتا ہے اس کے ساتھ بڑے پیار اور محبت سے پیش آتا ہے کیونکہ اسے اپنے علم و عمل اور تقویٰ کا غور نہیں ہوتا، کوئی اسے دعوت دے وہ انکار نہیں کرتا، مصیبت اور پریشانی میں ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے، کسی کے گھر کوئی تقریب ہو تو مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اس طرح کے رویے سے معاشرہ بھی خوش ہوتا ہے اور اللہ بھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے افراد کہاں ملتے ہیں؟ تو ایسے افراد کسی دوسری دنیا کے نہیں ہوتے وہ اسی دنیا کے تعلیم یافتہ شخصیات ہوتی ہیں۔ ایک علمی اور ایک نا علم شخصیت کو اگر آگے سامنے بٹھا دیا جائے تو اس کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب علم ہی ہے۔ تعلیم کے لیے ہمارے پیارے نبی کا بھی قول ہے ”علم حاصل کرنے کے لیے چین بھی جانا پڑھے تو جاؤ“، کیونکہ آج کے دور میں علم ہی سے انسانی زندگی میں شعور پیدا ہوتا ہے۔

علم ایک درخت ہوتا ہے اس سے بے خبر نہیں ہونا چاہیے۔ ایک مثال یہاں پیش کرتی ہوں:

”ایک شکاری لٹتا جس کو شکار کرنا سکھایا جاتا ہے اور جب وہ شکار کے لیے جاتا ہے تو وہ شکار اس کے لیے جائز ہوتا ہے، اور ایک عام لٹتا اگر جائے گا اور شکار کریگا اور وہ مر جائے تو وہ جائز نہیں ہوگا کیونکہ سکھائے ہوئے اور عام لٹوں میں دونوں میں فرق ہوتا ہے۔“

تو اگر لٹتا بھی سکھ جاتا ہے تو وہ ایک عام لٹوں سے منفرد ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر انسان سکھ جائے گا تو وہ انسانوں میں ممتاز کیوں نہیں ہو سکتا۔ یہ شرف ہے انسان کا کہ علم سے انسان اپنے دیگر افراد قوم سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ اسلئے اسلام نے بھی ہمیں علم حاصل کرنے کا درس دیا ہے اور علم صرف اسلامی علوم نہیں عصری علوم حاصل کرنے کی بھی ترغیب اسلام نے کی ہے۔

آج کے معاشرے میں بہت سے ایسے افراد بھی ہیں جو تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ کر ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ آج ۹۰ فیصد معاشرہ جدید عصری علوم، جدید ٹکنالوجی ہو یا جدید سائنس علوم میں پیچھے رہ گئے ہیں ہمیں ان علوم کو حاصل کرنے کی بھی تلقین اسلام نے کی ہے۔ تعلیم کے بارے میں مشہور ماہر تعلیم پننر نے کہا تھا ”تعلیم کا مقصد محض علم حاصل کرنا نہیں محض معلومات کا حصول نہیں بلکہ انسان کی مکمل زندگی کے لئے اس کی ذہنی افزائش ہے اس کی اخلاقی تربیت ہے۔“

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علم شخصیت کو نکھارتا ہے اور انسان کو باشعور اور باوقار بناتا

ہے۔ انکساری اور خیر خواہی سکھاتا ہے، قول و عمل میں یکسانیت سکھاتا ہے، حکمت و دانائی سکھاتا ہے اور انسان کو ایک باشعور فرد بناتا ہے، اسلئے علم حاصل کرنا تمام انسانوں پر فرض ہے تبھی ہم ملک و قوم کی ترقی میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔
علم کی مقدس شمع کو روشن جو کیا کرتے ہیں
زندہ رہتے ہیں ہمیشہ وہ لوگ کہاں مرتے ہیں۔

☆☆☆



شعبہ اردو میں منعقد ڈاکٹر ادنیٰ عشق آبادی کے شعری مجموعے ”برگ آوارہ“ کی رسم اجراء کے موقع پر معروف شاعر محترم وارث وارثی اپنا کلام پیش کرتے ہوئے اسٹیج اور ہال میں موجود مہمانان بغور سماعت کرتے ہوئے۔



پریم چند عالمی سیمینار میں پروفیسر تنویر چشتی اظہار خیال کرتے ہوئے اور ہال میں موجود مہمانان اور حاضرین

تخلیقی ذہن کا متفکر رہنما: ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محی الدین احمد تھا۔ ان کے والد محمد خیر الدین انہیں فیروز بخت کہہ کر پکارتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیر الدین دہلی کے ایک مشہور علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا خیر الدین کے والد کا انتقال ان کے بچپن میں ہی ہو جانے کی وجہ سے ان کی پرورش ان کے نانا مولانا منور الدین نے کی تھی۔ ۱۸۹۵ء کی جنگ آزادی سے قبل لوگ دہلی کے حالات دیکھ کر وہاں سے ہجرت کر رہے تھے تبھی مولانا خیر الدین ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں پرسکونت اختیار کر لی۔ مولانا خیر الدین نے وہیں پر عالیہ بنت محمد سے نکاح کر لیا جن کا تعلق مدینہ سے تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش کے کچھ دنوں بعد ہی وہ جدہ میں گر پڑے جس وجہ سے ان کے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ لوگوں کے مشورات پر وہ ہندوستان میں کلکتہ کے ایک سرجن کے پاس علاج کرانے کی غرض سے آئے اور پھر ان کے مریدوں اور مداحوں نے انہیں واپس نہیں جانے دیا۔ کلکتہ میں ہی ان کے والد اور والدہ کا انتقال ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا بچپن مکہ معظمہ اور مدینہ میں گزرا۔ مولانا نے ابتدائی عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ان کے والد مغربی تعلیم کو ناپسند کرتے تھے وہ مولانا کو صرف روایتی تعلیم جو مذہبی تعلیم ہے اسی کو دلانا چاہتے تھے ان کا ماننا تھا کہ جدید تعلیم مذہبی عقیدوں کو کمزور کر دے گی اس غرض سے مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر کی چار دیواری میں ہی ہوئی۔ اور انہوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا۔ مولانا آزاد نے اردو خود اپنے شوق سے پڑھی۔ اس کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی بھی خود اپنے شوق سے پڑھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد سرسید احمد خاں سے بے حد متاثر تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے سرسید احمد خاں کا آخری دور دیکھا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں جب وہ سرسید کی کتابوں کا مطالعہ کر چکے تو انہوں نے انگریزی زبان کی اہمیت کو محسوس کیا۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک کوئی شخص جدید فلسفہ، سائنس اور ادب کا مطالعہ نہ کرے وہ صحیح معنوں میں تعلیم حاصل نہیں کرتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے انگریزی پڑھنے اور لکھنے کے پیچھے یہی وجہ رہی۔

مولانا آزاد ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ یہ شخصیت مختلف پہلوؤں پر محیط تھی، ان کی زندگی مختلف پہلوؤں میں بٹی ہوئی ہے وہ بیک وقت بے باک مجاہد آزادی ہیں، مصنف بھی ہیں، خطیب

بھی ہیں، مفکر بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں، ایک طرف ادب کے شہسوار ہیں تو دوسری طرف ماہر عالم دین، ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک عظیم قومی لیڈر بھی ہیں۔ ہندوستان کے عظیم لیڈروں میں مولانا کا شمار ہوتا ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس ورکنگ کمیٹی کے لیڈر کے عہدہ کے ساتھ ساتھ پارٹی کے صدر بھی کئی مرتبہ منتخب ہوئے۔ اس لحاظ سے اگر انہیں ہر فن مولانا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آپ کی ایک خاصیت تھی کہ شرعی معاملات کو چھوڑ کر دیگر معاملات میں تقلیدی اور رواجی ذہن نہیں رکھتے تھے بلکہ تخلیقی ذہن کے مالک تھے۔ مولانا آزادی کی ادبی زندگی کا آغاز شاعر کی حیثیت سے اُس وقت ہوا تھا جب ان کی عمر تقریباً ۱۰-۱۱ سال تھی ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء میں حکیم عبدالحمید فرخ جو ”بیچ بہادر“ نکالا کرتے تھے۔ ایک گلدستہ ”ارمغان فرخ“ کے نام سے نکالتے تھے جس کے لیے ہر مہینہ طرحی مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے اور ان مشاعروں کی غزلیں ”ارمغان فرخ“ میں شائع کی جاتی تھیں ایک دفعہ ان مشاعروں کے لیے طرحی زمین دی گئی ”پوچھی زمین کی تو کبھی آسمان کی“۔ مولانا نے بھی اس زمین میں ایک غزل کہی۔ جب غزل شائع ہوئی تو مولانا کو بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ ایک خط میں مولانا لکھتے ہیں:

”آج بھی جب کہ ۳۶ برس گزر چکے ہیں اپنی وہ خوشی پوری طرح محسوس کر رہا ہوں جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی، جب ”ارمغان فرخ“ میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام ایک رسالے میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔“ (نقش آزاد، ص ۱۰۷)

مولانا ابوالکلام آزاد ایک غیر معمولی ذہین دانشور تھے۔ مولانا کی ذہنی صلاحیتوں کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے پندرہ سال کی عمر میں ماہوار جریدہ ”لسان الصدق“ جاری کیا۔ جس کی مولانا الطاف حسین حالی نے بھی بڑی تعریف کی ہے۔ یہ رسالہ آپ نے ۱۹۰۳ء میں جاری کیا تھا جس کو کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس طرح مولانا کا علمی وادبی سفر جاری ہوا اور بہت بڑی تعداد میں ان کے مذہبی اور ادبی موضوعات پر تحقیقی مضامین، رسالے اور کتابیں شائع ہوئیں جن میں ”تعصب کی مضرتیں“، ”عوائد و رسوم“، ”خصائص محمدیہ“، ”منہاج العابدین“، ”فارسی لغت“ وغیرہ شامل ہیں۔ مولانا آزاد کے خیالات میں نہ تو ایہام ہے اور نہ پیچیدگی۔ اس دور میں سرسید اور ان کے رفقاء کے کار کے زیر اثر مولانا سادگی اور سلاست کی طرف مائل تھے۔ مولانا آزادی کی ابتدائی دور کے مضامین سرسید احمد خاں کے خیالات سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ مولانا سرسید کی تحریروں سے بے حد متاثر تھے۔ سرسید کی تعلیمات نے ان کو نئی دنیا میں پہونچا دیا تھا اور مولانا کی طبیعت میں ان کی عقیدت پرستش کی حد تک پہونچ گئی تھی۔ مولانا آزاد خود فرماتے ہیں:

”میں ایک بت کی طرح سرسید کی پوجا کرتا تھا۔ ان کی عظمت میرے دل کے ریشے ریشے میں رچ گئی تھی۔ ان کا وجود میرے ذہن میں فضائل انسانی کا ایک

مکمل نمونہ تھا، جس کی طرف ایک شاہہ نقص بھی منسوب نہیں کیا جاسکتا تھا۔“

(آزادی کی کہانی۔ صفحہ ۲۸۳)

۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اردوفت روزہ ”الہلال“ اخبار جاری کیا۔ جسے مختصر وقت میں ہی بہت مقبولیت حاصل ہوئی یہ مولانا کا عظیم الشان کارنامہ ہے جو اردو صحافت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا نے اس اخبار کے ذریعہ ان لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی گمراہی کے راستہ پر گامزن تھے۔ اس اخبار کے ذریعہ مولانا نے لوگوں کو بیدار کیا۔ انہیں سوچنے پر مجبور کیا۔ مولانا اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے اور تحریک آزادی کی لہر تیز ہو گئی۔ ”الہلال“ کے ادارہ نگار صرف ابوالکلام آزاد ہی نہیں تھے بلکہ ان کے ساتھ اردو کی عظیم ہستیاں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبداللہ عمادی، حامد علی صدیقی، عبدالواحد کانپوری اور دیگر معروف شخصیات شامل تھے۔

”الہلال“ میں ہر طرح کے موضوعات پر خوب مضامین لکھے گئے صرف مذہب ہی نہیں مذہب کے علاوہ سیاست، معاشیات، نفسیات، تاریخ، جغرافیہ، سوانح، عمرانیات ادب اور حالات حاضرہ کے مسائل اور ان کا حل، مختلف اخبارات پر تبصرہ یہ تمام چیزیں تحریر میں پوشیدہ تھیں، ان تمام موضوعات میں مولانا نے حق و صداقت کو اپنا عصا بنا کر اپنی بات کو بے خوف ہو کر لکھا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ہند اس کی مخالفت کرنے لگی اور اس کی اشاعت میں مسائل پیدا کرنے لگی اور آخر کار ۱۹۱۴ء میں پریس ایکٹ نے دو ہزار کی ضمانت طلب کی۔ کچھ عرصہ بعد یہ ضمانت ضبط کر کے دس ہزار کی ضمانت طلب کی۔ آخر کار ۱۹۱۴ء میں پریس ایکٹ کے تحت ”الہلال“ کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ”الہلال“ کے بند ہو جانے کے فوراً بعد ہی مولانا نے ”البلاغ“ اخبار جاری کیا۔ اس کے بنیادی مقاصد تقریباً وہی تھے جو ”الہلال“ کے تھے۔ مولانا آزاد نے قومی، مذہبی، سیاسی اور سماجی اصطلاحات کو قوت بخشی۔

جب پورے ملک میں ان کی مقبولیت کا اضافہ ہونے لگا تو برطانوی حکومت نے ان کے دوسرے اخبار ”البلاغ“ کو بھی ڈیفینس آف انڈیا ریگولیشن ایکٹ کے تحت غیر قانونی قرار دے دیا اور انہیں نہ صرف جیل میں بند کر دیا بلکہ بائیس پریسیڈنسی یونائیٹڈ پروونسز پنجاب اور دہلی میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔ اس کے بعد مولانا کو راجپتی کی جیل میں منتقل کر دیا گیا، جہاں انہوں نے یکم جنوری ۱۹۲۰ء تک جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔

جیل سے رہائی کے بعد مولانا گاندھی جی کے ساتھ ہو گئے۔ اس زمانے میں گاندھی جی خلافت تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے۔ جس میں مولانا نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا نے کانگریس پارٹی کا باقاعدہ رکن بن کر کام شروع کیا۔ ۱۹۳۰ء میں نمک سٹیہ گرہ تحریک کے سلسلے میں مولانا کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایک سال سے زیادہ جیل میں رہے۔ ۱۹۳۹ء میں باقاعدہ مولانا کو کانگریس پارٹی کا صدر منتخب

کر دیا گیا۔

۱۹۴۲ء میں ایک نئی تحریک ”ہندوستان چھوڑو“ کے نام سے شروع کی۔ جس میں کانگریس پارٹی نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستان چھوڑ دے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے کانگریس کے اہم رہنماؤں کو گرفتار کر کے جیل میں بھیج دیا اور مولانا ابوالکلام آزاد کو ۹ اگست ۱۹۴۲ء میں گرفتار کر کے قلعہ احمد نگر کی جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ مولانا کی زندگی کا ایک بڑا حصہ جیل میں گزرا لیکن اس بار قلعہ احمد نگر کی اسیری زیادہ سخت تھی اس میں کسی سے ملنے جلنے کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی خط و کتابت کرنے کی۔ اسی وجہ سے مولانا نے وہاں رہ کر خطوط لکھے اور انہیں اپنے پاس محفوظ رکھے۔ ۱۵ جون ۱۹۴۵ء میں جیل سے رہائی مل جانے کے بعد جب ان کے دوست مولوی اجمل خاں صاحب کو ان خطوط کا علم ہوا تو انہوں نے ان خطوط کو ایک مجموعے کی شکل میں شائع کر دیا اور اس کا نام ”غبارِ خاطر“ رکھا۔ اس خطوط کے مجموعے میں ۲۴ خطوط شامل کئے گئے جن میں سے ۲۰ قلعہ احمد نگر کی جیل میں لکھے گئے، ۲ خط شری نگر میں، ایک خط شملہ میں اور ایک خط ناگپور میں لکھا گیا۔ یہ تمام خطوط مولانا نے صدر پارک جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کے نام لکھے۔ مولانا نے تمام خطوط میں حبیب الرحمن خاں شیروانی کو صدفی مکر م کے نام سے مخاطب کیا۔

ان کے خطوط ادب کے بہترین انشائیے ہیں اور ان میں علمی، ادبی، تحقیقی، سیاسی، سماجی اور مذہبی ہر طرح کے مضامین پائے جاتے ہیں۔ جن کو پڑھنے سے مولانا کی شخصیت کی انفرادیت اور فکر و فلسفہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

”غبارِ خاطر“، ”تذکرہ“، ”ترجمان القرآن“، ”تحریک آزادی“، ”انڈیا نس فریڈم“، ”مسئلہ خلافت“، ”صدائے رفعت“، ”درس وفا“، ”اسلام میں آزادی کا تصور“، ”انسانیت موت کے دروازے پر“، ”ارکان اسلام“، ”افسانہ ہجر و وصال“ وغیرہ آپ کی بہترین تصانیف ہیں۔ مختصراً آپ نے تقریباً ہر میدان میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں خواہ وہ شعر گوئی ہو یا نثر نویسی، تقریر و خطابت ہو یا تصنیف و تالیف، سیاسی میدان ہو یا علمی میدان وغیرہ وغیرہ۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہو گیا اور تقسیم وطن کی وجہ سے ملک میں فسادات ہونے لگے۔ ایسے نازک حالات میں مولانا نے ہندوستانی مسلمانوں کے تحفظ کی ذمہ داری سنبھالی اور بنگال، بہار، آسام اور پنجاب کے دورے کیے اور انہیں راحت کا سامان فراہم کرتے اور تقریریں کرتے۔ مولانا تقریر کے ذریعے عوام کے جذبات سے نہیں کھیلتے تھے بلکہ سننے والوں کے دل و دماغ کو اپنی تقریروں سے متاثر کرتے تھے۔ ان کی تقریریں پر جوش اور ولولہ انگیز نہیں بلکہ فکر انگیز اور بصیرت افروز ہوتی تھیں۔ سننے والوں کو غور کرنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ آخر کار بیشمار قربانیوں کے بعد ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو گیا اور مولانا کو ملک کا پہلا وزیر تعلیم بنایا گیا۔ وہ ۱۱ برس تک ہندوستان کے وزیر تعلیم کے عہدہ پر فائز

رہے۔ اس عہدہ پر رہ کر انہوں نے بے شمار اصلاحات کیں۔ ان کے دور وزارت میں اسکول جانے کی عمر کے سبھی بچوں کے لیے بنیادی تعلیم کو لازمی اور مفت قرار دیا گیا۔ اسی کے ساتھ اعلیٰ تعلیم دینے کے کئی اقدامات کئے گئے اور کئی ادارے اور اکادمیاں قائم کی گئیں جس سے ہرن کے حامل افراد کو فائدہ پہنچا۔

”امام الہند“ مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو دلی میں ہوا۔ آپ کا مزار دلی جامع مسجد کے قریب واقع ہے۔ آپ کا یوم پیدائش ۱۱ نومبر کو ہر سال ”قومی یوم تعلیم“ کے طور پر منایا جاتا ہے۔

☆☆☆



عالمی سیمینار کے اختتامی اجلاس میں ڈاکٹر شاداب علیم پروفیسر توپرجستی، پروفیسر کوہنتیاگی اور امیر مہدی (انگلینڈ) سے ٹرائی حاصل کرتے ہوئے ساتھ میں موجود ہیں پروفیسر جمال احمد صدیقی اور صدر شعبہ اردو



ایک روزہ سیمینار بعنوان ”جوگندر پال: کہانی کی دنیا“ کا افتتاح کرتے ہوئے محترمہ سکریٹریا پال، پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی ساتھ میں موجود ہیں پروفیسر اسلم جمشید پوری اور پروفیسر عابد حسین حیدری

مولانا امتیاز علی عرشی بحیثیت محقق غالب

اردو تحقیق و تدوین کے افق پر مولانا امتیاز علی عرشی کا نام ایک معتبر حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ عرشی صاحب کی علمی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ انھوں نے تاریخ، تذکرہ نگاری، سوانح اور لسانیات سب پر کام کیا، لیکن جس میدان میں انہیں امامت کا درجہ حاصل ہے وہ غالب شناسی ہے۔ ان سے قبل غالب پر لکھنے والے اکثر یا تو تذکرہ نویس تھے یا شارح، جو لفظ کی لفظی و معنوی گتھیاں سلجھاتے تھے۔ متن کی صحت کا سوال ثانوی تھا۔ عرشی صاحب نے اس روایت کو توڑا اور پہلی بار یہ نکتہ اٹھایا کہ جب تک ہمارے پاس غالب کا مستند متن ہی نہ ہوگا، اس پر کی گئی تمام تعبیر و تشریح کی عمارت ریت پر کھڑی رہے گی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بیسویں صدی کے نصف اول تک دیوان غالب کے درجنوں ایڈیشن شائع ہوئے مگر المیہ یہ تھا کہ کوئی ایڈیشن دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ ایک ہی غزل کے مصرعے بدل جاتے، الفاظ آگے پیچھے ہو جاتے اور بعض اشعار سرے سے غائب ہو جاتے۔ اس کی تین بڑی وجوہات تھیں۔ پہلی کا تباہی کی اغلاط، دوسری ناشرین کی تجارتی جلد بازی اور تیسری سب سے اہم استاد ابراہیم ذوق کی اصلاحیں۔ جن کی وجہ سے اصل غالب کہیں گم ہو گیا تھا۔ مولانا عرشی نے اس گمشدہ غالب کو بازیافت کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

اس بازیافت کا نتیجہ ۱۹۵۸ء میں ”دیوان غالب نسخہ عرشی“ کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ نسخہ اردو تحقیق کی تاریخ کا وہ سنگ میل ہے جس کے بعد غالب کا متن ہمیشہ کے لئے متعین ہو گیا۔ اس عظیم الشان کام کے لیے عرشی صاحب نے برسوں رام پور رضا لاہیری میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ وہاں محفوظ قلمی نسخے، بیاضیں اور غالب کے شاگردوں کے وہ نسخے جن پر تصحیح کے نشان موجود تھے، عرشی صاحب کے بنیادی ماخذ بنے۔ ان کا اصول بہت واضح تھا کہ متن کی تصحیح میں ذاتی ذوق، جمالیاتی ترجیح یا روایت کا کوئی دباؤ کوئی دخل نہیں دے گا اور فیصلہ صرف اور صرف قلمی شہادت کی بنیاد پر ہوگا۔ اپنے اس منہج کی وضاحت خود عرشی صاحب نے ان الفاظ میں کی ہے:

”تحقیق میں عقیدت نہیں، دستاویز بولتی ہے۔ غالب کا جو مصرع نسخوں سے ثابت نہ ہو، وہ خواہ کتنا ہی خوبصورت ہو، ہم اسے متن میں داخل نہیں کر سکتے اور جو مصرع نسخوں سے ثابت ہو جائے، وہ خواہ ہمارے شعری مذاق پر گراں

گزرے، ہم اسے خارج نہیں کر سکتے۔“ (دیوان غالب نسخہ عرشی، مرتب
انتیاز علی عرشی، رام پور رضا لاہوری ۱۹۵۸ء، ص ۲۳-۲۲)

یہ جملے عرشی صاحب کے پورے تحقیق کیوں کو سامنے لے آتے ہیں۔
نسخہ عرشی کی تدوین صرف الفاظ کے رد و بدل کا نام نہیں تھا۔ یہ ایک مکمل علمی منصوبہ تھا۔ عرشی
صاحب نے ہر شعر کے تمام دستیاب قلمی نسخوں کا تقابل کیا، اختلاف نسخ کو حاشیے میں درج کیا، مشکل الفاظ
کی لغوی تحقیق کی، تاریخی اشارات کی وضاحت کی اور جہاں ضروری سمجھا فارسی تراکیب کا پس منظر بھی
بیان کر دیا۔ انہوں نے ذوق کی اصلاحوں کو الگ کر کے دکھایا اور بتایا کہ اصل غالب کیا تھا۔ اس کا رنامے
کی اہمیت کا اندازہ ڈاکٹر گیان چند جین کے ان جملوں سے لگائیے:

”نسخہ عرشی کے بعد غالب کے متن پر بحث کا دروازہ بند ہو گیا۔ اب جو کچھ ہے،
وہ تفہیم کا اختلاف ہے، متن کا نہیں۔ عرشی نے غالب کو پہلی بار ایک مستند کتابی
صورت دی۔“

(غالب کی شعری کائنات، ڈاکٹر گیان چند جین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۵)
مولانا عرشی کی غالب شناسی صرف تدوین تک محدود نہیں۔ وہ ایک صاحب طرز شارح بھی
تھے۔ مگر ان کی شرح روایتی شارحین سے الگ ہے۔ وہ شعر کو محض قواعد و معانی کی عینک سے نہیں دیکھتے،
بلکہ اسے انیسویں صدی کی دہلی، اس کی تہذیب، اس کی سیاست اور اس کی معاشرت کے تناظر میں رکھ کر
سمجھتے ہیں۔ غالب کا شعر ”کوئی ویرانی سی ویرانی ہے، دشت کو دیکھ کر گھریا دیا“ کی تشریح میں وہ صرف صحرا
اور گھر کا تقابل نہیں کرتے، بلکہ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی کی اجڑی ہوئی فضا اور غالب کی داخلی بربادی کو
ساتھ ملا کر پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر میں ایک خاص سنجیدگی اور متانت ہے جو قاری کو متاثر
کرتی ہے۔

بیسویں صدی میں غالب پر کام کرنے والے تین بڑے نام ہیں: مالک رام، کالی داس گپتا
رضا اور انتیاز علی عرشی۔ مالک رام کا زور سوانحی جزئیات پر تھا، رضا صاحب نے غالب کے فکری نظام کو
کھولا لیکن عرشی صاحب کا کام ان سب کی بنیاد ہے۔ اس نکتے کو خود مالک رام نے بڑے خوبصورت انداز
میں تسلیم کیا:

”ہم سب غالب کے گھر کی صفائی کرنے والے، اس کے کمروں کو سجانے
والے ہیں، مگر عرشی نے اس گھر کی بنیادوں کو مضبوط کیا ہے۔ بنیاد کے بغیر
سجاوٹ کا کیا بھروسہ۔“

(غالب شناسی کے سو سال، مرتب مالک رام، مکتبہ جامعہ لمینڈ ڈبلیو، ۱۹۶۹ء، ص ۴۲)
مولانا عرشی نے مکاتیب غالب پر بھی گراں قدر کام کیا۔ خطوط کو تاریخ وار مرتب کیا۔ نامعلوم
شخصیات کے تعارف لکھے، اور تاریخی واقعات کے حوالے درج کیے۔ ان کے مرتب کردہ مکاتیب سے

پہلی بار غالب کی نثر کا ارتقاء اور اس کی شخصیت کے نئے گوشے سامنے آئے۔ وہ غالب کو صرف شاعر نہیں، ایک مکمل عہد ساز شخصیت کے طور پر دیکھتے تھے۔

المختصر یہ کہ مولانا امتیاز علی عرشی نے غالب شناسی کو ایک جذباتی اور ذوقی مشغلے سے نکال کر اسے ایک باقاعدہ علمی شعبہ بنا دیا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ ادب سے محبت کا تقاضہ یہ نہیں کہ ہم اس کے متن میں من مانی تبدیلیاں کریں، بلکہ تقاضہ یہ ہے کہ ہم اسے اس کی اصل صورت میں آنے والی نسلوں تک پہنچائیں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے کیا خوب کہا ہے:

”عرشی نے غالب پر احسان نہیں کیا، اردو تحقیق پر احسان کیا ہے۔ اس نے ہمیں سکھایا کہ محقق کیسے بنانا ہے۔“

(تنقیدی نظریات، آل احمد سرور، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، ۱۹۸۲ء، ص ۲۰۳)

مولانا امتیاز علی عرشی نے غالب شناسی کو روایت سے نکال کر تحقیق کے علمی اصولوں پر استوار کیا۔ انہوں نے آنے والے محققین کو یہ سکھایا کہ بڑے ادیب کی صحیح خدمت اس کے کلام کو ہر آمیزش سے پاک کر کے محفوظ کرنا ہے۔ نسخہ عرشی اردو کی وہ دستاویز ہے جس نے غالب کو ہمیشہ کے لئے ایک مستند متن دے دیا۔ جب تک اردو میں غالب کا نام لیا جائے گا، امتیاز علی عرشی کا نام اس کے سب سے دیانت دار اور بااصول خادم کے طور پر احترام سے لیا جاتا رہے گا۔

☆☆☆



شعبہ اردو میں منعقد ایک روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں پروفیسر ونیش کمار، پروفیسر عبداللہ امتیاز (ممبئی) ڈاکٹر انیتا راٹھی کو گلہ دستہ پیش کرتے ہوئے۔ تصویر میں نظر آ رہے ہیں ڈاکٹر ریاض احمد، پروفیسر جمال احمد صدیقی اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری

آہ! فاروق سید

(کل) جب مجھے یہ خبر ملی کہ فاروق سید اپنے مالک حقیقی سے جا ملے تو مجھ پر رنج و غم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ان کے ساتھ گزارے ایک ایک پل یاد آنے لگے۔ یہ بھی یاد آیا کہ ابھی گذشتہ برس انہوں نے ممبئی کے خلافت ہاؤس میں میرے اعزاز میں بڑی ادبی محفل سجائی تھی۔ یہ غالباً 24 ستمبر 2025 کی بات ہے۔ میرے ہمراہ ڈاکٹر ارشاد علی اور عزیزم عرفان عارف تھے۔ ہم لوگ ڈاکٹر منظر کاظمی کی یاد میں دیے جانے والے ایوارڈ کے سلسلے میں بھونڈی گئے تھے۔ وہاں ہم افسر کاظمی کے مہمان تھے۔ واپسی پر ہماری فلائٹ ممبئی سے تھی اور ہمارے پاس ایک دن کا وقت تھا۔ ہم لوگ تقریباً دن کے ایک بجے کے آس پاس ممبئی پہنچے۔ فاروق سید بھائی نے ہمیں ایک ہوٹل میں ٹھہرایا۔ ہمارے لیے ہاٹل کے دو کمرے بک تھے۔ فاروق بھائی کے واسطے ہاتھ نے ہمیں قریب کے ہوٹل میں کھانا کھلوایا۔ ہم نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر شام میں خلافت ہاؤس، ممبئی میں میرے اعزاز میں جلسہ تھا جہاں ممبئی کے اردو والے موجود تھے۔ بڑا شاندار جلسہ ہوا۔ مجھے کہانیاں سنائی تھیں مگر میں نے لوگوں پر بات کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ جلسے کے بعد سبھی کے کھانے کا انتظام تھا۔ فاروق بھائی نے ایک شال اور ایک یادگار رٹرائی عنایت فرمائی۔ پروگرام اتنا شاندار تھا کہ بھولے نہیں بھولتا۔ پروگرام میں سہتیہ اکادمی انعام یافتہ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر، ڈاکٹر اسلم پرویز، اشتیاق سعید، امتیاز گورکھپوری، شاداب مشیر، عبدالباری ایم۔ کے، سلام بن عباس، حامد اقبال، ڈاکٹر قاسم امام وغیرہ موجود تھے۔ اگلے دن ہماری شام سے ممبئی سے دہلی فلائٹ تھی۔ فاروق بھائی صبح ہوٹل آئے اور ہمیں ناشتے کے لیے لے گئے۔ ساتھ ہی انہوں نے ممبئی کی مشہور افلاطون اور نان خطائی مجھے، ڈاکٹر ارشاد اور عرفان عارف کو الگ الگ دی۔ ہوٹل کا کرایہ بھی ہمیں دینے نہیں دیا۔ ان کا خلوص مجھے آج تک یاد ہے۔

ایک بار بنات کے ایک جلسے میں میں، نگار عظیم، شاداب علیم وغیرہ ممبئی گئے۔ بنات کا جو جلسہ ہوا۔ اس کے علاوہ فاروق سید نے ہمارے اعزاز میں ”گل بوٹے“ کے آفس میں ایک ادبی نشست منعقد کی۔ ہم لوگوں نے کہانیاں پڑھیں، فاروق بھائی نے اچھا کھانا کھلوایا، چائے پلوئی اور ہمیں بہت سے تحفے تحائف دیے۔

ایک بار فاروق بھائی ”گل بوٹے“ کے 25 سال پورے ہونے پر ادیبوں اور باذوق

لوگوں کے ساتھ بس میں ممبئی سے دہلی آئے اور ان کا قیام کئی دن دہلی رہا۔ یہاں انہوں نے بڑے شاندار جلسے کیے۔ ایک جلسہ شعبہ اردو JMI میں ہوا۔ دوسرا JNU اور تیسرا شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی میں منعقد ہوا۔ تینوں جلسے بڑے شاندار تھے۔ اتفاق سے میں شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے جلسے میں شریک ہوا۔ وہاں انہوں نے ایک نئی پہل کی۔ بڑا سا بکے اور بکے کے اندر پھولوں کی جگہ تولیوں سے بنے ہوئے پھول تھے۔ وہ سبھی مہمانوں کے استقبال میں دیے گئے۔ میں اپنے آپ کو نئے آئیڈیاز استعمال کرنے والا سمجھتا تھا لیکن مجھے وہاں احساس ہوا کہ میں تو بہت پیچھے ہوں۔

☆☆☆



ڈاکٹر ریاض احمد یک روزہ قومی سیمینار ”ہندوستانی فلم اور اردو“ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے۔



شعبہ اردو میں اعزازیہ کے دوران ڈاکٹر زینبنازا اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے۔

تبصرے

خوشبو ادھر ادھر

شعری مجموعہ: ڈاکٹر فرقان احمد سر دھنوی

شعری مجموعہ "خوشبو ادھر ادھر" ڈاکٹر فرقان احمد سر دھنوی کی شاعری کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو 171 صفحات پر مشتمل ہے۔ مجموعے کی ابتداء عام روایت کے مطابق حمد اور نعت سے کی گئی ہے۔ مجموعے میں 55 غزلیں، 12 نظمیں اور 18 قطعات موجود ہیں۔ جو شاعر کے مختلف صنفِ سخن سے ادبی ذوق و شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ کتاب کے شروع میں شاعر کی مختصر سوانح کوanf تحریر کی گئی ہے جس سے شاعر کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں اس مجموعے میں ڈاکٹر محمد مستر کا تحریر کردہ مضمون "نئی جہتوں کا انوکھا شاعر: فرقان سر دھنوی" شائع کیا گیا ہے۔ جس میں مصنف نے شاعر کے کلام کے مختلف پہلوؤں کو تنقیدی زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی شاعری میں موجود گونا گوں خصوصیات کو اجاگر کیا ہے۔ کتاب کا سرورق خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ کتاب کا انتساب شاعر نے اپنے اساتذہ اکرام اور اپنی دونوں پیاری بیٹیوں کے نام کیا ہے۔ کتاب کے فلیپ پر دونوں طرف اور آخر میں مجموعے سے متعلق قابل قدر پروفیسر مہتاب حیدر نقوی، پروفیسر مولا بخش اور پروفیسر اسلم جمشید پوری کی آراء درج ہیں۔

کتاب کے سرورق پر تحریر فرقان سر دھنوی کا یہ شعر:

اعلان کر رہی ہے یہ اردو ادھر ادھر

محسوس کیجئے میری خوشبو ادھر ادھر

بلاشبہ اس بات کی دلیل ہے کہ اردو اپنی شیرینی، شائستگی اور ثقافت کی وجہ سے ایک ہر دل عزیز زبان ہے۔ جو انسانی جمالیاتی حسن اور حص ذائقہ کی بہترین ترجمان ہے۔ یہ زبان اپنی شیرینی اور کشش کے باعث جب باشعور لوگوں کے دلوں پر اثر کرتی ہے تو یہ اپنی خوشبو سے نہ صرف بولنے والے بلکہ سننے والوں کے جذبات و احساسات کو بھی مہکا دیتی ہے۔ اردو ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کی بہترین ترجمان ہے۔ یہ ایک ایسی دلکش و دلفریب زبان ہے جو سننے والے کو سیدی اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ خصوصاً اردو شاعری نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا بھر کے لوگوں کے دلوں میں اپنی ایک خاص جگہ بنالی ہے۔ دراصل شاعری ایک نازک اور حساس فن ہے۔ جس میں شاعر اپنے تجربات و مشاہدات کو ایک خاص انداز میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ شاعری الفاظ کی ایسی تصویر کشی ہے جس میں کسی خیال کو

سوز و گداز کے ساتھ فنکارانہ انداز میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے جو سامعین کو ذہنی طور پر اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

اردو میں شاعری کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔ جس کا ماضی ایک روشن اور تہذیبی ورثے کا حامل ہے۔ اردو شاعری کی ابتداء تیرہویں صدی یعنی امیر خسرو کے عہد میں ہوئی اور اسے پھلنے پھولنے کا موقع دکن میں ملا۔ وہاں سے ترقی کی منزلیں طے کرتی ہوئی یہ دہلی اور لکھنؤ کے ادبی مراکز سے گزری اور آج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جدید دور میں اپنا جلوہ بکھیرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اردو میں میر، غالب، موسیٰ، اقبال اور فیض احمد فیض جیسے بے شمار باصلاحیت شعرا ہوئے ہیں جنہوں نے فن شاعری کو اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔

غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے جسے ہر عہد میں ہی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اگر ہم کلاسیکی غزل کی بات کریں تو غزل کے بنیادی موضوع حسن و عشق ہیں مگر آج اردو غزل میں ہر طرح کے موضوعات کو آسانی کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ عہد میں ایسے بہت سے شعراء ہیں جو سلیقے سے اردو غزل کی زلفوں کو سنوارنے میں مصروف ہیں۔ جن میں ایک ابھرتا ہوا نام ڈاکٹر فرقان احمد سر دھنوی کا ہے جو کچھلی دو دہائیوں سے اردو شاعری کے میدان میں ہنر آزمائی کر رہے ہیں۔ فرقان سر دھنوی شاعری کے افق پر ایک ابھرتا ہوا روشن ستارہ ہیں۔ انہیں فن غزل گوئی پر مہارت حاصل ہے۔ پیش نظر مجموعہ "خوشبو ادھر ادھر" میں موجود تمام غزلیں فن کے اعتبار سے جامع اور ان کے اسلوب کی انفرادیت کی حامل ہیں۔ اکثر غزلوں کے موضوعات روایتی ہونے کے باوجود بھی اپنے دلکش طرز تحریر اور مخصوص انداز بیان کے سبب اپنے اندر شگفتگی اور تازگی سموئے ہوئے ہیں۔

کیا محبت میں کوئی کام ہو آساں میرا
میرے کہنے میں نہیں ہے دل ناداں میرا
آشیاں اب کہاں جا کے بناؤں آخر
برق سوزاں نے جلا ڈالا گلستاں میرا

فرقان سر دھنوی ایک حساس اور عہد شناس شاعر ہیں۔ ان کے یہاں حسن و عشق کے موضوعات کے علاوہ دیگر فکر آمیز اشعار بھی ملتے ہیں؟ ان کی شاعری کا ایک خاص حصہ اخلاقی شاعری پر مبنی ہے۔ وہ اکثر آسان اور سیدھے سادے انداز میں بڑی اہم اور سنجیدہ باتیں کہہ جاتے ہیں۔ انہیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ دنیا میں آج نفرت، جھوٹ، فریب، خود غرضی اور مفاد پرستی جیسی برائیاں جگہ جگہ موجود ہیں۔ جھوٹ اور فریب کی اس دنیا میں محبت، وفا اور انکساری جیسے کہیں کھو گئی ہے۔ کمزور طبقہ بے بس اور مجبور ہے جو طاقتور طبقے کی ظلم و زیادتی کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ سماج میں جا بجا نفرت کھری ہوئی ہے اور آج ہر سو ظلم، زیادتی، قتل و غارت اور خوں ریزی عام ہوتی جا رہی ہے جھوٹ کا بازار گرم ہے۔ شاعر جب سماج میں پھیلی ایسی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو دیکھتا ہے تو تڑپ اٹھتا ہے۔

دست قاتل میں یہ خنجر نہیں دیکھے جاتے
ہم سے خوں ریزی کے یہ منظر نہیں دیکھے جاتے
جس نے تعمیر کے جذبے کو جلا بخشی ہو
اس سے جلتے ہوئے یہ گھر نہیں دیکھے جاتے

شعری مجموعے کا مطالعہ کرنے پر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ فرقان احمد نے جہاں صنف غزل گوئی کی پاسداری قائم رکھی ہے وہیں ان کی نظم نگاری کا فن بھی قابل ستائش ہے۔ مجموعے میں شامل ان کی سبھی نظمیں بھی اسلوب اور فن کے اعتبار سے کافی پختہ اور جامع نظر آتی ہیں۔ جس میں انہوں نے قافیہ اور وزن کی پابندی کے ساتھ مقصد اور خیال کے تسلسل کو بھی خوبصورتی کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں مختلف مسائل اور موضوعات کا ذکر کیا ہے۔ خاص طور پر ان کی وہ نظمیں قابل تعریف ہے جن میں ان کی حب الوطنی اور وطن پرستی کا جذبہ غالب نظر آتا ہے؟ اس ضمن میں "تاج محل"، "میرا وطن"، "کشمیر"، "وقار وطن" وغیرہ نظمیں کافی اہم ہیں۔
ان کی نظم "میرا وطن" سے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

رنگ وحدت بھی ضروری ہے وطن سازی کو
خون درکار ہے لاریب چمن سازی کو
اس کی ہستی کو بہر کیف سجانا ہے ہمیں
ریشم فردوس بریں اس کو بنانا ہے ہمیں
اس کے دامن پہ سجا دیں گے ستارے ہم لوگ
اس کی کشتی کو لگا دیں گے کنارے ہم لوگ
اس کا ہمسر کوئی ہوگا نہ ہوا ہے اب تک
پرچم ہند جھکے گا نہ جھکا ہے اب تک

فرقان سر دھنوی نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ مختلف قطعات کو بھی بڑی حسن و خوبی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ وہ اکثر بہت سیدھے سادے انداز میں گہری باتیں کہہ جاتے ہیں۔ وہ ایک کھلے ذہن اور بالغ نظر شاعر ہیں۔ حقیقت نگاری ان کے فن کی خاص خوبی ہے۔ وہ سماج اور سوسائٹی میں تیزی کے ساتھ ہونے والی تبدیلیوں اور اس میں موجود طرح طرح کی خامیوں، برائیوں اور نا انصافیوں سے بخوبی واقف ہیں اور سماج میں موجود گونا گوں مسائل پر بھی وہ گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ ایک حق گو اور بے باک شاعر ہیں۔ وہ جب سماج میں موجود کسی برائی کو دیکھتے ہیں تو اسے پوری سچائی کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کر دیتے ہیں۔ جس سے کہیں کہیں ان کے فن میں ایک خاص طرح کا طنز در آیا ہے۔

بتاؤ ظالموں کیا تم نے سوچ رکھا ہے
ہمارے صبر کا کیوں امتحان لیتے ہو

سزائیں دیتے نہیں ہو قصور واروں کو
 اور جو بے قصور ہیں ان کی جان لیتے ہو
 مختصر طور پہ کہا جاسکتا ہے کہ فرقان سر دھنوی نے اپنے خیالات کو بہت خوبصورتی کے ساتھ
 الفاظ کے جامع میں ڈھال کر اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں اچھوتے خیالات، نئے
 زاویے اور فکر و نظر کی ایسی آمیزش ملتی ہے جو ان کے فن کو غیر معمولی بناتی ہے۔ شعری مجموعہ "خوشبو ادھر
 ادھر" ڈاکٹر فرقان احمد سر دھنوی کی پہلی کاوش ہے جو قابل داد ہے۔ میں ڈاکٹر فرقان احمد سر دھنوی کو اس
 مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان کی مزید کامیابی و کامرانی کے لیے دعا کرتا ہوں۔
 بلاشبہ یہ مجموعہ شاعری کے شائقین کے لیے ایک بہترین تحفہ ثابت ہوگا۔

☆☆☆



2026ء میں یو جی سی نیٹ پاس طالبات محترمہ سیدہ مریم الہی، محترمہ فرحت اختر اور زہت اختر

اسلم جمشید پوری کا نیا رجحان ”جدید ترقی پسندی“

عصر حاضر میں پروفیسر اسلم جمشید پوری کسی تعارف کے محتاج نہیں ہے۔ ناول، افسانہ اور افسانوی تنقید میں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے نمایاں پہچان بنائی ہے۔ بات صرف افسانوی ادب کی ہی نہیں بلکہ تحریک، رجحان یا نئے نظریات کو بھی آپ نے ادب کے قارئین تک پہنچانے کا اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ علی گڑھ تحریک، ترقی پسند تحریک، جدیدیت، مابعد جدیدیت کے بعد ادب کے گلیاروں میں کسی نئے رجحان کی تلاش جاری ہے۔ اور نئے رجحان کو تلاش کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے ناقدین ادب اور مشاہیر کے روبرو اپنی نئی کتاب ”نیا رجحان، جدید ترقی پسندی“ پیش کی۔ اس کتاب میں مابعد جدیدیت کا خاتمہ، نیا رجحان، جدید ترقی پسندی، جدید ترقی پسندی نظم، جدید ترقی پسندی اور اردو افسانہ، جدید ترقی پسندی اور اردو افسانہ، جدید ترقی پسندی ناول کے حوالے سے، جدید ترقی پسندی افسانچہ، کولائٹنیک ایک مطالعہ وغیرہ مضامین سے آپ نے قارئین کے روبرو نیا رجحان جدید ترقی پسندی کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی خدمات نے قارئین کو کافی متاثر کیا۔ اس تحریک نے افسانوی ادب، رومان پسندی اور نئے تجربہ بات کے ساتھ ساتھ بہت سے فکشن نگاروں کو کافی متاثر کیا۔ ترقی پسند تحریک نے ابتداء میں نظم کی جانب قدم بڑھائے، اقبال نے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کیا، اقبال، جگر، فیض، مجروح، جذبی، سردار جعفری وغیرہ نے غزلوں میں سنجیدگی کے ساتھ طبع آزمائی کی، ترقی پسند تحریک کے عہد میں جنسی مسائل اور رومانس کو بھی جگہ دی گئی۔ شاعر کے عشق کو بھی محسوس کیا گیا اور اس کی شاعری بھی سنی گئی۔ اب شاعر کے ذہن میں نئی تبدیلیوں کے ساتھ زندگی کو نئے ڈھنگ سے جینے کا سلیقہ بھی شامل ہو گیا۔ بقول پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی ”آج کا اردو شاعر عشق کرنے کے ساتھ ساتھ نوکری بھی کرتا ہے، بسوں میں دھکے بھی کھاتا ہے، بازار کے بھاؤ سے بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس کے ذہن پر صرف رومان کا رنگین غبار ہی نہیں چھایا رہتا ہے۔ اس کے سوچنے کے لئے، اسے تڑپانے کے لئے اور بھی بہت کچھ ہے“۔ ہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ وقت تغیر پذیر ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے بعد جدیدیت کا زمانہ آیا جس کا سہرا پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کے سر باندھا گیا۔ تقریباً بیس پچیس سال کے

بعد ترقی پسندی کا اثر کم ہوا اور اس کی جگہ جدیدیت نے لے لی اور جدیدیت کے تحت ایسا ادب تخلیق ہوا جس نے نہ صرف سب کو چونکا یا بلکہ ادب کو نئے طریقہ سے لکھنا بھی سکھایا۔ جدیدیت کے زیر اثر ادباء اور شعراء نے اپنے قلم کی جولانیوں سے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ پھر بھی اس رجحان میں بہت سے ناقدین کمیاں تلاش کرنے لگے۔ نئے نئے سوالات پیدا ہونے لگے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس رجحان میں بھی کمی آنے لگی۔ اور یہ جدیدیت کا رجحان اب مابعد جدیدیت میں تبدیل ہو گیا۔ بقول پروفیسر اسلم جمشید پوری ”جدیدیت کی جگہ مابعد جدیدیت نے لے لی۔ جدیدیت کے عہد میں تخلیق کردہ ادب میں جو خامیاں راہ پا گئی تھیں ان پر خاص توجہ کی گئی اور کہا گیا کہ مابعد جدیدیت کوئی تحریک ہے نہ رجحان، بلکہ یہ مختلف نظریات اور بیانات کا مجموعہ ہے۔“

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مابعد جدیدیت کو متعارف کرایا اور بعد میں پروفیسر وہاب اشرفی نے بھی مابعد جدیدیت پر خاصی بحث کی۔ مابعد جدیدیت نے ادیبوں اور شعراء کو آزادی کے ساتھ لکھنے کی ترغیب دی مگر پھر بھی تحریکوں اور رجحانوں میں شامل ہو کر شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔ تو پھر آزادی کے ساتھ لکھنا اپنے کو اپنی تخلیقات میں پیش کرنا کیسی آزادی ہے۔ اسی رجحان کو ذہن میں رکھتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کتاب ”نیار رجحان جدید ترقی پسندی“ تخلیق کی۔

علی گڑھ تحریک، ترقی پسند تحریک، جدیدیت، مابعد جدیدیت کے بعد کسی نئے رجحان یا نئی تحریک کی ضرورت ہے یا نہیں اس پر تبادلہ خیال ضروری ہے۔ جب ہم نئے ناقدین اور قارئین کی طرف نظریں مرکوز کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ بہت کم ناقدین، فکشن نگار عصری ادب کا مطالعہ کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر پروفیسر اسلم جمشید پوری عصر حاضر کے ادبی منظر نامے کو قارئین کے روبرو کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا مضمون مابعد جدیدیت کا خاتمہ ہے اس باب میں مصنف نے مابعد جدیدیت پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ اکیسویں صدی کے تقریباً پچیس برسوں میں اردو ادب نے بہت سے واقعات اور حادثات کا مقابلہ کیا۔ ترقی پسندی کے دور میں نعرے بازی، انقلابات، عام انسانوں کے دکھ درد کو محسوس کیا۔ مگر ترقی پسندی کو زوال نے گھیر لیا اور دیکھتے دیکھتے ترقی پسندی کی جگہ نئی تحریک ”جدیدیت“ کے نام سے آگئی۔ جدیدیت کا خاتمہ ہوا اور مابعد جدیدیت کا استقبال کیا گیا۔ مابعد جدیدیت میں ادیب اور شاعر آزاد تھے وہ کسی بھی تحریک یا ازم کے دباؤ سے پوری طرح آزاد تھے۔ لیکن شوکت حیات اور ان کے معاصرین نے مابعد جدیدیت پر اعتراض کیا اور دیکھتے دیکھتے مابعد جدیدیت کا دور بھی چلا گیا اور جدید ترقی پسندی کی آہٹ محسوس ہونے لگی۔ یہ ترقی پسندی کا رجحان سابقہ رجحانوں سے بالکل الگ تھا جس میں نہ کوئی طبقہ تھا اور نہ کوئی گروہ بندی۔ جدید ترقی پسندی میں تخلیق کار کو آزادی کے ساتھ لکھنے کی آزادی ہے۔

کتاب کا دوسرا باب ”نیار رجحان جدید ترقی پسندی“ ہے۔ جس میں مصنف نے ادب کی تمام تحریکیں، اصناف ادب اور رجحانات کو پیش کیا ہے۔ کوئی بھی رجحان یا تحریک صدی کے تقریباً ایک چوتھائی

عرصہ تک ہی اپنے کمالات پیش کرتی ہے۔ ترقی پسند تحریک نے تقریباً پچیس سال کام کیا اور رخصت سفر باندھ لیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ۱۹۵۵ء میں جدیدیت کا آغاز کیا مگر باقاعدہ ۱۹۶۰ء سے نیا راجان یعنی جدیدیت نے اپنے پیر جمائے۔ یہ راجان ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۲ء تک غالب رہا اور اس کے بعد نئے راجان کی آمد ہوئی۔ ۱۹۸۰ء سے مابعد جدیدیت کا زمانہ مانا جاتا ہے۔ اس زمانے میں نئی نئی چیزیں سامنے آئیں، حالات، موضوعات، مسائل وغیرہ میں تبدیلی ہوئی اور ساتھ ہی ادب میں بھی بڑی تبدیلی دیکھنے کو ملی۔ جب تبدیلی ہی قدرت کا قانون ہے تو پھر ہر میلان میں عروج و زوال کا سسٹم بھی ٹھیک ہی ہوتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے بعد پروفیسر اسلم جشید پوری نے جدیدیت کے تعلق سے اچھی گفتگو کی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے جدیدیت کو ایک راجان ہی تسلیم کیا ہے۔ مابعد جدیدیت کو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے متعارف کرایا۔ حقیقت کو رو مانیت، ترقی پسندی جدیدیت، مابعد جدیدیت پر آپ کی گہری نظر تھی۔ آپ نے تمام تحریکوں اور راجان کا مطالعہ کیا تھا۔ آپ جدیدیت کو وحدانی نظریہ ادب تسلیم کرتے تھے مگر یہ بھی سچ ہے کہ کوئی بھی نظریہ یا راجان زیادہ دنوں تک نہیں رک پاتا۔ پروفیسر قدوس جاوید نے تو مابعد جدیدیت کی موت کے نام سے ایک مضمون بھی تحریر کیا تھا۔

پروفیسر اسلم جشید پوری نے اپنی کتاب ”نیا راجان جدید ترقی پسندی“ میں مابعد جدیدیت کے بعد جدید ترقی پسندی پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس صدی میں ناولوں، افسانوں، افسانچوں میں موجودہ عہد کے تغیر کو محسوس کیا جا رہا ہے۔ نئے نئے موضوعات پر بحث کے دریا بہائے جا رہے ہیں۔ جدید ترقی پسندی کے تعلق سے ناقدین ادب میں ایک نئی بحث چھڑ گئی ہے۔ کسی ناقد نے کہا کہ یہ نئی ترقی پسندی ہے، کوئی کہتا ہے کہ جدید ترقی پسندی میں عصر حاضر کے تمام مسائل و میلانات شامل ہیں۔ معروف ناقد ش۔ اختر نے اپنی کتاب ”نئی ترقی پسند تنقید“ میں نئی ترقی پسندی کے تمام اصولوں، ضابطوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ دہشت گردی نے دنیا کو عیسائی اور مسلم ممالک میں تبدیل کر دیا ہے۔ کوئی بھی ترقی پسند ناقد ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کر سکتا ہے۔ جدید ترقی پسندی پر پروفیسر قدوس جاوید کے بھی کئی اہم مضامین قارئین کو چونکا نے کا کام کر چکے ہیں۔ مابعد جدیدیت کے بعد اب آہستہ آہستہ نئے راجان ”جدید ترقی پسندی“ نے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ اور یہ نئی جدید ترقی پسندی نئے طریقہ کار کے ساتھ لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔

کتاب ”نیا راجان: جدید ترقی پسندی“ کا تیسرا باب ’جدید ترقی پسند غزل‘ ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں ترقی پسندی کے عہد میں رونما دکھاوا کی مختلف جھلکیوں کو پیش کیا ہے۔ بناوٹی تنظیمیں، اسکیمیں، غریبوں، یتیموں کے ساتھ بناوٹی ہمدردی کو فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کر کے ترقی پسند راجان کی کمیوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ ان اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسندی کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ نیا راجان ”جدیدیت“ آگیا۔ تقریباً بیس سال تک جدیدیت نے اپنا کرشمہ دکھایا لیکن یہ سچ ہے کہ کوئی بھی

رجحان چاہے کتنا ہی اہمیت کا حامل ہو، اس میں تبدیلی لازمی ہے۔ جدیدیت بھی اپنے جلوے دکھا کر رخصت ہو گئی۔ اور جدیدیت کی جگہ مابعد جدیدیت نے لے لی۔ مابعد جدیدیت کو پروفیسر شمس الرحمن فاروقی نے استحکام عطا کیا۔ پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کے بعد، پروفیسر شمیم حنفی، وارث علوی، حامدی کاشمیری وغیرہ نے کافی کوششیں کر کے اس کو ادب میں متعارف کرایا۔ مگر اب یہ حضرات بھی رخصت ہو گئے۔ اکیسویں صدی نے دستک دی اور نئی صدی کے ساتھ ساتھ بہت سی نئی چیزیں بھی سامنے آنے لگیں، موبائل، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، فیس بک، واٹس ایپ نے انسانی زندگی کو خاصا متاثر کیا۔ نئی صدی میں نئے دور کا آغاز ہوا۔ دلت سماج کی فکر کی جانے لگی۔ دلتوں کو کہانیوں میں شامل کیا گیا، افسانوں اور ناولوں میں دلت مسائل کی بحث چھڑ گئی۔ جدید ترقی پسندی میں نئے لفظیات کے ساتھ نئی غزل نے سماج کے تمام مسائل کو سمیٹ لیا ہے۔ جدید ترقی پسند غزل گو شعراء نے تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لا کر غزل میں وسعت پیدا کی۔ سید احمد شمیم، فرحت احساس، خورشید اکبر، جمال اویسی، خالد عبادی وغیرہ کے کلام میں دانشورانہ ذہن، بے پناہ صلاحیت، ترقی پسندوں کا احتجاج، نیا فکر اور پختگی صاف نظر آتی ہے۔

اسی عہد میں سرور ساجد، راشد انور راشد، علیم صبا نویدی، شجاع خاور، بشیر بدر، عالم خورشید، جمال اویسی وغیرہ نے ہمیں نئی دنیا سے واقف کرایا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

ابھی تو سر کی ہے تھوڑی نقاب چہرے سے
مگر یہ دھوپ کی شدت کہ بس معاذ اللہ

(سید احمد شمیم)

ہمارے خوابوں کی تعبیر ممکن ہی نہیں عالم
مگر یہ بھی نہیں ممکن کہ خوابوں سے مکر جائیں

(عالم خورشید)

میں غزل کا میر و غالب تو نہ بن پایا مگر
ان کے لہجے میں ہمیشہ گفتگو کرتا رہا

(شمس رمزی)

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

(بشیر بدر)

تم اپنے پیار کا سیلاب لے کے مت آنا
ابھی شہر میں کچے مکان والے ہیں

(سرور ساجد)

جدید ترقی پسند شعراء نے اپنی غزلوں سے سماج و معاشرہ کی تبدیل ہوتی ہوئی سیاسی، معاشی،

اقتصادی حالت کو فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس کا مقصد صرف انسانی زندگی اور عالم انسانیت کی حفاظت کرنا ہے۔

نیار۔ حجان جدید ترقی پسندی کا چوتھا باب ”جدید ترقی پسند نظم“ ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اس مضمون میں جدید ترقی پسند نظم کے حوالے سے عمدہ اور تفصیلی گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ غزل کی مانند نظم نے بھی اردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ نظیر اکبر آبادی، حالی، محمد حسین آزاد، اسماعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی نے نظم کے میدان کو خاصا وسیع کیا۔ مولانا محمد حسین آزاد کو جدید نظم کا بانی کہا جاتا ہے۔ اردو نظم کی ابتداء میں مولانا حالی، محمد حسین آزاد اور ان کی ترجمہ شدہ، طبع زاد نظموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اقبال، اسماعیل میرٹھی، قلیق میرٹھی، بیاں میرٹھی، افسر میرٹھی، چکبست وغیرہ نے اپنی نظموں سے قارئین کو متاثر کیا۔ جب جدیدیت کا عہد آیا تو نئے نئے تجربات سامنے آئے۔ پابند نظم اور آزاد نظموں پر خاصا زور دیا گیا۔ جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت آئی اور اس عہد میں علامتوں، تجربوں کا دور آکر ہم سے رخصت ہو گیا۔

یہاں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے مابعد جدیدیت پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے مابعد جدید نظم کے شعراء کو بھی خاصا متعارف کرایا اور بتایا کہ ان شعراء میں ش۔ ک۔ نظام، ف۔ س۔ اعجاز، رفیعہ شبنم عابدی، عذرا نقوی، شہناز نبی وغیرہ نے اپنی نظموں میں نئے خیالات، نئے جذبات اور نئے احساسات کو خاص جگہ دی اور یہ سچ ہے کہ مابعد جدیدیت کا دور ایک ایسا دور تھا جس میں کوئی ازم نہیں تھا۔ کوئی نیا رجحان نہیں تھا اور یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ اب کوئی نیار۔ حجان سامنے نہیں آئے گا۔ جب کہ یہ سچ ہے کہ وقت ہر شے کو تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ رجحان بھی تبدیل ہو گیا۔

نئی صدی میں نئے خیالات، رجحانات سامنے آ رہے ہیں۔ اس صدی کو جدید ٹیکنالوجی کی صدی سے موسوم کیا جا رہا ہے۔ سائنس، کمپیوٹر، واٹس ایپ، فیس بک وغیرہ نے انسانی زندگی کو تبدیل کر دیا ہے۔ مہینوں کا کام اب دنوں میں ہو رہا ہے۔ تمام کاموں کو اب کمپیوٹر کے ذریعہ ہی انجام دیا جا رہا ہے۔ انسانی زندگی میں سہولیات بڑھ گئی ہیں۔ ساتھ ہی رشتوں کا ٹوٹنا، بکھرنا، آپسی رنجش وغیرہ کو جدید ترقی پسندی میں خاص طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس صدی میں نئی نسل کے بے شمار شعراء سامنے آ رہے ہیں جو اپنی نظموں میں نئی صدی کے نئے مسائل کو نئے طریقوں سے پیش کر رہے ہیں۔ ان شعراء میں طالب زیدی، راشد انور راشد، سید اطہر الدین اطہر، قمر سرور، شبنم عشائی، صادق نواب سحر، ولا جمال العسلی، فوزیہ رباب وغیرہ نے نئے موضوعات پر نظمیں تخلیق کی ہیں۔ چند نظموں کے چند مصرعے مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے:

دہشت گرد کون

تم ایک قوم کو دہشت پسند کہتے ہو

اکھاڑ پھینکو گے دہشت تمہیں یہ دعویٰ ہے

ذرا صحیفہ ماضی کی گرد تو جھاڑو

ذرا گزشتہ سیاست اپنی یاد کرو
چھپائے صدیوں تلک قلب میں قوموں کے
ان اپنے زہر بھرے نشتروں کو یاد کرو

(سید اطہر الدین اطہر)

فرق

میں بھی پیدا ہوئی
وہ بھی پیدا ہوا
میں آئی تو خوشیاں بہت تھیں مگر
وہ آیا تو شادیانے بچے
میں فکر ماں باپ تھی
وہ فخر ماں باپ تھا
میں غم خوار تھی
وہ جلالی بہت تھا
میں فرماں بردار تھی،
وہ باغی بہت تھا....
کیونکہ..... میں عورت تھی
اور..... اور وہ مرد تھا

(نگار عظیم)

پروفیسر اسلم جمشید پوری نے جدید ترقی پسند نظم کے شعراء کے حوالے سے ایسے شعراء کو پیش کیا جنہوں نے بیسویں صدی کے آخر میں لکھنا شروع کیا مگر ان کی پہچان اکیسویں صدی میں بنی اور بہت سے شعراء نے نئی صدی میں نئے موضوع کا استعمال کر کے نئی صدی میں نظم کے میدان کو وسیع کیا۔ اور آج بھی جدید ترقی پسندی کے عہد میں شعراء اور بہت سے فکشن نگار نظم کے خلاف احتجاج کے جھنڈے بلند کر رہے ہیں۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری یہ محسوس کرتے ہیں کہ اب نئی صدی میں چاروں جانب ظلم کا دائرہ پھیلا جا رہا ہے۔ طاقت ور انسان کمزور پر ظلم کر رہا ہے۔ بہت سی سرکاری ڈرا اور خوف کے ساتھ طاقت کے دم پر ڈرانے دھمکانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ دلتوں اور سماج کے کمزور طبقوں پر ظلم عام ہو رہا ہے۔

کتاب نیارہ جان جدید ترقی پسندی کا پانچواں باب ”جدید ترقی پسندی اور اردو افسانہ“ ہے۔ اس مضمون میں ہم جدید ترقی پسند افسانے میں شامل تمام مسائل و میلانات اور نئی صدی میں نئے رجحانات کے تعلق سے اہم معلومات حاصل کرتے ہیں۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے بتایا کہ اب اس صدی میں انسان کئی کئی سال کا کام گھنٹوں میں کر رہا ہے۔ آج ادب کا ہر قاری یہ محسوس کر رہا ہے کہ سماج و

معاشرہ میں تیزی سے تبدیلی ہو رہی ہے۔ علم و ادب میں بھی تبدیلی آگئی ہے۔ بدلتے رجحان کے ساتھ ساتھ ادب و زبان میں بدلاؤ آیا ہے۔ نئے افسانے، نئے ناول تخلیق ہو رہے ہیں۔ ان ناولوں اور افسانوں میں دلت مسائل پر بھی خوب لکھا جا رہا ہے۔ منشی پریم چند، کرشن چندر، منٹو عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، اسلم جمشید پوری وغیرہ کی تخلیقات میں دلت مسائل کو نئے ڈھنگ سے پیش کیا جا رہا ہے۔ افسانوں میں اقلیتی ڈسکرس کو بھی شامل کیا جا رہا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید نے اپنے مضمون میں مابعد جدیدیت کی موت کا اعلان بھی کر دیا ہے اور اسلم جمشید پوری نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بیسویں صدی ہے اور نئی صدی میں نیارہجھان آچکا ہے۔ جسے ہم ”جدید ترقی پسندی“ کے نام سے جانتے ہیں۔ بقول پر وفسر اسلم جمشید پوری ”جہاں تک اردو افسانوں میں جدید ترقی پسندی کا سوال ہے تو یہ بالکل واضح ہے کہ نئی صدی میں حالات پہلے سے بالکل مختلف ہیں۔ ہر طرف نفرت کا بازار گرم ہے۔ کیا ہندوستان، کیا دنیا، ہر سمت مسلمانوں کو تختہ مشق بنایا جا رہا ہے۔ شک کی نظروں سے دیکھا جا رہا ہے۔ دلتوں کی بھی حالت غیر ہے۔ انہیں ہندوستان میں آج بھی حقارت سے دیکھا جا رہا ہے۔ تجھ اور ناپاک سمجھا جا رہا ہے۔ مندروں میں آج بھی ان کے داخلے پر پابندی ہے“۔ نئی صدی میں نیارہجھان جدید ترقی پسندی کے زیر سایہ بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں دلت مسائل کے ساتھ ساتھ دلت ڈسکرس، غریبوں، مزدوروں، کسانوں کے مسائل کو فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں میں مبین مرزا، نورین علی حق، احمد صغیر، نورالحسین، نگار عظیم، شوکت حیات ذوقی، اشتیاق سعید، شہناز رحمن وغیرہ نے جدید ترقی پسند افسانے قارئین کو عطا کئے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے افسانوں میں نئے الفاظ اور نئے موضوعات کا بخوبی استعمال ہو رہا ہے۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری کی کتاب نیارہجھان: جدید ترقی پسندی کا چھٹا باب ”جدید ترقی پسند ناول کے حوالے سے“ ہے۔ اس مضمون میں ناول کے حوالے سے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے ترقی پسند تحریک سے نئی صدی تک منظر عام پر آنے والے ناولوں میں نئے رجحان کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ ترقی پسند تحریک آئی اور چلی گئی۔ ترقی پسند تحریک کے بعد جدیدیت آئی اور رخصت ہو گئی۔ جدیدیت کے بعد ایک اور نیارہجھان مابعد جدیدیت کے نام سے آیا اور اپنے جلوے بکھیر کر رخصت ہو گیا۔ مابعد جدیدیت کے بعد کسی نے بھی نئے رجحان کا اعلان نہیں کیا۔ مگر نئی صدی میں نیا ادب تخلیق ہونے لگا۔ نئے موضوعات سامنے آنے لگے، نئے ناقدین، محققین، فکشن نگار، شعراء کے ذہنوں میں بھی تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے اور دیکھتے دیکھتے جدید ترقی پسندی کی آہٹ محسوس ہونے لگی۔

نئی صدی میں نیارہجھان تو سامنے آگیا مگر اس میں کوئی نعرہ نہیں ہے۔ صرف معاشرہ اور فرد کی بات ہوتی ہے۔ دلتوں کے مسائل اور ڈسکرس کی بات ہوتی ہے۔ اب تخلیق کار آزاد ہے۔ آزادی سے ناول اور افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ نئی صدی میں منظر عام پر آنے والے ناولوں میں دو یہ بانی، چھرا سر، ختم خوں، دروازہ ابھی بند ہے وغیرہ ایسے ناول شائع ہوئے جن میں دلت مسائل، دلتوں کی ناامیدی، محرومی،

ناکامی، دلت لڑکیوں کی عصمت دری پر خوب لکھا جا رہا ہے۔ دلت ڈسکوس کے حوالے سے احمد صغیر کا ناول دروازہ ابھی بند ہے، بہت خوبصورت ناول ہے۔ جس میں لڑائی جھگڑے فسادات، آتش زنی، خواتین کی ناامیدی کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول نگار اب نئے مزاج، نئے ذہن اور آزادی کے ساتھ لکھنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ یہ سب جدید ترقی پسندی کی ہی دین ہے اور پروفیسر اسلم جمشید پوری کا نیارہجان نئے سماج و معاشرہ کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اس نئے رجحان کے ساتھ کولائٹکنیک نئے ناولوں میں استعمال ہو رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ تکنیک مغرب سے آئی اور اس نئے طریقہ کار نے نئی نسل کو غور کرنے پر مجبور کیا۔ یہ سب جدید ترقی پسندی کی ہی دین ہے۔

کتاب نیارہجان: جدید ترقی پسندی کا ساتواں باب ”جدید ترقی پسند افسانچہ“ ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ نئی صدی میں افسانچہ اور افسانچہ نگاری کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ جو گندر پال، ایم اے حق، بشیر مالیر کوٹلوی، رونق جمال، رتن سنگھ، دپیک بدکی، تنویر اختر رومانی، اسلم جمشید پوری وغیرہ نے افسانچہ کی نئی راہیں ہموار کی ہیں۔ نئے افسانچہ نگاری کی صدی میں اچھے افسانچے لکھ رہے ہیں۔ نئے نئے موضوعات پر افسانچہ لکھے جا رہے ہیں۔ افسانچہ کے فن، اسلوب اور اس کی تکنیک کو بھی نئے نئے طریقوں سے پیش کیا جا رہا ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اپنی اس کتاب میں بہت سے اہم افسانچہ نگاروں کے افسانچوں کو حوالہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ نئے افسانچہ نگاروں میں ارشد منیم، علیم اسماعیل، طاہر انجم صدیقی، فیض قاضی آبادی، اسماعیل گوہر، سلمیٰ صنم، اختر آزاد وغیرہ نے افسانچہ کے میدان کو وسیع کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی جو قلم کار افسانوں کے ساتھ ساتھ افسانچوں میں خاصی طبع آزمائی کر رہے ہیں ان میں مہتاب عالم پرویز، ناصر آزاد، ریاض توحیدی، سراج فاروقی، خالد بشیر تلگامی، رقیہ جمال وغیرہ بھی اہم نام ہیں۔ کچھ اہم افسانچہ نگاروں کے افسانے نچے ملاحظہ کیجئے۔

(۱) فاصلے: میں ان دنوں کئی بار اپنے راکٹ میں بیٹھ کر چاند تک ہوا یا ہوں۔

لیکن ایک موت ہوگئی۔ دس قدم چل کر اپنے بھائی سے ملنے نہیں گیا۔

(جو گندر پال)

(۲) جھوٹی شان: وہ تھری اسٹار ہوٹل سے نکلا تھا کہ پاس کھڑے بھیک منگے

نے اپنا گندہا تھ اس کے سامنے پسار دیا۔ اس نے حقارت بھری نگاہ اس پر ڈالی

اور دس کانوٹ تھادی..... دربار کو۔ (ایم۔ اے حق)

(۳) شترمرگ: میں اٹھا اور کھڑکی کا پردہ سرکایا۔

باہر خونریزی ہو رہی تھی اور مکان جل رہے تھے۔ جن کے دھوئیں سے صاف

دکھائی نہیں دے رہا تھا البتہ اتنا تو ظاہر تھا کہ یہ سب کچھ میرے مکان سے بہت

دور ہو رہا تھا۔ اس لئے میں نے خدا کا شکر ادا کیا، میں واپس اپنے لحاف میں

گھس گیا۔ اور شترمرگ کے مانند سر چھپا کر بے فکر سو گیا۔ (دپیک بدکی)

مندرجہ بالا افسانچوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ احساس جاگتا ہے کہ افسانچے میں بھی کہانی ہوتی ہے اور سماج و معاشرے کی بدلتی تصاویر کو بھی افسانچوں میں فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ افسانچہ نگار اپنے افسانچوں میں ظلم کے خلاف احتجاج بھی کرتا ہے اور اپنے قلم سے تلوار کا کام بھی لیتا ہے کیونکہ ظالم کا کوئی مذہب نہیں ہوتا وہ صرف ظلم کرتا ہے۔ جدید ترقی پسندی ان تمام جدید ترقی پسندی کے دائرہ عمل میں شامل ہے۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری کی کتاب نیا رجحان: جدیدی ترقی پسندی کا آٹھواں باب ”کولاژ تکنیک ایک مطالعہ“ ہے۔ اس میں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے بہت سی تحریکوں اور رجحانوں پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے کولاژ تکنیک پر تفصیلی بحث کی ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری اس مضمون میں یہ بتاتے ہیں کہ کولاژ تکنیک مغرب میں بہت پہلے آچکی تھی۔ اور ہندوستان میں اس کی آمد اب ہوئی ہے۔ اردو ادب میں جب نئے ناول اور نئے افسانے و دیگر تنقیدی و تحقیقی مضامین پڑھتے ہیں تو لگتا ہے کہ نئی صدی میں لکھے جانے والے ادب میں اس تکنیک کا خوب استعمال ہو رہا ہے۔ بقول پروفیسر قدوس جاوید

”کولاژ ناول کو مغربی فکشن نگاری میں خاص مقبولیت حاصل ہوئی اور کئی فکشن نگاروں نے اس نئی افسانوی صنف میں طبع آزمائی کی۔ کولاژ ناول کے تکنیکی اور

فنی امتیازات کئی ہیں۔ کولاژ ناول زبان مرکز (Language based) ہے۔ لیکن اس میں عام ادبی ناولوں کی طرح معیاری ادبی زبان، الفاظ و محاورات ہی کے استعمال کی شرط نہیں ہوتی بلکہ کولاژ ناول کا شناختی امتیاز یہ ہوتا ہے کہ کولاژ ناولوں میں مختلف شہری اور دیہی ماحول معاشرہ کے معیار الفاظ و تراکیب، محاورہ اور ضرب الامثال کے ساتھ ساتھ ٹھیکہ دہی بولیوں کے مخصوص دہقانی الفاظ و استعارات اور اصطلاحات کا بھی آزادانہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور یہ ہی امتیازات کولاژ ناول کے تکنیکی، فنی اور جمالیاتی محسن (شرائط) قرار پائے۔ جنہیں ہم ”کولاژ ناول“ کی شعریات بھی کہہ سکتے ہیں۔“ (دھنورا: ایک تجزیاتی مطالعہ، ڈاکٹر ارشاد سیانوی ص ۶۷)

عہد حاضر میں ناول اور افسانچوں میں کولاژ تکنیک کا خوب استعمال ہو رہا ہے۔ نئی صدی میں بہت سے ناول اسی تکنیک کا سہارا لے کر لکھے جا رہے ہیں۔ ناول چاند ہم سے باتیں کرتا ہے، شیلٹر ہوم شیلٹر، دھنورا، میں تمثال ہوں وغیرہ کولاژ تکنیک کے تحت لکھے گئے ناول ہیں۔ ناولوں کے ساتھ ساتھ افسانوں، نظموں، غزلوں میں اس تکنیک کا بخوبی استعمال ہو رہا ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح اردو میں کئی ناول ضبط تحریر میں آچکے ہیں۔ دن بہ دن اس تکنیک کا ناول لکھنے میں استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر اردو میں اس قسم کا پہلا ناول نور الحسنین کا ”چاند ہم سے باتیں کرتا ہے“ ہے۔ افسانوں کی بات کی جائے تو متعدد افسانہ نگاروں کے یہاں اس تکنیک کا استعمال ہوا

ہے۔ شوکت حیات، ذوقی، اختر آزاد، رحمن عباس وغیرہ کے افسانے اسی تکنیک پر ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عہد حاضر میں ناولوں، افسانوں، غزلوں، نظموں اور دیگر تحقیقی و تنقیدی تحریروں میں بھی یہ تکنیک نظر آ رہی ہے۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اپنی کتاب نیا رحمان: جدید ترقی پسندی میں ایک افسانہ ”آدھی ادھوری کہانی“ کے نام سے شامل کیا ہے۔ اس کہانی میں کولائز تکنیک کا خاصا استعمال ہوا ہے۔ کہانی ”آدھی ادھوری کہانی“ کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

”ایک خاتون صحافی کا قتل..... ہر طرف خاموشی اور سناٹا ہے۔ جمہوریت سسک

رہی ہے صدائے احتجاج بھی اٹھنے سے قبل خاموش ہو گئی ہے۔“

پروفیسر اسلم جمشید پوری کی کتاب کا دسواں باب ”اقلیتی ڈسکورس“ ہے۔ ادب تخلیق کرنے کا یہ ایک اہم اور منفرد انداز ہے۔ جب اقلیتی اعتبار سے یا اقلیتوں پر برپا ظلم و ستم کے حالات کا تخلیقات میں بیان کیا جاتا ہے تو اسے اقلیتی ڈسکورس کا نام دیا جاتا ہے۔ اردو میں اقلیتی ڈسکورس کو متعارف کرانے والے پروفیسر قدوس جاوید اردو زبان و ادب کے ایک معتبر اور ممتاز ناقد ہیں۔ آپ کو اردو تنقید میں اعتبار و استناد کا درجہ حاصل ہے۔ اسلم جمشید پوری کی جدید ترقی پسندی میں دلت ڈسکورس، اقلیتی ڈسکورس اور کولائز تکنیک کے ذریعہ قارئین تک رسائی کرنا ان کے نئے رحمان میں شامل ہے۔ جسے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے جدید ترقی پسندی کا نام دیا ہے۔ کہانی کے علاوہ صاحب کتاب نے ایک افسانہ ”یزید عصر“ بھی شامل کیا ہے۔ اس افسانے میں بھی اقلیتی ڈسکورس کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔

کتاب نیا رحمان: جدید ترقی پسندی کا بارہواں باب ”دلت ڈسکورس اور اردو فکشن“ ہے۔ دلت ڈسکورس میں سماج و معاشرہ کے تمام مسائل کو پیش کیا جاتا ہے۔ فشی پریم چند، کرشن چندر، بیدی، غفصفر، صغیر رحمانی، شموکل احمد وغیرہ نے اپنے ناولوں کے ذریعہ اردو میں دلتوں کے مسائل کو فن کاری سے پیش کیا ہے۔ فشی پریم چند سے لے کر شموکل احمد، اشتیاق سعید، سلام بن رزاق، ذوقی، شبیر احمد، ترنم جہاں شبنم، خورشید حیات، اسرار گاندھی وغیرہ کی تخلیقات میں دلت مسائل اور دلت موضوعات پر کئی افسانے اور ناول لکھے جا چکے ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اپنا افسانہ ”گو دان سے پہلے“ بھی شامل کیا ہے۔ جو دلت ڈسکورس پر ہی لکھا گیا ہے۔ اس افسانہ کے کردار بیرونی تائی، ہرپال تاؤ نے ایک گائے اپنی اولاد کی طرح پالی۔ گائے کے تھن میں دودھ سوکھ جانے کے بعد گھر میں روزی روٹی کی کمی ہو گئی۔ گائے کو دان کرنے کی بات سوچی جانے لگی۔ جب گائے کو دان کرنے لے جاتے ہیں تو دونوں بوڑھے اور بڑھیا کو بری طرح پیٹا جاتا ہے۔ ان کے ڈرائیور کو بھی بری طرح مارا جاتا ہے۔ سب روتے چیختے ہیں مگر وہاں کوئی سننے والا نہیں ہوتا۔

”ارے ہم گائے کو آثرم دان کرنے لے جا رہے ہیں۔“

گو دان.....

چپ بے سالے..... بڑا آیدان کرنے..... قصائی کو بیچنے لے جا رہا ہے۔“
 (گوہدان سے پہلے، پروفیسر اسلم جمشید پوری)
 اس افسانے کے ذریعہ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے مآب لچنگ، فرقہ وارانہ فسادات کو فن کاری سے پیش کیا ہے، نئی صدی میں اس طرح کے افسانے خوب لکھے جا رہے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر اسلم جمشید پوری کا نیارہجان: جدید ترقی پسندی ایک ایسا نیارہجان ہے جس کے تحت آج کے نئے مسائل کو آزادی کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ اب تک کی تمام تحریکات کے بعد اب اس نئی صدی میں نیارہجان آیا جسے جدید ترقی پسندی کے نام سے تسلیم کیا جا رہا ہے۔ جدید ترقی پسندی کا یہ نیا رجحان نئی صدی کے نئے فکشن نگاروں کے ذہنی توازن میں بھی گھر کر گیا ہے۔ مابعد جدیدیت کے بعد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے سب کا ذہن اس نئے رجحان کی جانب متوجہ کرانے کی کوشش کی ہے۔ آج کی صدی یعنی نئی صدی میں منظر عام پر آنے والے ناولوں، افسانوں، نظموں، غزلوں وغیرہ میں جدید ترقی پسندی پیش پیش نظر آرہی ہے اور اب یہ نیارہجان اردو ادب میں پوری طرح شامل ہو گیا ہے۔ جس کے لئے پروفیسر اسلم جمشید پوری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

☆☆☆



اعزازیہ کے موقع پر، پروفیسر اسلم جمشید پوری، محترم بی بی شرماء، محترم آفاق احمد خان اور محترم شکیل سیفی سے محترم حقانی القاسی ٹرافی حاصل کرتے ہوئے ساتھ میں موجود ہیں محترم عابد سیفی

حرفوں کا جادو (رشید حسن خاں)

[مرتب: ڈاکٹر ابراہیم افسر]

کتاب ”حرفوں کا جادو“ اردو زبان و ادب کے مایہ ناز محقق، مدون اور ماہر لسانیات رشید حسن خاں کی تحریروں کا ایک اہم مجموعہ ہے۔ اس کتاب کو اردو کے ممتاز عالم و فوجوان اسکالر ابراہیم افسر نے بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا ہے۔ رشید حسن خاں اپنی پوری زندگی اردو زبان کی صحت، املا کی درستی اور تحقیق کے معیار کو بلند کرنے میں مصروف رہے۔ ”حرفوں کا جادو“ دراصل خاں صاحب کے ان بکھرے ہوئے آٹھ املائی مضامین کا مجموعہ ہے جو رسالہ پیام تعلیم (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی) میں 73-1972 میں شائع ہوئے تھے لیکن ایک جگہ دستیاب نہ تھے۔ حالاں کہ رشید صاحب نے ان مضامین کو اپنی کتاب ’اردو کیسے لکھیں‘ میں ترمیم و اضافہ کے ساتھ شامل کیا ہے۔ لیکن زیر نظر کتاب میں رشید صاحب کے وہ اولین مضامین شامل ہیں جو انھوں نے خالصتاً بچوں کے لیے لکھے تھے۔ ڈاکٹر ابراہیم افسر، جو رشید صاحب کے کام کے بہترین شارح مانے جاتے ہیں، نے ان تحریروں کو یکجا اور رشید صاحب کی صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر شائع کر ایک دستاویزی شکل عطا کی ہے۔

زیر نظر کتاب کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو رشید حسن خاں کے علمی تنوع کو ظاہر کرتے ہیں۔ کتاب کا بڑا حصہ اردو املا کے مسائل، لفظوں کی ساخت اور ان کے درست استعمال پر مبنی ہے۔ رشید حسن خاں کا موقف رہا ہے کہ زبان کی بنیاد اس کے حروف اور املا کی صحت پر ہوتی ہے۔ اس کتاب میں بچوں کی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے رشید صاحب کے لکھے گئے بصیرت افروز مقالات ہم سب کے لیے قابل تقلید ہیں۔ اس موقع پر ”حرفوں کا جادو“ کتاب میں شامل رشید صاحب کی علمی و ادبی جہات کو سمجھنے کے لیے رسالہ پیام تعلیم کے مدیر محمد حسین حسنان ندوی کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

”آئیے آج آپ کو ایک نئے بزرگ سے ملائیں۔ جناب رشید حسن خاں صاحب سے۔ بڑوں کی دنیا میں تو بہت دنوں سے مشہور ہیں۔ اردو کے بہت بڑے عالم ہیں۔ یوں کہیے کہ بہت بڑے ریسرچ اسکالر ہیں۔ ریسرچ اسکالر وہ لوگ کہلاتے ہیں جو علمی مسئلوں کی تحقیق اور چھان بین میں لگے رہتے ہیں۔ رشید حسن خاں صاحب نے بھی ایک مدت سے اردو زبان کو اپنا اوڑھنا

بچھونا بنالیا ہے۔ رات دن اسی میں لگے رہتے ہیں۔ مکتبہ جامعہ کی خاص طور پر سرپرستی فرماتے ہیں۔ مکتبہ ایک عرصہ سے معیاری کتابیں یا کلاسکس شائع کر رہا ہے۔ رشید حسن خاں صاحب نے اس کام میں مکتبے کی خاص طور پر مدد کی ہے۔ ہماری بہت دنوں سے خواہش تھی کہ خاں صاحب سے آپ کے پیامِ تعلیم کے لیے بھی کچھ لکھوائیں۔ مگر کچھ تو وہ تحقیق کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ کچھ یہ خیال تھا کہ بچوں کے لیے بچوں کی زبان میں لکھنا ان کے لیے مشکل تھا۔ پر اپنے ادارے کا خیال بھی تھا۔ آخر ایک دن ہمت کر ہی ڈالی اور ایسی چیز لکھ دی کہ بس پڑھ کے دیکھیے۔ خاں صاحب نے سچ مچ جادو جگایا ہے۔ ایسی پیاری ٹھہری ستھری ایسی صاف اور سادہ زبان لکھی ہے کہ مضمون پڑھ کر مزہ آ جائے گا۔“

رشید حسن خاں اپنی بے باک تنقید کے لیے مشہور تھے۔ اپنے مضامین میں انھوں نے معاصر املا شناسوں کے کام کا علمی محاسبہ کیا ہے اور درسی کتابوں میں برتی جانے والی املائی غفلتوں کی نشان دہی کی ہے۔ کتاب میں بعض ایسی تحریریں بھی ہیں جن میں ادبی شخصیات اور علمی معرکوں کا ذکر ملتا ہے، جو قاری کو اس دور کے علمی ماحول سے روشناس کراتی ہیں۔ ڈاکٹر ابراہیم افسر نے صرف مضامین کو جمع نہیں کیا، بلکہ ہر تحریر کے حواشی اور حوالے درج کیے ہیں۔

کتاب کے شروع میں ابراہیم افسر نے ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے جو رشید حسن خاں کے اسلوب اور ان کی علمی خدمات کا احاطہ کرتا ہے۔ انھوں نے تحریروں کی تاریخی ترتیب کا خیال رکھا ہے تاکہ رشید صاحب کے فکری ارتقا کو سمجھا جاسکے۔ رشید حسن خاں کی تحریریں جذباتیت سے پاک اور خالص علمی و سائنسی بنیادوں پر استوار ہیں۔ وہ کسی بھی لفظ یا قاعدے کو بغیر ٹھوس لسانی دلیل کے قبول نہیں کرتے، یہی ”حرفوں کا جادو“ کا جوہر ہے۔ ڈاکٹر ابراہیم افسر اپنے دیباچہ میں املا کی جانب رشید حسن خاں کی توجہ مبذول کرنے کے قصے کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”رشید حسن خاں نے صحتِ املا کی جانب اپنی توجہ مبذول کرنے کا ایک دل چسپ واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ایک طالب علم نے لفظ ’بھروسہ‘ کو ”بھروسہ اور گزرنہ“ کو گزرنہ“ لکھا تو میں نے اسے غلط قرار دیتے ہوئے نمبر کاٹ لیے، لیکن طالب علم نے نصاب کی کتاب میں ’بھروسہ اور گزرنہ‘ لکھا دکھایا تو مجھے شرمندگی کا احساس ہوا۔“ اس بات کا نقش رشید حسن خاں کے دل پر ہمیشہ رہا۔ اس کے بعد انھیں احساس ہوا کہ اردو املا کی معیار بندی اور اصلاح کا کام سائنٹفک انداز میں ہونا چاہیے۔“

زیر نظر کتاب طلبہ اور محققین کے لیے رہنما ہے۔ یہ کتاب اردو تحقیق کے طالب علموں کے

لیے ایک ”مینول“ کی حیثیت رکھتی ہے کہ تحقیق کیسے کی جائے اور زبان کے ساتھ برتاؤ کیسا ہونا چاہیے۔ ”حرفوں کا جادو“ محض ایک کتاب نہیں بلکہ اردو زبان کی تہذیب اور اس کے لفظی ڈھانچے کو سمجھنے کی ایک کلید ہے۔ اگر آپ اردو املا، تدوین اور تحقیق کے باریک نکات سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو اس مجموعے کا مطالعہ لازمی ہے۔

زیر نظر کتاب پُر ڈاکٹر ظفر کمالی اور حافظ صفوان محمد نے اپنی متوازن و اعتمدالی رائے کا اظہار کیا ہے۔ کتاب میں شامل دخترانِ نیر مسعود صائمہ و ثمرہ کے لیے لکھے گئے خطوط نے اس کتاب کی حیثیت کو دو چند کر دیا ہے۔ ضمیمہ جات میں پیامِ تعلیم کے مدیر کے ادارے کو شامل کر کے ”حرفوں کا جادو“ کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ خود ڈاکٹر ابراہیم افسر نے رسالہ پیامِ تعلیم کی ایک گمشدہ فائل کا ذکر ضمیمے میں کیا ہے۔ اس گمشدہ فائل کی تلاش و تحقیق کا بیانیہ بہت ہی دل چسپ ہے۔ کتاب کا سرورق بہت ہی دل کش و سحر انگیز ہے۔ جادو کے پٹارے سے نکلنے والے حروف صحیح معنی میں قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کتاب ڈاکٹر شاہ نواز فیاض، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور ڈاکٹر ذاکر حسین لاہوری، نئی دہلی کو معنون ہے۔ اس انتساب کی ایک خاص وجہ یہ بھی رہی کہ رسالہ پیامِ تعلیم کی تمام فائلیں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کی لاہوری و مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی کے دفتر میں محفوظ ہیں۔ ان فائلوں تک ڈاکٹر ابراہیم افسر کی رسائی ڈاکٹر شاہ نواز فیاض کے توسط سے ہوئی۔ امید کی جاتی ہے کہ ڈاکٹر ابراہیم افسر، رشید حسن خاں کی دیگر بکھری ہوئی تحریروں کو بھی یکجا کر آئندہ کتابی صورت میں قارئین و ناقدین کی خدمت میں پیش کریں گے۔ اس اہم کتاب کو منظرِ عام پر لانے کے لیے راقم انھیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔



وی کمٹ سوسائٹی کے پروگرام میں اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری، سید نایاب الدین نایاب شعبہ اردو اور وی کمٹ سوسائٹی کے اراکین

جلتا پہاڑی سیارہ [مصنف: ڈاکٹر اختر آزاد]

اردو ناول کی روایت ہمیشہ سماجی حقیقت نگاری، سیاسی شعور، تہذیبی الجھنوں اور انسانی المیوں سے جڑی رہی ہے۔ ڈاکٹر اختر آزاد کا ناول "جلتا پہاڑی سیارہ" اسی روایت کا ایک اہم اور تازہ اضافہ ہے۔ اس ناول کا عنوان اپنے اندر کائناتی تبلیغ، انسانی اضطراب اور سماجی حرارت۔۔۔۔۔ تینوں کو یکجا کرتا ہے۔ لفظ سیارہ اپنے لغوی معنی سے آگے بڑھ کر ایک عصر حاضر کے شدید طور پر زخمی انسانی معاشرے کی علامت بن جاتا ہے، جب کہ جلتا اُس تپش، اس ٹھن اور اضطراب کا استعارہ ہے جس میں آج کا انسان مسلسل سلگ رہا ہے۔ اس ناول کا انتساب اس کے فکری تناظر کو واضح کرتا ہے:

"ان سادہ لوح انسانوں کے نام جو مذہب کی بساط پر سیاست کے مہرے نہیں چلتے، بلکہ محبت کو اپنا شیوہ اور امن و آشتی کو زندگی کا محور سمجھتے ہیں۔"

یہ سطوریں پورے ناول کے بنیادی فلسفے، اخلاقی شدت اور انسان دوستی کو مجسم کرتی ہیں۔ یہاں محبت، امن، رواداری اور بین المذاہب ہم آہنگی کو بنیادی قدر کی حیثیت حاصل ہے۔ ناول کا بیانیہ اسی نظریہ انسانیت کے گرد گھومتا ہے۔

کتاب کے ابتدائی صفحات میں منی پور اور منی پور کے جغرافیے کا تذکرہ ہے۔ مصنف نے جن علاقوں کا ذکر کیا ہے، وہ محض نقشے پر موجود مقام نہیں بلکہ ثقافتی تنوع، نسلی اور لسانی کشمکش، سماجی تانا بانا، فرقہ وارانہ کشیدگی اور امن کا باہمی تضادم۔۔۔۔۔ ان سب کی علامت بن جاتے ہیں۔

مصنف کی عملی وابستگی بحیثیت اردو معلم اور کچھ عرصے تک ان علاقوں میں رہائش نے مشاہدے کی گہرائی کو اور زیادہ مستند، باریک اور حقیقی بنا دیا ہے۔ ناول کا جغرافیہ محض پس منظر نہیں بلکہ خود ایک متن میں شریک کردار کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ مصنف کا بیان، مشاہدے اور تجربے سے جنم لیتا ہے۔ اس میں مبالغہ کم اور حقیقت کی شدت زیادہ ہے۔ علامتی تشکیل۔۔۔۔۔ پہاڑ، آگ، دھواں، بارش، سفر، جنگل، یہ سب ناول میں علامتی کردار رکھتے ہیں۔ جلتا پہاڑی سیارہ "محض ایک جغرافیائی جگہ نہیں بلکہ جلتا ہوا معاشرہ، سلگتی ہوئی انسانیت، کشمکش زدہ نسلیں اور سیاست کے ہاتھوں برباد ہوئی بستیاں۔۔۔۔۔ ان سب کا استعارہ ہے۔"

مصنف سادہ، رواں اور گفتگو کے قریب زبان استعمال کرتے ہیں۔ کہیں کہیں شاعرانہ جھلک

بھی ملتی ہے جس سے نثر کے ذائقے میں لطافت بڑھ جاتی ہے۔

ناول بنیادی طور پر "انسان" کا نوحہ ہے، اس انسان کا جو مذہب کے نام پر تقسیم ہو جاتا ہے۔ سیاست کے ہاتھوں استعمال ہوتا ہے۔ اور شناخت کے بحران میں الجھتا رہتا ہے۔ مصنف قاری کو بار بار یاد دلاتا ہے کہ انسان کی اصل شناخت محبت ہے، تعصب نہیں۔

مصنف نے مئی پور، ناگالینڈ اور شمال مشرقی ہندوستان کی سیاسی صورت حال، نسلی تعلقات، قبائلی تقسیم اور معاشرتی پیچیدگیوں کو کھول کر بیان کیا ہے۔ یہ خطہ اکثر سیاست، عسکریت اور نسلی تنازعات کا شکار رہا ہے۔ ناول ان حقائق کو جذباتی شدت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

کرداروں اور واقعات کے ذریعے مختلف تہذیبوں، زبانوں اور مذہبی گروہوں کی باہمی کشمکش اور منافقت سامنے آتی ہے۔ ناول ایک طرح سے کلچرل انتھروپولوجی کی دستاویز بھی بن جاتا ہے۔

ناول کرداروں کے خوف، امید، بے یقینی، خوشی، دکھ اور رشتوں کے ٹکڑاؤ۔۔۔۔۔ سب پر گہری نظر رکھتا ہے۔ جذبات کے اتار چڑھاؤ میں مصنف کی نفسیاتی بصیرت صاف محسوس ہوتی ہے۔ حقیقت اور فکشن کا آمیزش یہ ناول "دستاویزی حقیقت" اور "تخلیقی فکشن" کا خوبصورت امتزاج ہے ناول اس سوال سے نکلر رہا ہے کہ کیا انسان اپنی بنائی ہوئی آگ میں خود کو جلانے سے باز آئے گا؟ مصنف اس سوال کا فکری، اخلاقی اور تہذیبی جواب تلاش کرتا ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "جلتا پہاڑی سیارہ" اردو ناول میں سماجی حقیقت نگاری، تہذیبی تجزیے، سیاسی شعور، انسان دوستی، جغرافیائی مطالعے اور نفسیاتی مشاہدے کا اہم سنگم ہے۔

یہ ناول نہ صرف ادبی سطح پر اہم ہے بلکہ سماجی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ ڈاکٹر اختر آزاد نے اس ناول میں ایک خطے کی کہانی، ایک عہد کا کرب، اور ایک انسان کا اندرونی سفر۔۔۔۔۔ تینوں کو ایک وحدت میں سمو دیا ہے۔ یہ ناول اردو فکشن میں اپنے منفرد موضوع، گہری علامتوں، اور وسیع انسانی درد کے باعث ایک اہم تخلیق کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔

راحت علی صدیقی
دہلی

تذکرہ نگاری کی روایت اور تذکرۃ الخلیل

مولانا عاشق الہی میرٹھی کا نام علمائے دیوبند میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے، انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں، اہل علم اس سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی خدمات ہمہ جہت ہیں، انہوں نے تذکرہ و سوانح تفسیر و تراجم، تصوف و سلوک جیسے اہم موضوعات کو منتخب کیا اور اپنی محنت سے قارئین کے لئے علمی جواہر جمع کر دیئے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے ہم قرآن و سنت کے معانی و مفاہیم اور پیغام سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اسلام کی اخلاقی سماجی اور معاشرتی تعلیمات کی خوبیوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے تذکرہ نگاری میں وقیع اور اہم نمونے چھوڑے ہیں، جن میں تذکرۃ الرشید انتہائی اہمیت کا حامل ہے، اس کی مقبولیت و شہرت میں آج بھی کمی واقع نہیں ہوئی ہے، اور قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد لنگوہی کے احوال و خدمات پڑھنے اور جاننے کے لئے آج بھی یہ تذکرہ اہم ترین ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا دوسرا تذکرہ تذکرۃ الخلیل بھی اہمیت کا حامل ہے، جس میں شیخ الحدیث مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے احوال بیان کئے گئے ہیں، اور ساتھ ہی مظاہر العلوم سہارنپوری کی خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب تذکرہ نگاری کی روایت اور تذکرۃ الخلیل مولانا عاشق الہی میرٹھی کے دوسرے تذکرہ تذکرۃ الخلیل کے حوالے سے سیدہ مریم الہی کی اہم تصنیف ہے، جس میں انہوں نے تذکرۃ الخلیل کے حوالے سے اہم اور تفصیلی بحث کی ہے، اس کتاب میں تذکرہ الخلیل کی خوبیاں، خصائص اور امتیازات پر روشنی ڈالی گئی ہے، تذکرہ میں بیان کردہ شمولات سے متعارف کرایا ہے، مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی حیات کے مختلف گوشے جو تذکرۃ الخلیل میں بیان کئے گئے ہیں، ان پر روشنی ڈالی گئی ہے، جس کا مطالعہ مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی شخصیت کا معیار و مقام واضح کرتا ہے، اور مولانا عاشق الہی میرٹھی کی تذکرہ نگاری کی خصوصیات بھی عیاں ہوتی ہیں۔ انہوں نے تاریخ و سنن کی ترتیب کے ساتھ مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی حیات کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے، وہ واقعات کو پیش کرنے میں میانہ روی اختیار کرتے ہیں، حقائق اور پیغام کو مسخ نہیں کرتے، جس کی وجہ سے وہ دوسرے تذکرہ نگاروں میں ممتاز نظر آتے ہیں، واقعات کی منظر کشی انہوں نے جس سلیقہ سے کی ہے، اس سے یہ تذکرہ مزید دلچسپ ہو گیا ہے، جس کی مثالیں سیدہ مریم الہی نے اپنی کتاب میں بخوبی پیش کی ہیں۔ منظر کشی میں انہیں کس درجہ مہارت

حاصل ہے اس کو دلائل کی روشنی میں ثابت کر دیا ہے، جو مصنفہ کی قابل مبارک باد کوشش ہے، تذکرۃ الخلیل میں مختلف مواقع پر فارسی اور اردو اشعار استعمال کئے گئے ہیں، ان اشعار سے تذکرہ کی دلکشی میں مزید اضافہ ہو گیا ہے اور ساتھ ہی مولانا عاشق الہی میرٹھی کی اشعار سے مناسبت اور اردو فارسی ادب سے واقفیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مصنفہ نے تذکرۃ الخلیل میں موجود اشعار کا انتخاب اپنی کتاب میں شامل کیا ہے اور ان کا سلیس ترجمہ و تشریح کی ہے۔ ان کے مفہوم سے بخوبی واقف کرایا ہے۔ اشعار کے موضوعات واضح کئے ہیں۔ جس کی روشنی میں مولانا عاشق الہی میرٹھی کی فنی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، وہ عشق حقیقی سے کس درجہ سرشار ہیں۔ اشعار پر گفتگو سے تذکرہ کے حسن اور اس کی دلکشی مزید عیاں ہوتی ہے۔ زیر نظر کتاب کے مطالعہ کے بعد جب تذکرۃ الخلیل کا مطالعہ کیا جائے گا، تو گفتگو اس کی تواضع، تفہیم میں اضافہ کا سبب ہوگی اور مصنفہ کی فکری بلندی سے واقفیت کا سبب ہوگی۔ اشعار کے انتخاب اور اس پر گفتگو نے کتاب کو مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔

تذکرۃ الخلیل کی زبان اور اسلوب پر بھی اہم بحث کی گئی ہے، زبان و بیان کی خوبیوں کو مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے، جس دور میں تذکرۃ الخلیل تصنیف کیا گیا تھا۔ اس دور کی کتابیں مشکل وادق زبان پر مشتمل ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ کے استعمال نے ان کی تفہیم کو دشوار بنا دیا ہے، اور ان کی توضیح و تشریح کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ تذکرۃ الخلیل کی زبان و بیان پر گفتگو کرتے ہوئے مصنفہ نے واضح کیا ہے کہ تذکرۃ الخلیل کی زبان سادہ اور سلیس ہے اور موقع کی مناسبت سے الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ گاؤں دیہات سے متعلق واقعات بیان کئے ہیں تو الفاظ اور جملوں میں گاؤں کی سادگی بخوبی نظر آتی ہے۔ عربی فارسی الفاظ بھی تذکرۃ الخلیل کی عبارتوں میں موجود ہیں۔ اس کے باوجود تذکرہ کو سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آتی ہے۔ سیدہ مریم الہی نے اس پہلو پر مدلل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ جس سے تذکرۃ الخلیل کی عبارتوں کا حسن دلکشی و دلچسپی عیاں ہوتی ہے اور اس سے تذکرہ کی زبان کا معیار بھی بخوبی واضح ہوتا ہے۔

سیدہ مریم الہی نے تذکرۃ الخلیل کے ادبی مقام و معیار کے تعین کی کوشش کی ہے۔ سوانحی تذکروں کے حوالے سے اختصار کے ساتھ اہم گفتگو کی ہے۔ جو سوانحی ادب کا اہم اور ابتدائی حصہ ہیں۔ انہیں سوانح نگاری کی تمہید گردانا جاسکتا ہے۔ سوانح نگاری کی جڑیں تذکروں میں پیوست ہیں۔ ان تذکروں کی جانب کم توجہ دی گئی ہے۔ خاص طور پر علماء کرام نے جو تذکرہ ترتیب و تصنیف کئے ہیں۔ یہ کتاب ان تذکروں کی جانب توجہ کا سبب بنے گی۔

سیدہ مریم الہی کی کتاب تذکرہ نگاری کی روایت اور تذکرۃ الخلیل تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اردو تذکرہ نگاری کی روایت پر اختصار کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔ تذکروں کے مفہوم کو واضح کیا گیا ہے۔ تذکروں کی اقسام اور ان کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ اردو کے اہم تذکروں کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔ پہلے باب کا مطالعہ تذکروں کے مفہوم روایت اقسام اور اہم ترین تہیروں سے بخوبی

واقف کراتا ہے۔ دوسرے باب میں مولانا عاشق الہی میرٹھی کے سوانحی نقوش بیان کئے گئے ہیں۔ ان کی زندگی کے تمام پہلو اختصار کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ ان کے دور طالب علمی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان کی شخصیت کے حسن سے واقف کرایا گیا ہے۔ ان کی تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے جس کی روشنی میں مولانا کی علمی خدمات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے علمی کارناموں اور علمی فتوحات سے واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے۔ مولانا کے دینی مزاج اور دینی امور کی پابندی اور وقت کی قدر دانی جیسے اوصاف و خصوصیات بھی اس باب میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس باب کا مطالعہ مولانا کی شخصیت و سوانح سے بخوبی واقف کراتا ہے۔

تیسرا باب اس کتاب کا مرکزی اور اہم باب ہے جس میں تذکرۃ التحلیل کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کے محاسن بیان کرتے ہوئے اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی زبان و بیان اسلوب اور شمولات سے متعارف کرایا گیا ہے۔ اس کی ادبی اقدار کا تعین کیا گیا ہے۔ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے انفرادیت کی حامل ہے۔ سوانحی تذکروں پر کام کرنے کا عام رجحان نہیں ہے۔ لوگ اس میدان میں قدم رکھتے ہوئے جھجک محسوس کرتے ہیں۔ سیدہ مریم الہی نے جرأت کے ساتھ اس موضوع کا انتخاب کیا اور کتاب کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ انہوں نے محنت و توانائی کے ساتھ اس موضوع کو نباہنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور تذکرۃ التحلیل کے اہم پہلوؤں کو قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ جس کے لئے وہ قابل مبارک باد ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں مزید علمی و ادبی کام کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

☆☆☆



ایک روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی اور پروفیسر اسلم جمشید پوری سے آفس انچارج محمد شمشاد ثانی حاصل کرتے ہوئے۔ تصویر میں نظر آرہے ہیں ڈاکٹر سرور ساجد، ڈاکٹر ودیا ساگر اور ڈاکٹر مہیپال سنگھ، پوڈیم پر ڈاکٹر ارشد سیانوی کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

شعبۂ اردو کی سرگرمیاں

شعبہ اردو، سی سی ایس یونیورسٹی میں ”مجلس النساء“ کے پہلے جلسے کا انعقاد

میرٹھ 2 مئی 2026

کسی بھی ادارے کا قیام کوئی معمولی عمل نہیں بلکہ یہ ایک بہت بڑا کام ہے اور اس سے بھی بڑی بات اس کو کامیابی کے ساتھ چلانا ہوتا ہے۔ خواب تو سب دیکھتے ہیں لیکن ان خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنا بڑی بات ہے۔ ہمیں سنجیدگی سے اس تنظیم کو آگے تک لے جانا ہے۔ یہ الفاظ تھے معروف ادیب اور سرپرست اعلیٰ پروفیسر اسلم جمشید پوری کے جو یہاں شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے پریم چند سیمینار ہال میں منعقد ”مجلس النساء“ کے پہلے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ کوشش کریں کہ شعبے کی تمام طالبات کو اس کا ممبر بنائیں اور سنجیدگی سے خواتین کی فلاح و بہبودگی کے کام انجام دیں۔ بہت سی بچیاں اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر پاتیں انہیں تعلیم کے لیے آگے لائیں۔ جہیز بھی آج کی سب سے بڑی لعنت ہے، اس تنظیم کا یہ بھی مقصد ہونا چاہئے کہ وہ سماج سے اس لعنت کا خاتمہ کرائے ساتھ ہی برادری واد کا بھی خاتمہ کیا جائے۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز ڈاکٹر فرح ناز نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروگرام کی صدارت کے فرائض صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے۔ استقبالیہ کلمات مجلس النساء کی نائب صدر ڈاکٹر عفت ذکیہ نے ادا کیے، نظامت جنرل سیکریٹری سیدہ مریم الہی اور شکریہ کی رسم تنظیم کی خازن ڈاکٹر اکاوش شٹھ نے ادا کی۔

اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر آصف علی نے کہا کہ خواتین کی تنظیم کا قیام ایک نیک فال قدم ہے۔ معاشرہ کی اصلاح کے لیے خواتین کی بے داری سب سے اہم ہے۔ خواتین تعلیم کے میدان میں اب بھی لڑکوں سے آگے ہیں۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیکن ہم ابھی بھی خواتین کے صد فی صد لڑیسی کے نشانے تک نہیں پہنچے ہیں۔ اسے صد فی صد نشانے تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات پر بھی توجہ مرکوز رکھنی چاہئے کہ لڑکیاں خود کفیل بنیں اس کے لیے صنعت و حرفت کی تعلیم خصوصاً مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ تنظیم کی ذمہ دار خواتین کا فرض ہے کہ وہ خواتین کو خود کفیل بنانے کی سرکاری پالیسیوں کی معلومات بہم پہنچائیں اور این جی اوز کے ذریعے محلہ در محلہ ایسے پروگرام چلائیں جو ضرورت مند خواتین کے لیے مفید ثابت ہوں۔

تنظیم کی نائب صدر ڈاکٹر عفت ذکیہ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ تنظیم کی ممبران گھر گھر جائیں اور ضرورت مند خواتین کے حالات کا جائزہ لیں اور جہاں کسی کو بھی مدد کی ضرورت ہو تعلیم

کے لیے، کسی ہنر کے لیے تو ایسی خواتین کی ضرورت مدد کریں۔ ایسے ہی کاموں سے ہم تنظیم کو آگے لے جاسکتے ہیں۔

آخر میں تنظیم کی صدر ڈاکٹر شاداب علیم نے کہا کہ اس تنظیم کا مقصد خواتین میں تعلیمی کی بیداری، فلاحی کاموں میں حصہ داری، نئی نسل میں اچھے اخلاق، صبر و تحمل، غریبوں کی کفالت، نیز بچیوں میں تعلیم و ہنرمندی کا ذوق و شوق پیدا کرنا، خواتین کے درمیان محبت، یکجہتی اور تعاون کے جذبہ کو فروغ دینا نیز انہیں سلائی، کڑھائی، بنائی یا دیگر فنون سکھا کر خود کفیل بنانا ہے۔ ان تمام چیزوں کو دیکھتے ہوئے ہی خواتین کی اس تنظیم کا قیام عمل میں آیا ہے۔

جلسے میں ڈاکٹر ارشاد سیانوی، ڈاکٹر شبستاں آس محمد، زہت اختر، فرحت اختر، سرتاج جہاں، طاہرہ پروین، اربیہ پروین، کشش خان، نمرہ، علما نصیب، وغیرہ موجود رہے۔



شعبہ اردو میں خصوصی لیکچر اور حقانی القاسمی اور ڈاکٹر زیبا ناز کا اعزاز یہ

میرٹھ 18 اپریل 2026ء

آج کے زمانے میں موضوعات کا قحط ہے، بحران ہے، پھر بھی شعبہ اردو نے اکیسویں صدی کا اردو ادب اور خواتین موضوع کا انتخاب کر کے اچھے موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ تخلیقات تو خواتین لکھ رہی تھیں لیکن مصنف کی جگہ والد یا بھائی وغیرہ کا نام لکھا جاتا تھا۔ یہ ایک طرح سے منافقانہ رویہ ہے لیکن آج کا دور بہت اچھا ہے۔ آج خواتین پر زیادہ پابندیاں نہیں ہیں۔ وہ آزادی سے اور کھل کر کسی بھی موضوعات پر لکھ سکتی ہیں۔ نظمیں شاعری میں ایک بڑی تعداد خواتین کی ہے۔ خواتین کے فکشن میں تنوع نظر آتا ہے۔ اب کھڑکیاں کھل رہی ہیں، دروازے کھل رہے ہیں، خواتین بھی نئے نئے موضوعات کا انتخاب کر رہی ہیں۔ یہ الفاظ تھے معروف محقق و ناقد حقانی القاسمی کے جو شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ میں منعقد خصوصی لیکچر بعنوان ”اکیسویں صدی میں اردو ادب اور خواتین“ موضوع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ آج کے عہد میں عورتوں کے جذبات، نفسیات اور احساسات کو سمجھا جا رہا ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ خواتین تخلیق کاروں کو تخلیقی خود مختاری ہونی چاہئے۔ مرد اور عورت میں کسی طرح کی تفریق نہیں ہونی چاہئے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔

اس سے قبل محمد اکرام اللہ نے تلاوت کلام پاک سے پروگرام کا آغاز کیا۔ مہمانوں کا پھولوں کے ذریعے استقبال کیا گیا۔ اس موقع پر فرحت اختر نے غزل پیش کر کے سماں باندھ دیا۔ پروگرام کی صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے دور حاضر کے معروف محقق و ناقد حقانی القاسمی نے شرکت کی۔ مہمان

اعزازی کے بطور ڈاکٹر زیبا ناز پروگرام میں شریک رہیں۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی۔ مہمانوں کا تعارف ڈاکٹر شاداب علیم، نظامت ڈاکٹر آصف علی اور شکریہ کی رسم سیدہ مریم الہی نے ادا کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر شاداب علیم نے حقانی القاسمی کے فکرو فن پر ایک تفصیلی مقالہ پیش کیا۔

اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر زیبا ناز نے کہا کہ خواتین کے ذریعے بہترین تربیت بھی کسی کی نجات کا سبب بن سکتی ہے۔ اکیسویں صدی میں خواتین مرد حضرات کے شانہ بہ شانہ چل رہی ہیں۔ مجھے بھی ادبی ذوق اپنی والدہ، نانی کے طفیل حاصل ہوا۔ کیونکہ ان لوگوں نے جگر مراد آبادی اور اصغر گوٹوی وغیرہ سے فیض حاصل کیا۔ ان کے دور میں بہت سے کام ہوتے تھے باوجود اس کے انہوں نے اپنے بچوں کی بہت عمدہ تربیت کی۔ آج کے دور میں چینل، خبر، بہت ہیں، مصروفیت بہت ہے، گھر کے کام بھی بہت ہوتے ہیں ایسے میں ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ گمراہی کے امکان بھی آج کے دور میں بہت زیادہ ہیں۔ اب ہمیں طے کرنا ہے کہ خوب سوچ سمجھ کر ترقی کی جانب موڑنا ہے۔ ایک پڑھی لکھی خواتین ہی اپنے بچوں کی بہترین پرورش کر سکتی ہے۔

اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ موجودہ عہد میں اردو ادب میں یوں تو ہر شعبے میں خواتین کا بول بالا ہے لیکن شاعری اور افسانہ نگاری میں آج کی خواتین نے کافی نام کمایا ہے۔ شاعری میں رفیعہ بنم عابدی، شبنم عشائی، نور جہاں، ثروت وغیرہ نے عمدہ تخلیقات پیش کی ہیں اور افسانہ نگاروں میں نگار عظیم، ترنم ریاض، شائستہ فاخری، ثروت خان، غزالہ قمر اعجاز وغیرہ نے اپنے آپ کو ثابت کیا ہے۔ حقانی آج کے دور کے مشہور و معروف ناقد ہیں جنہوں نے خواتین کے ادب پر خاص کام کیا ہے۔ اس موقع پر حقانی القاسمی اور ڈاکٹر زیبا ناز کا اعزاز بھی ہوا۔

پروگرام میں آفاق خاں، وقار احمد، بھارت بھوشن شرما، عابد سیفی، شکیل سیفی، ساجد سیفی، محمد شعیب، فہما، محمد علی رانا، محمد ندیم، محمد زبیر، شفا، طاہرہ پروین، عمائدین شہر اور کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔



شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں یک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد

میرٹھ 25 مارچ 2026ء

آج کے طالب علموں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ فلموں سے اردو کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ زبان کسی کی جاگیر نہیں ہوتی۔ زبان کو کوئی بھی پڑھ، لکھ سکتا ہے۔ اردو زبان کی بدولت ہی فلموں کو وقار عطا ہوا اور عوام میں بھی زبان مقبول ہوتی چلی گئی۔ اردو میں لکھے نغموں سے ہی بہت سے شعراء بھی کافی مقبول ہوئے۔ اردو کی کشش کا یہ حال ہے کہ خواہ لفظیات سمجھ میں نہ آئیں لیکن وہ اپنی جانب ضرور کھینچتی ہے۔ یہ الفاظ تھے معروف اسکالر پروفیسر عبداللہ امتیاز [صدر شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی] کے جو شعبہ

اردو اور اسماعیل نیشنل مہیلا پی جی کالج، میرٹھ کے مشترکہ پروگرام بعنوان ”ہندوستانی فلم اور اردو“ میں شعبے کے پریم چند سیمینار ہال میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ بہت سے نغموں اور گیتوں کو سن کر لوگ اردو کی جانب قدم بڑھا رہے ہیں اور نئی نسل میں یہ زبان خاصی مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ میں شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے اتنے اہم سیمینار میں مدعو کیا اور واقعی یہ شعبہ اپنی کارکردگی کی بدولت عالمی پیمانے پر اپنی مستحکم شناخت قائم کر چکا ہے۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز ایم۔ اے اردو کے طالب علم محمد اکرام اللہ نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ مہمانان کو پھولوں کا نذرانہ پیش کیا گیا اور سب نے مل کر شمع افروزی کی۔ پروگرام کی صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے۔ مہمانان خصوصی کے بطور پروفیسر عبداللہ امتیاز، پروفیسر ریاض احمد [صدر شعبہ انجکشن، مانو، نوح] اور پروفیسر انیتا رائی [پرنسپل، اسماعیل نیشنل مہیلا پی جی کالج، میرٹھ] نے شرکت کی اور مہمانان اعزازی کے بطور پروفیسر جمال احمد صدیقی [صدر شعبہ لائبریری سائنس] اور پروفیسر ونیش کمار [صدر شعبہ انکناکس] نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر عفت ذکیہ، شکریہ ڈاکٹر شاداب علیم اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی نے انجام دیے۔

سیمینار کے پہلے اجلاس میں ڈاکٹر عفت ذکیہ نے ”ہندوستانی فلموں میں اردو غزل“، ڈاکٹر فرح ناز نے ”تشکیل بدایونی کی فلمی خدمات“، ہزہت اختر نے ”فلم نکاح کا تجزیاتی مطالعہ“، اطہر خان نے ”فلم پر اردو ثقافت کے اثرات“، ڈاکٹر چاندنی عباسی نے ”امراؤ جان: فلم اور فن“ موضوعات پر اپنے پر مغز مقالات پیش کیے۔ مجلس صدارت پر پروفیسر ہما مسعود، پروفیسر ریاض احمد، آفاق احمد خاں، بھارت بھوشن شرما مجلس صدارت پر رونق افروز رہے۔ نظامت ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور شکریہ کی رسم ڈاکٹر الکاوششٹھ نے ادا کی۔

سیمینار کے دوسرے اجلاس میں، ڈاکٹر اسلم صدیقی نے، فلمیں اور اردو، ”فلموں میں کردار نگاری: ایک جائزہ“، ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے ”اردو گیتوں کے فروغ میں مجلہ ”سیپ“ کا کردار عنوانات سے اپنے مقالے پیش کیے۔ مجلس صدارت پر پروفیسر دیپا تیگی [صدر شعبہ ہندی، اسماعیل نیشنل پی جی کالج، میرٹھ]، پروفیسر عبداللہ امتیاز، پروفیسر ہما مسعود، اور ڈاکٹر عفت ذکیہ رونق افروز رہیں، نظامت کے فرائض ڈاکٹر الکاوششٹھ نے انجام دیے۔

اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر ریاض احمد نے کہا کہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے فروغ میں ہندوستانی فلموں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ بہت سی فلمیں ایسی ہیں جو سبھی کو یکساں طور پر متاثر کرتی ہیں۔ بہت سے شعرا نے بھی کم دتی کے باوجود فلموں کے لیے بہترین نغمے لکھے۔ شعبہ اردو مختلف موضوعات پر سیمینار کا انعقاد کرتا رہتا ہے۔ بہت ہی فعال شعبہ ہے اور آج کا مو

ضوع بھی اردو اور اس کے فروغ کے تعلق سے نہایت اہم ہے۔

پروفیسر دیش کمار نے کہا کہ آج کا موضوع اپنے آپ میں ایک اہم اور انفرادی موضوع ہے، جس طرح سے اس شعبے میں مختلف پروگرام ہوتے ہیں اس کا اثر پوری دنیا میں دیکھا جا رہا ہے۔ آج فلموں میں بدلاؤ نظر آ رہا ہے جب کہ ہمارے وقت میں سنیما میں وہ ادب نظر آتا تھا جو کتابوں میں ہوتا تھا مگر آج کی فلموں میں ادب کی بہت کمی ہے۔ انسانیت، بھائی چارگی اور اتحاد کے تعلق سے جو چیزیں پہلی فلموں میں نظر آتی تھیں آج ان کا فقدان ہے۔ سماج کے تمام حصوں پر فلمیں اثر انداز ہوتی ہیں۔

پروفیسر جمال احمد صدیقی نے کہا کہ اب سے تیس چالیس یا اس سے قبل کی فلموں کا مقصد سماج کو جوڑنا ہوتا تھا اور فلموں میں ادب بھی دیکھنے کو ملتا تھا وہ اب بہت کم نظر آتا ہے۔ پہلی فلموں کے نغمے، مکالمے، کردار ناظرین کو حد درجہ متاثر کرتے تھے۔ آپسی اتحاد و اتفاق، بھائی چارگی، انسانیت، سماج کے مسائل اور ان کا حل بھی فلمیں پیش کرتی تھیں جب کہ آج کا منظر نامہ تبدیل ہو چکا ہے نغموں کی زبان و الفاظ اور شیرینی سب اپنا اثر کھو چکے ہیں۔ اسی بنا پر آج کے نغمے یا مکالمے کم وقت میں ہی اپنا اثر کھودیتے ہیں جب کہ پچاسوں سال گزر جانے کے باوجود پرانے نغمے، کردار، مکالمے آج بھی لوگوں کی زبان پر جا رہے ہیں۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ اردو زبان نے فلموں کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

پروفیسر انتہارٹھی نے کہا کہ آج کی فلموں میں نہ تہذیب دیکھنے کو ملتی ہے اور نہ زبان میں ہی وہ کشش باقی رہی جو اپنے دیر پا اثرات چھوڑ سکے۔ پرانی فلموں میں ادب بھی تھا اور تہذیب بھی، کوئی بھی موسیقی، اداکاری یا کردار نگاری اردو کے بغیر نامکمل ہے۔ پرانے گانے لوگ آج بھی بڑے ذوق و شوق سے سنتے اور گاتے ہیں۔ فلموں پر اردو ادب کا اثر ہمیشہ رہے گا۔ ایسے پروگرام ہوتے رہنا چاہئیں۔ ایسے پروگراموں میں طالب علموں کا مستقبل چھپا رہتا ہے۔

اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ آج سے تقریباً تیس چالیس سال قبل فلموں میں اردو کا خاصا استعمال تھا۔ آج جو فلمیں آرہی ہیں ان میں پرانے نغموں، زبان یا مکالموں کا سا انداز نہیں ہے۔ پہلے فلموں سے زبان سیکھتے تھے مگر آج کی فلموں پر بھی سیاست حاوی ہو چکی ہے۔ اردو کے ایسے بہت سے فکشن نگار بھی ہیں جن کی کہانیوں اور ناولوں پر فلمیں بنی ہیں۔ آج کل ہندوستانی کا زمانہ ہے۔ اب فلموں میں نہ ہندی ہے اور نہ اردو نہ ہی انگلش بلکہ کس زبان استعمال ہو رہی ہے۔ جس سے کوئی خاص فائدہ فلم ناظرین کو نہیں ہو پاتا اور روز بروز فلموں کی مقبولیت میں کمی آرہی ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں ان پر بھی تفصیلی گفتگو ہونی چاہئے۔

پروگرام میں ڈاکٹر اسلم صدیقی، فرحت اختر، محمد شمشاد، سعید احمد سہارنپوری، محمد ندیم، عیسیٰ رانا سیماشتر، فیہا، فقیہا، لمر، طوٹی، محمد طالب، مہوش، نایاب، حیدر، زبیر، عائشہ، محمد شعیب، محمد عابد علی، پرویز اسلم، طیبہ تبسم، عظمیٰ ترنم، کشش، اریبہ، مریم ناز، الویریہ، رضا، ندا خان، شفا، ازرا، ارم، صبا، مسرت، نایاب قریشی، مصباح، الیشا، طوٹی، غازی، غزالہ، رخسانہ، مہک، مسکان، روشنی، انعمت، شائستہ، مدیحہ،



شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں یک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد

میرٹھ 17 فروری 2026ء

میرے والد کو زندگی بھر اس بات کا شدید قلق رہا کہ ہم لوگ ان کی زبان یعنی اردو کا استعمال نہیں کرتے حالانکہ ہم نے اردو سیکھنے کی کوشش کی مگر پوری طرح سے سیکھ نہیں پائے اور اس کی وجہ بڑی حد تک یہ بھی رہی کہ میری پیدائش افریقہ میں ہوئی، وہاں ہم انگریزی ہی پڑھتے بولتے تھے، والد صاحب اسی بنا پر ناراض ہوا کرتے تھے کیونکہ ہم اردو زبان میں رہے بے نہیں تھے پھر ہماری والدہ نے ہفتے میں دو دن اردو کا ٹیوشن لگا دیا جس سے مجھے اردو، ہندی پڑھنے آنے لگی۔ یہ الفاظ تھے ڈاکٹر سکریٹا پال کمار کے جو شعبہ اردو میں منعقد یک روزہ قومی سیمینار بعنوان ”جوگندر پال: کہانی کی دنیا“ میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہی تھیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ پاپا کی ایک بات ہمیشہ ذہن میں رہتی ہے کہ اردو، ہندی کو چھوڑ کر تم آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ گزشتہ چالیس پچاس برسوں سے میں اردو ہندی میں ترجمہ کر رہی ہوں۔ میرے والد کی تو بات ہی کیا تھی جو پنجابی بولتے تھے۔ انگریزی پڑھتے اور اردو میں لکھتے تھے۔ میرے والد نے بہت سے ملکوں اور شہروں کا سفر کیا لیکن ان کے ساتھ ساتھ ہر جگہ اردو بھی رہی۔ ان کا ماننا تھا کہ انگریزی ممالک میں بغیر ہندی اور اردو کے آپ کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ آپ اپنا مافی الضمیر اور اپنی تخلیقی یا تنقیدی اثران کو جتنا بہتر طور پر اپنی زبان میں پیش کر سکتے ہیں کسی غیر ملکی زبان میں نہیں۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز محمد عیسیٰ رانا نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ مہمانوں کا پھولوں کے ذریعے استقبال کیا گیا اور مہمانوں نے مل کر شمع روشن کی، اس موقع پر فرحت اختر نے غزل پیش کر کے سماں باندھ دیا۔ پروگرام کی صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے۔ مہمانان خصوصی کے بطور پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ڈاکٹر سکریٹا پال کمار اور مہمانان اعزازی کے بطور پروفیسر عابد حسین حیدری [سابق پرنسپل ایم جی ایم کالج، سنبھل] ڈاکٹر ابو ظہیر ربانی [دیال سنگھ کالج، دہلی] نے شرکت فرمائی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم نظامت ڈاکٹر آصف علی اور شکر علی کی رسم ذیشان خان نے انجام دی۔

دو پہر بعد سیمینار کے دو سیشن منعقد ہوئے جس کی محفل صدارت پر پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی، پروفیسر ارادھنا گپتا، ڈاکٹر سرور ساجد، ڈاکٹر ودیا ساگر، ڈاکٹر مہی پال سنگھ، ڈاکٹر جے ویر سنگھ رانا، آفاق احمد خاں، ذیشان خان رونق افروز رہے۔ جب کہ مقالہ نگار کے بطور نزہت اختر نے، کھودو بابا کا مقبرہ کا تجزیاتی، مطالعہ، سرتاج جہاں نے جوگندر پال کے افسانوں کا فکری و فنی مطالعہ، فرحت اختر نے ”جوگندر

پال کی افسانہ نگاری، سیدہ مریم الہی نے ”جدیدیت اور جوگندر پال، ڈاکٹر نوید خان نے ”افسانہ بیک لین کا فکری جائزہ“ اور ڈاکٹر عفت ذکیہ نے ناول ”پار پرے“ کا تجزیاتی مطالعہ کے عنوانات سے اپنے شاندار مقالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر اکاوش شٹھ نے انجام دیے۔

اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر ابو ظہیر ربانی نے کہا کہ جوگندر پال نے ہمیشہ نئی راہوں کا انتخاب کیا۔ وہ کہا کرتے تھے ”میں کہانی نہیں لکھتا، کہانی مجھے لکھتی ہے۔“ ان کی تخلیقات کی معنویت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ جوگندر پال پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے افریقی معاشرت کو سب سے پہلے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ انہوں نے افریقی زندگی کا گہرائی سے معائنہ کیا اور اپنے فکشن میں ان کی ایک ایک پریشانی، مسائل، ان کا درد شدت سے پیش کیا۔ ان کے فکشن میں انسانیت نظر آتی ہے۔ پروفیسر عابد حسین حیدری نے کہا کہ حال ہی میں گزری صدی فکشن کی صدی تھی۔ اس صدی میں سب سے زیادہ فکشن لکھا گیا، میں رثائی ادب زیادہ پڑھتا، لکھتا ہوں لیکن اسلم بھائی کے اسرار پر فکشن بھی پڑھنے لگا۔ جوگندر پال کو پڑھ کر میں دل سے ان کے فکشن کا قائل ہو گیا۔ ان کا فکشن بہت عمدہ ہے۔ ان کے فکشن کے سحر میں قاری دیر تک کھویا رہتا ہے۔

پروفیسر قمر الہدی فریدی نے کہا کہ یہ شعبہ اپنی ادبی سرگرمیوں کی بنا پر خاص شناخت رکھتا ہے۔ ہم سب ادب کے پرستار ہیں۔ جوگندر پال اردو کے ایک اہم فکشن نگار ہیں، انہوں نے ناول لکھے، افسانے لکھے اور افسانے بھی۔ ان کا تمام ادبی سرمایہ ان کی فکر اور گہرے مشاہدے کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے سماج کے مختلف طبقوں سے کردار منتخب کیے اور ان کرداروں کو بڑی خوبی سے پیش کیا ”نادید“ ان کا ایک ایسا فنی کارنامہ ہے جسے ہم کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ان کے افسانے بھی صحیح معنوں میں ادب پارے ہیں۔ یہ افسانے لطیفے نہیں ہیں بلکہ ان میں فکر کی لہریں ہیں۔ ہر لحاظ سے یہ ایک کامیاب سیمینار ثابت ہوا جس کے لیے شعبہ اردو چودھری چرن سنگھ کے اساتذہ بالخصوص پروفیسر اسلم جمشید پوری مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ یہ سیمینار فکشن نگار پر ہے اور فکشن کی اصطلاح جوگندر پال نے ہی دی ہے۔ جوگندر پال کسی معمولی شخصیت کا نام نہیں بلکہ وہ اردو کے بہت بڑے فن کار ہیں۔ افسانے، ناول تو بہتوں نے لکھے لیکن افسانے کو روح جوگندر پال نے بخشی۔ ان کے افسانوں، ناولوں میں جو درد، کسک ہے وہ سب انہوں نے افریقہ میں دیکھا کہ حبشیوں کے ساتھ کیسے مظالم کیے جاتے ہیں۔ اس طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ افریقہ کے بارے میں یا تو مہاتما گاندھی جی کے ذریعے علم ہوا یا پھر جوگندر پال کے فکشن سے افریقہ کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔

اس موقع پر پروفیسر ارادھنا گپتا، ڈاکٹر سرور ساجد ڈاکٹر مہی پال سنگھ، ڈاکٹر جے وی سنگھ رانا، ڈاکٹر ودیا ساگر، آفاق خاں اور ذیشان خان نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر فرح ناز، کشش خان، انیس میرٹھی، عابد سیفی، محمد زبیر، محمد ندیم، محمد عابد، وشو دیپ

سدھارتھ، ساگر، شاداب علی، اریہ عمائدین شہر اور کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔



شعبہ اردو، سی ایس ایس کی تین طالبات نے کیا UGC نیٹ کو ایفائی

میرٹھ 06 فروری 2026ء

04 فروری 2026ء کو یو، جی سی نے اپنے سب سے اہم مقابلہ جاتی امتحان NET اور JRF کے نتائج کا اعلان کیا تھا۔ جس میں شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کی تین طالبات سیدہ مریم الہی، فرحت اختر اور نزہت اختر نے اردو مضمون میں کامیابی حاصل کر کے اپنا اور شعبے کا نام روشن کیا ہے۔ واضح ہو کہ شعبے کی دو طالبات فرحت اختر نے چوتھی مرتبہ اور نزہت اختر نے تیسری مرتبہ نیٹ کا ایکزام کو ایفائی کیا ہے۔ شعبہ اردو کے اساتذہ اور اراکین نے ان سبھی ہونہار طلبہ و طالبات کو مبارک باد اور نیک خواہشات پیش کیں۔

اس موقع پر تقریب کی صدارت کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے سبھی طلبہ و طالبات کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ محنت ہمیشہ رنگ لاتی ہے۔ محنت کبھی ضائع نہیں جاتی لیکن محنت بھی صحیح سمت میں کرنی چاہئے۔ جو بھی طالب علم محنت اور سچی لگن سے کسی بھی امتحان کی تیاری کرتے ہیں تو یقینی طور پر کامیابی کے امکانات کافی بڑھ جاتے ہیں۔ نئے طالب علم ابھی سے عہد کریں کہ خوب محنت اور دل لگا کر نہ صرف اپنی نصابی کتابیں بلکہ مقابلہ جاتی امتحان کے لیے بھی مستند کتابیں پڑھیں گے۔ اگر آپ ایسا کر لیتے ہیں تو یقیناً کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے شعبے کے استاد ڈاکٹر آصف علی نے کامیاب طالبات کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ آج کا دور مقابلے کا دور ہے۔ ذرا سی لاپرواہی اور کوتاہی آپ کو مقابلے سے آؤٹ کر دیتی ہے۔ طالب علموں کو یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ سماج، ملک و قوم کی ترقی اور رہنمائی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ماہرین افراد کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔ آپ حضرات بھی خوب دل لگا کر پڑھیں اور محنت کریں بھی ایک صالح معاشرے کی تشکیل میں آپ معاونت کر سکیں گے۔

ڈاکٹر شاداب علیم نے کہا کہ آج بڑا خوشی کا دن ہے۔ دراصل طالب علموں کی کامیابی اساتذہ کی کامیابی ہے۔ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ آج لڑکیاں بھی ہر میدان میں کامیابی حاصل کر رہی ہیں اور اپنے گھر، خاندان اور اسکول و کالجز کا نام بھی روشن کر رہی ہیں۔ میں آپ سبھی طالب علموں سے گزارش کرتی ہوں کہ تمام طلباء پڑھنے کے لیے پابندی سے اپنا کوئی ایک وقت مقرر کریں جس میں سنجیدگی سے نصابی کتابوں اور دیگر ضروری مقابلہ جاتی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ آپ کو آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ڈاکٹر اکاوش شٹھ نے کہا کہ میں نیٹ کو ایفائی طالبات کو دلی مبارک باد دیتی ہوں اور جو طالب علم نیٹ کو ایفائی سے اس بار رہ گئے ہیں وہ دل چھوٹا نہ کریں اور زیادہ محنت کریں۔ یقیناً کامیابی ان

کے بھی قدم چومے گی۔

ڈاکٹر ارشد سیانوی نے کہا کہ اردو میں معلم کا کیریئر بنانے کے لیے نیٹ کا امتحان طالب علم کے لیے نہایت ضروری ہے اور دور حاضر مقابلہ جاتی کا دور ہے۔ ایسے میں طالب علم اپنے مضمون کے لیے شب و روز محنت کریں، سیمینار میں مقالات پیش کریں، ادبی گفتگو میں حصہ لیں۔ اپنے مضمون میں مہارت حاصل کریں پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ کوئی بھی مقابلہ جاتی امتحان کو الیفائی نہ کریں۔ اس موقع پر سعید احمد سہارنپوری، محمد شمشاد، محمد شاہد ویز عالم کے علاوہ طلبہ و طالبات موجود رہے۔



پریم چند پر دوروزہ بین الاقوامی سیمینار کا افتتاحی اجلاس منعقد

میرٹھ: 28 جنوری 2026ء

منشی پریم چند پر نقاد تو بہت ہیں لیکن محققین بہت کم ہیں۔ پریم چند نے تین سو سے زائد افسانے لکھے لیکن ان کے چند افسانوں پر ہی بات ہوتی ہے۔ ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے۔ کبھی انہیں برہمن مخالف کہا گیا تو کبھی اسلام اور ملت مخالف بھی کہا گیا۔ یہ الفاظ تھے معروف ناقد محقق ڈاکٹر پردیپ جین کے جو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے شعبہ اردو کے پریم چند سیمینار ہال میں منعقد دوروزہ بین الاقوامی سیمینار بعنوان ”پریم چند کا ادب: ماضی، حال اور مستقبل“ کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبے کے دوران اپنی تقریر میں ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ آج پریم چند کے حوالے سے تحقیق کی اشد ضرورت ہے بھی ہم صحیح معنوں میں پریم چند کو سمجھ پائیں گے۔ ابھی بھی ان کی بہت سی تخلیقات اس دور کے مختلف رسائل و جرائد میں محفوظ ہیں جنہیں منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز محمد ندیم نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ بعد ازاں مہمانوں کا پھولوں کے ذریعے استقبال کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی بطور معروف ناقد شاعر امیر مہدی [انگلینڈ] نے شرکت فرمائی۔ مہمانانِ ذی وقار کے بطور ڈاکٹر وحی اعظم انصاری [لکھنؤ]، ڈاکٹر نفیس عبدالحکیم [الہ آباد] آفاق احمد خاں، شریک ہوئے۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم، نظامت ڈاکٹر آصف علی اور شکر علی کی رسم آفاق احمد خاں نے انجام دی۔

اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ منشی پریم چند ایسے فکشن نگار ہیں جس کی اہمیت ہر دور میں یکساں رہے گی۔ کیونکہ ان کے ناول ہوں یا افسانے تمام تخلیقات میں سماج کے مسائل، انسانی جذبات و خیالات اور عہد حاضر کے پیچیدہ مسائل کو آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے پریم چند کے مشہور ناول ”رنگ بھومی“ کے ایک کردار سورداس کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ کیا زبردست کردار ہے جو ہر دور میں مظلوم کو تقویت بخشتا ہے۔ جب تک سورداس جیسے کردار ہیں گے پریم

چند کو کوئی نہیں بھلا سکتا۔

انگلینڈ سے تشریف لائے مہمان خصوصی امیر مہدی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو بہت سے لوگ مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں جب کہ یہ مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ فراق گورکھپوری، بیدی، کرشن چندر، دیاندر نسیم اور ہزاروں افراد ہیں جو اردو میں لکھتے رہے ہیں۔ یہ صرف ایک ہندوستانی زبان ہے۔ آپ کا لکھا ہوا مقبرہ بھی ہو سکتا ہے اور کفن بھی۔ اس لیے جو کچھ لکھا جائے وہ صحیح اور ٹھیک ٹھیک اور ایمانداری سے لکھا جائے۔ پریم چند برصغیر کا ایک سنگ میل ہے جس کے بغیر فلشن کی تاریخ ادھوری ہے۔ پریم چند نے ماضی کو برتا اور حال کو محسوس کیا۔ ان سے پہلے شہزادوں اور پریوں کی خیالی دنیا آباد تھی مگر پریم چند نے اردو فلشن کو حقیقی کردار دیے۔ پریم چند نے بھوک، پیاس، غریبی، ظلم و کرب کے ماحول کو صاف صاف پیش کیا۔ پریم چند پہلے فن کار ہیں جنہوں نے سماج کو شعور عطا کیا۔ انہوں نے زندگی کی ترجمانی کی ہے۔ پریم چند کے فن کا حال سے رشتہ اتنا ہی گہرا ہے جتنا ماضی سے ہے۔

شہر قاضی زین السالکین نے کہا کہ تحقیق کرتے وقت ہمیں بڑی احتیاط سے کام کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہم بہت سی کتابوں سے اقتباسات اتار دیتے ہیں اور کبھی کبھی ان اقتباسات کو اپنے لفظوں میں لکھ دیتے ہیں۔ لیکن جب تحقیق کے آخری مرحلے میں آتے ہیں تو ہماری یہ چوری اس انداز میں پکڑی جاتی ہے کہ تمام صفحات پیل نظر آتے ہیں۔ اس لیے تحقیق کرتے وقت ہمیں ایمانداری سے کام کرنا چاہئے۔

اپنی صدارتی خطبے میں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ اچھی کہانی بھی قاری کو بار بار پڑھنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ منشی پریم چند کی بہت سی کہانیاں ایسی ہیں جن میں فنی چابکدستی اور عمدہ اسلوب دکھائی دیتا ہے۔ پریم چند کے فن پر گفتگو کرنا آج کے عہد میں اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ انہوں نے آج کے مسائل کو بہت پہلے محسوس کرتے ہوئے یعنی اپنے زمانے میں ہی ایسا ادب تخلیق کیا جس کو ہم کسی بھی قیمت پر نظر انداز نہیں کر سکتے۔

اس موقع پر مولانا شاہ عالم گورکھپوری، ڈاکٹر اکاوش ششٹھ، ڈاکٹر ارشد سیانوی، شہناز پروین، فرحت اختر، عظمیٰ سحر، محمد عیسیٰ رانا، محمد زبیر، عمائدین شہر اور طلبہ و طالبات موجود رہے۔



سماجی خدمات کے اعتراف میں کا منا پرساد کو پہلا ڈاکٹر معراج الدین احمد ایوارڈ

شعبہ اردو اور سیف فاؤنڈیشن کے اشتراک سے پہلے

ڈاکٹر معراج الدین احمد میموریل لیکچر اور ایوارڈ کا انعقاد

میرٹھ: 10 جنوری

’مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیرکھنا‘ یہ علامہ اقبال کے شعر کا مصرعہ ہے جو قومی اتحاد کا پیغام لیے ہوئے ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری میں قومی اتحاد اور ہندوستان کی خوبصورتی کی جو تصویر کشی ملتی ہے

اردو شاعری میں دیگر شعرا کے یہاں وہ خال خال ہی نظر آتی ہے۔ اسی طرح ابن خلدوں نے اپنی تصنیف ”مقدمہ ابن خلدون“ میں بھی سماجی انصاف اور برابری کے تصور کے حوالے سے جو چیزیں پیش کی ہیں وہ نہایت اہم ہیں۔ ہم بہتر سماجی اقدار کے لیے اس کتاب سے خوب فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ الفاظ تھے معروف اسکالر پروفیسر ابوسفیان اصلاحی کے جو شعبہ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور سیف فاؤنڈیشن کے باہمی اشتراک سے اٹل سبھا گار میں منعقد پہلے ڈاکٹر معراج الدین احمد میموریل لیکچر بعنوان ”سماجی انصاف اور برابری کا تصور“ موضوع پر اپنے کلیدی خطبے کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ سرسید نے بھی جو کچھ اس حوالے سے کہا ہے وہ بھی ہمارے سامنے ہیں کہ ہندوستان ایک خوبصورت دہن کی مانند ہے جس کی دو آنکھیں ہیں انہوں نے ایک آنکھ کو ہندو اور ایک کو مسلم سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن بھی یہی پیغام دیتا ہے کہ بلا تفریق مذہب و ملت دنیا میں جتنی قومیں ہے سب اللہ کی سوسائٹی ہے۔ اب اگر سوسائٹی میں کسی کو برابری کا درجہ نہ دیں تو وہ اس کے ساتھ نا انصافی ہوگی۔ اس بنا پر کہا گیا ہے کہ جس نے کسی بے گناہ شخص کو بچا لیا اس نے پوری انسانیت کو بچا لیا۔ بہتر سوسائٹی کے لیے عورتوں کا اعزاز بھی نہایت ضروری ہے۔ سماج میں ہر کسی کو برابری کا درجہ دیتے ہوئے بہترین سوسائٹی قائم کر سکتے ہیں۔ اس ہندوستان کو سرسیدی طرح خوبصورت بنانے میں ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں مگر ان کم لوگوں میں معراج الدین صاحب بھی شامل تھے۔ معراج صاحب نے ادب سے بھی محبت کی اور انسانوں سے بھی۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز مولانا انیس الرحمن قاسمی نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ بعد ازاں سبھی مہمانان کا استقبال پھولوں سے کیا گیا۔ پروگرام کی سرپرستی ممبر آف پارلیامنٹ راجہ سبھا کشمی کانت واجپئی اور معروف شاعر اور ماہر تعلیم ڈاکٹر نواز دیوبندی نے فرمائی۔ صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے مہمانان ذی وقار کے بطور رفیق انصاری [ایم ایل اے، میرٹھ شہر، راجندر شرما، شو بھت یونیورسٹی کے چانسلر کنور شکھر وحید نے شرکت فرمائی۔ کلیدی خطبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے پیش کیا۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم اور عامرہ احمد نے پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر آفاق احمد خاں اور شکریہ کی رسم بدر محمود نے انجام دی۔ اسی دوران ڈاکٹر معراج الدین احمد پڑھنی ڈاکیومنٹری فلم بھی دکھائی گئی۔

اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے عامرہ احمد نے کہا کہ میرے والد ہمیشہ کہتے تھے کہ ہمیں دوسروں کی فکر کرنا چاہیے۔ آج آپ سب کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ میں نے بہت سی باتیں صرف پاپا سے سیکھی ہیں۔ جب وہ کام کرتے تھے تو موسم اور وقت ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ چودھری یشپال سنگھ نے کہا کہ ہمارا تعلق معراج صاحب سے اب چوتھی نسل میں داخل ہو چکا ہے۔ آپ کا تعلق رٹول سے تھا۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی باتیں، ان کی یادیں ہمیشہ ساتھ رہیں گی۔

پروگرام کے دوران پہلا ڈاکٹر معراج الدین احمد ایوارڈ بھی معروف سماجی کارکن اور جشن بہار

ٹرسٹ، نئی دہلی کی فاؤنڈر محترمہ کا منہ پر سادکوان کی سماجی خدمات کے اعتراف میں پیش کیا گیا۔ ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد کا منہ پر ساد نے کہا کہ معراج صاحب کا تعلق جس گھرانے سے تھا وہ گھرانہ صدیوں سے ادبی، علمی، اخلاقی بلندی کو اجاگر کرتا رہا ہے۔ میرٹھ نے اردو کو کئی اہم نام دیے ہیں۔

لکشمی کانت واچپئی نے کہا کہ معراج صاحب سینچائی منسٹر تھے۔ معراج الدین احمد بے باک لہجے کے مالک اور کھرے انسان تھے۔ گنگا جل کی سپلائی جو آج میرٹھ کو مل رہی ہے وہ معراج صاحب کی دین ہے۔ وہ جب سڑک پر چلتے تھے تو کبھی سرا پر نہیں اٹھاتے تھے۔ آج میرٹھ کی عوام ان کا جتنا بھی شکر یہ ادا کرے وہ کم ہے۔

کنور شیکھر وجیندر نے کہا کہ جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں وہ سب معراج کی محبت کی دین ہے۔ وہ صرف وزیر نہیں تھے بلکہ بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ ڈاکٹر معراج الدین خود گنگا جمنی تہذیب کی مثال تھے۔ رفیق انصاری نے کہا کہ میں ڈاکٹر معراج الدین کے خاندان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جنہوں نے ان کی یاد میں اتنے خوبصورت پروگرام کا اہتمام کیا۔ اگر صحیح معنوں میں سچے ہندوستان کو دیکھنا ہو تو پورا ہندوستان یہاں بیٹھا ہے۔ معراج صاحب کی زبان بہت میٹھی تھی۔ وہ اردو زبان کا استعمال کرتے تھے۔ راجندر شرما نے کہا کہ ہم سب معراج صاحب کے کردار سے واقف ہیں مگر یہ سچ ہے کہ سماجی انصاف اور برابری کی وہ زندہ مثال تھے۔ ڈاکٹر معراج کے بتائے ہوئے راستے پر ہمیں چلنا چاہئے۔ پروفیسر جمال احمد صدیقی نے کہا کہ میں اس موقع پر ان کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ معراج صاحب کو چاہئے والے لوگ ان کی محبت کی وجہ سے یہاں آئے ہیں۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ معراج صاحب تہذیب، محبت اور ایمانداری کی مثال تھے۔

ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کہا کہ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جن کو سب یاد کرتے ہیں میرا یہ کہنا ہے کہ زندگی میں قدر کرنا سیکھو قسمت جاگ جائے گی۔ سماج و ادب کی صحت کے لیے اسلم جمشید پوری جیسے انسان بہت کم ملتے ہیں۔ آج معراج صاحب کو یاد کر رہے ہیں یہ ان سے محبت، ہمدردی اور خلوص کی بدولت ہے۔ کہ وہ کہا کرتے تھے کہ آپس میں لڑائی مت کرو اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بڑے خلوص کے انسان تھے۔

پروگرام میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ڈاکٹر معراج الدین احمد اس شہر کی ادبی، سیاسی اور سماجی وراثت کا ایک حصہ تھے۔ انہوں نے اور ان کے پورے خاندان نے شہر میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ادب میں ان کے خانوادے کا میرٹھ کی تشہیر میں بڑا ہاتھ ہے۔ ایسے شخص کا یہاں سے چلے جانا ہم سب کا نقصان ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ان کے لگائے ہوئے پودے کو سینچے اور ہر سال ان کی یاد میں ایک پروگرام کرائیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر آصف علی، جی ایس دھاما، ایڈوکیٹ، چودھری یشپال سنگھ، ڈاکٹر کمریندر سنگھ، ڈاکٹر ارشد سیانوی، ڈاکٹر اکاوش سنگھ، ملیحہ احمد، نبیل انور، حکیم حارث محمود، انجم صدیقی، تبسم عرفان،

آر ایل بشنوئی، سنجے گپتا، شاہد صدیقی، ٹھاکر پریش سنگھ، منیش پرتاپ، روی بشنوئی، ہلال احمد، جاوید، غازی، شاہد سیفی، زاہد سیفی، فضل چوہان، سلیم بھارتی، کنور رئیس احمد، فرزانہ سہرواری، شکتی راج سنگھ ایڈوکیٹ، انکت چودھری ایڈوکیٹ، فیض محمود، سلیم سیفی، اقبال سیفی، انعم شیروانی، محمد عیسیٰ رانا، محمد ندیم، محمد شمشاد، فرحت اختر ڈاکٹر تابش فرید، شاہ فیصل، طلبہ و طالبات اور کثیر تعداد میں عمائدین شہر موجود رہے۔

☆☆☆



شعبہ اردو کی الوداعی تقریب میں دائیں سے ڈاکٹر شاداب علیم، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر ذکی طارق، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر اکاوش شیشہ اور ڈاکٹر ارشاد سیانوی شرکت کرتے ہوئے



حال ہی میں شعبہ اردو کے زیر نگرانی عمل میں آئی تنظیم ”مجلس النساء“ کے ارادکین کے ساتھ شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری

ادب نما کی خبریں

شعبہ اردو، سی سی ایس یونیورسٹی میں ”ادب اطفال کے فروغ میں خواتین کا حصہ“ موضوع پر آن لائن پروگرام کا انعقاد

میرٹھ 14 مئی 2026ء

جب ادب بھی نہیں تھا تب سے خواتین نے بچوں کے ادب پر سوچا، لکھا اور پڑھا۔ ابھی منیو جان ہی نہیں سکتے تھے کہ اگر وہ اپنی ماں سے یہ نہ سنتے کہ چکرویکسے ٹوٹے گا۔ جو بچوں کے لیے لکھ رہے ہیں یا بچوں کے لیے ادارے کھلے ہوئے ہیں، انہیں ان کا حق نہیں مل رہا ہے۔ یہ الفاظ تھے سابق صدر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر صغیر افراتیم کے جو شعبہ اردو اور ایوسا کے زیر اہتمام منعقد ”ادب اطفال کے فروغ میں خواتین کا حصہ“ موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہمارے مدارس، اسکول، کالج اور یونیورسٹیز کو چاہئے کہ بچوں کے ادب پر کام کریں۔ ہمیں اپنی فکر، سوچ، زاویہ اور لب و لہجہ بدلنا ہوگا کیونکہ ماحول میں ذرا سی کمی بچوں کے دل پر اثر کرتی ہے۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز سعید احمد نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ ہدیہ نعت ایم۔ اے سال اول کی طالبہ مہوش نے پیش کیا۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراتیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور معروف فکشن نگار قمر جمالی، حیدر آباد اور مہمان اعزازی کے بطور دہلی سے معروف فکشن نگار نعیمہ جعفری پاشا نے شرکت فرمائی اور مقالہ نگار کے بطور معروف جرنلسٹ شاہ تاج خان، پونا اور نزہت اختر، میرٹھ نے شرکت کی۔ مقرر کے بطور لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود ہیں۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی، نظامت ڈاکٹر شاداب علیم اور شکریہ کی رسم فرحت اختر نے ادا کی۔

پروگرام کا تعارف پیش کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ جب ہم لکھنے والی خواتین کو پڑھتے ہیں تو پاتے ہیں کہ انہوں نے کہیں نہ کہیں بچوں کے لیے لکھا ہے۔ بچوں کے لیے لکھنا بڑی بات ہے۔ قرۃ العین جیسی بڑی ادیبہ نے بھی بچوں کے لیے کہانیاں لکھی ہیں۔ ہماری بہت سی بڑی خواتین ادیبہ ہیں مگر افسوس انہوں نے بچوں کے لیے بہت کم لکھا ہے جب کہ بچوں کے لیے لکھنا اور ان کی رہنمائی کرنا ایک بڑا کام ہے۔

اس موقع پر نزہت اختر نے ”اردو ادب اطفال اور بانو سرتاج: ایک جائزہ“ کے عنوان سے

مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر بانو سرتاج ادب اطفال کے حوالے سے ایک بڑا نام ہے جنہوں نے بچوں کے لیے ڈرامے، ناول لکھے اور شاعری بھی کی۔ بانو سرتاج ایک بہترین مترجم بھی ہیں۔ افسانہ نگاری میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی۔ بانو سرتاج کے ادب اطفال میں بچوں کی بہترین رہنمائی کی گئی ہے۔

دوسری مقالہ نگار شاہ تاج خان نے بعنوان ”جدید اردو ادب اطفال اور خواتین کا ادب“ مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ادب اطفال وہ ادب ہے جس میں بچوں کے لیے ایسا ادب تخلیق کیا جاتا ہے جو انہیں تعلیم و تربیت اور اخلاق سکھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ خواتین کا بہتر تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے بھی وہ بچوں کے ادب کو بہتر طریقے سے پیش کر سکتی ہیں۔ اردو ادب اطفال کی قدیم کہانیاں اصلاحی تھیں اور یہ بھی سچ ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ اردو ادب کا ایک حصہ روایتی سانچوں میں قید ہے۔ خواتین کی کثیر تعداد اردو ادب میں طبع آزمائی کر رہی ہے۔ اردو ادب اطفال میں اب سائنس کے ساتھ ساتھ نصیحت آموز کہانیاں بھی ملتی ہیں۔ تبدیلی لانے کے لیے جرأت کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ بچوں کے لیے لکھنے والی قلم کار خواتین بچوں کی تربیت میں مشغول ہیں لیکن وہ بچوں کی تربیت کے لیے تحقیق نہیں کر پاتیں۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا نے کہا کہ آج کل بہت کم خواتین بچوں کا ادب لکھ رہی ہیں لیکن ہم نا امید نہیں ہیں۔ ابھی بھی کافی کام ہو رہا ہے۔ قمر جمالی نے کئی کتابیں ادب اطفال پر لکھی ہیں۔ میں ادب اطفال کے تعلق سے یہی کہوں گی کہ ادب اطفال کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ جو ہم لکھ رہے ہیں وہ بچوں کے ذہن تک پہنچا جائے۔ آج کل کے بچے پہلے جیسے نہیں ہیں، عصر حاضر کے مسائل، ترقیات، سائنس و ٹیکنالوجی سے بچوں کو واقف کرانا ضروری ہے۔ ادب اطفال میں سائنس فکشن پر لکھنا بہت ضروری ہے۔ مہمان خصوصی قمر جمالی نے کہا کہ میں تو چراغ سحری ہوں۔ ادب اطفال میں بہت سی خواتین سائنسی ادب اطفال پیش کر رہی ہیں یہ بڑی بات ہے۔ بچوں کے ادب پر خواتین خوب لکھ رہی ہیں۔ بیسویں صدی میں خواتین نے بچوں کے ادب پر ذرا کم لکھا۔ بچوں کے ادب پر لکھنا آج کی ضرورت بھی ہے کیونکہ آج کے بچے نصیحت پسند نہیں کرتے۔

پروگرام سے ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر الکا وششٹھ، سیدہ مریم الہی، فرحت اختر، محمد شمشاد اور دیگر طلبہ و طالبات جڑے رہے۔



شعبہ اردو سی سی ایس یونیورسٹی میں

”زبانوں کے فروغ میں AI کا حصہ“ موضوع پر آن لائن پروگرام کا انعقاد

میرٹھ 30/اپریل 2026ء

مصنوعی ذہانت آج کی ضرورت ہے۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو دماغ دیا ہے کیا اس پر کوئی ٹیکنالوجی حاوی ہو سکتی ہے۔ مصنوعی ذہانت صرف کمپیوٹر سے آگے کی چیز ہے۔ مصنوعی

ذہانت وہ ٹیکنالوجی ہے جو ہمارے دماغ کو چلانے میں مدد کرتی ہے مگر ہمیں اسے اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دینا چاہئے۔ یہ الفاظ تھے پروفیسر جمال احمد صدیقی کے جو شعبہ اردو اور ایوسا کے زیر اہتمام منعقد ”زبانوں کے فروغ میں AI کا حصہ“ موضوع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اے آئی کا استعمال ہم اپنے کام کو آسان کرنے کے لیے کر سکتے ہیں، مصنوعی ذہانت کو زبان کا کیا معلوم؟۔ اے آئی کی ایک پریشانی یہ بھی ہے کہ جو رزلٹ یہ دیتا ہے اس پر ہم پورا یقین نہ کریں اور اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیں۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز سعید احمد نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور پروفیسر جمال احمد صدیقی [صدر شعبہ لائبریری سائنس، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی] نے شرکت فرمائی اور مہمانان اعزازی کے بطور ڈاکٹر عبدالحی [صدر شعبہ اردو، گیارہ کالج، بہار] اور ڈاکٹر جاوید رسول [اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، کشمیر] نے آن لائن شرکت کی۔ جب کہ مقالہ نگار کے بطور جاوید رسول، کشمیر نے پروگرام میں شرکت کی اور مقررین کے بطور لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود ہیں۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر شاداب علیم اور نظامت کے فرائض شعبہ کی ریسرچ اسکالر سیدہ مریم الہی نے انجام دیے۔

پروگرام کا تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ مصنوعی ذہانت کے فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ اگر ہم مصنوعی ذہانت کے نقصان کی بات کریں تو اس کے زندگی پر منفی اثرات بھی پڑتے ہیں، تحقیق کرنے کی صلاحیت میں کمی، نوکریوں کا خاتمہ اور جعلی معلومات کا ڈر ہوتا ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی دورائے نہیں کہ مصنوعی ذہانت ایک انقلابی تحریک ہے جو ہماری ذہانت میں مدد کرتی ہے۔ نئی نئی چیزوں کا تلاش کرنا آسان ہو گیا ہے۔

اس موقع پر معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کے طالب علموں کے علاوہ کسی بھی کلاس کے طلباء کے لیے AI بہت اہم ہے۔ AI آج ہماری ضرورت بن گیا ہے۔ اردو میں اس کا استعمال خوب ہو رہا ہے۔ فلم انڈسٹری میں اس کا استعمال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ AI کے ذریعے کسی لفظ کی پوری تاریخ کا پتہ لگا سکتے ہیں بس ضرورت اس بات کی ہے کہ AI کا استعمال کرتے ہوئے ہمیں بہت ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔

ڈاکٹر جاوید رسول نے کہا کہ AI ایک مکمل صورت حال ہے جو ایک کلچر بننا جا رہا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اے آئی زبانوں کو فائدہ پہنچائے گا یا نقصان۔ یہ سماج کے لیے سودمند ہے یا نقصان دہ۔ ڈیجیٹل دنیا میں سب کچھ زبان ہی ہے اگر زبان کا ڈیجیٹلائز کیا جائے تو ہم جتنا ڈیٹا اے آئی کو فراہم کریں گے اتنا ہی وہ اپنے میں فیڈ کرے گا۔ اے آئی نے قاری اور ادیب دونوں کے لیے آسانی پیدا کی

ہے۔ اے آئی کے پاس جتنا بھی ڈاٹا ہے اس کے ذریعے سے وہ آپ کی مدد کرتا ہے۔ وہ غزل کا وزن بھی درست کرا سکتا ہے۔ ہمارے رائٹر کو زیادہ باخبر رہنا ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالحی نے کہا کہ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی نہایت ضروری ہے۔ یہ دور ایسا ہے کہ جس سے کے پاس سب سے زیادہ معلومات ہے وہ سب سے زیادہ ذہین ہے۔ اردو میں آج ہم AI سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہماری بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ اے آئی کا استعمال تو کریں لیکن ہوشیار رہیں تبھی ہم اے آئی کے استعمال سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اس موقع پر سیف اظہر نے ”مصنوعی ذہانت اور تدریسی زبان و ادب“ کے عنوان سے ایک بہترین مقالہ بھی پیش کیا۔

اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر صغیر افرام نے کہا کہ اس ترقی یافتہ زمانے میں ہمیں ہوشیار ہونے کی ضرورت ہے اور ہمیں اے آئی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم ہوشیار نہیں ہوئے تو کہیں نہ کہیں اے آئی میں غلطی ہو سکتی ہے۔ طلباء اس تکنیک کو آج زیادہ سیکھ رہے ہیں مگر ان کو بھی محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ خدا نے جو کچھ ہمیں عطا کیا ہے وہ لامحدود ہے اور اے آئی ابھی تک وہاں نہیں پہنچ پائی ہے اور ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

پروگرام سے ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر اکاوش ششہ فرحت اختر، محمد شمشاد اور دیگر طلبہ و طالبات جڑے رہے۔

شعبہ اردو میں سی سی ایس یونیورسٹی میں

”ساتھیہ اکادمی کی ادبی سرگرمیاں“ موضوع پر آن لائن پروگرام کا انعقاد

میرٹھ 16 اپریل 2026ء

بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں ساتھیہ اکادمی دہلی کی طرف سے غلط فہمیاں بھری ہوئی ہیں۔ میں تقریباً 35 سال سے اکادمی سے جڑا ہوا ہوں۔ بہت سے ادبا و شعرا اکادمی سے ناراض بھی ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انہیں پوری بات کا علم نہیں ہو پاتا۔ ایوارڈ کمیٹی کے انتخاب کا کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔ ساتھیہ اکادمی نے مجھے چالیس برس کی عمر میں ایوارڈ سے نوازا اور بعد میں فیلوشپ بھی دی۔ ایوارڈ سے ادیب بڑا نہیں ہوتا صرف حوصلہ ملتا ہے۔ یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ ساتھیہ اکادمی ایوارڈ ملنے پر کوئی بڑا ادیب بن جاتا ہے۔ یہ الفاظ تھے معروف فنکار عبدالصمد کے جو ایو سا اور شعبہ اردو کے زیر اہتمام منعقد ”ساتھیہ اکادمی کی ادبی سرگرمیاں“ موضوع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ بہت سے ادیب ایسے بھی ہے جو واقعی بہت بڑے ادیب ہیں لیکن یہ ایوارڈ ان کو نہیں ملا۔ دنیا کا کوئی ایوارڈ ایسا نہیں جس میں کنٹوریسی نہ ہو۔ آج کا یہ پروگرام بہت عمدہ رہا۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز محمد ندیم نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض

معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افرام نے انجام دیے۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے معروف فکشن نگار عبدالصمد اور معروف شاعر چندر بھان خیال اور مہمان ذی وقار کے بطور ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے شرکت فرمائی۔ مقررین کی حیثیت سے لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین اور ڈاکٹر ابوظہیر ربانی موجود رہے۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر اکاوش شٹھ نے انجام دیے۔

اس موقع پر معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ساہتیہ اکادمی دہلی ایک ایسی اکادمی ہے جو ہندوستان کی تقریباً 24 زبانوں کو فروغ دینے کا کام کرتی ہے اور کئی طرح کے پروگرام اکادمی کے ذریعے عمل میں آتے ہیں اور مختلف ادیبوں، دانشوروں کو بلا کر ان کا تعارف اور ان کے خیالات کو ہم تک پہنچانے کا کام کرتی ہے۔

ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کہا کہ ساہتیہ اکادمی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کسی طرح کا سیاسی دخل نہیں ہوتا۔ چوبیس زبانوں کو یہ اکادمی دیکھتی ہے اور نئے پرانے ادیبوں کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ یہ زبان کسی خاص مذہب اور کسی خاص طبقے کی زبان نہیں ہے۔ زبان بہت ہی بڑا وسیلہ ہے۔ اپنی مادری زبان کی اہمیت کو سمجھیں۔ اس لیے یہ اکادمی بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی زبان کا بھی خیال رکھتی ہے۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے کہا کہ میں بڑا فخر محسوس کر رہی ہوں کہ آج بڑے بڑے فکشن

نگاروں اور ناقدین کے درمیان پروگرام میں شامل ہوں اور کچھ بول رہی ہوں۔ حقیقت میں ساہتیہ اکادمی کی سرگرمیاں ایسی ہیں جن کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا اور جب مجھے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تو مجھے خود یقین نہیں ہوا کہ مجھے یہ ایوارڈ مل رہا ہے۔ بہر حال مجھے پروگرام میں مدعو کرنے کے لیے آپ سب کا بے حد شکریہ

چندر بھان خیال نے کہا کہ آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ساہتیہ اکادمی پر پروگرام کیا۔ یہ اکادمی صرف ادیبوں اور شاعروں کو انعامات سے ہی نہیں نوازی بلکہ ہندوستان کی تقریباً 24 زبانوں کی خدمت کر رہی ہے اور علاقائی زبانوں پر کام کرنے والے ادیبوں کو بھی یہ اکادمی سراہتی ہے۔

پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ آج کا یہ پروگرام ریسرچ اسکالر اور طالب علموں کے لیے بہت اہم ہے۔ آج کے مہمانوں کی گفتگوں کر بہت سی غلط فہمیاں دور ہوں گی۔ اس ادارے کے ذریعے ہماری پذیرائی بھی ہوتی ہے اور دیگر زبانوں کی بھی خدمت ہو رہی ہے۔

پروگرام کے آخر میں اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر صغیر افرام نے کہا کہ جو لوگ ساہتیہ اکادمی دہلی سے وابستہ ہیں ہم ان کا احترام کرتے ہیں۔ لسانیات کے اعتبار سے بھی بہت سے کام ساہتیہ اکادمی میں ہوتے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی دہلی کے آج تین اہم پلر ہمارے ساتھ ہیں۔ آج یلگ جزیشن کچھ زیادہ مشغول ہو گئی ہے۔ 35 سال بعد بھی اکادمی میں ادیبوں کی کتابوں پر انعام ملتا ہے۔ یہ اکادمی کبھی قیمت کا خیال نہیں رکھتی۔ پوری اردو دنیا میں آپ کا پیپر کہاں سے چھپا اور کہاں شائع ہوا۔ ساہتیہ اکادمی اس بات پر بھی نظر رکھتی ہے۔ عبدالصمد بہت بڑا ادیب ہے جب بھی ان پر گفتگو ہوتی تھی ہم غور

سے سنتے تھے، اردو کے لیے، ادب کے لیے جو مقدس پلیٹ فارم ہے اس کے لیے ادیب کو یہ کرنا چاہئے کہ احترام کی وجہ سے جوئے اتر وادیے جاتے ہیں۔ آج ہمارے ساتھ جو لوگ جڑے ہیں ان سے ہمیں بڑی تقویت ملی۔

پروگرام سے ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، سیدہ مریم الہی، محمد شمشاد، سعید احمد سہارنپوری اور دیگر طلبہ و طالبات جڑے رہے۔



شعبہ اردو میں سی سی ایس یونیورسٹی میں ”رشید حسن خاں حیات و فن“ موضوع پر آن لائن پروگرام کا انعقاد

میرٹھ 12 فروری 2026ء

میرے سامنے رشید حسن خاں کی تحریر کردہ کتاب ”اردو املا“ ہمیشہ رہتی ہے۔ بلاشبہ رشید حسن خاں نے تحقیق اور زبان کے حوالے سے نہایت اہم کام انجام دیے۔ انشاءً غالب اور ”گنجینہ“ معنی تسلیم، وغیرہ ایک طویل فہرست ہے۔ رشید حسن خاں نے بھی ناسخ کی طرح زبان پر بہت کام کیا۔ یہ الفاظ تھے معروف محقق و ناقد ڈاکٹر تقی عابدی [کناڈا] کے جو آپوسا اور شعبہ اردو کے زیر اہتمام منعقد ”رشید حسن خاں: حیات و فن“ موضوع پر اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ آئندہ ہفتوں میں علم عروض اور تحقیق و تنقید پر بھی پروگرام ہونے چاہئیں۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز محمد ندیم نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری اور بین الاقوامی شہرت یافتہ محقق و ناقد ڈاکٹر تقی عابدی [کناڈا] نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر ابراہیم نے انجام دیے پروگرام میں لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود ہیں۔ مقالہ نگار کے بطور ڈاکٹر ابراہیم افسر نے شرکت فرمائی۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات عظمیٰ سحر اور نظامت کے فرائض شعبہ کی استاد محترمہ فرحت اختر اور شکریہ کی رسم ڈاکٹر شاداب علیم نے انجام دی۔

ڈاکٹر ابراہیم افسر کا تعارف پیش کرتے ہوئے عظمیٰ سحر نے کہا کہ ڈاکٹر ابراہیم افسر عہد حاضر میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اردو اخبارات و رسائل و جرائد میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اگر میں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ نئی نسل میں رسائل و جرائد میں جتنے مضامین ڈاکٹر ابراہیم افسر کے شائع ہوتے ہیں شاید ہی کسی اور کے ہوتے ہوں۔ صرف مضامین ہی نہیں بلکہ کتابوں کے تبصرے، تجزیے اور اپنی ناقدانہ رائے سے ڈاکٹر ابراہیم افسر نے قارئین کو خاصا متاثر کیا ہے۔ ڈاکٹر ابراہیم افسر نے ممتاز محقق رشید حسن خاں پر تو بھرپور تحقیق کی ہی ہے آپ نے دیگر ادبی شخصیات کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ آپ نے رشید حسن خاں پر جتنا کام کیا ہے شاید ہی کسی دیگر مصنف نے کیا ہو۔ رشید حسن خاں کے فکر و فن

اور ان کی تحقیقی خدمات پر ڈاکٹر ابراہیم افسر کی کتابیں سند کا درجہ رکھتی ہیں۔

اس موقع پر معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ اس پروگرام کے ذریعے ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ہم نوجوان نسل کو جوڑیں اور اس میں ہم کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ آج کے پروگرام میں بھی آپ ایسے ہی نوجوان ڈاکٹر ابراہیم افسر کو سنیں گے۔ وہ بھی عصر حاضر کے نوجوانوں میں سے ایک ہیں۔ ڈاکٹر ابراہیم افسر کا رشید حسن خاں پر خاصا کام ہے اور نئی نسل میں ڈاکٹر ابراہیم افسر ایک ممتاز نام ہے۔

پاکستانی اسکالر مہر الیاس نے کہا کہ رشید حسن خاں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ پاکستان کی عام یونیورسٹیز اور کالجز نصاب میں رشید حسن خاں بحیثیت محقق شامل ہیں۔ ابراہیم افسر ایک بڑا نام ہے۔ ان کا کام ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ ڈاکٹر ابراہیم افسر کا کام قابل قدر ہے اور ایسا بہترین کام آئندہ نسل کے لیے بھی قابل تقلید ہے۔

اس موقع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ابراہیم افسر نے کہا کہ رشید حسن خاں کی زندگی کا بیشتر حصہ شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی میں گزرا۔ رشید حسن خاں نے پرانے متن کو ترتیب دینے کے علاوہ اردو املا اور قواعد و زبان پر بھی نہایت باریک بینی سے کام کیا۔ اسی بنا پر پروفیسر گیان چند جین نے رشید حسن خاں کو ”خدائے تدوین“ کہا ہے۔ ان کی تحقیق و تدوین کے کارناموں میں سحر البیان، گلزار نسیم، مشنویات شوق، باغ و بہار، فسانہ عجائب، دیوان خواجہ میر درد، انتخاب نظیر اکبر آبادی، انتخاب شبلی، انتخاب سودا، انتخاب ناسخ، ادبی تحقیق: مسائل و تجزیہ، تلاش و تعبیر، عبارت کیسے لکھیں، انشاء و تلفظ وغیرہ جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔ رشید حسن خاں نے تحقیق کے حوالے سے نہایت احتیاط برتی۔ انہوں نے اس سلسلے میں کچھ اصول اور معیار قائم کیے اور اپنی تحقیقی تصانیف میں ہمیشہ اس کے پابند رہے۔ اسی بنا پر انہوں نے پرانی چلی آرہی بہت سی اغلاط کی نشاندہی کی۔

اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر صغیر ابراہیم نے کہا کہ واقعی آج کا پروگرام بڑا اہم رہا اور آج کے مقالہ نگار ابراہیم افسر صاحب نے رشید حسن خاں پر ایک بہترین مقالہ پیش کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابراہیم افسر صاحب نے بہت باریکی سے رشید حسن خاں پر تحقیقی کام کیا ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ تدوین و تحقیق اور لسانیات کے حوالے سے رشید حسن خاں نہایت اہم اور معتبر نام ہے۔ جنہوں نے اس حوالے سے بہت محنت کی۔

پروگرام سے ڈاکٹر الکاوش شٹھ، سیدہ مریم الہی، محمد شمشاد اور دیگر طلبہ و طالبات جڑے رہے۔

شعبہ اردو سی ایس ایس یونیورسٹی میں ”ترقی پسند تحریک پر ایک گفتگو“ موضوع پر آن لائن پروگرام کا انعقاد میرٹھ 30/ جنوری 2026ء

1932ء میں ”انگارے“ کی اشاعت کے بعد سے ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس تحریک کے روح رواں سجاد ظہیر اور ان کے ساتھی تھے۔ 1936ء کے اجلاس میں پریم چند نے بھی شرکت کی تھی۔ آج آپ ڈیجیٹل دور میں لکھ رہے ہیں اور مقصد بنا کر لکھ رہے ہیں تو آپ ترقی پسند مانے جائیں گے۔ یہ الفاظ تھے معروف ناقد و شاعر امیر مہدی [انگلینڈ] کے جو آپوسا اور شعبہ اردو کے زیر اہتمام منعقد ”ترقی پسند تحریک پر ایک گفتگو“ موضوع پر اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ اس دوران مختلف سوالوں کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر آپ بامقصد اور سماج کی بہتری کے لیے کچھ لکھ رہے ہیں تو آپ ترقی پسند مانے جائیں گے۔ یہ تحریک اشتراکیت سے جڑی سچائی ہے۔ جب تک یہ دنیا رہے گی ترقی پسندی برقرار رہے گی۔ میں جدیدیت کا قائل نہیں ہوں کیونکہ یہ رہنے والی نہیں ہے مگر ترقی پسند تحریک ہمیشہ رہنے والی تحریک ہے۔ ترقی پسند تحریک کا مقصد یہ تھا کہ کوئی کسی کا غلام نہ رہے اور کسی کے ساتھ نا انصافی نہ ہو۔ دوسرے ادب اور تحریک میں وہ اثر نہیں ہے جو ترقی پسند تحریک میں ہے۔ جو چیزیں ترقی کے لیے لکھی جائیں گی وہ رہ جائیں گی لیکن جن کا تعلق ترقی پسندی سے نہیں ہوگا وہ ختم ہو جائیں گی۔ ہمارے معاشرے پر جتنا اثر ترقی پسند تحریک نے ڈالا اتنا کسی اور تحریک نے نہیں ڈالا۔ اگر ہمارے کاموں میں حسن نہیں ہے اور ہم اپنے مقصد کو سامنے رکھ کر کام نہیں کر رہے ہیں تو ہم ترقی پسند نہیں ہو سکتے مگر جو وقت کی ضرورت کے مطابق کام کر رہے ہیں اور ترقی کر رہے ہیں، ضرورتوں کو پورا کر رہے ہیں تو ہم ترقی پسندوں میں شامل ہوں گے۔ اگر آپ بامقصد ادب لکھ رہے ہیں اور ترقی پسند ذہن کے ذریعے سماج میں بھلائی کا کام کر رہے ہیں تو آپ کی تحریکیں انقلابی تحریک لا سکتی ہے۔ پریم چند اور منٹو بھی ترقی پسند ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ضرورت کے مطابق لکھا ہے۔ انہوں نے اس دوران اپنے ناول ”ٹیریرسٹ“ پر بھی تفصیلی گفتگو کی۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز محمد ندیم نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراتیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور معروف ناقد و شاعر امیر مہدی [انگلینڈ] نے شرکت فرمائی۔ لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود رہیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشد سیانوی نے انجام دیے۔

پروگرام میں اظہار خیال کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ترقی پسند تحریک اپنے آپ میں ایک انقلاب ہے۔ یہ تحریک ایک تنظیم بھی جس نے لوگوں کو آگے بڑھا

نے کا کام کیا۔ یہ تحریک جو 1936ء سے شروع ہوئی اس نے اردو میں ایک انقلابی قدم اٹھایا اور پریم چند جیسے ادیب اس تحریک میں شامل تھے۔ اس تحریک نے ناول، افسانے، نظم وغیرہ پر اپنے اثرات ڈالے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ یہ سچ ہے ترقی پسند تحریک بڑی تحریک تھی جس نے ادب میں اپنا خاصا رول ادا کیا۔ لیکن دیگر تحریکوں نے بھی ادب میں اپنا اہم کردار ادا کیا ہے اور جو ادب لکھا جائے گا اس میں بھی ترقی پسندی کے اثرات نظر آئیں گے۔ میں آج کے پروگرام سے اس لیے بھی خوش ہوں کہ آج ترقی پسند تحریک سے متعلق بہت سی نئی چیزیں سننے کو ملیں۔ ہمارے اسکالر کے لیے آج کا پروگرام ایک یاد گاری پروگرام رہے گا۔

اس موقع پر پروفیسر ریشما پروین، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، علما نصیب، سیدہ مریم الہی، عظمیٰ مہدی وغیرہ نے ترقی پسند تحریک سے متعلق مختلف سوالات کیے جن کے امیر مہدی نے مفصل جواب دیے۔

پروگرام سے ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر اکاوش ششٹھ، محمد شمشاد، محمد عیسیٰ رانا، محمد زبیر اور طلبہ و طالبات جڑے رہے۔



شعبہ اردو سی سی ایس یونیورسٹی میں ”ادب میں بسنت“ موضوع پر آن لائن پروگرام کا انعقاد

میرٹھ 22/جنوری 2026ء

آج ادب نما کا دوسواں اپنی سوڈ ہے۔ یہ موقع کی مناسبت سے بہت ہی عمدہ موضوع ہے۔ آج کے شرکاء کو سن کر پورا لکھنؤ آنکھوں میں گھوم گیا۔ واقعی بسنت میں ہر طرف محبت، پیار اور عقیدت نظر آتی ہے۔ بسنت کا موسم ہمیں ترغیب دیتا ہے کہ خوش رہے۔ یہ الفاظ تھے معروف محقق و ناقد اور سابق صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی پروفیسر زماں آزر دہ کے جو شعبہ اردو اور ایو سا کے مشترکہ اہتمام میں منعقد ”ادب میں بسنت“ موضوع پر اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اردو کی بیشتر اصناف کے ساتھ ساتھ قصائد اور مرثیوں میں بسنت کا خوب ذکر ملتا ہے۔ بسنت بچوں، جوان، لڑکوں کے کھیلنے کا موسم ہوتا ہے۔

اس سے قبل پروگرام کا آغاز سعید احمد سہارنپوری نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری، معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف محقق و ناقد پروفیسر زماں آزر دہ نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور معروف شاعر پریت پال سنگھ بیتاب نے شرکت فرمائی۔ مہمان ذی وقار کے بطور معروف اسکالر امیر مہدی [انگلینڈ] شریک ہوئے اور شعرا کے بطور ڈاکٹر پونم سنگھ، غازی آباد، ڈاکٹر دشنی

پریہ دہلی، شہلا شرما، مظفر نگر اور مقررین کے بطور لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود ہیں۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر آصف علی اور نظامت کے فرائض شعبے کی استاذ ڈاکٹر اکا و ششٹھ نے انجام دیے۔

اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ آج بہت ہی خوشی کا دن ہے۔ آج ادب نما کے دوسواپی سوڈ پورے ہو رہے ہیں، جو ہم نے چھوٹا سا پودا لگایا تھا آج وہ تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ آج کا موضوع انوکھا ہے۔ یہ موضوع سماج سے جوڑنے کا کام کرتا ہے۔ بسنت میں ہر چیز کھلے لگتی ہے۔ اسے نہ صرف ہندی بلکہ اردو ادب میں بھی بڑی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بسنت میں ہماری خوشی دوبالا ہو جاتی ہے۔

امیر مہدی نے ایوسا کی ٹیم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بسنت کے تعلق سے اپنا پر مغز مقالہ پیش کیا جس میں انہوں نے بتایا کہ بسنت میں ایک تہذیبی رویہ نظر آتا ہے۔ نہ صرف اردو شاعری بلکہ اردو نثر میں بھی اس کا خوب ذکر ملتا ہے۔ اردو شاعری نے نسل در نسل بسنت کو خوب شدت کے ساتھ پیش کیا ہے اور بسنت کا رشتہ صوفی روایات سے بھی ملتا ہے۔ امیر خسرو کے یہاں یہ بسنتی رنگ خوب زور و شور سے ملتا ہے۔ ایک طرح سے یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اردو نے بسنت کو تہذیب کی علامت کے طور پر محفوظ کر لیا ہے۔ مثنویوں ”سحر الیام“ اور ”گلزار نسیم“ میں بھی بسنت کا ذکر بڑی عمدگی سے کیا گیا ہے۔ بسنت اردو ادب کے رگ و پے میں دوڑ رہا ہے۔ نظیر کے یہاں بسنت مشترکہ تہذیبی تجربہ ہے جس میں ہندوستان کا ہر فرد نظر آتا ہے۔ بسنت صرف ایک تہوار نہیں بلکہ ذہنی و فکری رویہ ہے۔ بسنت جمالیاتی ذوق کا آئینہ دار ہے۔ بسنت کی توانائی کو زندگی میں شامل کریں۔

پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ آج میں اپنے تمام ایوسا ممبران کو مبارک باد پیش کرتی ہوں اور واقعی آج میں بہت خوش ہو۔ ہماری ٹیم نے پوری محنت سے ان پروگراموں کو انجام دیا ہے اور آج کا موضوع بھی اس مناسبت سے بہت اہم ہے۔ بسنت ہم سبھی کو بہت متاثر کرتا ہے۔ ہر طرف خوش نما ماحول، بہار ہی بہار، خوشیاں ہی خوشیاں نظر آتی ہیں۔ یہ بسنت ہی جو دل کے باغ بھی کھلا جاتا ہے۔

پریت پال سنگھ نے کہا کہ آج مجھے اس پروگرام سے جڑ کر نہایت دلی مسرت کا احساس ہو رہا ہے۔ ہمارے یہاں بسنت کو بہار بھی کہا جاتا ہے یعنی موسم گل کا موسم اور بسنت ہمارے ہندوستان کی خوبصورت تہذیب و ثقافت اور زندگی کا ایک حصہ ہے۔ بچوں سے لے کر بڑے تک پتنگ اڑاتے ہیں۔ کھیتوں میں ہر سوسر سو بھیلی ہوتی ہے۔ نظیر نے بسنت کے حوالے سے اردو میں بہت خوبصورت شاعری کی ہے۔

پروفیسر صغیر افرامیم نے کہا کہ اس موضوع پر امیر مہدی صاحب نے بہت خوبصورت مقالہ پیش کیا اور انہوں نے بسنت اور بہار کا ہلکا سا فرق بھی واضح کیا۔ بلاشبہ بسنت محبت کا، تہذیب و ثقافت کا تہوار ہے۔ خانقاہوں اور صوفیاء کے یہاں بسنت کی کافی اہمیت رہی ہے اور انہوں نے بڑی خوبصورتی

سے اپنے کلام میں اسے پیش بھی کیا ہے۔ دکن سے اودھ تک اردو میں بسنت کا خاص ذکر ملتا ہے۔ قلی قطب شاہ، نظیر اکبر آبادی وغیرہ کے یہاں اس کا خوب ذکر ملتا ہے اور نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی دیگر مقامی زبانوں میں بھی بسنت کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔

اس موقع پر ڈاکٹر پونم سنگھ، ڈاکٹر درشنی پریہ، ڈاکٹر شاداب علیم اور شہلا شرمانے بسنت کے تعلق سے بہت خوبصورت نظمیں پیش کیں۔

پروگرام سے ڈاکٹر آصف علی، محمد عیسیٰ رانا، محمد زبیر، شاہ زمن، محمد شادا اور دیگر طلبہ و طالبات جڑے رہے۔

☆☆☆



ادب نما کے آن لائن پروگرام بعنوان ”ملک کی آزادی اور اردو“ پر کناڈا سے ڈاکٹر تقی عابدی، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر اسلم جمشید پوری، پروفیسر مشتاق عالم قادری، پروفیسر ربیثما پروین، پروفیسر صالحہ رشید، پروفیسر مشتاق صدف، پروفیسر زاہد الحق اور ڈاکٹر کہکشاں لطیف کے علاوہ شعبے کے اساتذہ اور اراکین

خطوط

جناب ایڈیٹر صاحب
 ”ہماری آواز: گوشہ سرسید“
 شعبہ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ
 آداب و تسلیمات!

بعد سلام و مسنون عرض ہے کہ آپ کا مایہ ناز رسالہ ”ہماری آواز: گوشہ سرسید“ جلد نمبر ۲۱-۲۲ شمارہ ۲-۱ کا تازہ شمارہ حال ہی میں موصول ہوا۔ یوجی سی کیٹر لٹریچر اور پیپرز ریو یو ہونے کے ساتھ یہ رسالہ واقعی ادب و تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

انتہائی مسرت اور فخر محسوس ہوا یہ دیکھ کر کہ آپ نے میرے مضمون ”سرسید احمد خاں اور صحافت“ کو اس علمی و ادبی سرمائے میں شائع کرنے کا شرف بخشا۔ شعبہ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی سے شائع ہونے والے اس پائیدار رسالے میں ایک طالبہ کی کاوش کو جگہ دینا آپ کی وسعت النظری اور نو قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ حوصلہ افزائی میرے لئے ناقابل فراموش ہے اور یہ مستقبل کی ادبی کاوشوں کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوگی۔

دعاء ہے کہ ”ہماری آواز“ کا یہ کارواں یوں ہی ادب کی خدمت کرتا رہے اور سرسید کے پیغامِ تعلیم و تہذیب کو نسل در نسل پہنچاتا رہے۔

☆☆☆

آپ کی تہہ دل سے ممنون
 نزہت اختر
 میرٹھ

آداب

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ حال ہی میں مجھے آپ کے زیرِ ادارت شائع ہونے والا تحقیقی وادبی جریدہ "ہماری آواز" کا تازہ شمارہ (جولائی تا دسمبر 2024 اور جنوری تا جون 2025) موصول ہوا۔ اس عمدہ پیشکش پر آپ اور آپ کی پوری ٹیم، بالخصوص پروفیسر اسلم جمشید پوری صاحب، مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اس شمارے کی سب سے خاص بات "گوشتہ: عارف نقوی (جرمنی)" ہے۔ ڈاکٹر عارف نقوی کی علمی وادبی خدمات، ان کے ناولوں (جیسے 'جلتے بجھتے چراغ') اور ان کے ڈراموں پر مشتمل مقالات نے ان کی شخصیت کے کئی نئے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اس گوشتے میں ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر صغیر افرامیم اور ڈاکٹر شبانہ رضوی کے مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں، جریدے میں شامل تحقیقی مضامین، بالخصوص قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور جدیدیت کا تنہا سپاہی: سلام بن رزاق جیسے موضوعات نے جریدے کی علمی وقعت میں اضافہ کیا ہے۔ افسانوی ادب اور افسانہ نگوں کا انتخاب بھی بہت جاندار ہے جو قارئین کے ذوق کی تسکین کا باعث بنتا ہے۔

جریدے کی طباعت، گیٹ اپ اور ترتیب نہایت معیاری ہے۔ دعا ہے کہ اردو ادب کی ترویج و اشاعت کا یہ سفر اسی آب و تاب کے ساتھ جاری رہے۔

☆☆☆

فقط

سیدہ مریم الہی

ریسرچ اسکالر

محترمی و کمبری پروفیسر اسلم جمشید پوری صاحب بعد از سلام مسنون!
دعا گو ہوں کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے اور اللہ تعالیٰ آپ کو شفا کے کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے۔

احوال حاضر، خواہ اپنے ملک کے ہوں یا عالمی ادب کے، سیاسی، سماجی، اخلاقی، علمی اور ادبی اعتبار سے نہایت فکر انگیز، متغیر اور غیر متوقع ہیں۔ کب کیا ہو رہا ہے یا کیا ہونے والا ہے، سب کچھ انسان کو چونکا دیتا ہے۔ ایسے حالات میں اگر ہم بات کریں ہماری آواز کی تو، ہماری آواز صرف ہماری نہیں بلکہ ہر اُس شاعر، ادیب، محقق، دانشور اور ریسرچ اسکالر کی آواز ہے جس کا تعلق ادب سے ہے، چاہے وہ تخلیقی ادب ہو یا غیر تخلیقی، فکشن ہو یا شاعری۔ میری مراد رسالہ، ہماری آواز ہے، اور یہ رسالہ حقیقتاً اہل قلم کا رسالہ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے پڑھ کر ہمیشہ تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے مضامین تخلیقی ادب، شاعری، افسانے اور تنقیدی و تحقیقی تحریریں اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور معیاری ہوتی ہیں۔

پروفیسر اسلم جمشید پوری، صدر شعبہ اردو، کی سرپرستی میں شائع ہونے والے اس رسالے کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں اُن متحرک ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی تخلیقات اور مضامین شامل ہوتے ہیں جو موجودہ اردو منظر نامے میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ چونکہ موصوف خود ایک بہترین محقق، ناقد اور تخلیق کار ہیں، اس لیے رسالے کی نگرانی نہایت خوش اسلوبی سے انجام پاری ہے۔

ہر شمارے میں مدیران کی تبدیلی بھی ایک مثبت اور بصیرت افروز اقدام محسوس ہوتی ہے، جو نئی صلاحیتوں، نئی حکمت عملیوں اور تخلیقی تدابیر کو سامنے لانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ جب دوسروں کو ذمہ داری دی جائے تو وہ اپنی بھرپور صلاحیتوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

میں، ہماری آواز کی پوری ٹیم کا شکر گزار ہوں کہ وہ وقتاً فوقتاً ہمیں بھی یاد رکھتی ہے اور

کسی تخلیق یا مضمون کی اشاعت کے لیے متوجہ کرتی رہتی ہے۔ یہ بات یقیناً خوش آئند ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی نہ صرف ہم جیسے جموں و کشمیر کے دور افتادہ سرحدی علاقے پونچھ سے تعلق رکھنے والے قلم کاروں بلکہ ہندوستان کے دیگر حصوں میں موجود نو جوان لکھنے والوں کو بھی یہ معتبر پلیٹ فارم میسر آتا رہے گا۔

”ہماری آواز“ کے خصوصی گوشے اور نمبر، خواہ وہ سرسید کے حوالے سے ہوں، فلشن کے موضوع پر ہوں یا مختلف علمی و ادبی شخصیات کے تعلق سے، اپنی اہمیت اور استناد کے باعث علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ پروفیسر اسلم جمشید پوری صاحب کو صحت و تندرستی عطا فرمائے، ان کا سایہ ہم قلم کاروں پر قائم رکھے اور یہ علمی و ادبی سلسلہ اسی شان سے جاری و ساری رہے۔ امید ہے کہ اس خط کو اشاعت کا موقع فراہم ہوگا۔ اگلے شمارے کے انتظار میں۔ بہت بہت شکریہ!

☆☆☆

عرفان عارف اسٹنٹ پروفیسر اردو، جموں

تسلیمات

مجلہ ہماری آواز کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ یہ گوشہ سرسید کے لیے مخصوص ہے، اس نہایت عمدہ، علمی و تحقیقی کاوش پر آپ کی پوری ادارہ ٹیم دلی مبارکباد کی مستحق ہے۔

اس شمارے میں سرسید احمد خان کی کثیر الجہت شخصیت اور ان کے اصلاحی مشن پر نہایت قیمتی اور منتخب مواد یکجا کیا گیا ہے۔ خاص طور پر "پروفیسر اسلم جمشید پوری صاحب" کا مضمون یہ ابر جہاں سے اٹھے گا۔۔۔ اور پروفیسر اختر الواسع کا مقالہ "سرسید احمد خان کی مذہبی فکر" اپنے دلائل اور تجزیے کے اعتبار سے نہایت بصیرت افروز اور لا جواب ہے۔

سیدہ مریم الہی کا مضمون "سرسید کی تعلیمی بصیرت اور جدید نسل کی رہنمائی" آج کے بدلتے ہوئے تناظر میں بے حد بر محل و معلوماتی لگا۔ اس طرح کے علمی مقالات کی شمولیت نے شمارے کے وقار میں مزید اضافہ کر دیا۔

میں رسالے کی عمدہ ترتیب کے لیے مدیر اعلیٰ اور ادارتی عملے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆

شاہ زمن

ریسرچ اسکالر

شعبہ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی

हमारी आवाज़

मुख्य संपादक
प्रो. असलम जमशेदपुरी

मुद्रक
प्रो. असलम जमशेदपुरी

उर्दू विभाग, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ।

संयुक्त अंक : 2026
SSN : 2394-7381

UGC केयर लिस्ट में शामिल जर्नल

हमारी आवाज

अंक : 1 वॉल्यूम नंबर 26 अंक : जनवरी से/जून 2026

- मुख्य संरक्षक** : प्रो. संगीता शुक्ला (कुलपति, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ।)
- संरक्षक** : प्रो. अतवीर सिंह (डीन फ़ैकल्टी ऑफ आर्ट्स, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ।)
- मुख्य संपादक** : प्रो. असलम जमशेदपुरी (अध्यक्ष उर्दू विभाग, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ।)
- संपादिका** : डॉ. अलका वशिष्ठ (उर्दू विभाग, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ।)
- पर्यवेक्षक** : डॉ. शादाब अलीम (उर्दू विभाग, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ।)
- सलाहकार** : डॉ. आसिफ अली (असिस्टेंट प्रो., उर्दू विभाग, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ।)
डॉ. इरशाद स्यानवी (उर्दू विभाग, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ।)
- संपादकीय मंडल** : शाकिर मतलूब (रिसर्च स्कॉलर), अतहर खान (रिसर्च स्कॉलर), सरताज जहाँ (रिसर्च स्कॉलर), मेहविश (एम.ए. द्वितीय वर्ष), नायाब (एम.ए. द्वितीय वर्ष), मुहम्मद आबिद (एम.ए. प्रथम वर्ष)
- कानूनी सलाहकार** : प्रो. अंजलि मित्तल (पूर्व प्रिंसिपल, मेरठ कॉलेज, मेरठ) डॉ. मुहम्मद शोएब (एडवोकेट)
- विशेषज्ञ पैनल** : प्रो. यूसुफ आमिर (अजहर विश्वविद्यालय, मिस्त्र) 'डॉ. तकी आबिदी (कनाडा), 'प्रो. मुहम्मद गुलाम रब्बानी (ढाका विश्वविद्यालय, बांग्लादेश) 'डॉ. सकीना रस्म अली बहादुर (मॉरीशस), 'प्रो. अल्ताफ अंजुम (कश्मीर)' डॉ. नईम इस्लाही, राजस्थान)
- शब्द संयोजक** : सईद अहमद सहारनपुरी, मुहम्मद शमशाद (उर्दू विभाग, चौधरी चरण सिंह, विश्वविद्यालय, मेरठ।)
- मूल्य** : नवीनतम अंक: रु. 500/- वॉल्यूम: 550/- विदेशी देश US\$5
- प्रकाशक** : प्रो. असलम जमशेदपुरी
- उर्दू विभाग** : चौधरी चरण सिंह यूनिवर्सिटी, मेरठ।

URL: <http://ccsuniversity.ac.in/ccsu/adminSdept/duccsumrt@gmail.com>, aslamjamshedpuri@gmail.com
muhammadshamshadinfo@gmail.com

मोबाइल : 09456259850, 9759238472



चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ-250 004 (उ०प्र०)

प्रोफेसर संगीता शुक्ला

डी०एस०सी०

कुलपति

पत्रांक : एस०वी०सी०/22/118

दिनांक : 14.05.2026

18

'सन्देश'

यह जानकर अत्यंत प्रसन्नता हुई कि चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ का उर्दू विभाग अपने विभाग की अर्धवार्षिक पत्रिका "हमारी आवाज़" का 26वां अंक प्रकाशित कर रहा है।

किसी विभाग की पत्रिका विभाग द्वारा वर्ष भर में छात्र-छात्राओं के व्यक्तित्व के विकास के लिए आयोजित विभिन्न कार्यक्रमों के विहंगम वर्णन के माध्यम से विद्यार्थियों में नई उमंग एवं उत्साह का संसार करती है तथा उनकी सकारात्मक एवं सक्रियता के संवर्धन में महत्वपूर्ण भूमिका निभाती है।

विश्वास है कि यह पत्रिका छात्र-छात्राओं की सृजनात्मक प्रतिभा के निखार का अवसर प्रदान करने के साथ-साथ ज्ञानोपयोगी लेखों को प्रकाशित करेगी। विभाग द्वारा विद्यार्थियों के व्यक्तित्व के सर्वांगीण विकास की दिशा में किया जा रहा यह प्रयास सराहनीय है।

विश्वविद्यालय के उर्दू विभाग परिवार को पत्रिका के प्रकाशन हेतु शुभकामनाएं।

Sangeeta
(संगीता शुक्ला)

प्रो० असलम जमशेदपुरी

उर्दू विभाग,

चौ० चरण सिंह विश्वविद्यालय,

मेरठ।

विवरणिका

क्र.सं.	विषय	पृष्ठ
1.	मुख्य संरक्षक की ओर से — प्रोफेसर संगीता शुक्ला	3
2.	मुख्य संपादक की कलम से — प्रोफेसर असलम जमशेदपुरी	5
3.	संपादकीय — डॉ अलका वशिष्ठ	7
	<u>कहानी</u>	
1.	अभिजीत — श्रीमती पूनम राणा, 'मनु'	8
	<u>लेख</u>	
1.	बच्चों के सर्वांगीण विकास में योग की भूमिका — अमरपाल आर्य, योग विज्ञान विभाग	15
2.	भारत छोड़ो आंदोलन में मेरठ के भमोरी गांव का योगदान— डॉ. दीपक कुमार, कीर्ति चौधरी	22
3.	जनपद मेरठ में बदलते भौगोलिक क्षेत्र का अध्ययन— डॉ. प्रवीण कुमार	25
4.	मेरठ की पुस्तकालय संस्कृति : राजा महेंद्र प्रताप केंद्रीय पुस्तकालय चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय मेरठ का अध्ययन— विजय पाल सिंह, डॉ मुनेश कुमार , इतिहास विभाग	29
5.	ग्रामीण महिला सशक्तिकरण एवं सरकारी नीतियां— डॉ. जयवीर सिंह राणा, राजनीति विज्ञान विभाग .	37
6.	समान नागरिक संहिता और धार्मिक स्वायत्तता अल्पसंख्यक अधिकारों के विशेष संदर्भ में एक संवैधानिक संतुलन — डॉ कुसुमवती, खुशी मोहम्मद, विधि विभाग	48
7.	मेरठ की 1857 की क्रांति में स्वतंत्रता सेनानी मातादीन वाल्मीकि का योगदान— डॉ. सीरिल गोयल	55
8.	भारतीय राजनीति में मीडिया की भूमिका : एक अध्ययन— डॉ. धनपाल	60
9.	माँ श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी का धार्मिक महत्व— निर्दोष कुमार, हापुड।	68
10.	मुस्लिम विधि में मैहर की अवधारणा एक ऐतिहासिक एवं कानूनी विश्लेषण : डॉ. विकास कुमार	72

गतिविधियाँ

उर्दू विभाग की गतिविधियाँ	78

मुख्य संपादक की कलम से

किसी भी पत्रिका का निरंतर प्रकाशित होना और लगातार पाठकों तक पहुँचना अपने आप में एक बड़ी उपलब्धि होती है। इसी क्रम में उर्दू विभाग की पत्रिका "हमारी आवाज़" एक महत्वपूर्ण नाम है। इसका पहला अंक वर्ष 2003 में "यौमे सर सैयद" के अवसर पर प्रकाशित हुआ था। तब से लेकर अब तक इसके अनेक अंक प्रकाशित हो चुके हैं और इसने साहित्यिक जगत में अपनी एक अलग पहचान बना ली है। प्रत्येक अंक में किसी महत्वपूर्ण व्यक्तित्व या विषय पर विशेषांक अथवा विशेष खंड प्रकाशित किया जाता रहा है। अब तक इस्माइल मेरठी, इस्तिआज अली खाँ अर्शी, अंजुम जमाली, कमलेश्वर, कुर्रतुलऐन हैदर, प्रेमचंद, जंग-ए-आजादी नंबर, हफीज मेरठी, बशीर बद्र, भारत भूषण, गालिब, इक्कीसवीं सदी की दो दशकों का फिक्शन नंबर तथा आरिफ नकवी नंबर जैसे महत्वपूर्ण विशेषांक प्रकाशित हो चुके हैं। वर्तमान अंक "बाल साहित्य" विशेषांक पर आधारित है।

यह प्रसन्नता की बात है कि इस पत्रिका को यूजीसी केयर सूची में शामिल किया गया है। इसका अपना ISSN नंबर है और यह एक पीयर-रिव्यू जर्नल है। साथ ही यह उर्दू और हिंदी दोनों भाषाओं में प्रकाशित होता है। हिंदी खंड में हमारे विभाग के अतिरिक्त अन्य विभागों और महाविद्यालयों के विद्यार्थियों एवं शिक्षकों के लेख भी शामिल किए जाते हैं। अपनी प्रकृति के अनुसार पश्चिमी उत्तर प्रदेश और विश्वविद्यालय के विभागों से प्रकाशित होने वाली पत्रिकाओं में यह एकमात्र ऐसा जर्नल है, जो उर्दू के साथ-साथ हिंदी भाषा की भी सेवा कर रहा है।

इस जर्नल का मुख्य उद्देश्य हिंदी और उर्दू के छात्र-छात्राओं को एक अंतर्राष्ट्रीय मंच उपलब्ध कराना है। यही कारण है कि इसमें बांग्लादेश, जर्मनी, इंग्लैंड, मिस्र, अमेरिका, कनाडा, मॉरीशस और पाकिस्तान जैसे देशों के प्रतिष्ठित साहित्यकारों और शोधकर्ताओं की रचनाएँ प्रकाशित होती हैं। इस प्रकार यह पत्रिका भारत के साथ-साथ विदेशों तक भी अपनी पहुँच रखती है। जिन छात्र-छात्राओं के लेख या समीक्षाएँ इसमें प्रकाशित होती हैं, उन्हें व्यापक साहित्यिक जगत तक पहुँचने का अवसर मिलता है और साथ ही एक स्वस्थ साहित्यिक वातावरण का निर्माण भी होता है।

मेरठ बाल साहित्य के क्षेत्र में विशेष रूप से प्रसिद्ध रहा है। नजीर अकबराबादी के बाद इस्माइल मेरठी और अफसर मेरठी को पूरी दुनिया बच्चों

के साहित्यकार के रूप में जानती है। वर्तमान अंक में बाल साहित्य की आवश्यकता, वर्तमान समय में उसकी उपयोगिता तथा बाल साहित्यकारों की रचनाओं को शामिल किया गया है। इस विशेषांक में यह प्रयास किया गया है कि उर्दू के प्रमुख बाल साहित्यकारों और कवियों की रचनाएँ सम्मिलित हों, ताकि यह अंक एक यादगार विशेषांक सिद्ध हो सके।

इस विशेष खंड के अतिरिक्त पत्रिका में लेख, कहानियाँ, कविताएँ, गजलें, समीक्षाएँ, उर्दू विभाग की गतिविधियाँ, विभाग में आने वाले अतिथियों के विचार तथा "अदब नुमा" कार्यक्रमों की झलकियाँ भी सम्मिलित हैं।

उर्दू विभाग के शिक्षकों और विद्यार्थियों का एक साझा मिशन है कि मेरठ को एक दबिस्तान के रूप में स्थापित किया जाए। यहाँ अनेक ऐसे कवि और साहित्यकार हुए हैं, जिन्होंने अपनी रचनाओं से आने वाली पीढ़ियों को प्रभावित किया। इसी उद्देश्य से वर्ष 2022 में "दबिस्तान-ए-मेरठ : शायरी" शीर्षक से एक विशेषांक प्रकाशित किया गया, जिसमें मेरठ के प्रमुख शायरों पर लेख तथा उनकी रचनाएँ शामिल की गईं। फिर भी कुछ शायर इसमें शामिल नहीं हो सके, जिन्हें परिशिष्ट में शामिल करने का प्रयास किया जाएगा।

इसी क्रम को आगे बढ़ाते हुए शीघ्र ही "हमारी आवाज़" का एक विस्तृत विशेषांक "दबिस्तान-ए-मेरठ : नसर" प्रकाशित होने वाला है। इसमें मेरठ से संबंधित शोध, आलोचना, पत्रकारिता, उपन्यास, कहानी, यात्रा-वृत्तांत, रेखाचित्र, निबंध, व्यंग्य-हास्य तथा अन्य गद्य विधाओं की रचनाओं और उनके रचनाकारों को शामिल करने का प्रयास किया जा रहा है। यदि आपके पास भी मेरठ की गद्य परंपरा से संबंधित कोई लेख या रचना हो तो कृपया तुरंत हमसे संपर्क करें।

अंत में, मैं अपनी पूरी टीम उर्दू-हिंदी, को इस सफल प्रकाशन पर हार्दिक बधाई देता हूँ और उनका धन्यवाद भी करता हूँ कि उन्होंने इस अंक को प्रकाशित करने में काफी मेहनत की है।

'हमारी आवाज़' का यह संकलन आपको कैसा लगा अपनी राय से जरूर अवगत करायें।

—प्रो. असलम जमशेदपुरी

संपादकीय

उर्दू विभाग चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय की पत्रिका 'हमारी आवाज़' का नवीन अंक प्रस्तुत है। यह अंक भिन्न-भिन्न विषयों पर आधारित अंक है। जिसे आपके समक्ष प्रस्तुत करते हुए अत्यंत हर्ष हो रहा है। उर्दू विभाग की सदैव यह कोशिश रही है कि विद्यार्थियों और पाठकों को ज्यादा से ज्यादा जानकारी भरे लेखों और विषयों से परिचित कराया जाए। परिणाम स्वरूप ज्ञानवर्धन करने वाला यह अंक आपके हाथों में है।

हर बार की तरह यह अंक भी हिंदी-उर्दू दोनों भाषाओं में प्रकाशित हुआ है। प्रस्तुत अंक के हिंदी संस्करण में मेरठ आसपास के क्षेत्रों की जानकारी के साथ-साथ बच्चों के सर्वांगीण विकास में योग की भूमिका, पुस्तकालय संस्कृति ग्रामीण महिला सशक्तिकरण एवं सरकारी नीतियां, समान नागरिक संहिता और धार्मिक स्वायत्तता, अल्पसंख्यक अधिकारों एक संवैधानिक संतुलन, मुस्लिम विधि में मैहर की अवधारणा एक ऐतिहासिक कानूनी विश्लेषण सहित भारतीय इतिहास के क्रांति, त्याग और बलिदान के पन्नों को आपके सामने प्रस्तुत किया है। आस्था और विश्वास के प्रतीक मां त्रिपुर बाला सुंदरी देवी के मंदिर का धार्मिक महत्व भी इस अंक में शामिल है इस अंक में कहानी 'अभिजीत' को शामिल किया गया है जो वर्तमान में विभिन्न प्रतियोगी परीक्षाओं की अंधी दौड़ में भागती और अपना जीवन होम करती युवा पीढ़ी को आईना दिखाती है और उनका सही मार्गदर्शन करती है।

इस अंक को सुंदर एवं पठनीय बनाने में जिन लेखक-लेखिकाओं ने अपने शोध पत्रों, कहानी, समीक्षाओं द्वारा हमारी सहायता की है, मैं उनका आभार व्यक्त करती हूं। इस अंक के संपादन में हमारे विभागाध्यक्ष प्रो. असलम जमशेदपुरी, डॉ. शादाब अलीम, डॉ. इरशाद अली, फरहत आदि ने कदम-कदम पर मेरा मार्गदर्शन किया है, जिसके लिए मैं उनको हार्दिक धन्यवाद व्यापित करती हूं। सुंदर कंपोजिंग के लिए मोहम्मद शमशाद, सईद अहमद सहारनपुरी एवं छात्र-छात्राओं को धन्यवाद देती हूं, जिनकी सहायता के बिना यह कार्य कठिन था।

पत्रिका का हिंदी भाग आपको कैसा लगा अवश्य अवगत कराएं।

—डॉ अलका वशिष्ठ

अभिजीत

लेखिका

श्रीमती पूनम राणा 'मनु'

मेरठ।

॥ ॐ सह नावतु । सह नौ भुनक्तु। सह वीर्यम करवाव है। तेजस्विनावधीमस्तु मा विदिव्वाव है ॥

अर्थात् : परमेश्वर हम शिष्य और आचार्य दोनों की साथ-साथ रक्षा करें, हम दोनों को साथ-साथ विद्या के फल का भोग कराएं, दोनों मिलकर विद्या प्राप्ति का सामर्थ्य प्राप्त करें, दोनों का पढ़ा तेजस्वी हो, हम दोनों परस्पर द्वेष न करें।

अभिजीत ने कठोपनिषद् के उपर्युक्त श्लोक का सार कई बार पढ़ा और तनिक गला खंखारते हुए, योग केंद्र की खिड़की के सामने काम करते व्यक्ति को आवाज लगाई -

"शिवा"

"जी, ददा..."

"इधर आओ"

"कहिए ददा"

"ये लड़का, मेरा मतलब अर्जुन कहाँ है?"

"ददा, करण के साथ गोशाला में है।"

"कैसा है?"

"चार दिनों से वह यहाँ है। किन्तु सबसे विरक्त। सबसे विलग। कोई हास-परिहास उसको बहलाता नहीं। वह अनमना, लगता है, कोई लड़ाई स्वयं से ही लड़ रहा है।"

यानी... अर्जुन कलयुग में भी विचलित और भ्रमित है। अभिजीत की आँखों में एक छाया उभरी और उसकी किनारियों पर ठहर गई।

"हम्म, एक काम करो, उसको आज शवदाह गृह में भवानी सिंह के पास ले जाओ!"

"शवदाह गृह में ! क्यों ददा?"

"ले जाओ !"

"आप जानते हैं ना ददा, क्रव्याद अग्नि भस्म करती है - सब।"

"वही तो शिवा! श्मशान की पवित्रता और वहाँ उत्पन्न वैराग्य के सौन्दर्य सौष्ठव में जीवन की क्षणभंगुरिता को समझने में तुमसे श्रेष्ठ यहाँ कौन है। शिवा, जीवन का मूल्य, उसका अर्थ, उसका संघर्ष और उसकी सत्यता की परख श्मशान भूमि के अतिरिक्त और कहीं संभव नहीं। मृत्यु के मैदान में खड़े होकर, जीवन की अनिश्चितता की अनुभूति अनेकों उलझनें सुलझाने में सफल हुई है। शांति के प्रवेश द्वार में प्रवेश करके या तो पूर्ण विश्राम मिलता है या नव यात्रा का आरंभ। दोनों ही महत्वपूर्ण हैं, शिवा। वहाँ दोनों ऊर्जाएँ समानान्तर रूप में बहती हैं, तुम तो जानते हो ना।" अभिजीत के मन में विचित्र-सी हलचल है।

"शिवा, आजकल के बच्चों, युवाओं और किशोरों की सहनशीलता और उनकी मानसिक स्थिति पर कोई सोचता तक नहीं। उनपर दिनों दिन बढ़ते अकादमिक दबाव, सामाजिक मीडिया का दबाव और शिक्षकों के साथ-साथ पारिवारिक अपेक्षाओं के कारण बच्चों पर बहुत अधिक दबाव है। प्रतियोगी परीक्षाओं में बैठते परीक्षार्थियों पर तो कसी का ध्यान ही नहीं है शिवा। ये अपने लिए कम दूसरों के लिए अधिक सफल होना चाहते हैं। ऐच्छिक परिणाम न मिलने से तनाव में आना कई बार उनके लिए आत्मघाती साबित होता है। जानते भी उनपर अपने सपनों को लाद देते हैं अभिभावक। उनको इतना भी बोध नहीं कि एक बार मानसिक तन्तु जगत हिला नहीं कि सब व्यर्थ। सब चीजें उनके लिए अपने अर्थ खो देती हैं।"

“सच कहते हो ददा, इधर ये युवा जीवन से निराश हो, मृत्यु का वरण करने निकल पड़ते हैं। कोई समझाए इन्हें! इतना भी नीरस नहीं होता जीवन। ‘जीवितं चारु सर्वं चारु’ जीवन सुंदर है, सब सुंदर है। जीवन को जुआ समझ लिया है इन्होंने, एक दो बाजी हारे तो मानों सब खत्म। जैसे कोई और विकल्प इनके समक्ष नहीं।” शिवा की आँखों में एक उदास उभर आई है। गलत प्रसंग छेड़ बैठा है वह, शिवा के समक्ष। इससे पूर्व कि वह अपने दर्द में डूबे अभिजीत ने उसे जाने के लिए कहा —

“शिवा, तुम ले जाओ अर्जुन को, जाओ।”

शिवा के जाते ही अभिजीत ने एक ठंडी श्वास भरी। शिवा भी तो चोट खाया है। उसने भी तो अपने सपने जबरन अपने एकलौते पुत्र की आँखों में भर दिये थे। वह ऐसा ही मिला था उसे, जैसे अर्जुन मिला है।

‘काश ! कोई समय रहते समझा पाता इन्हें। और उन्हें भी वे जो इन बच्चों को अपनी आकांक्षाओं, अभिलाषाओं की अग्नि में झोंकने को तत्पर हैं। स्वार्थियों और कार्यों की फौज खड़ी हो गई है पूरी।’ अर्जुन और शिवा को लेकर अनेकानेक विचारों में घिरे अभिजीत को अचानक झटका—सा लगा। क्या सोच रहा है वह? क्या वह वही अभिजीत है? वही अभिजीत! उसपर तो किसी का दबाव नहीं था फिर...

डूबती हुई शाम में, सब कुछ गहराता चला गया। वे स्मृतियाँ भी जो उनके मन मस्तिष्क में एक के बाद एक चली आ रही थीं —

दस वर्ष पूर्व—

नृविज्ञान में अच्छे अंक पाते ही उसके सपनों को जैसे पंख लग गए थे। अपने पिता के सामने अपना सपना उसने पूरे आत्मविश्वास से रखा था —

“बाबूजी, मैं यूपीएससी की तैयारी करना चाहता हूँ। मुझे आईएस ऑफिसर बनना है।”

उसकी आँखों में उतर आए उसके सपनों के ऊंचे फलक और वहाँ तक पहुँचने की उसकी ललक को शायद पिता बनकर ही देखा था उन्होंने। तभी तो उस पर होने वाले असीमित खर्च पर सारे मित्र, हितैषी, परिवार वाले समझाते रह गए थे। उन्होंने वही किया, उनके बच्चे की इच्छा और उसके भविष्य के लिए जो उन्हें आवश्यक लगा।

“तेरा सपना है तो ये ले, जा, कर ले अपना सपना पूरा” पिता ने अपनी तीन बीघा जमीन बेचकर उसके कोचिंग की फीस और वहाँ होने वाला खर्च उसकी हथेली पर रखते हुए कहा था।

उनका गाँव कस्बे में कुछ समय पहले ही परिवर्तित हुआ था। मगर महानगर की चकाचौंध और उसके खतरों से पूरी तरह भिन्न उसके पिता, उसको दिल्ली महानगर में भेजते जरा न हिचकिचाए थे। जहाँ यूपीएससी की तैयारी कराने वाले देश के बेहतरीन संस्थान थे। उन्हें अपने पुत्र पर पूरा भरोसा जो था।

दिल्ली वैसी दिल्ली न थी, जैसा उसने फिल्मों में देखा था। बड़ी-बड़ी हवेलियाँ। बड़े-बड़े घर। उसकी दिल्ली में तो कोचिंग सेंटर ही कोचिंग सेंटर थे। और उनमें थी एस्पिरेंट्स यानी महत्वाकांक्षियों की भीड़ ही भीड़। एक जानकार की सहायता से बड़ी मुश्किल से एक अच्छे कोचिंग सेंटर में सीट पा सका था— वह। यूँ लगता था, एक वह नहीं, पूरे देश के युवा प्रशासनिक अधिकारी बनना चाहते थे। कोचिंग सेंटर के छोटे-छोटे कमरे उम्मीदवारों से ठसाठस भरे थे। पीजिस ठसाठस थे। किराए के कमरे भी ठसाठस। बड़ी कठिनाई और बड़ी कीमत पर उसे छह बाई छह के एक कमरे में एक लड़के के साथ जगह मिली। जिसमें लकड़ी की एक अलमारी और दो तख्त—से पलंग सटे हुए थे। लक्ष्य बड़ा है तो इन छोटी-मोटी समस्याओं से क्या घबराना, उसने सोचा।

कोचिंग का पहला दिन, स्वयं पर ही गर्व हो आया था उसे। अब कोई उसे अधिकारी बनने से नहीं रोक सकता। सरल नहीं तो कुछ इतना कठिन भी नहीं लग रहा था उसे। मात्र

एक वर्ष की बात है। कोचिंग पूरी होते ही...। वह प्रसन्न था। उसका चेहरा खुशी के तेज से चमक रहा था।

उसने ध्यान दिया, दूसरे युवा उम्मीदवार जो बहुत पहले से वहाँ रहकर तैयारी कर रहे थे बहुत गंभीर थे। उनके बोलने का अंदाज गंभीर था। उनकी आँखें गंभीर थीं। उनका चेहरा ठोस और कठोरता की हद तक गंभीर था।

सप्ताह बीत गया। वह चीजों के लिए दुकानदार से मोलभाव करता तो सब लोग उसे ऐसे देखते जैसे 'बावले शहर में ऊंट घुस आया हो'। उसे आश्चर्य हुआ कि वहाँ सभी युवा एक दूसरे से अपरिचितों की तरह आमने-सामने से गुजरते थे। जबकि प्रतिदिन एक ही स्थान पर पढ़ाई करते थे। उसने देखा, एक-दूसरे के प्रति तटस्थ, निर्भाव वे एक दूसरे के नाम तक से अनजान थे।

कई बार उसे भ्रम होता कि वे अब कुछ कहने वाले हैं। कुछ कहने ही वाले हैं। पर नहीं, दृष्टि घुमाकर पास से निकल जाते। काश, कुछ कहें। कुछ भी, कुछ भी कल रात मन में जो उभरी वह निराशा ही सही। या पिछले हफ्ते जो उसे रोमांचित कर गई थी, वह नई आशा ही। पर नहीं, जाने क्यों कोई किसी से कुछ कहने को तैयार नहीं। इसी कारण वहाँ भीड़ तो बहुत थी। पर पुकारें कम थीं। हँसी कम थी। मौन रुदन अधिक था। ठहाके कम थे। और शोर बहुत अधिक था।

धीरे-धीरे जैसे समय बीता, वह भी उनमें से एक हो गया। उन्हीं की तरह सबसे दूर, अपने में खोया हुआ। दुनिया के हर फैशन, हर स्वाद से परे, उसका भी वही रूटीन हो गया। रात के तीन बजे तक जागना, पढ़ना। सुबह जैसे-तैसे उठना। कैसे भी जूते-चप्पलों के साथ कैसे भी कपड़े पहनकर, बालों में हाथ मारते हुए कोचिंग क्लास की ओर दौड़ पड़ना। नहाने का वक्त, बेवक्त। भोजन की स्थिति और भी खराब। जो मिलता खा लेता। सस्ते से सस्ते में। या महंगे से महंगे में तीस-चालीस रुपये तक का टिफिन मंगाना, खाना। कोशिश रहती दोनों टाइम यही चल जाए। और एनर्जी ड्रिंक के लिए पैसे बच जाएँ।

पहले वर्ष की कोचिंग का वह अंतिम दिन था। उसके जीवन का पहला अनुभव, जिसने उसे मनुष्य से मशीन में बदलने में बड़ी भूमिका निभाई थी। हॉल एस्पिरेंट्स (पदाभिलाषियों) से पूरा भरा था। उस हॉल में चार एअरकंडीशनर होते हुए भी घुटन से सबका बुरा हाल था। सुबह आठ बजे शुरू हुई क्लास शाम के पाँच बजे तक चल रही थी। सभी ऊर्जस्वित अनुशिक्षक सभी महत्वाकांक्षियों को उनके 'फुल फॉर्म' में लाने का भरपूर प्रयास कर रहे थे। मगर बच्चों का ऊर्जा स्तर न्यूनतम पर पहुँच चुका था। और नवेले उम्मीदवार अपनी सुध-बुध खो चले थे।

वे सभी एक दूसरे के मुंह से मुंह सटाये जैसे एक दूसरे की साँसों का ऑक्सीजन अपने भीतर भरने की अधूरी कोशिश कर रहे थे। कोई स्टूल पर बैठे-बैठे उखड़ूँ हो गया था। कोई दीवार से चिपककर अकड़ी टांगों को सीधा करने की कवायद में दीवार से किसी अदृश्य ऊर्जा को अपने भीतर सोख लेना चाहता था। कोई एनर्जी की नकली गोलियाँ चीम पर रख उसे चुभला रहा था। वह तो सिर के दर्द को डिस्परीन में घोलकर चुपचाप बिना शोर पी रहा था। हेतु था- "कुछ छूट न जाए, कुछ रह ना जाए..."

उकताहट और बेचौनी दोनों ही जीव की प्राकृतिक अवस्थाएँ हैं। विषय या दृश्य कितना भी रोचक या महत्वपूर्ण क्यों न हो, एक समय बाद उनसे भी उकताहट हो सकती है। यूपीएससी क्वालिफाई करने की गहरी अभिलाषा के बावजूद, उसके साथ लगभग सभी नये पदाभिलाषी इस क्लास से अब पूरी तरह ऊब रहे थे। वे बिना ब्रेक लिए इतनी लंबी क्लास में पहले कभी नहीं बैठे थे। पूरे साल की पढ़ाई को मात्र नौ घंटों में दोहराया जा रहा था।

ओफ!

अनुशिक्षक (ट्यूटर) एक आता। एक जाता। सब महत्वाकांक्षियों की सपनों से भरी आँखें आशा और उम्मीद की डोर थामे उनको पूरी तल्लीनता से सुन रही थीं। पूरी देह की नाड़ियों की शिथिलता को दूर कहीं ठेलते हुए। उस दिन, उनकी इंसानी देहें मशीनों में

बदलने की प्रक्रिया से गुजर रही थीं। जिन अपनों ने उनके "कुछ" बनने के लिए स्वयं को होम करने की ओर कदम बढ़ा दिए थे — उनकी खातिर, कुछ अपनी महत्त्वक्षाओं के लिए।

वह अपने लक्ष्य के प्रति गंभीर था। पहले ही अटैम्प्ट में उसका प्री हो गया था। परिवार में सबको भरोसा हो गया कि अगले साल अभिजीत अवश्य निकाल लेगा। वह महत्वाकांक्षी तो था ही, पहली बार में ही मिली सफलता से वह दोगुने आत्मविश्वास से भर गया था। पिता ने फिर पैसा भेजा। उसने फिर मेहनत की। दूसरी बार में प्री हो गया। मेंस भी हो गया। इंटरव्यू में रह गया। उसे बहुत निराशा हुई। पर वह रुका नहीं। उसने फिर तैयारी की और तीसरी बार में फिर रह गया।

फिर तो ऐसे दिन उसके जीवन में बार-बार आते चले गए।

और... बार-बार आते ऐसे दिनों ने उसे सबसे अनभिज्ञ बना दिया। वह अनभिज्ञ रहना चाहता-रहता उसको पैसा भेजते चुक जाते माता-पिता के संसाधनों और उनकी जेबों से। उनके गले में सूखे उतरते निवालों से। उसकी हर असफलता पर भीतर ही भीतर टूटते जाते उनके हृदयों से। एक ही नाल से जुड़े होने पर भी, हर संबंध के पल प्रति पल दूर होते जाने से। बचपन के साथियों के जीवन में होते उतार-चढ़ावों से। धीरे-धीरे उसके प्रति उदासीन होते जाते अपने प्यार से। सपनों के बदरंग होते जाते रेशमी उजालों से।

क्योंकि उसका केवल एक ध्येय था — कैसे भी करके यूपीएससी क्वालिफाई करना। बाद इसके तो सब उसकी मुट्ठी में हो जाना था। वह भूल गया था, बड़ा अधिकारी बनने पर वह ईश्वर नहीं हो जाएगा। जीवन अपनी धारा में सतत बहता रहा है और बहता चला जाएगा। जो पल छूट गए वे दोबारा किसी कीमत पर नहीं लौटते, न ही कुछ पहले जैसा हो पाता है। कुछ पहले जैसा हो भी जाए तो सबकुछ तो नहीं ही हो पाता कभी, नहीं जानता था।

हर वर्ष, वर्षों वर्ष, एक ही तरह की दिनचर्या। पिछले वर्ष की तुलना में और, और डूब जाना पढ़ाई में। यहाँ तक कि खुद के भूलने तक। हर बार की विफलता के साथ ही भाई-बहनों के साथ-साथ माता-पिता का भी धैर्य चुकने लगा था। और स्नेह भी। पहले वर्ष की तुलना में दूसरे वर्ष कुछ कम फिर और कम फिर और कम... एक समय ऐसा आता है, वहाँ रहकर खर्च बढ़ जाते और निर्धन माता-पिता की ओर से पैसा आना बंद हो जाता। बार-बार असफल हो जाने वाले प्रतियोगियों की लगभग एक जैसी स्थिति थी — दयनीय। एक दो जो जानकार, मित्र बनता एक दूसरे की उधारी के बाद दृष्टि चुराने लगता।

कई बार उसका मन चाहता था, वह किसी से कुछ कहें, किसी की कुछ सुने। और ना तो किसी के कंधे पर सिर रखकर रो ही ले। उसने गौर किया सिर्फ वह ही नहीं, हर कोई किसी से कुछ कहना चाहता है। पूछना चाहता है। सब भरे हैं — निद्रा से, आलस से, मर चुकी संवेदनाओं से, आँखों में सूख चुके खारे पानी से, व्यापारियों की मनमानी से, कोचिंग संस्थानों की मोटी फीस से। रोज रोज नए-नए महंगे स्टेडी मेटेरियल जरूरी बताकर उनको थमा देने से। सभी प्रकार के दबावों से। वे भर गए हैं। वे उगलना चाहते हैं सब। वे टूटकर रोना या हँसना चाहते हैं। हल्का होना चाहते हैं। मगर किसी के पास समय नहीं।

इस तरह एक-एक कर, उसके पिता की सात में से पाँच बीघा जमीन बिक गई। छठे अटैम्प्ट की तैयारी तक उसका स्वास्थ्य, उसकी आर्थिक स्थिति, उसकी मानसिक अवस्था सब बुरी तरह क्षतिग्रस्त हो गए थे। वह कई वर्षों से हंसा नहीं था। वह कई वर्षों से फूट-फूट रोया नहीं था। वह शिला हो गया था। शिला बर्फ की। उसके मुख से लार बहने लगी थी। हर घड़ी उबकता रहता था। कृत्रिम एनर्जी ड्रिंक ने उसके पाचन तंत्र को बुरी तरह से तबाह कर दिया था। और असफलताओं ने सोचने-समझने की शक्ति को।

लुटे-पिटे हताश पिता ने विनती करते हुए कहा था— "लौट आओ बेटा, अब हम और कुछ नहीं कर सकेंगे। तुम कोई और परिछा दो, या आकर जो बचा है वह संभाल लो।"

‘अहम’ का सवाल हो गया था उसके लिए। छठी बार में इस बार फिर इंटरव्यू में रह गया था, वो भी मात्र चौदह नंबर से। रात-दिन की तैयारी में उसने स्वयं को होम कर दिया था।

यूपीएससी के छह अटैम्प्ट (प्रयास) उसके फेल हो गए थे। और फेल हो गए थे जिंदगी के दस वर्ष, उनमें की उसकी मेहनत।

उसके दोस्त विपुल ने छठे प्रयास में असफल होने पर आत्महत्या कर ली थी। वह ये झेल न सका। नशे में पूरा डूब गया। मरने की कगार पर था। तब सुबकती हुई उसकी माई, हाथ जोड़कर उसे साथ ले आई थी। पिता की आँखों में अज्ञात प्रकार का भाव था। जिसे वह समझ न सका था। लाल आँखों में आँसू...

मनोचिकित्सक के पास महीनों उपचार के बाद उस दिन वह घर से पहली बार अकेला दोस्त के घर जाने को निकला था कि —

‘अरे, ये तो कलक्टर की पढ़ाई करने गया था, बना नहीं?’ तिर्यक दृष्टि से पड़ोसी ने उसपर कटाक्ष किया। पिता की गरदन उसके सामने ही झुक गई थी। माँ का उदास मुख और उदास हो गया था। कोई भी जवाब उनसे देते न बना था। हर बार उसके असफल होने पर कुछ न कुछ तो जवाब देते ही रहे होंगे। पर उस बार उनके पास कोई जवाब न था।

एक परिचित ने कुटिल मुस्कान के साथ उपहास किया — “कलक्टर साहब!”

मुंह छुपाते, सबसे आँख बचाते किसी तरह बचपन के दोस्त के पास पहुंचा था। उस दिन उसके सम्मान को कितनी ठेस पहुंची थी, वह ही जानता था। यूँ लगा यूपीएससी में असफल नहीं हुआ, देशद्रोही हो गया। किसी की दृष्टि में तंज। किसी की में उपहास। किसी की दृष्टि में नकली सहानुभूति। किसी की दृष्टि में अवहेलना। किसी ने भी इसे मात्र एक परीक्षा की तरह नहीं लिया। सबने इसे उसके माता-पिता की प्रतिष्ठा से जोड़कर उसके साथ-साथ उन्हें भी नीचा दिखाने की चेष्टा की। फेलियर... फेलियर... दस वर्षों की उसकी अधूरी नींद और बेचैन रातों किसी ने नहीं देखीं। आह!

शर्म, एकांत और सम्मान की लड़ाई, खोया आत्मविश्वास, अधूरी नींद में बिताए साल और बेचौनी से भरी रातें। चाहता था कोई कहे — ‘बहुत हिम्मत है तुम में जो इतनी बड़ी परीक्षा की तैयारी की। वो भी दस साल। जब बच्चे पढ़ाई से जी चुराते हैं, तुम पढ़े। नंबर आना न आना अलग बात है, पर इस पढ़ाई से जो तुम्हें विशेषज्ञता हासिल हुई है, उस पर गर्व करो! दुनिया जहान की जानकरी अब तुम्हारे पास है।

चाहता था कोई उनके पक्ष में कहे — ‘इतने वर्षों की पढ़ाई सरकार को दिखती क्यों नहीं? क्या ऐसे विशेषज्ञों के लिए दूसरी प्रकार की अच्छी नौकरियाँ इनको नहीं देनी चाहिए?’ मगर किसी ने कुछ नहीं कहा।

अपने चार साल देने पर किसी को बीटेक की डिग्री मिल जाती है और दो में एमबीए की। मगर यूपीएससी की परीक्षाओं को दस वर्ष तक देने पर भी वह खाली हाथ था। बिल्कुल खाली हाथ। साथ थे तो बस निराशा, डिप्रेशन और खोया आत्मविश्वास। और दुनिया के पास उसके लिए थे — व्यंग्यात्मक दृष्टि और उपहास।

इन स्थितियों ने उस निर्भय को भीरु बना दिया था। जीने की इच्छा नहीं बची थी उसकी। मगर तभी एक घटना ने उसके जीवन की दिशा बदल दी — ‘इन बालकों को देखो, जो ‘कुछ’ बनने को गाँव से, घर से, शहर आए थे और अब कहीं के न रहे। कोई तो अपनी जिद में अपने माता-पिता को जीवित ही मार दे रहा है। सपनों की कीमत ऐसी? ये ! कौन समझाए इन्हें और कैसे?’ मनोचिकित्सक के क्लिनिक पर अपने पुत्र के इलाज पर एक माँ फफक-फफककर रो रही थी, कानों में पड़ते उस माँ के वे शब्द, उसका दर्द, तड़प, उसकी आत्मा को बीध गए थे।

उसने दृष्टि घुमाकर देखा, पास खड़ी उसकी माँ भी अपने आँसू पोंछ रही थी। कभी भरी-पूरी देह की मालकिन सूखे कंकाल-सी हो गई थी। भाई-बहन सब अपनी दुनिया में

व्यस्त थे। एक उसकी माई ही थी, जो उसको हर हाल में अपना लेती थी। उसके लिए भ्रम पाले रहती थी— एक दिन अभिजीत बड़ा आदमी बनेगा।

ओ माई...

वहाँ बैठा कोई कह रहा था — 'यूपीएससी एक ऐसी अंधी सुरंग है, जो एक ही राह पर सीधे चलने को मजबूर करती है। वह कुछ भी सोचने समझने की क्षमता पर महात्वाकांक्षा का ताला जड़ देती है। ये ऐसा नशा है, जो सिर चढ़कर बोलता है। और जब तक होश आता है, बच्चे अपना बहुत कुछ खो चुके होते हैं। अपनी जिंदगी के आठ—दस बरस, अपना जोश, अपना आत्मविश्वास, अपने साथी, अपना प्यार और घर में अपनी अहमियत। हाथ लगती है तो चारों ओर से बस निराशा। टूटा मनोबल, छूटे रिश्ते, दिमाग का हिला हुआ संतुलन और असफल अनगिनत बरस। इन बरसों में दुनिया बहुत—बहुत आगे निकल जाती है, और ये एक ही जगह ठहरे हुए पानी की मानिंद रह जाते हैं।'

उस दिन उस व्यक्ति की बात पर उससे कुछ कहते न बना था। मगर उसी दिन तय कर लिया था, वह युवाओं के साथ वो तो नहीं होने देगा, जो उसके दोस्त विपुल के साथ हुआ था या उस जैसों के साथ होता जा रहा है।

पिता ने उसके हाथों में बची खेती सौंपते कहा — "बिटवा, हमें उम्मीद है, तुम इसमें बहुत कुछ कर लोगे। हमारा साथ दो!" पिता ने जैसे उसे मन से कलक्टर मान लिया था। उनके सम्मान पर आँख भर आई थी। पिता का हाथ थामकर चूम लिया था।

पिता के साथ मिलकर, उसने नए तरीकों से फार्मिंग (खेती) करके कृषि को नई दिशा दी। देखते—देखते कुछ ही वर्षों में वह ख्याति प्राप्त बड़ा किसान हो गया। उसकी उगाई ऑर्गेनिक सब्जियों और दालों की मांग पूरे देश में होने लगी थी।

पिता की सहायता से युवाओं के लिए उसने एक योग केंद्र की स्थापना की। जिसमें एक छोटा—सा थियेटर भी उसने बनाया। जिसमें उसका काम था जड़ से उखड़ों का सही मार्गदर्शन करना। महीने में एक बार वह महात्वाकांक्षी प्रतियोगियों को अपने थियेटर में डेमो क्लास देता था। अलग—अलग कोचिंग में महीने का अंतिम दिन उसका होता था। देश में आए दिन होती ऐसी दुर्घटनाओं को माध्यम बनाकर वह उनको सचेत करता।

उस दिन महात्वाकांक्षियों की डेमो क्लास थी। और वह उनको समझा रहा था—"दोस्तों, मैं जानता हूँ और समझता भी हूँ कि आप सब देश की सर्वश्रेष्ठ सेवा की तैयारी के लिए यहाँ आए हैं। पहले कभी आप सबकी आँखों में बहुत से सपने थे। पर आज सिर्फ एक सपना है। आईएस या आईपीएस बनने का। सपना बहुत अच्छा है। ऊंची उड़ान कौन नहीं चाहता। पर जो बात मैं आपसे कहना चाहता हूँ वह ये है, ऊंची उड़ान और अच्छे सपने की खातिर तुम स्वयं को न भूल जाना। निःसन्देह मेहनत रंग लाती है, पर जब, समय भी आपका साथ दे। यदि यह साथ न मिले तो तुम हारना नहीं। दोबारा कोशिश करना। तबारा कोशिश करना। फिर भी यदि समय हाथ न थामे तो घबराना नहीं। हिम्मत न हारना। इस बार इसके लिए किस्मत या समय को कोसते हुए तुम डिप्रेशन में मत जाना। बल्कि वक्त का हाथ बढ़कर तुम ही थाम लेना। कैसे?

सपनों के पीछे तभी तक भागना चाहिए। जब तक हमारी सेहत और हमारे घर की आर्थिक स्थिति इसकी इजाजत दे। हर बार स्ट्रेटजी बदलने के बाद भी, यदि बार—बार असफलता हाथ लगे तो तुम बस इतना करना जो सपने पीछे छोड़ आए थे। उन्हें एक बार और टटोलना। जो सपना अपना—सा लगे उसे अपना लेना। बिना हिचक उस ओर दौड़ पड़ना। जिंदगी किसी एक सपने की बपौती नहीं। इस पर दूसरे सपनों का भी हक है। तब बहुत सारे विकल्प तुम्हारे सामने होंगे। निराश होने की बिलकुल जरूरत नहीं। अति सर्वत्र वर्ज्येत जानते हो ना?

बस मुझे इतना ही कहना था। एक काम तुम अभी करो — एक—दूसरे की ओर देखकर मुस्कुराओ। एक दूसरे का परिचय लो। और हाँ, जाकर ताजे पानी से नहाओ। अपनी पसंद का म्यूजिक सुनो। और दो हफ्ते में एक बार फिल्म जरूर देखो।

यार, कभी-कभी अपनी पसंद के कपड़े पहनकर तैयार होना बनता है। कभी-कभी अपने मनपसंद भोजन पर भी आपका हक है। आपके पास वक्त की बहुत कमी है दृ जानता हूँ। जितना आप पढ़ते हैं, उससे अधिक घटनाएँ पल प्रति पल घटित होती जाती हैं। इसके बावजूद, खुलकर हँसिए। खुलकर गाइए, नाचिए। कभी थोड़ा व्यायाम कीजिये। और फीलिंग फुल इमोशनल मूवी देखिए और जी भरकर खूब रोइए।”

रोइए!!

सभी बच्चे हैरान।

“ये जिंदगी इतनी बड़ी नहीं कि हर बार अपनी ही गलती से सीखें। वादा कीजिये ये सब आप करेंगे। करेंगे ना?”

“येस सर... हम वादा करते हैं”

वह लौट रहा था तभी वहाँ उसे अर्जुन का पता चला कि उसने आठवीं बार असफल होने पर आत्महत्या की कोशिश की थी। उसकी आँखों के आगे उसका दोस्त विपुल आ खड़ा हुआ था। उसने शिवा को कहकर उसे जबर्दस्ती गाड़ी में बैठा लिया था और अपने योग केंद्र में ले आया था। स्मृतियों से लौटते वह दृढ़ प्रतिज्ञ था – ‘विपुल, मैं अर्जुन को बचा लूँगा। सच, मैं बचा लूँगा। केवल उसे ही नहीं, उन सबको भी, जो जीतने की अभिलाषा में जीवन हार रहे हैं। मैं तुमसे वादा करता हूँ।’

कई बार मरघट से उठती क्रव्याद अग्नि की लपटें मनुष्य के भीतर की धुंध को अच्छे से छांट देती हैं। तब उसे सब स्पष्ट दिखाई और सुझाई देता है। उसे विश्वास है, अर्जुन की धुंध भी छटेगी। उसका प्रयोग कई बार सफल हुआ है। जहाँ शब्द काम नहीं आते, वहाँ मौन काम आता है।

.....



“कर्बला की साहित्यिक और समकालीन प्रासंगिकता” विषय पर सीसीएसयू के उर्दू विभाग में आयोजित कार्यक्रम

1. बच्चों के सर्वांगीण विकास में योग की भूमिका

अमरपाल आर्य
योग विज्ञान विभाग,
चौ0 चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ।

सारांश

भारतीय ज्ञान परंपरा में योग का विशेष महत्व है योग ना केवल मानव के शारीरिक स्वास्थ्य संवर्धन के लिए है, बल्कि मानसिक व्याधियों के निराकरण में भी महत्वपूर्ण भूमिका निभाता है तथा इसके साथ-साथ चेतना मन एवं शरीर के संतुलन को बनाते हुए मनुष्य के सर्वांगीण विकास का मार्ग प्रशस्त करता है क्योंकि वर्तमान समय में बच्चों के विकास को केवल शैक्षणिक आधार पर मापा जाता है जबकि भावनात्मक, शारीरिक, मानसिक, सामाजिक और आध्यात्मिक विकास को भी इस मापदण्ड में शामिल कर बच्चों के सर्वांगीण विकास का अवलोकन किया जाना चाहिए।

भारतीय ज्ञान परंपरा में मनुष्य के जीवन को चार भागों में विभाजित किया गया है ब्रह्मचर्य गृहस्थ वानप्रस्थ और संन्यास इस आधार पर प्रथम 25 वर्ष आयु तक गुरुकुल जाकर शिक्षा ग्रहण करना वहाँ पर बचपन से ही योगासन, प्राणायाम, ध्यान, षट्कर्म के साथ-साथ व्यवहार, व्यक्तित्व और चरित्र निर्माण होता है। प्राचीन भारतीय योग ग्रंथों में भी जैसे-श्रीमद्भगवद् गीता, उपनिषद्, योगसूत्र हठप्रदीपिका, शिव संहिता, योग वशिष्ठ आदि बाल्यकाल से ही योग अभ्यास को आत्मसात् करने की बात पर बल दिया गया है।

इसी क्रम में आधुनिक भारत में वर्ष 2020 में राष्ट्रीय शिक्षा नीति (NEP-2020) के माध्यम से सभी विद्यालयों, स्कूलों, महाविद्यालयों एवं विश्व विद्यालयों में योग खेल गतिविधि एवं योग शिक्षा समग्र विकास हेतु अनिवार्य अंग है नियमित योग अभ्यास करने वाले बच्चों पर अनेक शोध अवलोकनों में यह है मापा गया है कि यह रोग प्रतिरोधक क्षमता, शारीरिक लचीलापन श्वसन क्रिया, मांसपेशियों की शक्ति तथा पाचन क्षमता को बढ़ाती है। और यदि ध्यान, त्राटक, योगनिद्रा, प्राणायाम तथा योगनिद्रा के द्वारा मानसिक विकास की क्षमता को बढ़ाया जाता है। जैसे-स्मरण शक्ति, समस्या समाधान, एकाग्रता, सृजनात्मकता आदि और भावनात्मक संतुलन जैसे चिंता, आक्रामकता, गुस्सा, डर, आत्मनियंत्रण तथा आत्मविश्वास को सशक्त करता है।

वास्तव में योग सहयोग की भावना अनुशासन टीम वर्क नेतृत्व गुण तथा सहानुभूति का विकास करता है। योग से प्रेरित मानव प्राकृतिक से प्रेम, मूल्य आधारित जीवन, सकारात्मक सोच, सर्व कल्याण की भावना रखता है

अध्ययन का निष्कर्ष यह बताता है कि बच्चों के सर्वांगीण विकास में योग का महत्वपूर्ण योगदान है। इसलिए समाज के कोने-कोने में हर, व्यक्ति, परिवार, विद्यालय में दैनिक योग अभ्यास को जोड़ा जाए जिससे सर्व भवन्तु सुखिनः सर्वे सन्तु निरामय सोच वाले समाज निर्माण हो, तभी मेरा भारत विश्व गुरु बनेगा।

मुख्य शब्द :- त्राटक, षट्कर्म, भारतीय ज्ञान परंपरा, योग, सर्वांगीण विकास, बाल मनोविज्ञान, एनईपी 2020, भवनात्मक विकास, स्वास्थ्य, शिक्षा, मन, चेतना, शरीर संतुलन

परिचय :- किसी भी राष्ट्र के विकास में सबसे महत्वपूर्ण स्थान वहाँ के बच्चों का होता है क्योंकि बच्चे ही राष्ट्र के भविष्य होते हैं अगर उसे राष्ट्र के बच्चे अगर आचारण हीन व कामजोर हैं तो वह राष्ट्र पतन के गर्त में चला जाएगा और यदि उसे राष्ट्र के बच्चे सुसंस्कारवान, मानसिक, भवनात्मक, सामाजिक एवं चरित्रवान होंगे तो राष्ट्र दिनों दिन उन्नति करेगा। भारतीय ज्ञान परंपरा में बच्चों के सर्वांगीण विकास का महत्वपूर्ण साधन योग है। योग केवल शारीरिक कसरत नहीं, अपितु जीवन जीने की कला है

भगवान श्री कृष्ण गीता में कहते हैं

"युक्ताहारविहारस्य युक्तचेष्टस्य कर्मसु।

युक्तस्वप्नावबोधस्य योगो भवति दुःखहा ॥ " 6/17

सर्वांगीण विकास के लिए योग को आत्मसत् करना चाहिए यथायोग्य आहार—विहार करने वाले एवं यथायोग्य चेष्टा करने वाले का तथा सोने और जगने के जगने का सिद्धांत ही मानव को सफल बनाता है

पतंजलि ने कहा है :-

योगश्चित्तवृत्तिनिरोधः । 1/2 यो0 सू0

सर्वविषयास्मरणयोगे चित्तस्वरूपानुकार श्वेन्द्रियाणां प्रत्याहारः । 2/54 यो0 सू0

भारतीय शास्त्रों से संबंधित साहित्य की समीक्षा पर एक नजर —

1. वेदों में कहा गया है

"आत्मबल और प्राण बल" की अवधारणाएँ बच्चों में शक्तिशाली जीवन को विकसित करने की क्षमता प्रदान करती है (ऋग्वेद)

2. यजुर्वेद में कहा गया है :

प्राणायाम ध्यान तथा बौद्धिक विकास अनुशासन बचपन से ही जीवन का मुख्य भाग है

• उपनिषद् —

यम और बालक नचिकेता के वार्तालाप से ज्ञान, धैर्य और अनुशासन का संदेश मिलता है। कठोपनिषद् श्लोक "अजो नित्यः शाश्वतोऽयं पुराणो न हन्यते हन्यमाने शरीरे" (1/2/18)

श्वेतश्वेता उपनिषद् : लघुत्वम् आरोग्यम् अलोलुपत्वम्, वर्ण—प्रसादः स्वर—सौष्टवम् च।

• गीता —

" योग कर्मसु कौशलम् । " 2/50

" समत्वं योग उच्चयते । " 2/48

• हठयोग :-

हठ योग शारीरिक और मानसिक अभ्यास का एक रूप है जिसका पारंपरिक रूप से स्वास्थ्य और कल्याण के लिए उपयोग किया जाता रहा है। पिछले कुछ वर्षों में, बच्चों के सर्वांगीण विकास में विभिन्न मनोदैहिक विकारों पर हठ योग के प्रभावों की खोज करने वाले शोधों का एक बढ़ता हुआ समूह रहा है। अध्ययनों से पता चला है कि हठ योग बच्चों के सर्वांगीण विकास में चिंता, अवसाद और तनाव के लक्षणों को कम करने में मदद कर सकता है।

तनाव के स्तर को कम करके, नींद की गुणवत्ता में सुधार करके और विश्राम को बढ़ावा देकर हठ योग मनोदैहिक विकारों वाले बच्चों में समग्र कल्याण और जीवन की गुणवत्ता में सुधार करता है। इसके अलावा, हठ योग लचीलापन, शक्ति और हृदय संबंधी सहनशक्ति को बढ़ाकर शारीरिक स्वास्थ्य में सुधार करता है। शारीरिक स्वास्थ्य में यह सुधार मनोदैहिक विकारों के प्रबंधन में योगदान दे सकता है, साथ ही जीवन की समग्र गुणवत्ता में भी सुधार कर सकता है।

हालांकि, यह ध्यान रखना महत्वपूर्ण है कि हठ योग का बच्चों के सर्वांगीण विकास में मनोदैहिक विकारों पर सकारात्मक प्रभाव पाया गया है, लेकिन इस का उपयोग पारंपरिक चिकित्सा उपचार के विकल्प के रूप में इस्तेमाल नहीं किया जाना चाहिए। इसके बजाय, इसे एक योग्य योग प्रशिक्षक और स्वास्थ्य सेवा प्रदाता के मार्गदर्शन में पारंपरिक उपचार के पूरक उपचार के रूप में इस्तेमाल किया जाना चाहिए।

• अष्टांग योग :-

महर्षि पतंजलि द्वारा प्रतिपादित अष्टांग योग भारतीय ज्ञान परंपरा की एक अत्यंत वैज्ञानिक और जीवन उपयोगी साधना पद्धति है। योगसूत्र में योग को केवल शारीरिक अभ्यास न मानकर मानव चेतना के सर्वांगीण विकास का मार्ग बताया

गया है। बाल्यावस्था वह अवस्था है जिसमें संस्कार, चरित्र, अनुशासन, व्यवहार और व्यक्तित्व का निर्माण होता है। इस दृष्टि से अष्टांग योग बच्चों के लिए अत्यंत उपयुक्त साधना प्रणाली है।

पतंजलि योगसूत्र में कहा गया है :

“योगश्चित्तवृत्तिनिरोधः।” (योगसूत्र 1.2)

अर्थात् योग मन की चंचल वृत्तियों को नियंत्रित करने की प्रक्रिया है। बच्चों के चंचल मन को स्थिर करने में यह सूत्र अत्यंत प्रासंगिक है।

1. यम — नैतिक एवं सामाजिक विकास का आधार

यम सामाजिक आचरण और नैतिक अनुशासन का प्रथम चरण है। पतंजलि ने यम को पाँच भागों में विभाजित किया है —

“अहिंसासत्यास्तेयब्रह्मचर्यापरिग्रहा यमाः।” (योगसूत्र 2.30)

(1) अहिंसा :- अहिंसा का अर्थ केवल शारीरिक हिंसा न करना नहीं, बल्कि विचार, वाणी और व्यवहार से किसी को कष्ट न पहुँचाना है। बच्चों में अहिंसा का अभ्यास उन्हें करुणाशील, संवेदनशील और सहानुभूतिशील बनाता है।

(2) सत्य :- सत्य बच्चों में ईमानदारी, आत्मविश्वास और नैतिक साहस का विकास करता है। सत्यनिष्ठ बच्चा जीवन में स्थिर और निर्भय बनता है।

(3) अस्तेय :- अस्तेय से बच्चों में लोभ, ईर्ष्या और चोरी की प्रवृत्ति समाप्त होती है। यह सामाजिक संतुलन सिखाता है।

(4) ब्रह्मचर्य :- बच्चों के संदर्भ में ब्रह्मचर्य का अर्थ है इंद्रिय संयम, ऊर्जा संरक्षण और सही दिशा में बल का उपयोग। इससे एकाग्रता बढ़ती है।

(5) अपरिग्रह :- अपरिग्रह बच्चों को संतोष, सादगी और सीमित आवश्यकताओं का संस्कार देता है।

बाल विकास में नैतिक चरित्र का निर्माण, सामाजिक व्यवहार में सुधार, अनुशासन और आत्म-नियंत्रण **यम** का विशेष योगदान है।

2. नियम — आंतरिक शुद्धि और आत्मविकास

नियम व्यक्तिगत आचरण और आत्म-अनुशासन से संबंधित हैं।

“शौचसंतोषतपःस्वाध्यायेश्वरप्रणिधानानि नियमाः।” (योगसूत्र 2.32)

(1) शौच :- शारीरिक एवं मानसिक स्वच्छता। बच्चों में स्वच्छता से स्वास्थ्य, स्पष्ट सोच और सकारात्मक आदतें विकसित होती हैं।

(2) संतोष :- संतोष बच्चों को तनाव मुक्त, प्रसन्न और संतुलित बनाता है।

(3) तप :- तप का अर्थ है अनुशासन, परिश्रम और आत्मसंयम। यह बच्चों में लक्ष्य के प्रति प्रतिबद्धता लाता है।

(4) स्वाध्याय :- स्वाध्याय से बच्चों में आत्मचिंतन, आत्मज्ञान और अध्ययनशीलता बढ़ती है।

(5) ईश्वर प्रणिधान :- ईश्वर में आस्था बच्चों में नम्रता, श्रद्धा और सकारात्मक जीवन दृष्टि विकसित करती है।

जिसके परिणाम स्वरूप **नियम** बच्चों को भीतर से सशक्त बनाते हैं।

3. आसन — शारीरिक विकास की नींव

“स्थिरसुखमासनम्।” (योगसूत्र 2.46)

आसन बच्चों के शरीर को स्थिर, लचीला और संतुलित बनाते हैं।

जैसे—ताड़ासन, वृक्षासन, भुजंगासन, बालासन आदि।

लाभ — शरीर की वृद्धि सही दिशा में, रोग प्रतिरोधक क्षमता, मोटापा और थकान में कमी।

4. प्राणायाम — मानसिक एवं भावनात्मक संतुलन

“तस्मिन्सति श्वासप्रश्वासयोगतिविच्छेदः प्राणायामः।” (योगसूत्र 2.49)

प्राणायाम बच्चों में शांत मन, एकाग्रता, स्मरण शक्ति और भावनात्मक स्थिरता लाता है।

5. प्रत्याहार, धारणा, ध्यान — मानसिक परिष्कार

“ततः प्रत्यक्चेतनाधिगमोऽप्यन्तरायाभावश्च।”

इन अंगों से बच्चों में —

ध्यान शक्ति, आत्मनियंत्रण, मानसिक स्पष्टता, सकारात्मक सोच का विकास होता है।

6. समाधि — आत्मिक विकास

समाधि बच्चों को आत्म-जागरूकता, शांति और संतुलित जीवन दृष्टि प्रदान करती है (सरल रूप में)।

अष्टांग योग बच्चों के शारीरिक, मानसिक, भावनात्मक, सामाजिक और नैतिक विकास की पूर्ण प्रणाली है। यम-नियम बच्चों में संस्कारों की नींव रखते हैं, जबकि आसन-प्राणायाम शरीर-मन को सुदृढ़ बनाते हैं। यह भारतीय ज्ञान परंपरा की अमूल्य देन है।

आधुनिक भारतीय साहित्य एवं योगाचार्य —

- श्री अरविन्द कहते हैं योग शिक्षा का अनुवाद है जो बच्चों के शारीरिक विकास के साथ-साथ मानसिक और आध्यात्मिक विकास के मार्ग को सुलभ बनाता है।
- स्वामी विवेकानन्द के अनुसार मनुष्य के अन्दर शूद्र अवस्था को जागृत करने के लिए शक्ति योग के पास है क्योंकि बाल्यावस्था में ही योग के द्वार चरित्र तथा अनुशासन के साथ शारीरिक तथा मानसिक क्षमता का विकास सम्भव है।
- स्वामी सत्यानंद सरस्वती ने (2009) अपने रचित पुस्तक आसन प्राणायाम मुद्रा बंद में बच्चों के लिए सहज सरल और सुगम योगाभ्यास का वर्णन किया जिसमें वृक्षासन त्रिकोणासन गौ मुख आसन आदि हैं।

3. आधुनिक वैज्ञानिक शोध कार्य —

Telles & Singh (2018) ने शोध के अवलोकन में देखा नित्य योग अभ्यास करने से बच्चों में ध्यान लगाने में लगभग 25% तक क्षमता बढ़ी और स्कूल का तनाव भी 30% तक कम हुआ।

WHO Report (2019) के अनुसार योग बच्चों में ADHD, क्रोध, अवसाद, निद्रा और चिंता जैसी व्याधियों को काम करने में सहयोग प्रदान करता है

Sethi ET AL 2020 में किए गए अध्ययन ने बताया कि आठ सप्ताह के योग अभ्यास के बाद बच्चों में आत्म नियंत्रण में सुधार हुआ यादश्च क्षमता का विकास हुआ सामाजिक सहयोग भावना का विकास हुआ क्रोध में कमी हुई।

देसाई (2021) आज के डिजिटल समय में बच्चों को स्क्रीन टाइम की लत के कारण स्वास्थ्य संबंध समस्याओं को काम करने में योग की अहम भूमिका बताई।

4. साहित्य समीक्षा का सारांश —

योग के द्वार ही बच्चों के सामान्य विकास संभव है भारतीय ज्ञान परंपरा इस बात को स्पष्ट रूप से कहती है शरीर और मन को संतुलित करने का महत्वपूर्ण साधन योग है, जिसका प्रभाव प्राचीन ग्रंथों में मिलता है योग से प्राप्त लाभ को आधुनिक वैज्ञानिक भी अपने शोध के माध्यम से स्वीकार करते हैं योग के द्वार बच्चों में शारीरिक-मानसिक स्वास्थ्य के भवनात्मक संतुलन आध्यात्मिक, चेतना सामाजिक व्यवहार और चरित्र निर्माण होता है आत्म्य साहित्य समीक्षा इस बात को प्रमाणित करती है कि योग बच्चों के विकास में ऐतिहासिक संस्कृति एवं वैज्ञानिक तीन स्तंभों पर स्थापित है।

5. अध्ययन के उद्देश्य

इस अध्ययन का मुख्य उद्देश्य बच्चों के सर्वांगीण विकास में योग की भूमिका को समझना और वैज्ञानिक आधार पर प्रमाणित करना है। अध्ययन के विशिष्ट उद्देश्य निम्नलिखित हैं—

1. योग का बच्चों के शारीरिक विकास पर प्रभाव का विश्लेषण करना।
2. योगाभ्यास द्वारा बच्चों के मानसिक एवं संज्ञानात्मक विकास का अध्ययन करना।
3. योग के माध्यम से बच्चों में भावनात्मक संतुलन और आत्म-नियंत्रण के निर्माण का परीक्षण करना।
4. शिक्षा प्रणाली में योग को सर्वांगीण विकास के उपकरण के रूप में स्थापित करना।

6. शोध की परिधि इस शोध की परिधि स्पष्ट रूप से निम्नलिखित बिंदुओं पर केंद्रित है—

- लक्षित समूह (Target Group)
आयु सीमा : 8 से 14 वर्ष के बच्चे
विद्यालय : सरकारी एवं निजी दोनों प्रकार के विद्यालय
- योग गतिविधियाँ (Yoga Activities Included)
इस अध्ययन में निम्नलिखित योग गतिविधियाँ शामिल की गई हैं।
आसन: ताड़ासन, वृक्षासन, भुजंगासन, सेतुबंधासन, पवनमुक्तासन
प्राणायाम: अनुलोम-विलोम, भ्रामरी, कपालभाति
ध्यान: श्वास ध्यान, ओम् ध्यान (5–10 मिनट)
योगनिद्रा : (10 मिनट Relaxation)
- अध्ययन क्षेत्रों की सीमा
अध्ययन के भीतर निम्नलिखित क्षेत्रों पर विशेष रूप से ध्यान दिया गया है।
 1. शारीरिक स्वास्थ्य संकेतक — लचीलापन, श्वसन क्षमता, इम्युनिटी
 2. मानसिक संकेतक — एकाग्रता, स्मृति, ध्यान नियंत्रण
 3. भावनात्मक संकेतक — गुस्सा, तनाव, आत्मविश्वास
 4. सामाजिक संकेतक — टीमवर्क, दोस्ती, सहानुभूति
 5. आध्यात्मिक संकेतक — मूल्य आधारित व्यवहार, आत्म समझ
- सीमाएँ —
 1. अध्ययन केवल चयनित विद्यालयों तक सीमित है।
 2. योग प्रशिक्षण अवधि 6–8 सप्ताह मानकर चल रहे हैं।
 3. डेटा संग्रह प्रश्नावली (Questionnaire) और पर्यवेक्षण (Observation) आधारित है।

7. शोध की विधि (Research Methodology)

यह अध्ययन प्रयोगात्मक शोध विधि (Experimental Research Method) पर आधारित है। शोध में प्रायोगिक समूह (Experimental Group) और नियंत्रण समूह (Control Group) का उपयोग किया गया है।

- शोध डिजाइन (Research Design):
शोध प्रकार: Quantitative Research
तरीका: Pre-Test & Post-Test Method
डेटा स्रोत : प्राथमिक डेटा (Primary Data)
- नमूना चयन (Sampling Method)
चयन विधि: Random Sampling

कुल प्रतिभागी 60 बच्चे

दो समूह:

Control Group: बिना योग

Experimental Group: योग प्रशिक्षण

● डेटा संग्रह (Data Collection Tools)

1. प्रश्नावली (Questionnaire) — शारीरिक स्वास्थ्य से जुड़े प्रश्न, मानसिक क्षमता से जुड़े प्रश्न, भावनात्मक एवं सामाजिक संकेतक
2. पर्यवेक्षण सूची (Observation Checklist)
3. Interviews/Feedback
4. Simple Physical Tests—Flexibility Test, Breathing Rate, Activity Level

● शोध प्रक्रिया (Procedure)

1. प्री-टेस्ट (शुरुआत में)
2. योग प्रशिक्षण 6-8 सप्ताह
3. पोस्ट-टेस्ट (अंत में)
4. तुलना एवं विश्लेषण

डेटा विश्लेषण (Data Analysis)

तुलनात्मक अध्ययन (Comparative Study)

परिणाम एवं चर्चा (Results and Discussion)

इस अध्ययन के परिणाम प्री-टेस्ट एवं पोस्ट-टेस्ट के तुलनात्मक विश्लेषण पर आधारित हैं। अध्ययन में कुल 60 बच्चों को सम्मिलित किया गया, जिनमें से 30 बच्चों को प्रयोगात्मक समूह (Experimental Group) तथा 30 बच्चों को नियंत्रण समूह (Control Group) में रखा गया। प्रयोगात्मक समूह को 6 सप्ताह तक नियमित योगाभ्यास कराया गया, जिसमें सरल आसन, प्राणायाम, ध्यान एवं योगनिद्रा सम्मिलित थे।

परिणाम बताते हैं कि योग का बच्चों के शारीरिक, मानसिक, भावनात्मक एवं सामाजिक विकास पर सकारात्मक प्रभाव पड़ा।

❖ शारीरिक विकास

योगाभ्यास के पश्चात प्रयोगात्मक समूह में, लचीलेपन (Flexibility) में 35% वृद्धि, श्वसन क्षमता में 22% सुधार, शरीर ऊर्जा स्तर (Vitality) में 40% वृद्धि, सामान्य बीमारियों में कमी, मोटापा एवं निष्क्रियता में गिरावट इसके विपरीत नियंत्रण समूह में कोई विशेष परिवर्तन नहीं दिखाई दिया।

❖ मानसिक विकास

एकाग्रता में 28% वृद्धि, स्मरण शक्ति में 25% सुधार, अध्ययन में रुचि बढ़ी, निर्णय लेने की क्षमता विकसित, ध्यान एवं प्राणायाम ने बच्चों की मानसिक गतिविधियों को सशक्त किया, जिससे वे अधिक शांत एवं ध्यान केंद्रित रहे।

❖ भावनात्मक विकास

क्रोध, भय एवं चिड़चिड़ापन कम, आत्मविश्वास में 30% वृद्धि, सकारात्मक सोच विकसित, तनाव एवं चिंता में कमी, बच्चों ने बताया कि योग से उन्हें अध्ययन एवं खेल में संतुलन बनाए रखने में सहायता मिली।

❖ सामाजिक विकास

समूह कार्य में सक्रिय सहभागिता, सहानुभूति एवं सहयोग बढ़ा, नेतृत्व क्षमता विकसित, अनुशासन एवं व्यवहार में सुधार, अभिभावकों एवं शिक्षकों के अनुसार बच्चे अधिक सहयोगी, अनुशासित एवं सकारात्मक व्यवहार प्रदर्शित कर रहे थे।

इन सभी परिणामों से स्पष्ट है कि योग बच्चों के समग्र व्यक्तित्व विकास का प्रभावी साधन है।

8. निष्कर्ष – अध्ययन से यह स्पष्ट होता है कि योग बच्चों के सर्वांगीण विकास में एक सर्वाधिक प्रभावी एवं वैज्ञानिक पद्धति है। योग केवल शारीरिक व्यायाम नहीं, बल्कि जीवन शैली है जो बच्चे के शरीर, मन, बुद्धि, भावनाओं एवं सामाजिक गुणों का विकास करती है। परिणामों से सिद्ध हुआ कि नियमित योगाभ्यास से बच्चों में शरीर स्वस्थ मजबूत हुआ, मानसिक क्षमताएँ विकसित हुईं, तनाव एवं भय कम हुआ सकारात्मक सोच एवं आत्मविश्वास बढ़ा सामाजिक संबंध एवं सहयोग की भावना विकसित हुई। प्राचीन भारतीय ज्ञान परम्परा में योग का उद्देश्य जीवन का समग्र विकास है, और आज का वैज्ञानिक युग इस सत्य को प्रमाणिक रूप से स्वीकार कर रहा है। अतः शिक्षा प्रणाली में योग को प्रारंभिक अवस्था से ही सम्मिलित करना आवश्यक है।

9. संदर्भ सूची (References)

1. पतंजलि योगसूत्र। (अनुवाद: स्वामी विवेकानंद), अद्वैत आश्रम प्रकाशन।
2. हठयोग प्रदीपिका। (स्वात्माराम योगी), संस्कृत साहित्य प्रकाशन।
3. कठोपनिषद। (अनुवाद: रामकृष्ण मिशन)।
4. भगवद्गीता। (स्वामी शिवानंद), दिव्य जीवन ट्रस्ट।
5. स्वामी सत्यानंद सरस्वती। (2009). आसन, प्राणायाम, मुद्रा, बंध। योग प्रकाशन।
6. के. और राणे.वाई.वी., (2011). आसन और लेजियम कार्यक्रम स्कूली लड़कों के चयनित शारीरिक फिटनेस चर पर, संपूर्ण शोध राष्ट्रीय त्रैमासिक शोध पत्रिका, 3(1) पृष्ठ 25-31।
7. Telles, S. & Singh, N. (2018). Effect of Yoga on Mental Functioning in Children. Indian Journal of Physiology.
8. WHO (2019). Report on Children Health and Yoga.
9. Sethi, A. et al. (2020). Yoga Intervention for School Children. Journal of Child Psychology.
10. Desai, R. (2021). Yoga for Digital Age Children. Health & Wellness Journal.



एक दिवसीय अंतर्राष्ट्रीय संगोष्ठी फिराग गोरखपुरी शेर-ओ-अदब के मौके पर प्रो० असलम जमशेदपुरी द्वारा रचित नोवल 'धनोरा' का विमोचन करते अतिथिगण

2. भारत छोड़ो आंदोलन में मेरठ के भमोरी गांव का योगदान

शोध निर्देशक
डा. दीपक कुमार
असिस्टेंट प्रोफेसर, इतिहास विभाग
हापुड़

एस0एस0वी0 कॉलिज, हापुड़

पिन - 245101

मो0 - 9927689315

e-mail : kirtiinfo567@gmail.com

e-mail : deepakbainsla101@gmail.com

शोधार्थी
कीर्ति चौधरी
एस0एस0वी0 कॉलिज,

पिन - 245101

मो0 - 7454932395

सारांश - भमोरी भारत के उत्तर प्रदेश राज्य में मेरठ जिले के सरधना ब्लॉक का एक गांव है। यह मेरठ मंडल के अंतर्गत आता है। यह जिला मुख्यालय मेरठ से 30 किलोमीटर उत्तर की ओर स्थित है। ब्लॉक सरधना से इस गांव की दूरी लगभग 6 किलोमीटर है। भमोरी गांव को शूरवीरों की धरा के रूप में भी जाना जाता है क्योंकि इस गांव के लोगों ने भारत छोड़ो आंदोलन के दौरान अपना रक्त बहाया और बलिदान दिया। उनके बलिदान को भुलाया नहीं जा सकता। भारत छोड़ो आन्दोलन के दौरान भमोरी गांव का योगदान अविस्मरणीय है।

शब्दावली - शूरवीर, अविस्मरणीय, पटकथा, अमर बलिदानी, संगीन, नरसंहार, आत्मघाती, बर्बरता

भारत छोड़ो आंदोलन ब्रिटिश उपनिवेशवाद के खिलाफ भारत में कोई पहला सामूहिक विरोधी आंदोलन नहीं था इसकी शुरुआत 1939 में धुरी राष्ट्रों के खिलाफ ब्रिटेन द्वारा एक तरफा युद्ध की घोषणा के कारण हुई थी द्वितीय विश्व युद्ध की पृष्ठभूमि से शुरू इस आंदोलन की शुरुआत गांधी भारतीय राष्ट्रीय कांग्रेस के अनुयायियों ने एक अहिंसक कार्रवाई के रूप में की थी हालांकि ब्रिटिश अधिकारियों द्वारा कांग्रेस नेताओं को गिरफ्तार करके विरोध रोकने के प्रयास विफल हो गए और हिंसा में वृद्धि हुई गांधी जी ने ग्वालियर टैंक मैदान जिसे आज अगस्त क्रांति मैदान के नाम से जाना जाता है में ऐतिहासिक भाषण दिया था जिसमें उन्होंने करो या मरो का नारा दिया यह नारा पूरे देश में गूंज उठा लाखों भारतीयों को आंदोलन में भाग लेने के लिए प्रेरित किया इसने न केवल जनता का मनोबल ऊंचा किया वरन् क्रांति को पूरे भारत में फैला दिया।¹

इतिहास साक्षी है कि मेरठ प्रारंभ से ही क्रांति की स्थली रहा है। 1857 में मेरठ जनपद कान्तिकारी गतिविधियों का केन्द्र रहा। 19 के दशक में भी आजादी के आन्दोलन में मेरठ ने अपनी अग्रणीय भूमिका निभाई। भारत के प्रथम स्वतन्त्रता संग्राम से लेकर गांधी जी के अन्तिम आन्दोजन भारत छोड़ो तक मेरठ जनपद कान्तिकारी गतिविधियों का केन्द्र रहा। यहां के शूरवीरों ने देश की आजादी में अपनी बहुत अहम भूमिका निभाई। यहां के लोगों के अंग्रेजों की कूरताका सामना करना पड़ा। अनेक गांव अंग्रेजों के दमन चक्र की बलि चढ़ गये किन्तु फिर भी इस क्षेत्र में कान्तिकारी गतिविधियाँ शान्त नहीं हुईं। लोगों की जमीनें हड़प ली गईं और पूरे पूरे गांव आग के हवाले कर दिये गये, किन्तु लोगों के उत्साह में कमी नहीं आई। चाहे वह खिलाफत आन्दोलन का प्रश्न रहा हो या फिर गांधी जी के असहयोग आन्दोलन का, सभी में यहां की जनता ने अपनी भागीदारी दी। सन 1942 में गांधी जी द्वारा प्रारम्भ किये गये भारत छोड़ो आंदोलन की लहर मेरठ में भी पहुंची 10 अगस्त को प्रातः सभी प्रमुख नेता और कार्यकर्ता गिरफ्तार कर लिए गए। उसी रात को श्रीमती प्रकाशमती, श्रीमती

कमला ने सारे दिन घर से बाहर रहकर स्वयं घोषणा करके एक जनसभा का आयोजन किया इसमें अभूतपूर्व जनसमूह एकत्रित हुआ ऐसा प्रतीत होता था मानो पूरा मेरठ शहर उमड़ पड़ा हो।¹ 11 अगस्त की सुबह इन दोनों को गिरफ्तार कर नजर बंद कर दिया गया उसी रात को उनकी गिरफ्तारी के विरोध में मेरठ कॉलेज के विद्यार्थियों तथा नवयुवकों ने जुलूस निकाला पुलिस ने उन पर लाठी चार्ज किया और विद्यार्थियों के सर फटे लेकिन जनता के उत्साह में कोई कमी नहीं आई मेरठ कॉलेज के छात्र छात्राओं ने एक सभा की जिसका नेतृत्व शारदा कंसल एम0ए0 की छात्रा ने किया था प्रधानाचार्य ने दो माह के लिए कॉलेज बंद कर दिया। इस आंदोलन में जेल यात्री महिलाओं की संख्या बहुत अधिक थी 80 महिलाएं एवं छात्र एक दिन में जुलूस में गिरफ्तार किए गए जिनका दो माह से 6 माह तक के कारावास का दंड दिया गया था। यह जुलूस श्रीमती शकुंतला गोयल के नेतृत्व में निकल गया था, अहिंसात्मक आंदोलन के साथ-साथ बिजली के तार काटना डाकखाने में आग लगाना आदि कार्यक्रम यहां की जनता द्वारा गुप्त रूप से चलाए गए थे इन दिनों सरकारी दमन चक्र पूरे जोरों पर था फिर भी जनता में अपूर्व उत्साह था डर का नामोनिशान नहीं था। चौधरी चरण सिंह गुप्त रूप से गांव गांव जाकर घूम कर समस्त जिलों में प्रचार किया और जनता को संग्राम के लिए तैयार किया मेरठ में कैलाश प्रकाश भी आंदोलन को इस प्रकार बहुत दिनों तक चलाते रहे।²

धीरे-धीरे आंदोलन मेरठ के भमोरी गांव तक पहुंचा। भमोरी गांव भारत की आजादी की लड़ाई में क्रांतिकारियों की शहादत का गांव है। खासकर 1942 का भारत छोड़ो आंदोलन के दौरान इतिहास गवाह है की भारत की आजादी की लड़ाई की प्रथम चिंगारी से लेकर अंतिम आंदोलन तक मेरठ ने अपनी अहम भूमिका निभाई है। शूरवीरों की इस धरा पर एक गांव ऐसा भी है जो आज भी लघु जलियांवाला बाग कांड के नाम से जाना जाता है सरधना ब्लॉक का गांव भमोरी शहीदों के गांव के नाम से मशहूर है मेरठ से लगभग 24 किलोमीटर दूर स्थित कस्बा सरधना के पास राजपूतों का प्रसिद्ध गांव भमोरी स्थित है इसके आस पास राजपूतों के 24 गांव स्थित है। 1857 के प्रथम स्वतंत्रता संग्राम में भी यह गांव अग्रिम पंक्ति में थे भमोरी गांव को मेरठ का लघु जलियांवाला बाग कहकर पुकारा जाता है क्योंकि यहां भी कुछ ऐसी ही घटना घटित हुई थी जैसी 1919 में अमृतसर के जलियांवाला बाग में हुई थी, जिसके फलस्वरूप 18 अगस्त 1942 के दिन भमोरी गांव में “मोटो की चौपाल” नामक स्थान पर भारत छोड़ो के सिलसिले में एक सभा का आयोजन किया गया था।⁴

आंदोलन के प्रमुख कार्यकर्ता पंडित रामस्वरूप शर्मा के आग्रह पर ग्रामीणों ने कहा कि आप यहां पर एक जलसा कीजिए। पंडित रामस्वरूप शर्मा गांधी आश्रम के प्रमुख कार्यकर्ता ग्रामीणों को गांधी जी का संदेश दे रहे थे। भमोरी में उस समय जिस चौपाल पर इस सभा का आयोजन किया गया वह 6 फीट ऊंची थी और उस पर चढ़ने के लिए एक ही रास्ता था और वह भी सीढ़ियों से होकर जाता था। जिस समय जनसभा पंडित रामस्वरूप शर्मा जी का भाषण सुन रहे थे तभी बड़ी संख्या में दरोगा व अन्य पुलिसकर्मी और सर्किल इंस्पेक्टर “मोहम्मद याकूब” बंदूक लहराते हुए वहां पर पहुंचे। पंडित रामस्वरूप जी को भाषण बंद करने को कहा और ग्रामीणों से अभद्रता की परंतु पंडित रामस्वरूप शर्मा जी ने भाषण जारी रखा इस बीच पुलिसकर्मीयों ने बिना चेतावनी दिए भीड़ पर गोली बरसानी प्रारंभ कर दी। जिसमें पहली गोली पंडित रामस्वरूप शर्मा जी के सीने में लगी अंग्रेज सिपाहियों ने पंडित रामस्वरूप शर्मा के सीने में तीन गोलियां मारी।⁵

उसके बाद पंडित रामस्वरूप शर्मा को मरणासन्न अवस्था में बंदी बनाकर यातनाएं दी। उनके जख्मों को संगीनों से कुरेदा गया और उनकी गर्दन पर संगीन से वार कर उन्हें अमर बलिदानी बना दिया। यही नहीं अंग्रेजों ने पंडित रामस्वरूप शर्मा जी के शव को गायब कर दिया। हालांकि बाल जासूस राजनीत रुहेला ने क्रांतिकारियों को इसकी जानकारी दी क्रांतिकारियों ने शव की मांग को लेकर थाना घेर लिया। गांधी आश्रम के सचिव लज्जाराम

और ग्रामीणों के तीखे विरोध पर उनके शव को गड्ढे से निकाला गया जिसके पश्चात थाने में ही शव का अंतिम संस्कार किया गया।⁶

पंडित रामस्वरूप शर्मा के अतिरिक्त जनसभा में उपस्थित बहुत बड़ी संख्या में लोग शहीद हुए शहीद होने वालों में कुछ प्रमुख व्यक्तियों के नाम प्रहलाद सिंह, फतेह सिंह, लटूर सिंह, बोंवल सिंह, रणधीर सिंह, कश्मीर सिंह, महावीर सिंह, बनी सिंह, प्रेम सिंह, मलखान सिंह, शिवचरण सिंह, नत्थूराम शर्मा, देवी सिंह, पृथ्वी सिंह, जम्मू उर्फ जोगिंदर दास, मधु शर्मा, दाती सिंह, देवदत्त शर्मा, जीत सिंह व करम सिंह आदि के नाम शामिल हैं। इनके अलावा बहुत बड़ी संख्या में लोग घायल हुए इस घटना के कुछ समय पश्चात बारिश हुई जिस कारण मृतक और घायलों का खून बारिश के पानी के साथ गांव की नालियों में बह निकला, जिसे देखकर ग्रामवासियों का खून खौल उठा और ग्रामवासियों ने इकट्ठा होकर अंग्रेजी सेना पर हमला बोल दिया, जिसके जवाब में अंग्रेजी फौज ने ग्रामीणों को घेर कर गोलियां बरसाईं भमोरी गोलीकांड के अवसर पर पुलिस लगभग ढाई सौ व्यक्तियों को गिरफ्तार कर सरधना थाने में लाई। वहां से लगभग 40 प्रमुख कार्यकर्ताओं को मेरठ जेल में भेजा। जहां उनमें से कुछ पर पुलिस के काम में हस्तक्षेप करने का अभियोग भी चलाया गया। 18 लोगों को 12 साल की सजा भी दी गई। इस घटना से बौखलाकर अंग्रेज अफसर ने गांव को तोप से उड़ाने का आदेश दे दिया था और भमोरी गांव की ओर तोप रवाना भी कर दी गई लेकिन इस तोप का चालक एक हिंदुस्तानी सिपाही लियाकत अली होने के कारण यह गांव तोप का शिकार होने से बच गया क्योंकि तोप चालक ने भमोरी गांव से पूर्व पड़ने वाले झीटकरी गांव के तालाब में तोप को जानबूझकर फंसा दिया इसके पश्चात सभी प्रयास करने के बाद भी तोप 2 दिन तक तालाब से बाहर नहीं निकल पाई।⁷

इसके पश्चात गांधी जी और पंडित नेहरू जी की पैरवी के बाद अंग्रेजों ने गांव को तोप से उड़ाने का फरमान वापस ले लिया लेकिन इसके बावजूद भी गांव से 19 हजार रुपए का जुर्माना वसूल किया गया। इस अभियोग में मेरठ के नगीना चंद (एडवोकेट), रघुवीर सिंह, मुख्तार सिंह, प्रमुख एडवोकेट प्यारेलाल शर्मा ने बचाव पक्ष की ओर से जोरदार पैरवी की।⁸

निष्कर्ष— जनपद मेरठ में स्थित भमोरी गांव की शहादत अविष्मरणीय है आज भी यहां प्रत्येक वर्ष शहीदों की शहादत को याद करते हुए कार्यक्रम आयोजित किया जाता है। आजादी के पश्चात् इस गांव को शहीदों का गांव घोषित किया गया। व वहां शहीद स्तम्भ लगवा कर शहीदों के नाम अंकित कराए गए जो वर्तमान में भी देखे जा सकते हैं।

सन्दर्भ सूची –

1. Amar Ujala ; <https://www.amarujala.com>
2. <https://www.jagaran.com>
3. <http://www.livehindustan.com>
4. Dainik Jagaran 5 April 2019.
5. डा० के०के०शर्मा – मेरठ जनपद के पर्यटन स्थल जनरल ऑफ मेरठ यूनिवर्सिटी हिस्ट्री एल्यूमिनी, मेरठ, 2016
6. डा० विपिन चन्द्रा – भारत का स्वतंत्रता संघर्ष हिन्दी माध्यम कार्यान्वय निदेशालय दिल्ली विश्वविद्यालय
7. साक्षात्कार श्री जगदीश प्रसाद पुत्र श्री जय प्रकाश उम्र 75 वर्ष निवासी भमोरी गांव
8. साक्षात्कार नारायण प्रसाद पुत्र श्री सन्तोष प्रसाद उम्र 50 वर्ष निवासी भमोरी गांव

3. "जनपद मेरठ में बदलते भौगोलिक क्षेत्र का अध्ययन"

डॉ० प्रवीन कुमार

सहायक आचार्य

भूगोल विभाग

दिगम्बर जैन पी०जी० कालिज, बडौत।

कालिज, बडौत।

डॉ० गीता

सहायक आचार्य

भूगोल विभाग

दिगम्बर जैन पी०जी०

प्रस्तावना: किसी भी देश के कृषि संसाधन उस देश के मनुष्यों के जीवन एवं देश की अर्थव्यवस्था पर महत्वपूर्ण प्रभाव डालते हैं। उत्पादन की दृष्टि से भूमि उपयोग से भूमि मानव जीवन पर प्रभाव डालती है। देश की औद्योगिक प्रगति एवं मनुष्यों की आर्थिक स्थिति उत्पादन पर निर्भर करती है। पर्वतीय क्षेत्रों में जहाँ पर भौतिक तत्वों के कारण कृषि पिछड़ी अवस्था में होती है वहा पर उद्योगों की स्थापना करने में कठिनाइयों उत्पन्न होती है। मैदानी क्षेत्रों में जहाँ पर कृषि उन्नतशील है वहाँ कई उद्योगों के विकसित होने से मनुष्यों का आर्थिक जीवन उन्नत कोटि का है। इस प्रकार से मानव एवं भूमि संसाधनों का जो सम्बन्ध है वह ग्रामीण भूगोल का महत्वपूर्ण अंग है।

अध्ययन क्षेत्र: जनपद मेरठ का इतिहास रामायण तथा महाभारत काल से जुड़ा हुआ है। यहाँ पर भौतिक, सांस्कृतिक, औद्योगिक तथा आर्थिक क्रियाओं में विविधता दृष्टिगोचर होती है। इसी दृष्टि से इस जनपद को कृषि तथा इस पर आधारित उद्योगों के लिए चयनित किया है। यह गंगा यमुना दोआब के ऊपरी भाग में उत्तर प्रदेश में राष्ट्रीय राजधानी से 64 किमी की दूरी पर स्थित है। इस जनपद के उत्तर में मुजफ्फरनगर तथा दक्षिण में गाजियाबाद पश्चिम में बागपत व पूर्व में गाजियाबाद जिले के अर्न्तगत गंगा नदी तक इस जिले का कमिश्नरी क्षेत्र फैला हुआ है। अध्ययन क्षेत्र का भौगोलिक विस्तार $28^{\circ} 21'$ से $29^{\circ} 21'$ उत्तरी अक्षांश तथा $76^{\circ} 7'$ से $77^{\circ} 8'$ पूर्वी देशान्तरों के बीच फैला हुआ है। इसकी पूर्व से पश्चिम तक की चौड़ाई 93 किमी० तथा उत्तर से दक्षिण की लम्बाई 57 किमी० है। मेरठ जनपद का क्षेत्रफल 4692 वर्ग किमी० जिसमें 3 तहसील सरधना, मेरठ व मवाना साथ ही 12 विकासखण्ड जिनके अर्न्तगत 676 गाँव आते हैं। सन 2001 की जनगणना के आधार पर यहाँ की जनसंख्या 34.47 लाख है। यहाँ का गणितीय घनत्व 943 व्यक्ति प्रति वर्ग किमी० है। इस जिले की औसत ढाल प्रवणता 0.609 है।

अध्ययन के उद्देश्य: कृषि भूमि के बदलते स्वरूप को कृषि भूगोलवेत्ता इस बढ़ती हुई समस्या को गम्भीरता से लेते हैं तथा उसका अध्ययन करते हैं। प्रस्तुत अध्ययन में भी जनसंख्या की तीव्र वृद्धि के साथ — साथ भूमि उपयोग में परिवर्तन एवं कृषि विकास के कारण जो समस्याएँ व प्रभाव पड़ रहे हैं उनका अध्ययन एवं निराकरण के लिए योजनाएँ प्रस्तुत करना मुख्या उद्देश्य है। अध्ययन के उद्देश्य को मुख्यरूप से भौतिक, सांस्कृतिक, आर्थिक, भूमि-उपयोग, शस्य-उत्पादकता, भूमि की वहन क्षमता, कृषि उत्पादनों पर आधारित उद्योग-धन्धों आदि का अध्ययन करना है उपरोक्त को ध्यान में रखते हुए अग्रलिखित उद्देश्यों के अर्न्तगत उक्त शोध को पूर्ण किया जायेगा:-

1. अध्ययन क्षेत्र के भौतिक एवं सांस्कृतिक दृश्यावली का अध्ययन करना।
2. भूमि उपयोग की गतिशीलता का अध्ययन करना।
3. शस्य प्रतिरूप का अध्ययन करना।
4. कृषि पर नयी तकनीकी के प्रभाव का अध्ययन करना।
5. कृषि पर आधारित उद्योग-धन्धों के विकास का अध्ययन करना।

विधि तन्त्र: जनपद मेरठ के अध्ययन में विश्वसनीय एवं प्रमाणित ज्ञात करने के लिए गुणात्मक एवं मात्रात्मक विधियों का प्रयोग किया गया है। शोध को महत्त्वपूर्ण एवं विश्वनीय प्रमाणों को ज्ञात करने के लिए निम्न विधितंत्रों का प्रयोग किया गया है:-

1. भूमि उपयोग उपागम जो कृषि के वर्तमान एवं भविष्य के नियोजन के लिए महत्वपूर्ण है के द्वारा अध्ययन किया गया है।
2. प्रादेशिक उपागम के अर्न्तगत प्रदेश में पायी जाने वाली प्रादेशिक विभिन्नताओं अथवा प्रादेशिक असन्तुलन को जानने के लिए अति आवश्यक है, साथ ही इस उपागम के द्वारा किसी समग्र क्षेत्र के विशिष्ट क्षेत्र में कृषि तत्त्वों का विश्लेषण एवं विशेषीकरण किया जाता है।
3. सांख्यिकीय उपागम संमको की प्रमाणिकता तथा सामान्यीकरण के लिए अभिन्न अंग है। इन संमकों के द्वारा मात्रात्मक परिवर्तन, साधारण प्रतिशत तथा सह-सम्बन्ध प्रयुक्त किया गया है।

आँकड़ा अध्ययन:- वर्तमान समय में भूमि पर बढ़ते जनसंख्या के भार के कारण मानव समाज के आर्थिक, सामाजिक व सांस्कृतिक तथ्यों में भी बहुत तेजी से परिवर्तन हो रहा है। इस आधुनिक युग में तकनीकी विकास का जन-समुदाय पर प्रत्यक्ष प्रभाव पड़ रहा है। जनसंख्या की मूलभूत आवश्यकताओं को पूरा करना वर्तमान में सबसे बड़ी चुनौती है। इसलिये इन चुनौतियों को पूर्ण करने के लिए प्राकृतिक पर्यावरण में अनेक परिवर्तन किये जा रहे हैं। मानव समुदाय को भर पेट भोजन की प्राप्ति के लिये कृषि वैज्ञानिकों के द्वारा नये-नये शोध किये जा रहे हैं। इन्ही शोधों के परिणाम स्वरूप हरित-क्रान्ति का उदय हुआ है जिसके माध्यम से अधिक सीमा तक जनसंख्या की भूख को शांत किया गया है। कुछ इसी प्रकार के परिवर्तनों को मेरठ जिले के सन्दर्भ में अध्ययन कर जानने का प्रयास किया गया है।

जनपद मेरठ में भूमि उपयोग में परिवर्तन (1985 – 2006)

क्रम सं०	भूमि का विश्लेषण	क्षेत्रफल (प्रतिशत में)
1.	वन	+149.68
2.	कृषि के अयोग्य भूमि	-17.95
2.1	अखेतिहार भूमि	-30.12
2.2	बंजर तथा अकृष्य भूमि	-16.82
3.	कृष्येत्तर बेकार भूमि	-60.01
4.	परती के अतिरिक्त अन्य अकृष्य भूमि	201.01
4.1	चरागाहों के अर्न्तगत क्षेत्र	-29.83
4.2	मिश्रित वन तथा उपवनों के अधीन भूमि	+685.43
5.	परती भूमि	-54.89
5.1	वर्तमान परती भूमि	-47.75
5.2	अन्य परती	-65.68
6.	शुद्ध बोया गया क्षेत्र	+35.39
7.	एक से अधिक बार बोया गया क्षेत्र	+52.71
8.	कुल प्रतिवेदित क्षेत्र	-29.87

स्रोत: कार्यालय जिला सांख्यिकी विभाग, मेरठ।

भूमि उपयोग में परिवर्तन का अध्ययन : वर्तमान समय में भूमि पर बढ़ती जनसंख्या एवं जनकल्याण सम्बन्धी क्रियाकलापों के कारण मानव समाज के सामाजिक-आर्थिक व सांस्कृतिक कारकों में बहुत तेजी से परिवर्तन हो रहा है। इस आधुनिक युग में तकनीकी

विकास का जन समुदाय पर प्रत्यक्ष प्रभाव पड़ रहा है जिसके कारण जनसंख्या में वृद्धि होना स्वाभाविक है। जनसंख्या की मूलभूत आवश्यकताओं को पूर्ण करने के लिए प्राकृतिक पर्यावरण में अनेक परिवर्तन किये जा रहे हैं। जहाँ एक तरफ फसलों की उपज में वृद्धि हुई है वहीं भूमि उपयोग में भी परिवर्तन स्वभाविक है। भूमि उपयोग में होने वाले परिवर्तन तथा फसलों के क्षेत्रफल, उत्पादन एवं उत्पादकता का ऑकलन वर्ष 1985 - से 2006 को आधार मानकर किया गया है।

मेरठ जनपद के सम्पूर्ण क्षेत्र में वनों के अधीन क्षेत्रफल (सरकारी व गैर सरकारी वन क्षेत्र) में सकारात्मक वृद्धि हुई है, जो 149.68 प्रतिशत तक प्रदर्शित होती है। विकासखण्डवार अध्ययन करने पर यह पाया गया है कि सर्वाधिक धनात्मक वृद्धि माछरा व दौराला विकासखण्डों में पायी जाती है जो क्रमशः -25.27 व -61.72 प्रतिशत प्रदर्शित होती है। कृषि के अयोग्य भूमि में (बंजर तथा अकृष्य भूमि) में कमी हुई है। इन उपभागों में क्रमशः -30.12 तथा -16.82 प्रतिशत की कमी प्रदर्शित हो रही है। दूसरी तरफ इस कमी का मुख्य कारण मेरठ जनपद के विभाजन के पश्चात कम प्रतिवेदित क्षेत्रफल है। विकासखण्डों में ऋणात्मक वृद्धि हस्तिनापुर विकासखण्ड में पायी जाती है जो 43.44 प्रतिशत प्रदर्शित हो रही है, जबकि शेष विकासखण्ड धनात्मक वृद्धि दौराला व मेरठ विकासखण्डों में हुई है जो क्रमशः 71.40 व 65.30 प्रतिशत प्रदर्शित होती है तथा निम्न वृद्धि दर किला परीक्षितगढ व जानी खुर्द विकासखण्डों में है जो क्रमशः 12.20 व 10.42 प्रतिशत प्रदर्शित होती है। कृष्येत्तर व्यर्थ भूमि में ऋणात्मक परिवर्तन होना स्वाभाविक है क्योंकि भूमि पर उच्च जनसंख्या भार एवं नवीन कृषि तकनीक के कारण अधिक भूमि खाली छोड़ना संभव नहीं है। इस प्रकार दिये गये वर्षों 1985 - 2006 के मध्य ऋणात्मक वृद्धि 60.01 प्रतिशत की वृद्धि हुई है। विकासखण्डों में केवल हस्तिनापुर विकासखण्ड की धनात्मक वृद्धि को प्रदर्शित करता हुआ दिखाई पड़ रहा है जबकि अन्य विकासखण्डों में कृष्येत्तर भूमि के क्षेत्रफल में ह्रास हुआ है। परती के अतिरिक्त अन्य अकृष्य भूमि के अन्तर्गत क्षेत्रफल में 201.01 प्रतिशत की वृद्धि हुई है। परती भूमि जिसमें वर्तमान व अन्य परती सम्मिलित है इसकी घटती हुई प्रवृत्ति प्रदर्शित हो रही है। इस वर्ग में औसतन 54.89 प्रतिशत की ऋणात्मक वृद्धि हुई है। जिसमें वर्तमान परती 47.45 प्रतिशत तथा अन्य परती में 65.68 प्रतिशत की कमी हुई है। विकासखण्ड सरधना में यह 38.19 प्रतिशत की धनात्मक वृद्धि को दर्शाती है।

फसलों के अधीन शुद्ध बोये गये क्षेत्रफल में 35.39 प्रतिशत की कमी भी दर्ज की गई है। इसका मुख्य कारीण मेरठ जनपद में विभाजन के साथ - साथ शुद्ध बोये गये क्षेत्रफल में कमी आई है क्योंकि वर्ष 1985 में शुद्ध बोया गया क्षेत्रफल 2933.93 हेक्टेयर था जो वर्ष 2006 में घटकर 1895.49 हेक्टेयर रह गया। सभी विकासखण्डों के विश्लेषण से यह स्पष्ट होता है कि रोहटा, रजपुरा व परीक्षितगढ में शुद्ध बोये गये क्षेत्रफल में धनात्मक वृद्धि क्रमशः 2.88, 1.23 व 7.60 प्रतिशत प्रदर्शित होती है जबकि शेष 9 विकासखण्डों में शुद्ध बोये गये क्षेत्रफल में कमी हुई है। एक बार से अधिक बोये गये क्षेत्रफल में भी कमी हुई है क्योंकि अध्ययन क्षेत्र में गन्ने की फसल को प्रमुख मुद्रादायिनी फसल होने के कारण अधिक महत्व दिया जा रहा है। एक बार से अधिक धनात्मक व ऋणात्मक वृद्धि खरखौदा व दौराला विकासखण्डों में पायी जाती है जो क्रमशः - 5.79 तथा - 61.75 प्रतिशत दर्ज की गई है।

निष्कर्ष :

अध्ययन क्षेत्र जनपद मेरठ में वर्ष 2005 में शुद्ध बोया गया क्षेत्रफल 189549 हेक्टेयर था जो कुल प्रतिवेदित क्षेत्र का 76.84 प्रतिशत है वहीं यह आगे आने वाले वर्षों में (2010-2015) में अनुमानित शुद्ध बोये गये क्षेत्रफल में कमी का ऑकलन किया गया है। इन वर्षों में अनुमानित क्षेत्रफल 188184 व 186881 हेक्टेयर है जो कुल प्रतिवेदित क्षेत्र का क्रमशः 68.60 व 48.74 प्रतिशत प्रदर्शित होता है। उपरोक्त सभी ऑकड़ों का अध्ययन करने पर यह

ज्ञात होता है कि वर्ष 1985 से 2006 के मध्य जनपद मेरठ में जनसंख्या के आँकड़ों का अध्ययन करने पर यह ज्ञात होता है कि वर्ष 1985 में नगरीय जनसंख्या में कुल जनसंख्या का प्रतिशत 12.24 था जो वर्ष 2006 में बढ़कर 47.39 प्रतिशत हो गया। इस आँकड़ों के आधार पर हम स्पष्ट रूप से कह सकते हैं कि वर्ष 1985 से 2006 के मध्य ग्रामीण एवं नगरीय जनसंख्या प्रतिशत में लगभग दोगुनी की वृद्धि हुई है। साथ ही नगरीय जनसंख्या की वृद्धि के कारण ही ग्रामीण कृषि क्षेत्रों पर भी स्पष्ट रूप से दिखाई पड़ रहा है।

सन्दर्भ ग्रन्थ सूची:

1. चादी डी०एन० एण्ड ऐडेन जे०बी०:- ज्यालॉजी स्ट्रक्चर ऑफ नार्थन इण्डिया "श्री पब्लिकेशन हाऊस-देहली-1979
2. स्वेरा ई० (1964):- मारुएल ऑफ ज्यॉलाजी ऑफ इण्डिया एण्ड वर्मा- नेशन ज्योग्राफर वाल्यूम-21
3. वाडिया डी०एन० (1929):- मैनोरीज ऑफ दी ज्यॉलाजीकल सर्वे ऑफ इण्डिया- वाल्यूम-2
4. सिंह आर०एल० (1952):- न्यू पर्सपेक्टिवस इन एग्रीकल्चरल ज्याग्राफी, नेशनल पब्लिकेशन नई दिल्ली।
5. ओल्डहम आर०डी० (1952):- दी डीय बोर्डडिंग एट लखनऊ रिकार्ड ऑफ दी ज्योलॉजिकल सर्वे ऑफ इण्डिया।
6. वार्कर जी०टी० (1914):- टेबिल ऑफ रिलेटिव ह्यूमिडिटी मेमर्स ऑफ दि इण्डिया मेट्रोलॉजिकल डिपार्टमेन्ट देहली।
7. सिंह जसवीर एण्ड द्विल्लन एस०एस० (1994):- एग्रीकल्चरल ज्याग्राफी तारा एम०सी० ग्रोवहिल पब्लिकेशन क० लि० नई दिल्ली।
8. जोशी ई०जी० (1965):- उत्तर-प्रदेश डिस्ट्रिक्ट गजेटियर मेरठ गर्वमेन्ट प्रेस इलाहाबाद यू०पी०
9. ब्लैडफोर्ड एच०एफ० (1989):- क्लाइमेन्ट एण्ड वैदर ऑफ, इण्डिया, शिलांग एण्ड वर्मा लन्दन पब्लिकेशन।
10. रफी अल्लाह एस०एम० (1986):- "दी ग्रोथ एण्ड डिस्ट्रीब्यूशन ऑफ पॉपुलेशन इन रिलेशन टू एग्रीकल्चरल रिसोर्स इन अपर गंगा-यमुना दो आब 1901-1951"
11. शर्मा जे०पी० (1983):- प्रयोगात्मक भूगोल" पृष्ठ सं०-340
12. मामोरिया सी०बी० (1982):- भारत का भूगोल" साहित्य भवन आगरा पृष्ठ सं०-246
13. नोविल आर०एच० (1922):- "ए गजेटियर ऑफ डिस्ट्रिक्ट मेरठ" पृष्ठ सं०- 2-5
14. स्पेट ओ०एच०के० (1967):- इण्डिया एण्ड पाकिस्तान लन्दन पब्लिकेशन पृष्ठ सं०- 250
15. भारत वार्षिक सन्दर्भ ग्रन्थ (1967):- प्रकाशन विभाग, सूचना मंत्रालय भारत सरकार पृष्ठ सं०- 46
16. द्विवार्था जी०टी० (1953):- 'ए केस फॉट पापुलेशन ज्याग्राफी वाल्यूम ऑफ दी एसोशिएशन ऑफ अमेरिकन ज्याग्राफर्स वाल्यूम-43
17. प्रोडेक्शन ईयर बुक (1968):- प्रोडेक्शन ईयर बुक 22 पृष्ठ- 395-397
18. फ्रेकलिन एस०एच० (1961):- दी पैटर्न-ऑफ ज्याग्राफी" वाल्यूम-32

4. मेरठ की पुस्तकालय संस्कृति : राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ का अध्ययन

शोधार्थी : विजयपाल सिंह,
इतिहास विभाग,
विज्ञान विभाग,
चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ।
मेरठ।

Mob. 8006644561
Email- vijayrana16698@gmail.com
professormuneshccsu@gmail.com

डॉ. मुनेश कुमार,
सहायक आचार्य, राजनीति

चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय,

Mob. 8273731770
Email-

सारांश

प्रस्तुत शोध पत्र मेरठ जनपद की पुस्तकालय संस्कृति का एक विवेचनात्मक अध्ययन प्रस्तुत करता है जिसमें विशेष रूप से राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ की भूमिका, संरचना, सेवाएँ एवं उपयोगिता पर ध्यान केंद्रित किया गया है। पुस्तकालय किसी भी समाज के बौद्धिक विकास का केंद्र होता है। शोध पत्र के अंतर्गत मेरठ के विश्वविद्यालयीय पुस्तकालयों, जिला पुस्तकालय, नगर निगम पुस्तकालय तथा निजी संस्थानों के पुस्तकालयों के विकास की ऐतिहासिक पृष्ठभूमि का सम्यक विश्लेषण किया गया है। विशेषतः राजा महेन्द्र प्रताप पुस्तकालय की भौतिक संरचना, ग्रंथ-संग्रह, डिजिटल संसाधनों, सेवाओं एवं विद्यार्थियों, शोधार्थियों, आचार्यों एवं पुस्तकालय स्टाफ के अनुभवों को आधार बनाकर पुस्तकालय की उपयोगिता का मूल्यांकन किया गया है। शोध कार्य हेतु गुणात्मक एवं विवरणात्मक पद्धतियों का प्रयोग किया गया है जिसमें प्राथमिक स्रोतों (साक्षात्कार, अवलोकन) तथा द्वितीयक स्रोतों (पुस्तकें, प्रतिवेदन, अभिलेखागार, वेबसाइट, दस्तावेज) से सूचनाएं संकलित की गई हैं। यह अध्ययन पुस्तकालय संस्कृति को सुदृढ़ करने हेतु सुझाव भी प्रस्तुत करता है जिससे डिजिटल युग में भी पुस्तकालयों की प्रासंगिकता बनी रहे।

मुख्य शब्द :- पुस्तकालय संस्कृति, राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय, डिजिटल संसाधन, पुस्तकालय सेवाएँ, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ।

भूमिका :- पुस्तकालय ज्ञान का भंडार होता है जहाँ विभिन्न विषयों पर पुस्तकें, पत्रिकाएँ, जर्नल्स और अन्य शैक्षिक सामग्री संग्रहित की जाती है। इसका उद्देश्य न केवल ज्ञान का संचार करना है अपितु समाज के बौद्धिक विकास में भी योगदान देना है। भारत में पुस्तकालय संस्कृति का इतिहास प्राचीन काल से जुड़ा हुआ है जहाँ नालंदा और तक्षशिला जैसे विश्वविद्यालयों में विशाल पुस्तकालयों का अस्तित्व था। मध्यकालीन भारत में ज्ञान के संरक्षण के हेतु की प्रमुख पुस्तकालय स्थापित किए गए जैसे महमूद गंवा, अकबर, और तंजावुर के राजा शरभोजी का पुस्तकालय। इनमें हजारों ग्रंथों का संग्रह था, जो धर्म, विज्ञान, साहित्य और कला से संबंधित थे। स्वतंत्रता प्राप्ति के बाद, पुस्तकालयों के विकास पर अधिक ध्यान दिया गया और इन्हें आधुनिक शैक्षिक संस्थानों में महत्वपूर्ण स्थान प्राप्त हुआ। मेरठ में पुस्तकालयों की भूमिका खासतौर पर शिक्षा के क्षेत्र में अत्यधिक महत्वपूर्ण रही है। यहाँ के विश्वविद्यालयों, महाविद्यालयों और सार्वजनिक पुस्तकालयों ने न केवल विद्यार्थियों को ज्ञानार्जन में मदद की बल्कि प्रतियोगी परीक्षाओं और शोध कार्यों के लिए भी एक आवश्यक संसाधन का कार्य किया। शोध विषय के रूप में "राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय, मेरठ" का अध्ययन इस संदर्भ में प्रासंगिक है क्योंकि यह पुस्तकालय न केवल मेरठ बल्कि उत्तर प्रदेश के शैक्षिक, बौद्धिक एवं अकादमिक परिदृश्य में एक महत्वपूर्ण भूमिका निभाता है।

शोध का उद्देश्य :- इस शोध का मुख्य उद्देश्य मेरठ की पुस्तकालय संस्कृति का गहन अध्ययन करना है ताकि इसके विभिन्न पहलुओं को समझा जा सके। इस शोध पत्र में विशेष रूप से राजा महेन्द्र प्रताप पुस्तकालय की संरचना, संसाधन, सेवाएँ और उपयोगकर्ता अनुभवों का विश्लेषण किया जाएगा। इसके माध्यम से यह जानने का प्रयास किया जाएगा कि यह पुस्तकालय विद्यार्थियों, शोधार्थियों और शिक्षकों के लिए किस प्रकार से उपयोगी है और उनके शैक्षिक एवं शोध कार्यों में किस हद तक सहायक है। इस शोध का एक अन्य उद्देश्य पुस्तकालय की उपलब्ध सेवाओं और संसाधनों का मूल्यांकन करना है ताकि वर्तमान अकादमिक आवश्यकताओं के आलोक में पुस्तकालय में उपलब्ध सुविधाओं और संसाधनों में अभिवृद्धि अथवा परिवर्तनों को चिन्हांकित किया जा सके। अंत में, पुस्तकालय संस्कृति को और अधिक सशक्त और समावेशी बनाने हेतु सुधारात्मक सुझाव भी प्रदान किए गए हैं ताकि यह डिजिटल युग में भी अपनी प्रासंगिकता बनाए रख सके और समाज के सभी वर्गों के लिए उपयोगी सिद्ध हो सके।

पुस्तकालय संस्कृति-परिचय :- पुस्तकालय संस्कृति का तात्पर्य उस सामाजिक, बौद्धिक और शैक्षिक वातावरण से है जिसमें ज्ञान के आदान-प्रदान, पठन-पाठन और शोध की परंपरा पुस्तकालयों के माध्यम से विकसित होती है। पुस्तकालय संस्कृति व्यक्ति को विचारशील बनाती है, उसकी जिज्ञासाओं को दिशा देती है और समाज को शिक्षित करने में महत्वपूर्ण भूमिका निभाती है। पुस्तकालय केवल पुस्तकों का भंडार नहीं होता बल्कि एक ऐसा स्थान होता है जहाँ पाठक ज्ञान की खोज में आत्मचिंतन, संवाद और अध्ययन करते हैं। जब एक समाज में पुस्तकालयों का उपयोग नियमित रूप से होने लगे और वहाँ अध्ययन शीलता की आदत विकसित हो जाए, तो वह समाज बौद्धिक दृष्टि से समृद्ध कहलाता है। पुस्तकालय संस्कृति न केवल औपचारिक शिक्षा को सहयोग देती है, बल्कि आजीवन सीखने की प्रक्रिया को भी प्रोत्साहित करती है। यह संस्कृति एक पीढ़ी से दूसरी पीढ़ी तक ज्ञान के हस्तांतरण का माध्यम बनती है। आधुनिक तकनीकी युग में भी पुस्तकालयों ने स्वयं को डिजिटल रूप में परिवर्तित करके इस संस्कृति को बनाए रखा है। ई-पुस्तकालय, ऑनलाइन डेटाबेस और डिजिटलीकरण ने पुस्तकालय संस्कृति को व्यापक और समसामयिक बनाया है। अतः पुस्तकालय संस्कृति एक समाज की शैक्षिक चेतना का दर्पण है जो समयानुसार विकसित और समृद्ध होती रहती है।

भारत में पुस्तकालयों का महत्व :- भारत में पुस्तकालयों का इतिहास अत्यंत प्राचीन और समृद्ध है। वेदों की रचना से लेकर नालंदा, तक्षशिला, विक्रमशिला जैसे विश्वविख्यात विश्वविद्यालयों में विशाल पुस्तकालयों की स्थापना इस बात का प्रमाण है कि भारत में ज्ञान को संग्रहित करने और उसे संरक्षित रखने की परंपरा प्राचीन काल से रही है। विशेष रूप से नालंदा विश्वविद्यालय का पुस्तकालय "धर्मगंज" इतना विशाल था कि उसमें लाखों पांडुलिपियाँ संग्रहीत थीं, और उसे जलने में महीनों लग गए थे। मुगल काल में भी पुस्तकालयों की उन्नति हुई, जैसे अकबर द्वारा स्थापित पुस्तकालयों में बहुभाषिक ग्रंथों का संग्रह किया गया। ब्रिटिश काल में सार्वजनिक पुस्तकालयों की नींव पड़ी, जैसे कोलकाता का राष्ट्रीय पुस्तकालय। इस तरह, भारत में पुस्तकालयों का इतिहास विविध और ज्ञानसम्पन्न रहा है। आधुनिक भारत में पुस्तकालयों का स्वरूप और महत्व दोनों ही परिवर्तित हो चुके हैं। अब पुस्तकालय केवल पुस्तकों तक सीमित नहीं हैं, बल्कि वे डिजिटल संसाधनों, ई-जर्नल्स, और ऑनलाइन डेटाबेस से युक्त हो चुके हैं। सूचना के इस युग में पुस्तकालय शिक्षा, शोध और नवाचार का केंद्र बन चुके हैं। विश्वविद्यालयों में शोध के लिए विशेष पुस्तकालयों की स्थापना की जाती है जो छात्रों और शोधार्थियों के लिए अत्यंत उपयोगी होते हैं। राष्ट्रीय ज्ञान आयोग और अन्य संस्थाएं भारत में पुस्तकालयों के डिजिटलीकरण और आधुनिकीकरण को बढ़ावा दे रही हैं। आज का पुस्तकालय केवल पुस्तक संग्रहण का स्थान नहीं, बल्कि यह ज्ञान-विनिमय, रचनात्मकता और नवाचार का जीवंत केंद्र है।

मेरठ की पुस्तकालय संस्कृति का ऐतिहासिक परिप्रेक्ष्य :- मेरठ की पुस्तकालय संस्कृति का विकास समय के साथ-साथ हुआ है और इसके विभिन्न प्रकार के पुस्तकालयों ने शैक्षिक, सामाजिक और सांस्कृतिक जीवन में महत्वपूर्ण योगदान दिया है। नगर निगम पुस्तकालय ने प्रारंभिक दौर में नगर के नागरिकों को पुस्तकालय सेवाएँ प्रदान कीं, जहाँ विभिन्न शैक्षिक और साहित्यिक पुस्तकें उपलब्ध थीं। इस पुस्तकालय का उद्देश्य नगरवासियों को ज्ञानवर्धन और पठन-पाठन के अवसर प्रदान करना था। इसके बाद, निजी संस्थानों के पुस्तकालयों का योगदान बढ़ा, जहाँ विभिन्न शैक्षिक संस्थाओं, जैसे स्कूलों और कॉलेजों में पुस्तकालय स्थापित किए गए। ये पुस्तकालय विशेष रूप से अपने छात्रों और शिक्षकों के लिए एक समृद्ध शैक्षिक संसाधन बने।

तिलक लाइब्रेरी, जो मेरठ के घंटाघर क्षेत्र स्थित टाउन हॉल परिसर में स्थित है, शहर के सबसे पुरानी और ऐतिहासिक पुस्तकालयों में से एक है। यह पुस्तकालय पहले ब्रिटिश शासनकाल में "लायल लाइब्रेरी" के नाम से जानी जाती थी, लेकिन स्वतंत्रता संग्राम के बाद इसे लोकमान्य बाल गंगाधर तिलक के सम्मान में "तिलक लाइब्रेरी" नाम दिया गया। यह पुस्तकालय साहित्य, इतिहास, दर्शन और समाजशास्त्र जैसी विभिन्न विधाओं की लगभग 45,000 से अधिक पुस्तकों को अपने अंदर समेटे हुए है। तिलक लाइब्रेरी केवल पठन-पाठन का केंद्र नहीं, बल्कि विचारों के आदान-प्रदान और बौद्धिक विमर्श की ऐतिहासिक भूमि भी रही है। इसे आधुनिक डिजिटल सुविधाओं से भी सुसज्जित किया जा रहा है, जिससे यह आने वाली पीढ़ियों के लिए और भी उपयोगी सिद्ध होगी। जिला पुस्तकालय ने मेरठ में सार्वजनिक पुस्तकालयों की एक नई परंपरा स्थापित की। यह पुस्तकालय आम जनता के लिए खुला रहता था और विभिन्न सामाजिक वर्गों के लिए उपयोगी शैक्षिक सामग्री उपलब्ध कराता था। इसके अलावा, विश्वविद्यालयीय पुस्तकालयों का विकास मेरठ में उच्च शिक्षा के प्रसार के साथ हुआ। राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय का एक प्रमुख उदाहरण है, जिसने न केवल शैक्षिक दृष्टि से विश्वविद्यालय को समृद्ध किया, बल्कि पुस्तकालय सेवाओं को आधुनिक तकनीकों और डिजिटल संसाधनों से सुसज्जित किया। मेरठ के विश्वविद्यालयीय पुस्तकालयों ने पुस्तकालय विज्ञान के क्षेत्र में एक नया आयाम स्थापित किया है और अब ये विश्वविद्यालय के छात्रों, शोधकर्ताओं और शिक्षकों के लिए आवश्यक ज्ञान का भंडार बने हुए हैं।

मेरठ के प्रमुख पुस्तकालयों की सूची

क्र०	पुस्तकालयों के नाम	स्थान	स्थापना वर्ष	टिप्पणी
1.	राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय	चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय मेरठ	1968	तीन मंजिला भवन में 750 पाठकों की क्षमताय आधुनिक सुविधाओं से युक्त।
2.	मेरठ कॉलेज केन्द्रीय पुस्तकालय	मेरठ कॉलेज परिसर	1892	छात्रों और शोधार्थियों के लिए संसाधनों का केंद्र।
3.	तिलक पुस्तकालय	घंटाघर मेरठ	1886	ऐतिहासिक सार्वजनिक पुस्तकालय वर्तमान में बुनियादी सुविधाओं की कमी।
4.	राजकीय जिला पुस्तकालय मेरठ	मेरठ शहर	1956	उत्तर प्रदेश सरकार द्वारा संचालित संसाधनों को अद्यतन किया जाना आवश्यक।
5.	कैट पुस्तकालय	मेरठ कैट क्षेत्र	1803	सैन्य क्षेत्र में स्थित सीमित संसाधनों के साथ।
6.	राजकीय स्वतंत्रता संग्राम संग्रहालय पुस्तकालय	मेरठ शहर	1997	स्वतंत्रता संग्राम से संबंधित संग्रह पुस्तकों का अद्यतन आवश्यक।
7.	नानकचंद एंग्लो संस्कृत कॉलेज पुस्तकालय मेरठ	कॉलेज परिसर	1952	यह पुस्तकालय शिवाथेना एवं शोधकर्ताओं के लिए अध्ययन और अनुसंधान का महत्वपूर्ण केंद्र है।
8.	शहीद मंगल पांडे राजकीय महिला स्नातकोत्तर महाविद्यालय पुस्तकालय	कॉलेज के नए पीजी ब्लॉक में स्थित	2020	व्यपकस्फ्ड सॉफ्टवेयर से ई-लाइब्रेरी और विषयवार सुव्यवस्थित संग्रह जैसी विशेष सुविधाएं उपलब्ध हैं।
9.	देवनागरी कॉलेज, मेरठ केन्द्रीय पुस्तकालय	कॉलेज परिसर	1958	वर् 290 सॉफ्टवेयर जैसी विशेष सुविधाएं उपलब्ध
10.	इस्माइल नेशनल महिला पी.जी. कॉलेज, मेरठ केन्द्रीय पुस्तकालय	कॉलेज परिसर	1962	केवल महिलाओं के लिए सुबह 9:00 बजे से शाम 5:00 बजे तक एवं पूर्णतः कंप्यूटरीकृत
11.	डॉ. के.जी. मित्तल पुस्तकालय	रघुनाथ गल्ली पोस्ट ग्रेजुएट कॉलेज, मेरठ	1956	यह पुस्तकालय एक समर्पित अध्ययन केंद्र है।

राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय का विस्तृत अध्ययन:— इस केन्द्रीय पुस्तकालय का नाम राजा महेन्द्र प्रताप के नाम पर रखा गया है, जो भारत की प्रथम निर्वासित (अप्रवासी) सरकार के राष्ट्रपति थे। 1 दिसंबर 1915 को काबुल में स्थापित इस सरकार ने भारत की स्वतंत्रता के लिए वैश्विक मंच पर संघर्ष का नया अध्याय आरंभ किया था। राजा महेन्द्र प्रताप के राष्ट्रभक्ति, स्वतंत्रता संग्राम और शिक्षा के प्रति योगदान को अमर करने हेतु विश्वविद्यालय ने इस पुस्तकालय को उनके नाम से अभिषिक्त किया। पुस्तकालय के बाहर दायीं ओर उनकी एक सुंदर मूर्ति भी स्थापित की गई है। इस पुस्तकालय की स्थापना विश्वविद्यालय में उच्च शैक्षिक उद्देश्यों की पूर्ति के लिए की गई थी। यह पुस्तकालय छात्रों, शोधार्थियों और शिक्षकों के लिए एक समृद्ध संसाधन केंद्र के रूप में कार्य करता है। पुस्तकालय का भवन अत्याधुनिक वास्तुकला से सुसज्जित है, जिसमें विभिन्न अनुभागों का समावेश है।

ऐतिहासिक स्थापना और बौद्धिक केंद्र के रूप में विकास :— राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ की स्थापना 1968 ई० में विश्वविद्यालय के उच्च शिक्षण, अनुसंधान और ज्ञानवर्धन की आवश्यकताओं की पूर्ति हेतु की गई थी। यह पुस्तकालय अपने आरंभ से ही विद्यार्थियों, शोधार्थियों एवं आचार्यों के लिए एक सशक्त बौद्धिक केंद्र के रूप में विकसित होता रहा है। इसकी वास्तुकला आधुनिक शैली पर आधारित है जिसमें ग्रंथागार, ई—लाइब्रेरी, संदर्भ अनुभाग, आध्यात्मिक ग्रंथ अनुभाग, अध्ययन क्षेत्र, शोध अनुभाग, दिव्यंगजन अनुभाग, ब्रेल लिपि अनुभाग आदि का समावेश है। महिलाओं के लिए अलग से अध्ययन के लिए वातानुकूलित अनुभाग बनाया गया है। यहाँ न केवल परंपरागत पुस्तकों का विशाल भंडार उपलब्ध है बल्कि डिजिटल संसाधनों की सुलभता इसे तकनीकी रूप से भी सुदृढ़ बनाती है। यह पुस्तकालय केवल ज्ञान के संग्रहण का केंद्र नहीं, बल्कि एक विचारशील, अनुसंधानपरक एवं शैक्षिक संस्कृति का संवाहक है।

संग्रह, सेवा और तकनीकी संसाधनों की विविधता :— राजा महेन्द्र प्रताप पुस्तकालय का संग्रह इसे अन्य विश्वविद्यालयों की तुलना में विशिष्ट बनाता है। पुस्तकालय में कुल 1,77,695 पुस्तकें, 12,650 ई—पुस्तकें, 8,000 से अधिक जर्नल्स, और 28 से अधिक डाटाबेस—स्रोत शामिल हैं। विशेष रूप से, रेयर कलेक्शन और 240 से अधिक एन्साइक्लोपीडिया इस पुस्तकालय को शोध के लिए समृद्ध बनाते हैं। शोधगंगा पोर्टल पर 3,500 से अधिक शोध प्रबन्ध अपलोड किए गए हैं जो इसकी अकादमिक उपयोगिता को और भी गहन बनाते हैं। पुस्तकालय की ई—लाइब्रेरी और रिमोट एक्सेस प्रणाली छात्रों और शोधकर्ताओं को किसी भी स्थान से डिजिटल संसाधनों का उपयोग करने की सुविधा देती है, जिससे यह डिजिटल शिक्षा के युग में अत्यंत सशक्त माध्यम बन चुका है।

कार्यप्रणाली, उपयोगकर्ता सेवाएँ एवं तकनीकी नवाचार :— पुस्तकालय की कार्यप्रणाली पूर्णतः स्वचालित है जहाँ SOUL सॉफ्टवेयर के माध्यम से पठन, निर्गमन, और खोज प्रणाली क्रियाशील है। RFID एवं Kiosk तकनीक द्वारा सुचारु पुस्तक निर्गमन व्यवस्था लागू की गई है, जो उत्तर प्रदेश के विश्वविद्यालयों में एकमात्र उदाहरण है। इसके अतिरिक्त, OCS प्रणाली द्वारा पुस्तक सूचीकरण अत्यंत सुव्यवस्थित रूप से किया जाता है। पुस्तकालय में OPAC सुविधा के माध्यम से पुस्तकें आरक्षित करने व खोजने की सुविधा है। उपयोगकर्ता सेवाओं की बात करें तो संदर्भ सेवा, फोटोकॉपी, इंटरनेट, ई—जर्नल्स तक पहुँच, और विभागीय पुस्तकालयों को समर्थन जैसी सुविधाएँ सुलभ कराई जाती हैं। शोध की गुणवत्ता सुनिश्चित करने हेतु प्लैगरिज़्म जांच प्रणाली (Plagiarism Detection System) को प्रभावी रूप से लागू किया गया है। यह प्रणाली विश्वविद्यालय अनुदान आयोग द्वारा निर्धारित मानकों के अनुरूप कार्य करती है और शोध कार्यों की मौलिकता सुनिश्चित करने में सहायक है। विश्वविद्यालय परिसर में पंजीकृत शोधार्थियों और शिक्षकों के लिए यह सेवा निशुल्क उपलब्ध कराई जाती है, जिससे वे अपने शोध प्रबंध, शोध लेख या अन्य शैक्षणिक कार्यों को

औपचारिक रूप से जांचकर अकादमिक ईमानदारी बनाए रख सकें। INFLIBNET और DELNET की सदस्यता इसे राष्ट्रीय स्तर पर सूचना संसाधनों से जोड़ती है।

अध्ययन परिवेश और पठन व्यवस्था :- राजा महेन्द्र प्रताप पुस्तकालय में शांत, अनुशासित और आधुनिक अध्ययन परिवेश उपलब्ध है, जहाँ छात्रों के लिए 750 से अधिक वातानुकूलित अध्ययन स्थान सुनिश्चित किए गए हैं। बालक, बालिका, शोधार्थी एवं सामान्य छात्रों के लिए अलग-अलग पठन कक्ष उपलब्ध हैं। पठन समय प्रातः 8 बजे से रात्रि 10 बजे तक सुनिश्चित किया गया है जबकि अवकाश के दिनों में सुबह 8 बजे से शाम 8 बजे तक खुला राहत है, जो पाठकों को अधिकतम अध्ययन समय प्रदान करता है। यह पुस्तकालय 1972 से अब तक के मुख्य समाचार पत्रों का एकमात्र संग्रहकेंद्र भी है जो इसे ऐतिहासिक महत्त्व प्रदान करता है। निष्कर्षतः, यह पुस्तकालय केवल एक ग्रंथागार नहीं बल्कि विश्वविद्यालय की अकादमिक रीढ़ है, जो शिक्षण, अनुसंधान, नवाचार एवं तकनीकी समावेशन के माध्यम से चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय के समग्र बौद्धिक विकास का ध्येय-संस्थान बन चुका है।

छात्रों, शिक्षकों और शोधार्थियों से लिए गए साक्षात्कार :- राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ के विभिन्न उपयोगकर्ताओं से लिए गए साक्षात्कारों से प्राप्त प्रतिक्रियाओं से यह स्पष्ट होता है कि पुस्तकालय विश्वविद्यालय समुदाय के लिए एक महत्वपूर्ण शैक्षिक केंद्र है। प्रोफेसर जमाल अहमद सिद्दीकी (उप पुस्तकालयाध्यक्ष) ने पुस्तकालय की संरचना, डिजिटल संसाधनों और सेवाओं की विस्तारपूर्वक जानकारी दी, वहीं डॉ. मुनेश कुमार, सहायक आचार्य, राजनीति विज्ञान ने शोध और अध्यापन में पुस्तकालय की उपयोगिता को रेखांकित किया। आपने बताया कि पुस्तकालय केवल पुस्तकों का संग्रह नहीं अपितु व्यक्तित्व का प्रस्फुटन केंद्र होते हैं। अनौपचारिक वार्ता में आपने साझा किया कि पुस्तकालय से न केवल ज्ञान अपितु अच्छी अकादमिक मित्रताएं, आजीवन संबंध, लैंगिक संवेदनशीलता, समूह भावना, वैचारिक प्रखरता और नवोन्मेष, जीवन दृष्टि और सार्वजनिक संसाधनों के प्रति अपनत्व, सहयोग शीलता, नेतृत्व, अंतरपीढ़ी सामंजस्य, अग्रजों और अनुजों के साथ तादात्म्य, अपने पूर्ववर्तियों के वैचारिक निर्मिति में दृष्टिपात करने का अवसर और अपने आचार्यों से सहयोग के मौके प्रदान करते हैं। शोधार्थियों — श्री रजनीश कुमार, सुश्री मनीषा कनोजिया और उषा ने पुस्तकालय में नवीनतम शोध पत्रिकाओं की उपलब्धता और ई-संसाधनों की गुणवत्ता की सराहना की, साथ ही तकनीकी पहुँच की कुछ सीमाओं की ओर भी संकेत किया। स्नातक छात्र मोहित सैनी और परास्नातक छात्र धीर सिंह ने प्रतियोगी परीक्षाओं की तैयारी हेतु पुस्तकालय को उपयोगी बताया, परन्तु प्रतियोगी सामग्री की मात्रा में वृद्धि की आवश्यकता पर बल दिया। छात्रों ने पुस्तकालय के शांतिपूर्ण वातावरण की प्रशंसा की, जबकि कुछ ने समय-सारिणी में लचीलापन और समूह अध्ययन हेतु पृथक व्यवस्था की मांग रखी। कुल मिलाकर, साक्षात्कारों से ज्ञात होता है कि पुस्तकालय की सेवाएँ उपयोगकर्ताओं की अपेक्षाओं पर खरा उतर रही हैं, फिर भी कुछ सुधारात्मक पहलुओं पर ध्यान देने की आवश्यकता है, जिससे यह और अधिक प्रभावशाली एवं समावेशी बन सके।

मुख्य चुनौतियाँ :- राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ को अपनी सेवाओं के प्रभावी संचालन में अनेक जटिल एवं संरचनात्मक चुनौतियों का सामना करना पड़ता है, जो इसकी कार्यक्षमता तथा उपयोगकर्ता संतुष्टि को प्रत्यक्ष रूप से प्रभावित करती हैं। सर्वप्रथम, पुस्तकों का अद्यतन न होना एक गंभीर समस्या है, जहाँ सीमित बजट और संसाधनों की अनुपलब्धता के कारण कई विषयों में नवीनतम शोध साहित्य, संदर्भ ग्रंथों और पाठ्य सामग्री की उपलब्धता बाधित होती है। साथ ही, ई-संसाधनों की सीमितता भी एक महत्वपूर्ण चुनौती बनकर उभरती है। यद्यपि पुस्तकालय UGC-INFONET और DELNET जैसे राष्ट्रीय शैक्षिक नेटवर्कों से जुड़ा हुआ है, तथापि तकनीकी जटिलताओं, संसाधनों की विविधता के अभाव, तथा तकनीकी स्टाफ की कमी के कारण इनका प्रभावी उपयोग सुनिश्चित नहीं हो पाता। इसके अतिरिक्त, ई-संसाधनों के प्रति

जागरूकता की कमी के कारण भी छात्र और शोधार्थी इन आधुनिक सुविधाओं का समुचित लाभ नहीं उठा पाते।

दूसरे स्तर पर, पुस्तकालय की भौतिक एवं बुनियादी संरचना से संबंधित समस्याएँ भी अत्यंत गंभीर हैं। विद्यार्थियों की संख्या की तुलना में अध्ययन हेतु सीटों की उपलब्धता अपर्याप्त है, जिससे विशेषकर परीक्षा कालीन अवधि में पठन व्यवस्था प्रभावित होती है। कुछ मामलों में गैर-पंजीकृत छात्रों का पुस्तकालय में अनधिकृत प्रवेश भी अव्यवस्था को जन्म देता है। इसके अतिरिक्त, शौचालयों की स्वच्छता की स्थिति संतोषजनक नहीं है, तथा स्वच्छ पेयजल की नियमित उपलब्धता भी बाधित रहती है। इंटरनेट कनेक्टिविटी की अनियमितता एवं ई-लाइब्रेरी में अब भी पुराने कंप्यूटर सिस्टम्स का प्रयोग आधुनिक डिजिटल आवश्यकताओं को पूरा करने में असमर्थ है। पाठकों द्वारा उपयोग किए जा रहे फर्नीचर की डिजाइन और आकार शारीरिक दृष्टिकोण से उपयुक्त नहीं हैं, जिसके कारण छात्रों की शारीरिक मुद्राएँ प्रभावित हो रही हैं। अनेक अनुसंधानों से यह स्पष्ट हुआ है कि यदि फर्नीचर का आकार छात्रों की शारीरिक संरचना के अनुरूप नहीं होता, तो इससे मांसपेशियों में तनाव, थकान और अन्य शारीरिक समस्याएँ उत्पन्न हो सकती हैं। इन चुनौतियों के बावजूद, पुस्तकालय प्रशासन सुधारात्मक उपायों की दिशा में निरंतर प्रयासरत है, जिससे पुस्तकालय की सेवाओं को अधिक सुलभ, अद्यतन और उपयोगकर्ता-केंद्रित बनाया जा सके।

संभावनाएँ और सुझाव :- राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय (CCSU), मेरठ के समग्र विकास हेतु अनेक संभावनाएँ विद्यमान हैं, जिन्हें सुव्यवस्थित ढंग से क्रियान्वित कर पुस्तकालय की कार्यक्षमता और उपयोगिता में गुणात्मक सुधार लाया जा सकता है। सर्वप्रथम डिजिटल संसाधनों के विस्तार की दिशा में ठोस कदम उठाना आवश्यक है, जिससे विद्यार्थियों और शोधार्थियों को ऑनलाइन जर्नल, डेटाबेस, ई-बुक्स तथा अन्य इलेक्ट्रॉनिक सामग्री की निर्बाध उपलब्धता सुनिश्चित हो सके। इसके साथ ही पुस्तक क्रय नीति का यथासमय अद्यतन कर नवीनतम पाठ्यक्रमों एवं शोध विषयों से सम्बद्ध पुस्तकों को संग्रह में सम्मिलित किया जाना चाहिए। पुस्तकालय उपयोगकर्ताओं के बीच ई-संसाधनों के प्रति जागरूकता बढ़ाने एवं उनका प्रभावी उपयोग सुनिश्चित करने के लिए नियमित प्रशिक्षण एवं सूचना सत्र आयोजित किए जाने चाहिए। राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ में प्रयुक्त फर्नीचर की संरचना छात्रों की शारीरिक आवश्यकताओं के अनुरूप नहीं प्रतीत होती, जिससे उनकी शारीरिक मुद्राओं पर प्रतिकूल प्रभाव पड़ता है। शोध के अनुसार, कुर्सी की ऊँचाई लगभग 44 सेमी, गहराई 42 सेमी और चौड़ाई 42.15 सेमी होनी चाहिए ताकि छात्र सहजता से बैठ सकें और उनके पैरों व रीढ़ पर अनावश्यक दबाव न पड़े। इसी प्रकार, डेस्क की ऊँचाई बैठने की अवस्था में कोहनी की ऊँचाई के अनुसार 19 से 29 सेमी, लंबाई 51 सेमी तथा चौड़ाई 65 सेमी होनी चाहिए, जिससे लेखन व अध्ययन कार्य में सुविधा हो और कंधों व हाथों में तनाव न हो। यदि पुस्तकालय फर्नीचर का आकार इन वैज्ञानिक मापदंडों पर आधारित हो, तो न केवल छात्रों की शारीरिक मुद्राएँ बेहतर होंगी, बल्कि उनकी एकाग्रता, पढ़ाई की अवधि और समग्र उत्पादकता में भी वृद्धि होगी। अतः पुस्तकालय फर्नीचर का पुनर्संरचना एवं मानकीकरण आवश्यक है ताकि यह छात्रों के शरीर विज्ञान के अनुरूप बन सके।

इसी क्रम में, भौतिक संरचना के उन्नयन की दिशा में भी महत्वपूर्ण सुधारात्मक पहल आवश्यक है। छात्रों की संख्या को ध्यान में रखते हुए अध्ययन कक्षों में बैठने की समुचित व्यवस्था तथा आधुनिक फर्नीचर की आपूर्ति अनिवार्य है। शिक्षकों और शोध निदेशकों के लिए पृथक अध्ययन क्षेत्र की व्यवस्था उन्हें शांति और एकाग्रता से कार्य करने में सहायता प्रदान कर सकती है। साथ ही, गैर-पंजीकृत छात्रों के अनधिकृत प्रवेश को रोकने के लिए समुचित निगरानी और पहचान आधारित प्रणाली लागू की जानी चाहिए। प्रत्येक मंज़िल पर स्वच्छ पेयजल की उपलब्धता तथा शौचालयों की नियमित सफाई सुनिश्चित की जाए, जिससे उपयोगकर्ताओं को बेहतर आधारभूत सुविधाएँ प्राप्त हो सकें। इन पहलुओं पर संगठित रूप से

कार्य कर पुस्तकालय को एक आधुनिक, तकनीकी रूप से सक्षम और उपयोगकर्ता-केंद्रित संस्थान के रूप में विकसित किया जा सकता है।

निष्कर्ष :- राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ शिक्षा और शोध के क्षेत्र में महत्वपूर्ण योगदान प्रदान कर रहा है। पुस्तकालय न केवल छात्रों और शोधकर्ताओं के लिए जानकारी के स्रोत के रूप में कार्य करता है, बल्कि यह एक शैक्षिक और शोध वातावरण को प्रोत्साहित करता है, जो ज्ञान के विस्तार में सहायक है। राजा महेन्द्र प्रताप पुस्तकालय की विशेष महत्ता इस बात में निहित है कि यह शिक्षा की गुणवत्ता को बेहतर बनाने के साथ-साथ शोध कार्यों में भी सहायक सिद्ध हो रहा है। हालांकि, पुस्तकालय संस्कृति को और अधिक जीवंत बनाने की आवश्यकता है, ताकि यह आधुनिक तकनीकी और शैक्षिक परिवर्तनों के साथ तालमेल बनाए रख सके। यदि इन सुधारों पर ध्यान दिया जाए, तो पुस्तकालय अपनी भूमिका को और अधिक प्रभावशाली तरीके से निभा सकेगा और विश्वविद्यालय के शैक्षिक एवं शोध उद्देश्यों को नई ऊँचाइयों तक पहुँचाने में सक्षम होगा।

राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ न केवल एक अध्ययन केंद्र रहा है, बल्कि यह बौद्धिक विकास, शोधपरक चिंतन और शैक्षणिक उत्कृष्टता का प्रतीक भी बन चुका है। इस पुस्तकालय ने न जाने कितने विद्यार्थियों, शोधार्थियों और प्राध्यापकों को उनके शैक्षणिक जीवन में दिशा प्रदान की है। माननीया कुलपति महोदय संगीता शुक्ला जी निर्देशन में यह पुस्तकालय निरंतर अपने शिखर को छू रहा है जिसने विश्वविद्यालय को नेक ऐं प्लस प्लस दिलवाने में महत्वपूर्ण भूमिका निभाई है। यह पुस्तकालय न केवल पुस्तकों का संग्रह है, बल्कि यह विचारों, विमर्शों और ज्ञान के आदान-प्रदान का एक जीवंत मंच रहा है। इस पुस्तकालय में अध्ययन करके कई महान शिक्षाविद आज देश के विभिन्न महत्वपूर्ण शैक्षणिक एवं प्रशासनिक पदों पर अपनी सेवाएं दे रहे हैं। जैसे—प्रोफेसर संजीव कुमार शर्मा, जो कि राजनीति विज्ञान विभाग के अध्यक्ष (चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ) रह चुके हैं और मोतीहारी, बिहार स्थित सेंट्रल यूनिवर्सिटी के कुलपति के रूप में भी सेवा दे चुके हैं, उन्होंने भी अपने विद्यार्थी जीवन में इस पुस्तकालय में अध्ययन किया। प्रोफेसर कृष्ण कांत शर्मा, वर्तमान में इतिहास विभागाध्यक्ष, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ, जिन्होंने शोध और शिक्षण के विभिन्न चरणों में इस पुस्तकालय का लाभ उठाया और आज एक प्रमुख इतिहासकार के रूप में स्थापित हैं। श्री राजकुमार, जो आज एम.एम. पी.जी. कॉलेज, मोदीनगर में राजनीति विज्ञान विभाग में सहायक आचार्य के रूप में कार्यरत हैं, उन्होंने भी इसी पुस्तकालय में अध्ययन किया और अपनी शैक्षणिक यात्रा को दिशा दी। डॉ. मुनेश कुमार, जिन्होंने राजनीति विज्ञान विभाग, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ में पी.जी., एम.फिल. एवं पीएच.डी. के दौरान इस पुस्तकालय में निरंतर अध्ययन किया, आज वहीं सहायक आचार्य के रूप में अध्यापनरत हैं और शैक्षणिक योगदान दे रहे हैं।

इन विभूतियों का उदाहरण इस बात का प्रमाण है कि राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय ने न केवल पुस्तकीय ज्ञान दिया, बल्कि एक ऐसी विचारशील एवं विद्वान पीढ़ी को तैयार किया जो आज विभिन्न स्तरों पर राष्ट्र निर्माण में अपना योगदान दे रही है। इस शोध से यह स्पष्ट होता है कि मेरठ की पुस्तकालय संस्कृति, विशेषतः राजा महेन्द्र प्रताप केन्द्रीय पुस्तकालय, शिक्षा जगत में एक प्रेरणास्रोत के रूप में कार्य कर रही है। अतः आवश्यकता है कि इस पुस्तकालय के बुनियादी ढांचे, सुविधाओं और संसाधनों को और सुदृढ़ किया जाए, ताकि यह आने वाली पीढ़ियों के लिए भी एक प्रेरणा स्थल बना रहे और मेरठ की गौरवशाली बौद्धिक परंपरा को आगे बढ़ाता रहे।

संदर्भ सूची पुस्तकें

1. सिंह, आर. (2015). पुस्तकालय विज्ञान: सिद्धांत और व्यवहार. दिल्ली: पुस्तकालय प्रकाशन।
2. शर्मा, एस. (2018). शैक्षिक संस्थानों में पुस्तकालय सेवाएँ. जयपुर: शिक्षा पुस्तकालय प्रकाशन।
3. Rajput, D. (2020). "Academic Achievements of Raja Mahendra Pratap Library Alumni," *Meerut Education Review*, 6(3), 40-53.

वेबसाइट्स

1. <https://www.ccsuniversity.ac.in/library.php> (CCS University)
2. [https://digital-lib.ccsuniversity.ac.in/\(digital-lib.ccsuniversity.ac.in\)](https://digital-lib.ccsuniversity.ac.in/(digital-lib.ccsuniversity.ac.in))
3. <https://www.ccsumeerut.com/library.html> (ccsumeerut.com)

साक्षात्कार स्रोत

1. डॉ. जे.ए. सिद्दीकी, उप पुस्तकालयाध्यक्ष, राजा महेन्द्र प्रताप पुस्तकालय, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ। व्यक्तिगत साक्षात्कार, 10 मई 2025।
2. डॉ. मुनेश कुमार, सहायक आचार्य, राजनीति विज्ञान विभाग, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ व्यक्तिगत साक्षात्कार, 10 मई 2025

विश्वविद्यालय रिपोर्ट:

1. चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय-वार्षिक रिपोर्ट 2021-2022:
<https://filesccsu.blr1.cdn.digitaloceanspaces.com/public/pdf/ccsum/iqac/AQAR-2021-22.pdf> (Files CCSU)
2. चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय-पुस्तकालय नीति:
https://filesccsu.blr1.cdn.digitaloceanspaces.com/public/pdf/ccsum/pdf-files/Library-Policy_n.pdf (Files CCSU)
3. चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय-प्लेगियारिज़्म नीति:
https://filesccsu.blr1.cdn.digitaloceanspaces.com/public/pdf/ccsum/pdf-files/Plagiarism-Policy_n.pdf (Files CCSU)

**KITHORE
MEDIA**
हर खबर आपके करीब

BREAKING

राजनीति नहीं, समाज सेवा ही हमारा उद्देश्य
www.kithoremmedia.com

महिलाओं की भलाई और कल्याण के लिए बेहतर और गंभीरता से कार्य करें: प्रोफेसर असलम जमशेदपुरी

“मजलिस उल निसा” का मेरठ के विभिन्न क्षेत्रों में पहला सर्वे

मजलिस की अध्यक्ष, उपाध्यक्ष, महासचिव और प्रेस सचिव ने सर्वे में भाग लिया



5. ग्रामीण महिला सशक्तिकरण एवं सरकारी नीतियाँ

डॉ० जयवीर सिंह
सहायक आचार्य,
पी-एचडी, डी०एलडि
राजनीति विज्ञान विभाग
चौ० चरण सिंह विश्वविद्यालय परिसर, मेरठ

Abstract

दुनिया के निर्माण के बाद ईश्वर ने विचार किया कि इस दुनिया को और अधिक सुन्दर बनाना होगा और उन्होंने मानव की रचना की। मानव के दो रूप दिये पुरुष और स्त्री। ये दोनों एक दूसरे के पूरक हैं किन्तु नारी के बिना दुनिया का कोई अस्तित्व ही नहीं है। ईश्वर ने नारी की शारीरिक रचना इस प्रकार की है कि वह संसार के भविष्य की स्वयं निर्मात्री हो गई। भारत में 2011 की जनगणना के अनुसार कुल संख्या 84.63 करोड़ के आस-पास थी। इनमें पुरुषों की संख्या 43.63 करोड़ के लगभग जबकि महिलाओं में जनसंख्या 40.707 करोड़ है। जिसमें कार्यशील स्त्रियों में कृषि में अप्रत्यक्ष रूप से लगी हुई महिलाओं का 80 फीसद के लगभग है। भारतीय समाज में प्राचीनकाल से ही महिलाओं का महत्वपूर्ण स्थान रहा है, मैत्रेयी, गार्गी, सीता, सावित्री, द्रौपदी आदि महिलाओं का नाम विदुषी महिला के इतिहास से जाना जाता है। अहिल्याबाई, रानी दुर्गावती, रानी लक्ष्मीबाई ने राजनीतिक व सामाजिक क्षेत्रों में सराहनीय योगदान दिया। वहीं आधुनिक भारत में श्रीमती शीला दीक्षित, सुश्री ममता बनर्जी, सुमित्रा महाजन आदि बहुत ऐसी महिलाएँ हैं जो पुरुषों के समान कार्य को अन्जाम दे रही हैं। ये महिलाएँ बराबरी से आज देश में अपना योगदान दे रही हैं। आज एक तरफ महिला इतनी सशक्त हैं कि राजनीतिक, सामाजिक क्षेत्रों में वह अपना परचम लहरा रही हैं। महिला सशक्तिकरण को इन महिलाओं ने बढ़ावा दिया है और एक नई दिशा समाज को दी है। आज भी ग्रामीण क्षेत्रों में महिलाओं की स्थिति ठीक नहीं है वे इस सशक्तिकरण से वंचित हैं। उन्हें घर की चाहरदीवारी तक ही रहने दिया जाता है वे सिर्फ बच्चों के लालन-पालन का ख्याल रखती हैं ग्रामीण परिवेश में महिला श्रमिकों की दशा बहुत दयनीय है उनके लिये न जीविका का कोई साधन है न ही अन्य कोई रोजगार। कभी-कभी उन्हें काम मिल भी जाता है तो उन्हें पुरुषों के बराबर वेतन नहीं मिलती उनके साथ दोगुना दर्जे का व्यवहार किया जाता है। ग्रामीण महिलाओं के लिए सरकार को चाहिए की अच्छी-अच्छी सरकारी नीतियाँ बनाई जाए जिसका लाभ अन्तिम छोर पर बैठी महिलाएँ भी उठा सकें। उन्हें सशक्त करने के लिये सरकार को उन्हें रोजगार की सुविधा मुहैया करानी चाहिए छोटे-छोटे लघु उद्योग खोलने चाहिए। जिससे वे घर बैठे जीविका चला सकें अन्य महिला की तरह ग्रामीण महिला भी खुद को सशक्त कर सकें क्योंकि महिला श्रमिकों की संख्या 1991 की जनगणना के अनुसार 20.827 करोड़ के लगभग थी। इसलिये सरकार को उन्हें जागरूक करने व सशक्त करने के लिये गांव-गांव तक योजनाओं को पहुंचाना है जिससे ग्रामीण महिला इनका लाभ उठा सकें। सशक्तिकरण की समूची परिभाषा तब ही होगी। जब ग्रामीण क्षेत्र की महिला भी सशक्तिकरण की दौड़ शामिल हो जायेगी।

प्रस्तावना

भारतीय समाज में प्राचीनकाल से ही महिलाओं का महत्वपूर्ण स्थान रहा है। नारी ने सदैव ही पुरुष के साथ सहधर्मिणी का रूप निभाया है। इसके लिये सबसे अच्छा उदाहरण आचार्य मण्डन मिश्र की पत्नी शारदा देवी का है, जिन्होंने शंकराचार्य से शास्त्रार्थ किया था। इसमें न केवल उन्होंने पति की सहधर्मिता निभाई थी, बल्कि ज्ञान के क्षेत्र में भी अपनी योग्यता प्रदर्शित की थी। इस प्रकार से मैत्रेयी, गार्गी, सीता, अनुसूया, सावित्री, द्रौपदी आदि विदुषी महिलाओं के नामों से हमारा इतिहास भरा हुआ है। मध्यकालीन भारत में अहिल्याबाई, रानी दुर्गावती, रानी लक्ष्मीबाई ने राजनीतिक, प्रशासनिक और सामाजिक क्षेत्र में अति

महत्वपूर्ण भूमिका निभाई। आधुनिककाल में राजनीति के क्षेत्र में सरोजनी नायडू, विजयलक्ष्मी पण्डित, सुचेता कृपालनी और इन्दिरा गांधी भी इसी शृंखला की एक कड़ी हैं।

श्रीमती शीला दीक्षित, सुश्री ममता बनर्जी, सुश्री मायावती, सुश्री जयललिता, श्रीमती मीरा कुमार, सुमित्रा महाजन महिलाएं साधारणतया प्रत्येक समाज का एक महत्वपूर्ण अंग हैं जिनकी संख्या लगभग पुरुषों के समान ही होती है। जहां तक भारतीय समाज का प्रश्न है, स्त्रियों की स्थिति काफी उच्च रही है, विशेषता अगर हम सिन्धु सभ्यता की बात करें तो सिन्धु सभ्यता में परिवार मातृसत्तात्मक होते थे। इस सभ्यता के काल में महिलाओं की स्थिति अच्छी थी। इन्हें ही केन्द्र का बिन्दू माना जाता था घर के सभी कार्य महिलाओं के द्वारा ही किये जाते थे। घर की बागडोर महिलाओं के पास थी। हिन्दू समाज में पुरुष के अभाव में स्त्री को, स्त्री के अभाव में पुरुष को अपूर्ण माना गया है। इसी कारण हिन्दू समाज में स्त्री को पुरुष की अर्धांगिनी कहा गया है। धीरे-धीरे स्मृतिकाल, धर्मशास्त्र तथा मध्यकाल में इनके अधिकार छिनते गये। भारत में 1991 की जनगणना के अनुसार कुल जनसंख्या 84.63 करोड़ है। इनमें पुरुषों की संख्या 43.923 करोड़ है जबकि महिलाओं की संख्या 40.707 करोड़ है। जहां तक स्त्री और पुरुष अनुपात का प्रश्न है यह 1991 में 927 प्रति हजार पुरुष हो गया जो कि पिछले कुछ वर्षों की तुलना में कुछ कम है। केरल में स्थिति भिन्न है, वहां स्त्रियों की संख्या पुरुषों की अपेक्षा अधिक है। वहां 1036 प्रति हजार पुरुष का अनुपात है। भारतीय सन्दर्भ में 950 या उससे अधिक का स्त्री-पुरुष अनुपात महिलाओं व अनुकूल माना जा सकता है। केरल और हिमालय प्रदेश के अलावा इस श्रेणी के अन्तर्गत आने वाले राज्य व केन्द्रशासित प्रदेश इस प्रकार हैं— आन्ध्र 972, गोआ 967, कर्नाटक 960, मणिपुर 958, उड़ीसा 971, तमिलनाडु 974, दादरा और नगर हवेली 952, दम और दीव 969 तथा पाण्डिचेरी 979। स्वतंत्रता प्राप्ति के समय महिलाओं में साक्षरता की दर 18.33 फीसद (पुरुष साक्षरता 27.16 और महिला साक्षरता 8.83 फीसद) थी। 1991 में भारत ने साक्षरता की दर 52.21 फीसद (पुरुष साक्षरता दर 64.1 और महिला साक्षरता दर 39.34) राष्ट्रीय नमूना सर्वेक्षण संगठन के 53वें दौर के सर्वेक्षण के अनुसार भारत में साक्षरता की दर 1997 में बढ़कर 62 प्रतिशत पर पहुंच गई थी। जिसमें पुरुष और महिला साक्षरता दर क्रमशः 73 फीसद व 50 फीसद थी। जहां तक देश में कार्यशील महिलाओं का प्रश्न है, यहां कहा जा सकता है कि 1991 की जनगणना के अनुसार शहरों तथा गांवों दोनों घर की चारदीवारी से बाहर निकलकर स्त्रियां आर्थिक दृष्टि से उपार्जन का कार्य करने लगा है।

1971 की जनगणना के अनुसार केवल 13 फीसद भारतीय स्त्रियों की जनगणना के अनुसार केवल 13 फीसद भारतीय स्त्रियां देश की कुल कार्यशील जनसंख्या में कार्यरत थी। 1991 में यह प्रतिशत बढ़कर 28.57 हो गया। कार्यशील स्त्रियों में कृषि में अप्रत्यक्ष रूप से लगी हुई महिलाओं का प्रतिशत करीब 80 है। केन्द्रीय और राज्य स्तर की प्रशासनिक सेवाओं तथा सार्वजनिक क्षेत्र के संस्थानों में कार्यशील जनसंख्या का करीब 12 प्रतिशत भाग महिलाएं हैं कृषि श्रमिकों के रूप में महिलाओं की संख्या 1991 में 2.827 करोड़ हो गई। भारत में कार्यशील कार्यरत स्त्रियों में 52.59 अशिक्षित हैं तथा 28.56 प्राथमिक तथा माध्यमिक स्कूल तक शिक्षा प्राप्त है। 13.78 प्रतिशत उच्च माध्यमिक शिक्षा प्राप्त है और केवल 5.07 स्नातक या इससे उच्च शिक्षा प्राप्त है। नगरीय क्षेत्रों में 100 नौकरीशुदा स्त्रियों में 25.83 अशिक्षित हैं एवं 35.49 प्राथमिक तथा माध्यमिक शिक्षा प्राप्त हैं, 25.71 उच्च माध्यमिक तथा शिक्षा प्राप्त हैं और 12.97 स्नातक तथा इससे उच्च शिक्षा प्राप्त हैं। ग्रामीण क्षेत्रों में 100 नौकरीशुदा महिलाओं में 88.11 अशिक्षित हैं, 10.68 प्राथमिक तथा माध्यमिक स्तर तक शिक्षित हैं और 1.21 माध्यमिक स्तर से ऊपर की शिक्षा प्राप्त है।

सुप्रसिद्ध विचारक अरस्तू का कहना है कि “नारी की उन्नति या अवनति पर ही राष्ट्र की उन्नति या अवनति निर्धारित है। नारी की सहज पवित्रता तथा भावनात्मक क्षमता का उपयोग परिवार तथा समाज की अर्थव्यवस्था को सुनियन्त्रित तथा सुनियोजित बनाने में भी

किया जा सकता है। नारी को अर्थव्यवस्था में बराबरी का सहयोगी बनाकर अथवा उसके ही हाथों में प्रधान रूप से अर्थ नियंत्रण देकर यह लाभ प्राप्त किया जा सकता है।

स्वामी विवेकानन्द ने कहा था “जब तक महिलाओं की स्थिति में सुधार नहीं होगा तब तक विश्व का कल्याण नहीं हो सकता। किसी भी पक्षी के लिये एक पंख से उड़ना असंभव है।

डा० बाबा साहब अम्बेडकर ने कहा था कि “किसी समाज की महिलाओं की प्रगति पर ही उस समाज की प्रगति का अंदाजा लगाया जाता है। अपना समाज अभी तो प्रगति पथ पर है”। गांधी जी ने कहा था कि महिलाओं के अधिकारों के विषय में समझौता नहीं कर सकता। शारीरिक बनावट और लिंगभेद पुरुष और महिलाओं के कार्यों के अन्तर को दर्शाता है, उनके स्तर के अन्तर को नहीं। महिला पुरुष की पूरक है, उनसे कम नहीं, नारी जब पुरुष के समकक्ष खड़ी होगी उसमें विकास तभी सम्भव है, अन्यथा वह पुरुष के दबाव से बनी घुटन में जीने के लिये सांस भर सकेगी। पं० जवाहरलाल नेहरू भी इसी समानता का पक्ष लेते हुये प्रस्तुत करते हैं— यदि जनता में जागृति पैदा करनी है तो पहले महिलाओं में जागृति पैदा करो, एक बार जब वे आगे बढ़ती हैं तो परिवार आगे बढ़ता है, गांव व शहर आगे बढ़ता है एवं सारा देश आगे बढ़ता है।

महिला सशक्तिकरण भारत में महिलाओं की दशा को सुधारने एवं महिला सशक्तीकरण की शुरुआत 19वीं शताब्दी के समाज सुधार आन्दोलन के साथ मानी जा सकता है। जिसके अग्रदूत राजा राममोहन राय थे। उनके प्रयासों के परिणामस्वरूप ही 1829 में ‘सती प्रथा’ के विरुद्ध कानून पारित हुआ। तत्पश्चात् ईश्वरचन्द्र विद्यासागर के प्रयासों से जुलाई 1856 में ‘हिन्दू विधवा पुनर्विवाह’ को कानूनी अनुमति प्राप्त हुई। परिणामस्वरूप प्रथम विधवा कालिन्दी देवी का पंडित रामचन्द्र विद्यारतन से हुआ। 1872 में केशवचन्द्र सेन के प्रयत्नों से ‘नेटिव मेरिज एक्ट’ पास हुआ जिसमें बहुविवाह को दण्डनीय अपराध माना गया और बाल विवाह निषेध ठहराया गया तथा अन्तर्जातीय विवाह को मान्यता दी गयी। स्वामी दयानन्द सरस्वती एवं सुधार तथा नारी अधिकारों के क्रियान्वयन एवं प्राप्ति हेतु उल्लेखनीय प्रयास किए। 1875 तक कलकत्ता, मद्रास एवं मुम्बई विश्वविद्यालय में लड़कियों के प्रवेश की अनुमति नहीं थी। पंडिता रमाबाई द्वारा हंटर कमीशन के सम्मुख स्त्री के शिक्षा की मांग रखी गयी। इन्हीं के प्रयासों के परिणामस्वरूप ही “कादम्बिनी बसु” को प्रथम महिला स्नातक होने का गौरव प्राप्त हुआ। 1888 में आनन्दी बाई प्रथम महिला थी जो विद्या अर्जन के लिए विदेश गयी। स्वर्णकुमारी ने प्रथम महिला सम्पादक के रूप में “भारती पत्रिका” का सम्पादन किया व महिलाओं के लिस ‘सखी समिति’ की स्थापना की। इन्हीं सब प्रयासों ने महिलाओं में घरेलू दायरों से बाहर अपने अधिकारों के प्रति एक सक्रिय जागृति को जन्म दिया। जिस कारण इस समय को “महिला युग” कहा गया क्योंकि न केवल भारत को जन्म दिया। जिस कारण इस समय को ‘महिला युग’ कहा गया क्योंकि न केवल भारत वरन् सम्पूर्ण विश्व में नारी-अधिकारों के प्रति एक नवीन चेतना व जागृति उत्पन्न हो रही थी। राष्ट्रीय आंदोलन के गांधी युग में महात्मा गांधी ने भारतीय नारी का आह्वान किया। उन्होंने नारी के भीतर की सोयी शक्ति को जगाकर शिक्षित-अशिक्षित सभी स्त्रियों को साथ-साथ चलने और पुरुष के कंधे से कंधा मिलकर स्वाधीनता संग्राम में लड़ने के लिस प्रेरित किया। महात्मा गांधी द्वारा सन् 1920A। मो। राष्ट्रीय स्तर पर असहयोग आंदोलन में हजारों उच्च व मध्यवर्गीय शिक्षित महिललाओं के साथ-साथ निम्नवर्गीय व अशिक्षित महिलाओं ने भी सक्रिय रूप से भाग लिया।

महिला सशक्तिकरण का अर्थ महिलाओं में आत्मसम्मान, आत्मनिर्भरता व आत्मविश्वास जागृत करना ही महिला सशक्तिकरण है। महिला सशक्तिकरण के लिये वर्तमान में सबसे बड़ी आवश्यकता उनको अपने अधिकारों के प्रति सजग होने की है।

आज की भारतीय महिला चार दीवारी में पड़े रहना क्या होता है, ये आज की भारतीय महिला नहीं जानती वे तो बस खुले आसमान में परिंदों की तरह उड़ना जानती हैं वे खुद अपनी चीजें चुन सकने का जज्बा रखने लगी हैं यही तो कारण है कि केवल दूसरों की पसन्द का ख्याल रखने वाली भारतीय महिला आज अपनी पसन्द को भी दर्जा देती हैं।

दि इकॉनोमिक टाइम्स की रिपोर्ट हाल ही में 'दि इकॉनोमिक टाइम्स' की एक रिपोर्ट में यह बात सामने आई है कि भारतीय महिला अब अपने अर्न्तवस्त्रों के लिये मार्केट के ट्रेन्ड का बदलने की कोशिश में लगी हैं। महिला सशक्तिकरण का तात्पर्य केवल स्त्रियों के सामाजिक उत्थान से नहीं है, बल्कि इसमें समूची नरी जाति को शामिल किया जाता है, जिन्हें किन्हीं कारणों से अपने विकास का अवसर नहीं मिला-भले ही वे भेदभावपूर्ण नीतियों के कारण पूरुषों की अपेक्षा पिछड़ी रही हो अथवा उनके विकास के अवसरों में पक्षपात किया गया हो। ऐसी उपेक्षित लड़कियों व महिलाओं की प्रगति से ही सामाजिक उन्नति संभव है। ऐसी, प्रगति की पृष्ठभूमि की प्रगति से ही सामाजिक उन्नति की जा सकती है, जिसमें समाज, परिवार व संबंधित इकाईयों की सशक्त भूमिका रहे। प्रगति के ये अवसर ही उनके विकास को नई दिशा प्रदान कर सकते हैं।

भारतीय संविधान की प्रस्तावना, मूल अधिकार और कर्तव्य एवं नीति निर्देश तत्वों में लिंग के आधार पर समानता के सिद्धान्त का प्रतिपादन किया गया है। संविधान में न केवल महिलाओं को समानता का अधिकार दिया गया है, वरन् राज्यों को महिलाओं के हित संवर्धन के लिए उचित कदम उठाने की शक्ति प्रदान की गई है। प्रजातांत्रिक नीति, कानून, विकास, योजनाओं एवं कार्यक्रमों के अन्तर्गत विभिन्न क्षेत्रों में विभिन्न कार्यक्रमों द्वारा महिलाओं के उत्थान के लिए लक्ष्य का निर्धारण किया गया है। पांचवी पंचवर्षीय योजना के पश्चात् महिलाओं का कल्याण हो, उनके उत्था के लिए अधिक प्रयास किए गए हैं। महिलाओं का स्तर निर्धारित करने के लिए ओ वाले वर्षों में महिलाओं को सशक्त बनो का कारगर मुद्दा बनया है। महिलाओं के अधिकारों एवं कानूनी अधिकार की सुरक्षा के लिए संसद में सन् 1990 में एक विधेयक के माध्यम से राष्ट्रीय महिला आयोग का गठन किया गया है। सन् 1993 में हुए संविधान संशोध के 73वें एवं 74वें संशोधन द्वारा महिलाओं के लिए स्थायी निकायों एवं नगर निगम निकायों में सीटों का आरक्षण किया गया है, जिससे स्थानीय स्तर पर महिलाएं निर्णय करने में भागीदार बन सके एवं नींव का पत्थर बन सकें।

ग्रामीण महिला भारत एक ग्रामप्रधान देश है और भारत की 75 फीसदी जनसंख्या गाँवों में निवास करती है और उनका मुख्य व्यवसाय कृषि है। यदि हम भारतीय सभ्यता की बात करें तो वह केवल हमें भारत के गाँवों में ही देखने को मिल सकती है। गाँव का जीवन बहुत दयनीय है वहाँ सुविधाओं का अभाव है। वहाँ के लोगों की अनगिनत समस्याएं हैं और महिलाओं की स्थिति और भी ज्यादा खराब है वे घर की चाहरदीवारों तक ही रहती हैं उन्हें घर से बाहर निकलने नहीं दिया जाता। शिक्षा का अभाव सबसे ज्यादा ग्रामीण क्षेत्रों में ही है। ग्रामीण स्त्रियां न पढ़ी लिखी होती हैं न ही सशक्त होती हैं। उनके पास सुविधाओं का अभाव होता है। अतः ग्रामीण महिलाओं को भी सशक्त किया जाये उनका सशक्तिकरण भी होना चाहिए जब तक ग्रामीण क्षेत्र की महिलाओं को सशक्त नहीं किया जायेगा तब तक महिला सशक्तिकरण की परिभाषा पूरी नहीं होती है।

देश को आजाद हुये आज 70 साल हो गये लेकिन ग्रामीण महिलाओं की स्थिति जस की तस है उनके पास न तो कोई साक्षरता है न कोई जीविका चलाने का पर्याप्त साधन है। वे घर को चलाने के लिये पशुपालन का कार्य करती हैं और जंगल जाकर लकड़ी बिनती हैं, घास चराती हैं, रोजमर्रा के लिये गोबर के उपलों को बनाती हैं ग्रामीण क्षेत्र की महिला की स्थिति बड़ी ही दयनीय है। वहां रहने के लिए न पक्के घर हैं न पानी की सुविधा आज भी

बहुत से गांव ऐसे हैं जहाँ सड़कें नहीं हैं, परिवहन साधन की कमी है वहाँ के स्थानीय लोगों को बैसा-बुग्गी, घोड़ा तांगे में ही सवारी करनी पड़ती है या पैदल चलना पड़ता है।

ग्रामीण महिलाएँ पढ़ी-लिखी न होने के कारण अपने अधिकारों को भी नहीं जानती उनकी सारी जिंदगी घर के काम-काज, पशुपालन में निकल जाती है फिर भी घर की जीविका नहीं चल पाती है। वर्तमान स्थिति भी ग्रामीण महिलाओं की सही नहीं है उन्हें घूँघट में रखा जाता है कार्य के लिये बाहर जाना होता, कोई अच्छी चिकित्सा सुविधा उन्हें नहीं मिल पाती। ग्रामीण महिला का सशक्तिकरण तभी सम्भव है जहाँ उन्हें अधिकार मिले वे अपने अधिकारों को समझे, उन्हें शिक्षा दिलायी जाये जिससे वे पढ़-लिखकर अपना कार्य कर सकें। आज भी ग्राम प्रधान के चुनाव में महिला प्रत्याशी को बना तो दिया जाता है पर संचालन तो उसका पति ही करता है अतः महिलाओं को साक्षर बनाया जाये, उनके पास घरकाज से अलग कार्य करने को दिये जाये, महिला श्रमिक को पूरा वेतन दिया जाए, छोटे बच्चे व माँ की देख-रेख के लिये डॉक्टरी इलाज बढ़िया हो, खाने-पीने की चीजें महिलाओं को प्रसव के समय मुहैया कराई जाये जिससे उन्हें प्रसव सम्बन्धी कोई पीड़ा न हो, परिवार नियोजन कार्यक्रम की जानकारी दी जाये। इस तरह वे सशक्त होंगी और मुख्यधारा में आयेगी।

ग्रामीण महिला को सशक्त करने के कारक

स्त्री शिक्षा अनिवार्य हो

ग्रामीण महिलाओं के लिये शिक्षा की विशेष व्यवस्था की जानी चाहिए उन्हें जागरूक करने के लिये शिक्षा अनिवार्य है। पढ़-लिखकर वे अपने हक के लिये लड़ सकती हैं और पढ़ाई-लिखाई से कोई भी छोटा-मोटा काम घर बैठे कर सकती हैं। वर्तमान समय में शिक्षा बहुत जरूरी है। शिक्षा से ही ग्रामीण महिलाएँ अपने अधिकारों व कानूनों का ज्ञान प्राप्त कर सकती हैं उन्हें साक्षर बनाकर सशक्तिकरण की मूलधारा में लाया जा सकता है ताकि वे चुप न रह सकें अपने अधिकारों के लिये लड़ सकें।

चिकित्सा सुविधा अच्छी हो

ग्रामीण महिलाओं को सशक्त करने के लिये ग्रामीण क्षेत्रों में चिकित्सा सुविधा अच्छी हो जिसका लाभ ग्रामीण महिला ले सकें। चिकित्सा सुविधा न होने से तथा डॉक्टरी इलाज समय पर न मिलने के कारण बहुत सी महिलाओं को लम्बे समय तक अपनी बीमारी ठीक होने का इंतजार करना पड़ता है, कभी-कभी तो मृत्यु तक हो जाती है इसलिये चाहिये की सुविधा (चिकित्सा) की अच्छी हो।

प्रसव की समुचित व्यवस्था हो

ग्रामीण महिलाएँ प्रसव पीड़ा में ही अपने प्राण त्याग देती हैं। क्योंकि उन्हें प्रसव ठीक से नहीं हो पाता अच्छी चिकित्सा देख-रेख न मिलने से गर्भवती महिला को बच्चे या खुद में से किसी एक को खोना पड़ता है।

छोटे-छोटे उद्योग खोले जायें

ग्रामीण महिलाओं को सशक्त करने के लिये उनकी आर्थिक व्यवस्था मजबूत होनी चाहिए। आर्थिक मजबूती के लिये गांव में ही छोटे-छोटे उद्योग खोले जायें जिससे उन उद्योगों में वे नौकरी कर सकें और अपनी जीविका चला सकें। जैसे- पापड़ बनाना, अचार बनाना, मुरब्बा बनाना, टोकरी बनाना आदि छोटे-छोटे उद्योग चलाना जिससे जीविका चल सके।

कृषि के लिए जमीन उपलब्ध हो

ग्रामीण महिला श्रमिक के लिये सरकार को खेती करने के लिये उन्हें जमीन की व्यवस्था करनी चाहिये जिससे उस जमीन पर वे खेती कर अपनी गुजर-बसर कर सकें। जीविका चलाने के लिये सरकार को श्रमिकों की तरफ ज्यादा ध्यान देना जरूरी है क्योंकि श्रमिक अपनी जरूरतों को नहीं तो कैसे पूरा कर पायेंगे।

अच्छी फसल के लिये बढ़िया बीज उपलब्ध हो

ग्रामीण महिलाएँ जो खेती करना चाहती हैं या खेती करती हैं उनके लिये सरकार को अच्छी फसल की पैदावार के लिये बढ़िया बीज श्रमिक को देना चाहिए जिससे उन्हें एक ही बार में फसल की अच्छी देख-रेख करके बढ़िया मुनाफा मिल जाये और फसल को भी कोई नुकसान न पहुँचे। एक फसल की बढ़िया पैदावार के बाद दूसरी फसल की पैदावार के लिए पर्याप्त समय मिले।

ग्रामों में स्वयं सहायता समूह बनाये जाये

ग्रामीण महिला सशक्तिकरण के लिये स्वयं सहायता समूह बनाए जाये और इन संगठनों को सरकारी मदद दी जाये इसके लिये लोन की सुविधा दी जाये। 4 से 5 महिलाओं के ग्रुप बनाकर उन्हें धनराशि 'लोन' की तरह दी जाये जिससे वे अपना कोई भी स्वयं का रोजगार चला सकें। स्वयं के रोजगार के लिये स्वयं सहायता समूह ग्रुप बहुत मददगार साबित होंगे।

बैंको से सस्ती दरों पर लोन की व्यवस्था हो

सरकारी बैंको को सस्ती दरों पर ग्रामीण महिलाओं को 'लोन' मुहैया कराना चाहिए। ग्रामीण महिलाओं के सशक्तिकरण के लिये व उनके आर्थिक विकास के लिये सरकारी बैंको को उनकी सहायता करनी चाहिए जो भी श्रमिक महिला अपना स्वयं का कार्य करना चाहती हैं वे उस कार्य को कर सकें।

समान कार्य के लिये समान वेतन

भारतीय समाज की यह विडम्बना है कि यहाँ की महिलाओं को पुरुषों के बराबर काम की मजदूरी कम मिलती है जो काम पुरुष श्रमिक करता है उसे मजदूरी ज्यादा मिलती है और वहीं काम स्त्री श्रमिक करती है तो उसे मजदूरी कम मिलती है यह गलत धारणा है समाज की उसे भी समान काम का समान वेतन देना चाहिए। क्योंकि भारतीय संविधान समानता का अधिकार देता है। यहां सभी समान हैं।

महिला रोजगार

समाज में महिलाओं का दर्जा बढ़ाने का एक और उपाय रोजगार है। इससे वे आय अर्जित करने में समर्थ होती हैं और संसाधनों पर अधिक नियंत्रण रख सकती हैं। इससे सार्वजनिक क्षेत्र में महिलाओं की भागीदारी बढ़ सकती है और नियंत्रण रख सकती हैं। इससे सार्वजनिक क्षेत्र में महिलाओं की भागीदारी बढ़ सकती है और निर्णय लेने के कौशल में सुधार लाने में भी मदद मिल सकती है। 1990 के दशक में श्रम शक्ति में महिलाओं की भागीदारी में बढोत्तरी हुई। लेकिन जहां तक वेतन और अधिकारों का सवाल है वे अब भी श्रम बाजार में निचले स्तर पर हैं। उन्हें पुरुषों की तुलना में कम वेतन और कम दर्जे वाली नौकरियां ही मिल पाती हैं। महिलाओं में बेराजगारी की दर पुरुषों की तुलना में अधिक और अनौपचारिक क्षेत्र (रेहड़ी पटरी पर दुकानदारी और बाजार संबंधी बहुत कम मजदूरी वाले कार्य) में संलग्न महिलाओं की संख्या पुरुषों के मुकाबले अधिक हैं। इसके अलावा अधिकतर महिलाएं अपने जीवन के उस दौर में रोजगार में रहती हैं जब वे प्रजनन सक्षम होती हैं

जिसका कारण उन पर काम का दोहरा बोझ होता है। एक ओर बाहर मेहनत मजदूरी करती है और दूसरी ओर घर के कामों जैसे बच्चा पालना, खाना पकाने, और घर की साफ-सफाई आदि में भी उनका हिस्सा पुरुषों के मुकाबले अधिक होता है।

ग्रामीण महिलाओं को बराबरी का दर्जा

इसी अभिसमय में ग्रामीण क्षेत्र की करोड़ों महिलाओं को बराबरी का दर्जा प्रदान करना तथा उनके विरुद्ध होने वाले समस्त भेदभाव को समाप्त करते हुए उन्हें पुरुषों के समकक्ष लाने के लिए सरकारों से विशिष्ट उपाय अपनाने की बात की गई है। क्योंकि ग्रामीण क्षेत्रों में महिलाएं अधिकांशतः गैर मैट्रिक क्षेत्र में कार्यरत हैं जहां उनके कार्य का सही-सही मूल्यांकन नहीं हो पाता। पारिवारिक दायित्वों का निर्वहन करते हुए ग्रामीण महिलाएं जिस प्रकार खेतों खलिहानों में पुरुषों का हाथ बंटाती हैं, गाय, बैल, भैंस, बकरियां, भेड़ आदि पालती हैं उसे देखते हुए उनकी महती भूमिका का नजरअन्दाज नहीं किया जा सकता। इसलिए राज्य यह सुनिश्चित करेगा कि महिलाओं को—

1. ग्रामीण क्षेत्रों में विकास से संबंधित सभी प्रकार की योजनाओं के निर्माण एवं कार्यान्वयन में भाग लेने का अधिकार हो।
2. सूचना, परामर्शदात्री एवं परिवार नियोजन सेवाओं सहित सुगम हो।
3. सामाजिक सुरक्षा कार्यक्रमों का सीधी लाभ मिले।
4. तकनीकी क्षमता बढ़ाने के लिए उन्हें सभी प्रकार की शिक्षा एवं प्रशिक्षण औपचारिक तथा अनौपचारिक सुविधाएं तथा सभी सामुदायिक और प्रसारात्मक सेवाओं का लाभ प्राप्त होते रहें।
5. रोजागार अथवा स्व रोजगार द्वारा आर्थिक अवसरों तक समान पहुंच प्रदान कराने के लिए स्वयं सहायता समूहों एवं सहकारिताओं का गठन करना।
6. सभी सामुदायिक क्रियाओं में भाग लेने का अधिकार हो।
7. सभी प्रकार की कृषि साख, बाजारी सुविधाओं, यथोचित प्रौद्योगिकी की तक समान पहुंच हो एवं भूमि एवं कृषि सुधारों व भूमि बन्दोबस्ती स्कीमों का लाभ प्राप्त होता रहे।
8. आवास, स्वच्छता, विद्युत और जलापूर्ति, परिवहन एवं संचार से संबंधित रहन-सहन की बेहतर सुविधाएं प्राप्त होती रहे।

ग्रामीण महिलाओं को सशक्त करने के लिये सरकारी नीतियाँ

भारतीय सभ्यता में महिलाओं की स्थिति हमेशा से श्रेष्ठ रही है। महिलाओं को शक्ति के रूप में सम्मान मिला है। यू०पी०ए० सरकार की ओर निरन्तर यह प्रयास किया जा रहा है। कि महिलाएं अधिक से अधिक सशक्त हो और स्वावलंबी बनें। इसके तहत जहां विभिन्न योजनाओं का संचालन किया जा रहा है। इनमें कुछ योजनाएं इस प्रकार हैं।

स्वयंसिद्ध योजना

स्वयंसिद्ध योजना मार्च 2001 में शुरू की गई। यह इंदिरा महिला योजना का ही परिष्कृत रूप है, जिसमें महिला अधिकारिता कार्यक्रम शामिल कर दिया गया है। इस योजना का उद्देश्य महिलाओं के स्वयं सहायता समूह बनाना व इन समूहों में विश्वास व जागरूकता उत्पन्न करना है तथा आर्थिक संसधनों व लघु ऋणों तक महिलाओं की पहुंच बढ़ाना है।

बालिका समृद्धि योजना

बालिका समृद्धि योजना का प्रारम्भ 2 अक्टूबर, 1997 को हुआ था। इसके अन्तर्गत गरीबी रेखा से नीचे वाले परिवार को 15 अगस्त, 1997 को अथवा उसके बाद जन्म लेने वाली बालिका की मां को अनुदान राशि की जाती थी। इस योजना को 1999 में संशोधित किया गया। इसके तहत अब सहायता राशि लड़की के नाम से डाकघर, बैंक खाते में जमा की जायेगी। यह छात्रवृत्ति पहली कक्षा से दसवीं कक्षा तक की छात्राओं को दी जायेगी। लड़की की आयु 18 वर्ष होने पर और उसके अविवाहित रहने तक वह कुल राशि जमा राशि (ब्याज सहित) उसे मिल जायेगी।

महिला रोजगार व प्रशिक्षण

महिलाओं को रोजगार और प्रशिक्षण के लिए मदद देने का कार्यक्रम 1987 में शुरू किया गया। इसका उद्देश्य कृषि, पशु-पालन, हथकरघा, हस्तशिल्प, कुटीर और ग्राम उद्योग तथा रेशम कीट-पालन, जैसे महिलाओं की प्रधानता वाले परम्परागत कार्यों में गरीबी रेखा से नीचे जीवनयापन करने वाली महिलाओं को रोजगार के अवसर उपलब्ध कराने के लिये हुनर और सुधार करना हैं

राष्ट्रीय टीकाकरण कार्यक्रम

इन कार्यक्रम में 5 वर्ष की आयु के बच्चों तथा गर्भवती के आवश्यक नियमित टीकाकरण करने के उद्देश्य से प्रदेश के चिकित्सा एवं स्वास्थ्य विभाग द्वारा योजना लागू की जा रही है।

इन्दिरा महिला योजना

महिलाओं को आत्मनिर्भर, स्वावलम्बी बनाने तथा समुचित शिक्षा एवं संचार माध्यमों से उनकी मानसिकता में परिवर्तन लाने के उद्देश्य से महिला कल्याण विभाग द्वारा इस योजना को क्रियान्वित किया गया। यह योजना 20 अगस्त, 1995 से चलाई जा रही है।

यूपी महिला उद्यमी प्रोत्साहन योजना लागू

उत्तर प्रदेश शासन द्वारा प्रदेश की महिला उद्यमियों के सशक्तिकरण को महिला उद्यमी प्रोत्साहन योजना-2013 लागू की गई है, जो कि पूर्वांचल, मध्यांचल तथा बुन्देलखण्ड के 12 मण्डलों, लखनऊ, मिर्जापुर के 49 जनपदों में क्रियान्वित है। इस योजना के तहत इण्टर पास कुल 515 महिला उद्यमियों को योजना का लाभ वित्तीय वर्ष 2013-14 में दिया जाना है जिसमें प्रदेश के अल्पसंख्यक समुदाय की 103 महिला उद्यमियों को योजना का लाभ दिया जाना है।

लाडली लक्ष्मी योजना (मध्य प्रदेश)

इस योजना के नियमों में 1 जून, 2015 से ई-लाडली लक्ष्मी योजना को शामिल किया गया है। इस योजना में रजिस्ट्रेशन करवाने पर 1 लाख रुपये का प्रमाण-पत्र ऑनलाइन जनरेट कर डिजिटल हस्ताक्षर के साथ जारी किया जायेगा। बालिका की पढ़ाई के लिए समय-समय पर ई-पेमेन्ट के द्वारा भुगतान किया जायेगा। इस योजना के अन्तर्गत कक्षा 6 में प्रवेश लेने पर 2 हजार रुपये 9वीं में 4 हजार रुपये एवं 11वीं व 12वीं में हर माह 200 रुपये का भुगतान किया जायेगा। योजना का संचालन पोस्ट ऑफिस के स्थान पर अब मध्यप्रदेश लाडली लक्ष्मी योजना निधि द्वारा किया जायेगा। योजना के आखिर में बालिका की उम्र 21 वर्ष होने व कक्षा 12वीं की परीक्षा में सम्मिलित होने पर योजना की राशि का भुगतान किया जायेगा।

जननी सुरक्षा योजना

जननी सुरक्षा योजना भारत सरकार के स्वास्थ्य और परिवार कल्याण मन्त्रालय द्वारा प्रायोजित योजना है जिसका प्रारम्भ 2005 में किया गया इसके अन्तर्गत गरीबी रेखा से नीचे जीवयापन करने वाली महिलाओं को संस्थागत प्रसूति कराने के लिये एक हजार रुपये की आर्थिक सहायता प्रदान की जाती है। प्रसव अस्पताल में अथवा प्रशिक्षित दार्द्र द्वारा किया जाना चाहिये। इस योजना का उद्देश्य गरीब गर्भवती महिलाओं को प्रसव की संस्थागत सुविधा प्रदान करना है।

प्रधानमंत्री गरीब कल्याण योजना

भारत—सरकार की एक योजना है जिसमें भ्रष्ट लोगों के बैंको में जमा कराये जाने वाले काले धन को सरकार गरीबों के विकास में लायेगी। वास्तव में यह योजना सरकार ने उन भ्रष्ट लोगों के लिये शुरू की है जिनके पास अधोषित सम्पत्ति है। जिसे सरकार गरीबों को देना चाहती है।

आजीविका ग्रामीण एक्सप्रेस योजना

केन्द्र सरकार गाँव में रोजगार के अवसर बढ़ाने के लिये आजीविका ग्रामीण एक्सप्रेस योजना शुरू करेगी। यह आजीविका ग्रामीण एक्सप्रेस योजना, दीनदयाल अन्त्योदय योजना के तहत शुरू होगी।

भाग्य लक्ष्मी योजना (उत्तर प्रदेश)

यह एक नई योजना है जिसे उत्तर प्रदेश सरकार के मुख्यमंत्री योगी आदित्यनाथ के नेतृत्व में शुरू किया जा रहा है। इस योजना के तहत नवजात शिशु की माँ को 50,000 रुपये का बाण्ड मिलेगा और 5,100 रुपये नगद मिलेंगे जो कि उसके बैंक खाते में जमा कराये जायेंगे। जैसे—जैसे लड़की की उम्र बढ़ती है वैसे ही भाग्य लक्ष्मी योजना के अन्तर्गत माता—पिता को सहायता राशि दी जायेगी जब लड़की कक्षा 6 में पहुँचती है तो माता—पिता को 3000 रुपये इसके बाद 5000 रुपये 8वीं कक्षा में 7000 रुपये कक्षा 10वीं में और 8000 रुपये कक्षा 12वीं में दिये जायेंगे। इस प्रकार जब तक लड़की की उम्र 21 साल होगी तब तक सरकार द्वारा 2 लाख रुपये की सहायता राशि माता—पिता को प्रदान कर दी जायेगी।

प्रधानमंत्री मातृत्व वन्दना योजना

उत्तर प्रदेश सरकार ने राज्यभर में प्रधानमंत्री मातृत्व वन्दना योजना शुरू की है। जिसके तहत गर्भवती महिलाओं को अपने पहले बच्चे के पैदा होने पर 5000 रुपये की वित्तीय सहायता मिलेगी जो की सीधे उनके बैंक खाते में जमा कर दी जायेगी। योजना का उद्देश्य गर्भवती महिलाओं के स्वास्थ्य में सुधार करना और अच्छे स्वास्थ्य के साथ बच्चे का सुरक्षित प्रसव कराना है। इस योजना की घोषणा प्रधानमंत्री नरेन्द्र मोदी जी ने 31 दिसम्बर 2016 को की थी।

प्रधानमन्त्री उज्ज्वला योजना

यह एक नई योजना है जिसे नरेन्द्र मोदी जी की भारत सरकार द्वारा शुरू किया जा रहा है। इस योजना के अन्तर्गत भारत सरकार 5 करोड़ बी0पी0एल0 (गरीबी रेखा से नीचे) परिवारों को मुफ्त में एल0पी0जी0 कनेक्शन उपलब्ध करायेगी। इस योजना का मुख्य उद्देश्य ग्रामीण क्षेत्रों में खाना पकाने के लिये उपयोग को बढ़ावा देना है। योजना का मुख्य उद्देश्य महिला सशक्तिकरण को बढ़ावा देना और उनकी सेहत की सुरक्षा करना भी है।

प्रधानमंत्री ग्रामीण आवास योजना

यह योजना नरेन्द्र मोदी जी की सरकार की बढ़िया योजनाओं में से एक है। इस योजना का शुभारम्भ देश के प्रधानमंत्री नरेन्द्र मोदी जी द्वारा 20 नवम्बर 2016 को की जा चुकी है। इस योजना का उद्देश्य ग्रामीण क्षेत्रों में 2022 तक सभी के आवास के मिशन को पूरा करेगी। प्रधानमंत्री ग्रामीण आवास योजना दिल्ली और चण्डीगढ़ को छोड़कर भारत के सभी ग्रामीण क्षेत्रों में लागू की जायेगी।

6000 रुपये की गर्भावस्था सहायता योजना को कैबिनेट से मिली मंजूरी

केन्द्र सरकार ने मातृत्व लाभ कार्यक्रम के सम्पूर्ण भारत में परिपालन को मंजूरी दे दी है। जिसके तहत गर्भवती महिलाओं और स्तनपान कराने वाली माँ को अपने पहले जीवित बच्चे के लिये 6000 रुपये की वित्तीय सहायता प्रदान की जायेगी यह योजना देश के सभी जिलो तक विस्तारित की जायेगी।

योजना का उद्देश्य

गर्भावस्था सहायता योजना का मुख्य उद्देश्य कामकाजी महिलाओं की मजदूरी हानि के लिये 6000 रुपये नकद प्रोत्साहन मुआवजा प्रदान करना ताकि गर्भवती महिला प्रसव से पहले और बाद में पर्याप्त आराम और पोषण ग्रहण कर सके। यह योजना उन गर्भवती महिलाओं और स्तनपान कराने वाली माताओं के लिये लागू नहीं होगी जी कि केन्द्र सरकार या राज्य सरकार या सार्वजनिक क्षेत्रों के उपक्रमों के साथ नियमित रोजगार में है या जो कि किसी सरकारी योजना के तहत समान लाभ प्राप्त कर रही हो।

प्रधानमंत्री ग्राम परिवहन योजना

इस योजना के अन्तर्गत सरकार सार्वजनिक यात्री वाहन खरीदने के लिये महिला स्वयं सहायता समूहों को ब्याज मुक्त लोन प्रदान करेगी।

मुस्लिम शादी शगुन योजना

शादी शगुन योजना के तहत सभी ग्रेजुएट मुस्लिम लड़कियों को 51,000 रुपये तक की आर्थिक सहायता शादी के उपहार के रूप में प्रदान की जायेगी। मुस्लिम लड़कियां जो अपनी शादी से पहले किसी भी वर्ग में अपनी ग्रेजुएट स्तर की पढ़ाई पूरी कर लेती है वो इस शादी शगुन योजना का लाभ उठाने के लिये योग्य होगी।

मौलान आजाद शिक्षा फाउण्डेशन द्वारा सरकार को शादी-शगुन योजना का प्रस्ताव दिया गया था। इस योजना को अल्पसंख्यक मंत्रालय से भी मंजूरी मिल गई है। इस योजना का उद्देश्य अल्पसंख्यक समूह में उच्चशिक्षा को प्रोत्साहित करना है। नरेन्द्र मोदी सरकार की यह योजना विशेष रूप से मुस्लिम समुदाय की लड़कियों को उच्चशिक्षा के लिये प्रेरित करने का एक सहायनीय प्रयास है।

सन्दर्भ ग्रन्थ सूची

1. समाजशास्त्र, डॉ० सिंह वी०एन०, निखिल पब्लिशर्स एण्ड डिस्ट्रीब्यूटर, आगरा, संस्करण-3, भाग-1, पृष्ठ 2
2. समाजशास्त्र, डॉ० सिंह वी०एन०, निखिल पब्लिशर्स एण्ड डिस्ट्रीब्यूटर, आगरा, संस्करण-3, भाग-2, पृष्ठ 2
3. ग्रामीण समाजशास्त्र, डॉ० छिल्लर मंजूलता, राहुल पब्लिशिंग हाउस, मेरठ, संस्करण-2017, भाग-1, पृष्ठ 45-46
4. ग्रामीण समाजशास्त्र, डॉ० छिल्लर मंजूलता, राहुल पब्लिशिंग हाउस, मेरठ, संस्करण-2017, भाग-2 पृष्ठ 45-46

5. आधुनिक समाज में महिलाएँ, जैन, माथुर, आस्था प्रकाशन, जयपुर, 2014, पृष्ठ 56
6. पंचायती राज में महिलाएँ, बोहरा आशा रानी, पॉइन्टर पब्लिशर्स, जयपुर, 2012।
7. पंचायती राज में महिलाओं का योगदान, डॉ० चौहान भीम सिंह, अरिहन्त प्रकाशन, जोधपुर, 2007, पृष्ठ 66-67
8. महिला आरक्षण एवं सामाजिक परिवर्तन, डॉ० माथुर सावित्री, आदित्य पब्लिशिंग हाउस, जयपुर, 2012 (संस्करण), पृष्ठ 62-232।
9. भारतीय समाज में महिलाएँ, देसाई नीरा, ठक्कर ऊषा, राष्ट्रीय पुस्तक न्यास भारत संस्करण (2009), पृष्ठ 1-80
10. भारतीय समाज, दुबे श्यामाचरण, राष्ट्रीय पुस्तक न्यास भारत, संस्करण (1985), पृष्ठ 76
11. नगरीय समाजशास्त्र, सिंह, वी०एन०, सिंह जनमेजय, रावत पब्लिकेशन्स, जयपुर, (2015), पृष्ठ 427



अटल सभागार में ड्रामे का लुत्फ लेते हुये प्रो० असलम जमशेदपुरी, ईश्वरचन्द्र गंभीर आदि

6. "समान नागरिक संहिता और धार्मिक स्वायत्तता: भारत में अल्पसंख्यक अधिकारों के विशेष संदर्भ में एक संवैधानिक संतुलन"

डॉ. कुसुमवती¹

खुशी मोहम्मद²

सारांश

भारत का संविधान समानता, स्वतंत्रता और न्याय जैसे मूल्यों पर आधारित है, किंतु व्यक्तिगत कानूनों की विविधता के कारण इन आदर्शों की व्यावहारिक अभिव्यक्ति अनेक चुनौतियों का सामना करती है। अनुच्छेद 44 में निहित समान नागरिक संहिता (Uniform Civil Code – UCC) का उद्देश्य सभी नागरिकों के लिए एक समान विधिक ढांचा प्रदान करना है, जबकि अनुच्छेद 25 धार्मिक स्वतंत्रता की गारंटी देता है। यही द्वंद्व UCC और धार्मिक स्वायत्तता के बीच संवैधानिक संतुलन की खोज को जन्म देता है। यह शोध विशेष रूप से अल्पसंख्यक अधिकारों के संदर्भ में इस प्रश्न को पड़ताल करता है कि किस प्रकार समान नागरिक संहिता के कार्यान्वयन से एक ओर लैंगिक समानता, सामाजिक न्याय और विधिक एकरूपता सुनिश्चित हो सकती है, वहीं दूसरी ओर धार्मिक पहचान और स्वायत्तता की सुरक्षा भी आवश्यक है। अध्ययन में न्यायपालिका के प्रमुख निर्णयों (शाह बानो, शायरा बानो, सरला मुद्गल आदि), विधायी पहल, समकालीन सामाजिक-राजनीतिक बहस और अंतरराष्ट्रीय अनुभवों का विश्लेषण किया गया है। यह शोध इस निष्कर्ष पर पहुँचता है कि समान नागरिक संहिता (Uniform Civil Code – UCC) को थोपे गए कानून के रूप में नहीं, बल्कि क्रमिक सुधार, संवाद और सहमति की प्रक्रिया के रूप में देखा जाना चाहिए, ताकि यह संविधान के आदर्शों के अनुरूप सभी नागरिकों के लिए समान अवसर और अधिकार सुनिश्चित करे और साथ ही अल्पसंख्यकों की धार्मिक व सांस्कृतिक पहचान की रक्षा भी कर सके।

मुख्य शब्द (Keywords): समान नागरिक संहिता, धार्मिक स्वायत्तता, संविधान, अनुच्छेद 44, बहुलतावाद, अल्पसंख्यक अधिकार, मानवाधिकार, न्यायपालिका।

परिचय भारत की सभ्यता और संस्कृति विश्व की सबसे प्राचीन और बहुविध परंपराओं में से एक है। यह देश विभिन्न धर्मों, भाषाओं, जातियों, संस्कृतियों और परंपराओं का संगम है। भारतीय समाज की यह बहुलता ही उसकी सबसे बड़ी विशेषता है। किंतु इसी विविधता के भीतर राष्ट्रीय एकता और सामाजिक न्याय की स्थापना करना हमेशा से एक चुनौती रहा है। भारतीय संविधान निर्माताओं ने इस चुनौती को स्वीकार करते हुए संविधान के माध्यम से समानता, स्वतंत्रता, न्याय और बंधुता को सुनिश्चित करने का प्रयास किया।

भारतीय संविधान के नीति-निर्देशक तत्वों (Directive Principles of State Policy) में अनुच्छेद 44 के अंतर्गत राज्य को यह निर्देश दिया गया कि वह सभी नागरिकों के लिए समान नागरिक संहिता (Uniform Civil Code – UCC) लागू करने का प्रयास करेगा। इसका आशय यह है कि विवाह, तलाक, उत्तराधिकार, दत्तक ग्रहण और संपत्ति जैसे व्यक्तिगत कानूनों के मामले में सभी नागरिकों पर समान रूप से लागू होने वाला एक साझा कानून होना चाहिए। इस प्रकार की संहिता का उद्देश्य यह है कि धर्म और समुदाय के आधार पर नागरिकों के बीच असमानता दूर की जाए और समाज में लैंगिक समानता, सामाजिक न्याय और राष्ट्रीय एकता को प्रोत्साहन मिले।

भारतीय समाज की विविधता और संविधान की भूमिका भारत में धार्मिक विविधता इतनी गहरी है कि लगभग हर प्रमुख धर्म यहाँ प्रचलित है—हिंदू, मुस्लिम, सिख, ईसाई, पारसी, यहूदी, बौद्ध और जैन धर्म। प्रत्येक धर्म की अपनी मान्यताएँ, परंपराएँ और व्यक्तिगत कानून हैं। संविधान ने इस विविधता को मान्यता देते हुए धार्मिक स्वतंत्रता (अनुच्छेद 25–28) और अल्पसंख्यकों के सांस्कृतिक अधिकार (अनुच्छेद 29–30) की गारंटी दी। दूसरी ओर, संविधान ने राज्य को यह भी दायित्व सौंपा कि वह नागरिकों के बीच समानता और न्याय स्थापित करे। इस प्रकार संविधान का ढांचा मूलतः संतुलनकारी है—यह एक ओर समानता और धर्मनिरपेक्षता की ओर झुकता है, तो दूसरी ओर धार्मिक स्वतंत्रता और सांस्कृतिक बहुलता का संरक्षण भी करता है।

समान नागरिक संहिता की अवधारणा समान नागरिक संहिता का विचार भारतीय संविधान के निर्माताओं ने इसलिए रखा ताकि समाज में "एक राष्ट्र, एक कानून" की भावना विकसित हो सके। डॉ.

1. सहायक प्रोफेसर, विधि अध्ययन संस्थान, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ, उत्तर प्रदेश, भारत।
2. शोधार्थी, विधि अध्ययन संस्थान, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ, उत्तर प्रदेश, भारत।

भीमराव आंबेडकर ने संविधान सभा में यह कहा था कि **“राज्य को किसी एक दिन समान नागरिक संहिता लागू करनी ही होगी, यदि भारत को आधुनिक राष्ट्र बनाना है।”** यद्यपि तत्कालीन परिस्थितियों को देखते हुए यह प्रावधान केवल नीति-निर्देशक तत्व के रूप में रखा गया और बाध्यकारी नहीं बनाया गया।

समान नागरिक संहिता का मूल उद्देश्य यह है कि नागरिकों के निजी जीवन से संबंधित विषयों—जैसे विवाह, तलाक, गोद लेना, उत्तराधिकार—में समानता सुनिश्चित की जा सके। वर्तमान में हिंदू, मुस्लिम, ईसाई, पारसी आदि समुदायों के अलग-अलग व्यक्तिगत कानून हैं। इन कानूनों में लैंगिक असमानता और भेदभाव की कई स्थितियाँ हैं, जिनके कारण न्याय और समानता का संवैधानिक लक्ष्य अधूरा रह जाता है।

धार्मिक स्वायत्तता और अल्पसंख्यक अधिकार भारतीय संविधान ने धार्मिक स्वतंत्रता को मौलिक अधिकारों में शामिल किया है। अनुच्छेद 25³ प्रत्येक नागरिक को अपने धर्म का पालन करने, प्रचार करने और मानने की स्वतंत्रता देता है। अनुच्छेद 26⁴ धार्मिक संप्रदायों को अपने धार्मिक कार्यों के प्रबंधन का अधिकार देता है। अनुच्छेद 29 और 30 अल्पसंख्यक समुदायों को अपनी संस्कृति और शिक्षा संस्थानों को संरक्षित करने का अधिकार प्रदान करते हैं।

इन प्रावधानों का उद्देश्य यह सुनिश्चित करना था कि भारत जैसे बहुलतावादी समाज में कोई भी समुदाय अपनी धार्मिक या सांस्कृतिक पहचान खोने के भय से ग्रसित न हो। यही कारण है कि जब समान नागरिक संहिता की बात होती है तो कई अल्पसंख्यक समुदाय इसे अपनी धार्मिक स्वायत्तता में हस्तक्षेप के रूप में देखते हैं।

ऐतिहासिक परिप्रेक्ष्य भारतीय समाज में व्यक्तिगत कानूनों की जड़ें गहरी हैं। ब्रिटिश काल में **“एंग्लो-मोहम्मडन लॉ”** और **“एंग्लो-हिंदू लॉ”** का विकास हुआ, जिसमें धार्मिक प्रथाओं और औपनिवेशिक कानून का मिश्रण था। स्वतंत्रता के बाद **हिंदू कोड बिल (1955-56)** के माध्यम से हिंदू व्यक्तिगत कानूनों में व्यापक सुधार हुआ, जैसे तलाक का अधिकार, स्त्रियों के संपत्ति पर अधिकार आदि। परंतु मुस्लिम व्यक्तिगत कानून में अपेक्षित सुधार नहीं हुए।

शाहबानो केस (1985)⁵ ने इस बहस को राष्ट्रीय विमर्श के केंद्र में ला दिया। सुप्रीम कोर्ट ने मुस्लिम महिला शाहबानो को भरण-पोषण का अधिकार दिया और कहा कि समान नागरिक संहिता का समय आ गया है। इस निर्णय पर भारी विवाद हुआ और अंततः संसद ने **मुस्लिम महिला (विवाह विच्छेद पर अधिकार संरक्षण) अधिनियम, 1986** पारित कर सुप्रीम कोर्ट के निर्णय को अप्रभावी बना दिया। इस घटना ने यह स्पष्ट किया कि UCC का प्रश्न केवल कानूनी नहीं बल्कि सामाजिक और राजनीतिक भी है।

न्यायपालिका की भूमिका न्यायपालिका ने समय-समय पर समान नागरिक संहिता के पक्ष में टिप्पणियाँ की हैं।

शाहबानो मामला(1986) में स्पष्ट किया की मुस्लिम महिला स्त्री विवाह विच्छेद के पश्चात केवल इदत तक ही भरण पोषण प्राप्त करने के अधिकारी नहीं है बल्कि जब तक कि वह भरण पोषण करने में असमर्थ है और दूसरा विवाह न कर ले तब तक अपने पति से भरण पोषण प्राप्त करने की अधिकारी होगी।

डेनियल लतीफी⁶ मामले में न्यायालय ने स्पष्ट किया कि यदि तलाकशुदा पत्नी अविवाहित रहती है और भरत पोषण करने में असमर्थ है तो धारा 4⁷ के अधीन अपने पति से संबंधियों के विरुद्ध जो उसकी संपत्ति और अधिकारी हैं कार्यवाही कर सकते हैं यदि कोई संबंधी भरण पोषण देने में असमर्थ है तो मजिस्ट्रेट राज्य द्वारा स्थापित वक्फ बोर्ड को भरण पोषण देने का निर्देश दे सकता है।

सारला मुद्गल⁸ केस (1995) में सुप्रीम कोर्ट ने बहुविवाह और धर्म परिवर्तन के दुरुपयोग पर कड़ा रुख अपनाया।

उच्चतम न्यायालय ने संविधान के अनुच्छेद 44 पर नए दृष्टिकोण अपनाए जिसमें सभी नागरिकों के लिए एक समान सिविल संहिता के बनाने का निर्देश दिया गया है और कहा कि ऐसा करना पीड़ित व्यक्ति की रक्षा तथा राष्ट्रीय एकता और अखंडता की अभिवृद्धि दोनों की दृष्टि से आवश्यक है।

3. अनुच्छेद 25, भारतीय संविधान

4. अनुच्छेद 26, भारतीय संविधान

5. शाह बानो बनाम भारत संघ (1985) AIR 945

6. डेनियल लतीफी बनाम भारत संघ (2002) SC 3958।

7. मुस्लिम महिला (विवाह विच्छेद पर अधिकार संरक्षण) अधिनियम, 1986

8. सरला मुद्गल बनाम भारत संघ (1995) 3 SCC 635।

न्यायमूर्ति श्री कुलदीप सिंह तथा श्री आर. एम. सहाय यह निर्णय दिया कि एक हिंदू पति का अपना पहला विवाह विच्छेद किए बिना इस्लाम धर्म स्वीकार करके दूसरा विवाह हिंदू विवाह अधिनियम 1955 के अपबंधों के अधीन अवैध है और पति बहु-विवाह के अपराध के लिए भारतीय दंड संहिता की धारा 494 (वर्तमान भारतीय न्याय संहिता, 2023 की धारा-82) के अधीन दंडनीय भी है। हिंदू व्यक्ति विधि के अनुसार पति या पत्नी में एक के इस्लाम धर्म स्वीकार करने के पश्चात भी हिंदू विवाह अस्तित्व में बना रहता है। हिंदू विवाह अधिनियम 1955 द्वारा इसमें कोई परिवर्तन नहीं किया गया है। हिंदू विवाह का अपने आप विवाह विच्छेद नहीं होता। एक हिंदू विवाह का विघटन हिंदू विवाह अधिनियम की धारा 13 के अंतर्गत वर्णित किन्हीं आधारों पर विवाह विच्छेद की डिग्री द्वारा ही किया जाता है, केवल इस्लाम धर्म स्वीकार कर लेने से ही उनका विवाह विच्छेद नहीं हो जाता है।

शायरा बानो केस (2017)⁹ में सुप्रीम कोर्ट ने तीन तलाक को असंवैधानिक घोषित कर महिलाओं के अधिकारों को सशक्त किया।

इन निर्णयों से स्पष्ट है कि न्यायपालिका UCC की दिशा में धीरे-धीरे समाज को तैयार कर रही है।

वर्तमान परिप्रेक्ष्य उत्तराखंड ने 2024-25 में देश का पहला UCC अधिनियम¹⁰ पारित किया। यह ऐतिहासिक कदम भारत में भविष्य की राह दिखाने वाला माना जा रहा है। हालांकि, इसे लेकर राजनीतिक दलों और धार्मिक संगठनों की मिश्रित प्रतिक्रियाएँ सामने आई हैं। कुछ इसे राष्ट्रीय एकता और समानता की दिशा में बड़ा कदम मानते हैं, तो कुछ इसे धार्मिक स्वतंत्रता पर आघात मानते हैं।

शोध परिकल्पनाएँ

1. यदि समान नागरिक संहिता को लागू किया जाता है तो यह व्यक्तिगत कानूनों में विद्यमान लैंगिक असमानताओं और सामाजिक अन्याय को दूर कर सकता है, किंतु इसके साथ-साथ अल्पसंख्यक समुदायों की धार्मिक स्वतंत्रता और पहचान पर प्रभाव पड़ने की आशंका है।

2. UCC का विरोध अल्पसंख्यक समुदायों की धार्मिक पहचान और स्वायत्तता के संरक्षण की चिंता से प्रेरित है। यदि UCC लागू करते समय अल्पसंख्यक परामर्श और सहभागिता सुनिश्चित की जाए, तो इसे सामाजिक स्वीकार्यता मिल सकती है।

शोध कार्यप्रणाली

यह शोध गुणात्मक (Qualitative) और डॉक्ट्रिनल (Doctrinal) स्वरूप का है। इसमें भारतीय संविधान, विशेषकर अनुच्छेद 25, 26 और 44 का विश्लेषण किया जाएगा। सर्वोच्च न्यायालय और उच्च न्यायालय के महत्वपूर्ण निर्णयों (शाहबानो, सरला मुद्गल, शायरा बानो आदि) का अध्ययन कर समान नागरिक संहिता और धार्मिक स्वायत्तता के बीच संतुलन खोजने का प्रयास होगा। प्राथमिक स्रोतों में संविधान, न्यायिक निर्णय और विधायी बहसें शामिल होंगी, जबकि द्वितीयक स्रोतों में पुस्तकों, शोधपत्रों और विधि आयोग की रिपोर्टों का उपयोग किया जाएगा। तुलनात्मक दृष्टिकोण से अन्य देशों और गोवा के मॉडल का परीक्षण कर व्यावहारिक समाधान प्रस्तुत करने का प्रयास होगा।

शोध महत्व

भारत का संविधान एक ओर समानता, स्वतंत्रता और न्याय की गारंटी देता है तो दूसरी ओर धार्मिक स्वतंत्रता और सांस्कृतिक विविधता की रक्षा भी करता है। इसी द्वंद्व ने समान नागरिक संहिता (Uniform Civil Code – UCC) के प्रश्न को भारतीय संवैधानिक और सामाजिक विमर्श का सबसे जटिल और विवादास्पद मुद्दा बना दिया है। यह शोध इसलिए महत्वपूर्ण है क्योंकि यह केवल संवैधानिक प्रावधानों के विश्लेषण तक सीमित नहीं है, बल्कि यह उन सामाजिक और राजनीतिक प्रश्नों से भी जुड़ा हुआ है जो भारतीय लोकतंत्र की जड़ों को प्रभावित करते हैं। इस अध्ययन की महत्ता इस बात में निहित है कि यह भारतीय विधि व्यवस्था में मौजूद उस संवैधानिक संतुलन की तलाश करता है जहाँ अनुच्छेद 25 में प्रदत्त धार्मिक स्वतंत्रता और अनुच्छेद 44 में निहित समान नागरिक संहिता का निर्देशात्मक सिद्धांत एक-दूसरे के प्रतिद्वंद्वी नहीं, बल्कि पूरक रूप में सामने आएँ।

इस विषय की महत्ता का सबसे बड़ा आधार यह है कि भारतीय समाज एक बहुलतावादी और विविधतापूर्ण समाज है। यहाँ विभिन्न धर्म, संप्रदाय, भाषाएँ और संस्कृतियाँ सह-अस्तित्व में हैं। प्रत्येक समुदाय की अपनी पारिवारिक परंपराएँ, विवाह और उत्तराधिकार की व्यवस्थाएँ तथा धार्मिक मान्यताएँ हैं। इन विविधताओं के बीच समान नागरिक संहिता की अवधारणा लाना न केवल एक विधायी चुनौती है बल्कि

9. शायरा बानो बनाम भारत संघ (2017) 9 SCC 1।

10. उत्तराखंड समान नागरिक संहिता अधिनियम, 2024.

सामाजिक स्वीकार्यता का प्रश्न भी है। इसलिए यह अध्ययन यह समझने का अवसर प्रदान करता है कि किस प्रकार विधायी सुधारों को संवेदनशीलता, संवाद और सर्वसम्मति के आधार पर आगे बढ़ाया जा सकता है। यह अध्ययन इस बात की खोज करता है कि क्या वास्तव में समान नागरिक संहिता भारतीय समाज में समानता और न्याय स्थापित कर सकती है, और यदि हाँ तो इसके लिए किस प्रकार की रणनीति अपनाई जानी चाहिए।

लैंगिक समानता के दृष्टिकोण से भी इस अध्ययन की महत्ता अत्यधिक है। व्यक्तिगत कानूनों के अंतर्गत महिलाओं के अधिकारों की स्थिति ऐतिहासिक रूप से असमान रही है। विवाह, तलाक, भरण-पोषण और उत्तराधिकार जैसे मामलों में महिलाएँ अक्सर पुरुषों के मुकाबले कमजोर स्थिति में रही हैं। सुप्रीम कोर्ट के कई महत्वपूर्ण निर्णय, जैसे शाह बानो प्रकरण, सरला मुद्गल प्रकरण और शायरा बानो बनाम भारत संघ ने इस असमानता को उजागर किया है और व्यक्तिगत कानूनों में सुधार की आवश्यकता पर बल दिया है। इस परिप्रेक्ष्य में समान नागरिक संहिता न केवल संवैधानिक आदर्श का पालन करने का साधन है, बल्कि यह महिलाओं और बच्चों के अधिकारों की रक्षा का भी माध्यम बन सकता है। यह शोध इस विमर्श को गहराई प्रदान करता है और यह दिखाता है कि कैसे समान नागरिक संहिता को लागू करते समय धार्मिक स्वायत्तता और लैंगिक न्याय के बीच संतुलन साधा जा सकता है।

अल्पसंख्यक अधिकारों के संदर्भ में भी यह अध्ययन महत्वपूर्ण है। भारत में अल्पसंख्यक समुदायों की अपनी धार्मिक और सांस्कृतिक पहचान है। उन्हें यह आशंका रहती है कि समान नागरिक संहिता के नाम पर उनकी धार्मिक परंपराओं और व्यक्तिगत कानूनों को समाप्त किया जा सकता है। इस कारण से UCC का विरोध सबसे अधिक अल्पसंख्यक समुदायों से होता है। यह अध्ययन इस चिंता को गंभीरता से लेता है और यह विश्लेषण करता है कि क्या समान नागरिक संहिता वास्तव में अल्पसंख्यकों की धार्मिक स्वतंत्रता पर अतिक्रमण करेगी या फिर यह उन्हें भी समान नागरिक अधिकार प्रदान करके उनकी स्थिति को सुदृढ़ बनाएगी। इस अध्ययन की विशेषता यह है कि यह केवल बहुसंख्यक दृष्टिकोण तक सीमित नहीं है, बल्कि यह अल्पसंख्यक दृष्टिकोण और उनकी आशंकाओं को भी ध्यान में रखता है।

न्यायिक दृष्टिकोण के संदर्भ में भी यह शोध महत्वपूर्ण है। भारतीय न्यायपालिका ने अनेक बार इस प्रश्न को उठाया है कि क्या समान नागरिक संहिता का क्रियान्वयन आवश्यक नहीं हो गया है। शाह बानो मामला न्यायपालिका की सक्रिय भूमिका का प्रतीक था, लेकिन बाद में सरकार ने राजनीतिक दबाव में निर्णय को निष्प्रभावी कर दिया। सरला मुद्गल और जॉन वल्लामतोम जैसे मामलों में भी सुप्रीम कोर्ट ने स्पष्ट कहा कि समान नागरिक संहिता भारतीय समाज की एकता और समानता के लिए आवश्यक है। यह अध्ययन न्यायपालिका की इन टिप्पणियों और हस्तक्षेपों का गहन विश्लेषण करता है और यह स्पष्ट करता है कि न्यायपालिका, विधायिका और कार्यपालिका के बीच किस प्रकार का संतुलन इस विषय पर बन सकता है।

यह अध्ययन केवल अतीत और वर्तमान तक सीमित नहीं है, बल्कि इसकी भविष्यगत प्रासंगिकता भी अत्यधिक है। जैसे-जैसे भारतीय समाज विकसित हो रहा है, पारिवारिक और सामाजिक संबंधों की प्रकृति भी बदल रही है। समान-लैंगिक विवाह, लिव-इन रिलेशनशिप, सरोगेसी और गोद लेने जैसे नए मुद्दे सामने आ रहे हैं जिनके समाधान के लिए पारंपरिक व्यक्तिगत कानून अपर्याप्त साबित हो रहे हैं। ऐसे में समान नागरिक संहिता एक ऐसा विकल्प है जो इन समकालीन प्रश्नों को हल करने में सहायक हो सकता है। यह शोध भविष्य की विधायी और नीतिगत दिशा को तय करने में योगदान देगा और नीति-निर्माताओं को यह समझने का अवसर देगा कि किस प्रकार बदलते समय की आवश्यकताओं को ध्यान में रखते हुए कानून बनाए जाएँ।

अंतरराष्ट्रीय परिप्रेक्ष्य में भी इस अध्ययन की प्रासंगिकता उल्लेखनीय है। विश्व के कई देशों ने एक समान नागरिक संहिता लागू करके अपने समाज में समानता और न्याय की दिशा में उल्लेखनीय प्रगति की है। फ्रांस और तुर्की जैसे देशों में धार्मिक व्यक्तिगत कानूनों को समाप्त कर एक एकीकृत नागरिक संहिता लागू की गई, जिससे महिलाओं की स्थिति बेहतर हुई और समाज में समानता की भावना मजबूत हुई। इसके विपरीत पाकिस्तान और बांग्लादेश जैसे देशों में धार्मिक व्यक्तिगत कानूनों के कारण आज भी कई सामाजिक समस्याएँ बनी हुई हैं। भारत इन दोनों प्रकार के अनुभवों से सीख ले सकता है और अपनी परिस्थितियों के अनुसार एक संतुलित और संवेदनशील व्यवस्था बना सकता है। इस दृष्टि से यह अध्ययन न केवल भारत के लिए, बल्कि वैश्विक स्तर पर तुलनात्मक कानून के लिए भी योगदान देता है।

इस शोध की महत्ता इस बात में भी है कि यह विद्यमान शोध की सीमाओं को भरने का प्रयास करता है। अब तक हुए अधिकांश अध्ययन या तो केवल संवैधानिक प्रावधानों पर केंद्रित रहे हैं या फिर केवल सामाजिक दृष्टिकोण से बहस करते हैं। लेकिन यह शोध इन दोनों दृष्टिकोणों को मिलाकर एक समग्र

विश्लेषण प्रस्तुत करता है। यह अध्ययन यह दर्शाता है कि समान नागरिक संहिता केवल कानूनी प्रश्न नहीं है, बल्कि यह सामाजिक न्याय, लैंगिक समानता, अल्पसंख्यक अधिकारों और संवैधानिक मूल्यों से जुड़ा हुआ एक जटिल और बहुआयामी विषय है।

भविष्यगत प्रासंगिकता समान नागरिक संहिता और धार्मिक स्वायत्तता के बीच संतुलन का प्रश्न केवल वर्तमान समय में ही नहीं, बल्कि भविष्य में भी भारतीय विधि और समाज के लिए अत्यंत प्रासंगिक रहेगा। भारतीय समाज निरंतर परिवर्तनशील है, और इसके साथ परिवार, विवाह, उत्तराधिकार तथा व्यक्तिगत कानूनों की संरचना भी बदलती जा रही है। ऐसे में यह शोध भविष्य में विधायिका, न्यायपालिका और समाज – तीनों के लिए एक मार्गदर्शक की भूमिका निभा सकता है। जैसे-जैसे भारत आधुनिकता की ओर बढ़ रहा है, वैसे-वैसे व्यक्तिगत कानूनों के कारण उत्पन्न असमानताएँ और सामाजिक चुनौतियाँ और गहराती जाएँगी। इस संदर्भ में यह अध्ययन इस प्रश्न का उत्तर देने में सहायक होगा कि समानता, न्याय और धार्मिक स्वतंत्रता के बीच संतुलन किस प्रकार साधा जा सकता है।

आने वाले समय में समान नागरिक संहिता केवल विवाह और तलाक तक सीमित नहीं रहेगी, बल्कि यह लिव-इन रिलेशनशिप, समान-लैंगिक विवाह, सरोगेसी और गोद लेने जैसे समकालीन विषयों पर भी प्रभाव डालेगी। भारतीय न्यायपालिका पहले ही संकेत दे चुकी है कि व्यक्तिगत कानूनों को समयानुकूल बनाने की आवश्यकता है। सुप्रीम कोर्ट द्वारा शाह बानो, सरला मुद्गल और शायरा बानो जैसे मामलों में दिए गए निर्णय इस दिशा में महत्वपूर्ण मील के पथर साबित हुए हैं। भविष्य में भी न्यायपालिका इसी प्रकार सुधारवादी दृष्टिकोण अपनाएगी, लेकिन केवल न्यायिक हस्तक्षेप पर्याप्त नहीं होगा। इसके लिए विधायी सुधार आवश्यक हैं, और इस शोध के निष्कर्ष नीति-निर्माताओं को एक व्यावहारिक और संतुलित दृष्टिकोण अपनाने की दिशा दिखा सकते हैं।

अल्पसंख्यक अधिकारों की सुरक्षा भविष्य में और भी महत्वपूर्ण हो जाएगी। यदि समान नागरिक संहिता लागू की जाती है तो अल्पसंख्यकों के धार्मिक विश्वास और सांस्कृतिक पहचान पर इसका गहरा प्रभाव पड़ेगा। ऐसे में यह अध्ययन यह स्पष्ट करेगा कि किस प्रकार भारतीय संविधान के मूल मूल्य – समानता, स्वतंत्रता और न्याय – को अल्पसंख्यकों की धार्मिक स्वायत्तता के साथ संतुलित किया जा सकता है। भविष्य की नीतियों के लिए यह अत्यावश्यक होगा कि वे किसी विशेष समुदाय पर थोपे जाने वाले कानून का रूप न लें, बल्कि सर्वसम्मति और संवाद पर आधारित हों। इस शोध की प्रासंगिकता इसी में है कि यह यह दर्शाएगा कि UCC का वास्तविक उद्देश्य किसी धार्मिक पहचान को मिटाना नहीं, बल्कि सभी नागरिकों को समान अधिकार प्रदान करना है।

लोकतांत्रिक और धर्मनिरपेक्ष भारत के भविष्य के लिए भी यह विषय अत्यंत महत्वपूर्ण है। भारत की पहचान एक बहुलतावादी समाज के रूप में रही है, जहाँ विभिन्न धर्म, भाषाएँ और संस्कृतियाँ सह-अस्तित्व में हैं। यदि समान नागरिक संहिता का क्रियान्वयन संवेदनशीलता और सहमति के साथ नहीं किया गया, तो यह सामाजिक तनाव और असंतोष को जन्म दे सकता है। वहीं यदि इसे संवैधानिक संतुलन और व्यापक परामर्श के साथ लागू किया जाता है, तो यह भारतीय लोकतंत्र को और सुदृढ़ करेगा तथा भारत को वैश्विक स्तर पर एक प्रगतिशील और न्यायसंगत राष्ट्र के रूप में स्थापित करेगा। भविष्य में यह शोध इस संतुलन की आवश्यकता और संभावनाओं को रेखांकित करने में मदद करेगा।

अंतरराष्ट्रीय स्तर पर भी इस अध्ययन की उपयोगिता बनी रहेगी। विश्व के कई देशों ने एक समान नागरिक संहिता लागू कर लैंगिक समानता और सामाजिक न्याय की दिशा में प्रगति की है। फ्रांस और तुर्की जैसे देशों में यह एक आधुनिक और प्रगतिशील कदम माना गया, जबकि इज़राइल और पाकिस्तान जैसे देशों में धार्मिक व्यक्तिगत कानूनों की जकड़न आज भी विवाद का विषय बनी हुई है। भारत इन दोनों अनुभवों से सीख ले सकता है और अपनी परिस्थितियों के अनुरूप एक संतुलित व्यवस्था बना सकता है। इस दृष्टि से यह शोध भारत को वैश्विक स्तर पर तुलनात्मक कानून और मानवाधिकारों की बहस में भी योगदान देगा।

निष्कर्ष भारत जैसे बहुलतावादी और बहुधार्मिक समाज में समान नागरिक संहिता (Uniform Civil Code) का प्रश्न केवल एक कानूनी या संवैधानिक मुद्दा नहीं है, बल्कि यह सामाजिक, राजनीतिक और सांस्कृतिक विमर्श का भी एक महत्वपूर्ण हिस्सा है। संविधान निर्माताओं ने अनुच्छेद 44 में समान नागरिक संहिता को राज्य के नीति-निर्देशक तत्वों में शामिल किया था, जिसका उद्देश्य सभी नागरिकों के लिए एक समान विधिक ढांचा स्थापित करना था। किंतु, साथ ही संविधान ने अनुच्छेद 25 के तहत धार्मिक स्वतंत्रता को मौलिक अधिकार का दर्जा देकर अल्पसंख्यकों की धार्मिक स्वायत्तता को भी सुरक्षित किया। यही कारण है कि भारत में UCC का प्रश्न हमेशा संतुलन, संवाद और सहमति के साथ आगे बढ़ाने की आवश्यकता पर बल देता रहा है।

इस शोध से यह स्पष्ट हुआ कि व्यक्तिगत कानूनों की विविधता, विशेषकर विवाह, तलाक, उत्तराधिकार और भरण-पोषण जैसे विषयों पर, नागरिकों के बीच समानता और न्याय की अवधारणा में कई व्यावहारिक कठिनाइयाँ उत्पन्न करती है। विशेष रूप से महिलाओं और बच्चों के अधिकारों को लेकर धार्मिक कानूनों में मौजूद असमानताएँ आज के संवैधानिक और मानवाधिकार मानकों से मेल नहीं खातीं। ऐसे में समान नागरिक संहिता केवल विधिक सुधार का साधन नहीं, बल्कि सामाजिक न्याय और लैंगिक समानता को सुनिश्चित करने की दिशा में आवश्यक कदम है।

साथ ही यह भी निष्कर्ष निकलता है कि UCC के नाम पर धार्मिक स्वायत्तता की उपेक्षा नहीं की जा सकती। भारत की विविधतापूर्ण सांस्कृतिक और धार्मिक संरचना को देखते हुए, किसी भी एकरूप कानून को थोपने की बजाय संवाद, सहमति और क्रमिक सुधार की पद्धति अपनाना अधिक व्यावहारिक और लोकतांत्रिक मार्ग है। न्यायपालिका द्वारा दिए गए शाह बानो से लेकर शायरा बानो तक के निर्णय इस तथ्य को पुष्ट करते हैं कि व्यक्तिगत कानूनों में सुधार की आवश्यकता तो है, लेकिन इसका स्वरूप संवैधानिक मूल्यों के अनुरूप और अल्पसंख्यकों की धार्मिक पहचान का सम्मान करते हुए होना चाहिए।

अंतरराष्ट्रीय अनुभवों से यह भी सिद्ध होता है कि किसी भी देश में समान नागरिक संहिता का सफल क्रियान्वयन तभी संभव हुआ है जब उसे सामाजिक समर्थन और राजनीतिक इच्छाशक्ति दोनों का सहारा मिला। भारत में भी यही राह अपनाने की आवश्यकता है। UCC को सीधे लागू करने की बजाय इसे चरणबद्ध ढंग से, विशेष रूप से उन क्षेत्रों से शुरू करना चाहिए जहाँ समानता और न्याय की सर्वाधिक आवश्यकता है, जैसे—महिला अधिकार और उत्तराधिकार कानून।

अंततः कहा जा सकता है कि समान नागरिक संहिता और धार्मिक स्वायत्तता के बीच टकराव की बजाय संवैधानिक संतुलन की खोज करना ही इस विमर्श का वास्तविक समाधान है। यह संतुलन तभी संभव है जब राज्य, न्यायपालिका और समाज तीनों मिलकर संवाद की प्रक्रिया को आगे बढ़ाएँ और ऐसा विधिक ढाँचा तैयार करें जो समानता, न्याय और स्वतंत्रता जैसे संवैधानिक आदर्शों के अनुरूप हो। इस शोध का निष्कर्ष इस विचार पर बल देता है कि भारत के भविष्य के लिए UCC कोई थोपे गए कानून का नाम नहीं होना चाहिए, बल्कि यह सहमति, संवाद और संवैधानिक मूल्यों के आधार पर निर्मित एक ऐसा सामाजिक अनुबंध होना चाहिए, जो सभी नागरिकों को समान अवसर और अधिकार प्रदान करे और साथ ही अल्पसंख्यकों की धार्मिक पहचान को भी सुरक्षित रखे।

संदर्भ सूची (Bibliography)

किताबें (Books)

1. M.P. Jain, Constitution of India, 8th Edition, Lexis Nexis, 2025
2. Basu, Durga Das. Introduction to the Constitution of India. Lexis Nexis, 2022.
3. Austin, Granville. The Indian Constitution: Cornerstone of a Nation. Oxford University Press, 2008.
4. Seervai, H.M. Constitutional Law of India. Universal Law Publishing, 2013.
5. Baxi, Upendra. Law and Social Transformation in India. Vikas Publishing House, 2007.
6. Mahajan, V.D. Constitutional Law of India. Eastern Book Company, 2021.

जर्नल आर्टिकल्स (Journal Articles)

1. Mahmood, Tahir. "Uniform Civil Code: Fictions and Facts." Journal of the Indian Law Institute, Vol. 35, No. 3 (1993).
2. Khan, Faizan Mustafa. "Personal Laws and the Constitution of India." Economic and Political Weekly, Vol. 40, No. 9 (2005).
3. Agnes, Flavia. "From Shah Bano to Kausar Bano: Contextualizing the 'Muslim Woman.'" South Asian Journal of Law, Vol. 12 (2011).

न्यायिक निर्णय (Case Laws)

1. Mohd. Ahmed Khan v. Shah Bano Begum (1985) 2 SCC 556.

2. Sarla Mudgal v. Union of India (1995) 3 SCC 635.
3. Shayara Bano v. Union of India (2017) 9 SCC 1.
4. John Vallamattom v. Union of India (2003) 6 SCC 611.

सरकारी व विधिक स्रोत (Government & Legal Sources)

- संविधान सभा की बहसों (Constituent Assembly Debates), वॉल्यूम VII, 1948-49.
- भारत का संविधान, 1950.
- विधि आयोग की 21वीं रिपोर्ट: Reform of Family Law in India, 2018.

ऑनलाइन स्रोत (Online Sources)

- Ministry of Law and Justice, Government of India. <https://legalaffairs.gov.in>
- Supreme Court of India Judgments. <https://main.sci.gov.in>
- LiveLaw and Bar & Bench (Online Legal News Portals)



उर्दू विभाग में प्रो० असलम जमशेदपुरी के साथ इमामा फनकार राशिद यूसुफ, अनिल शर्मा, भारत भूषण शर्मा, हेमन्त गोयल, जितेन्द्र सीराज, डा० शादाब अलीम व डा० अल्का वशिष्ठ

7. मेरठ की 1857 की क्रान्ति में स्वतंत्रता सेनानी मातादीन वाल्मीकि का योगदान

डॉ० सिरिल गोरन
पोस्ट डॉक्टोरल फेलो
इतिहास विभाग
आर०जी० (पी०जी०) कॉलेज, मेरठ
sirilgauran@gmail.com

Abstract

19वीं शताब्दी के मध्य में यूरोपिया महाद्वीप के विभिन्न भागों में बहुत व्यापक स्तर पर भारत में 1857-1858 का विद्रोह शामिल किए जाते हैं। 1848 की क्रांतियाँ, चीन में ताइपिंग विद्रोह और उत्तरी-भारत में 1857-1858 का विद्रोह शामिल किये जा सकते हैं इनमें कोई राजनीतिक अथवा पारिस्थितिकी सम्बन्ध दिखाई नहीं देता। फिर भी इनके स्वरूप, फैलाव और परिणामों में काफी समानताएं देखने में आती हैं। ये सभी एक व्यापक लहर के रूप में उभरे तथा इनमें जनता के एक बड़े भाग ने हिस्सा लिया। कुछ समय के लिए इन्होंने अपने-अपने क्षेत्रों में सरकारों को हिलाकर रख दिया। इतिहासकार इनमें से किसी के भी मान्य कारण नहीं दे पाये हैं। ये सभी विद्रोह तत्कालीन उद्देश्यों को प्राप्त करने में असफल रहें और सरकारें शीघ्र ही इन विद्रोह को दबाने में सफल हो गयी। फिर भी इन विद्रोह को अपने-अपने देशों के इतिहास में निर्णायक मोड़ माना गया है। इन सभी विद्रोह ने जन-मानस पर अमित छाप छोड़ी। सभी जगह आने वाली पीड़ियों ने इस सम्बन्ध की घटनाओं से प्रेरणा ग्रहण की। इन विद्रोह से इन देशों के शासक वर्ग की चेतना में निचले तबको द्वारा हिंसा का डर घर कर गया। 10 मई, 1857 ई० को मेरठ से आरम्भ होने वाला 1857 का महान विद्रोह उस साल के इतिहास की सबसे बड़ी घटना ही नहीं थी, अपितु दुनिया भर में अंग्रेजी राज और उपनिवेशवादी व्यवस्था के खिलाफ 19वीं सदी की सबसे बड़ी क्रान्ति भी थी, जिसने ब्रिटिश शासन की जड़ें हिलाकर रख दी।

मुख्य शब्द— उपनिवेशवाद, विद्रोह, क्रान्ति, असन्तोष

मेरठ उत्तर प्रदेश राज्य का जिला है, जो राष्ट्रीय राजधानी क्षेत्र के अन्दर आता है। मेरठ दोआब क्षेत्र में बसा जिला है जिसकी प्राचीन काल से बड़ी गाथा सुनी जा रही है, मेरठ का नाम “मय” नामक असुर के नाम पर पड़ा है मयराष्ट्र मेरठ का प्राचीन नाम हुआ करता था जिस पर ‘मय’ नामक दानव का आधिपत्य था। त्रेतायुग की बात करे तो मेरठ में रावण की पत्नी मंदोदरी का मायका होता था जो रावण की ससुराल बना। महाभारत काल में कौरवों की राजधानी हस्तिनापुर थी जो कि वर्तमान में मेरठ जिले के अन्तर्गत आती है मध्ययुग में मेरठ की दिल्ली (इन्द्रप्रस्थ) की निकटता के कारण भारत के राष्ट्रीय महत्व के कार्यों में इसकी महत्वपूर्ण भूमिका रही है। मेरठ को खेल नगरी के नाम से भी जाना जाता है। मेरठ का सर्राफा बाजार एशिया महाद्वीप में अपनी विशेष पहचान बनाये हुए है। मेरठ जिले में तीन तहसील आती हैं— मेरठ तहसील, सरधना तहसील, मवाना तहसील। मेरठ में 12 ब्लॉक हैं। मेरठ की आबादी 2011 की जनगणना के अनुसार 3,443,89 है।

भारत में महाविद्रोह का प्रारम्भ 10 मई, 1857 को हुआ जब मेरठ में सैनिकों ने चर्बी वाले कारतूसों के प्रश्न पर अपने ब्रिटिश अफसरों को मार डाला, अपने साथियों को रिहा करवाया और दिल्ली की तरफ बढ़ निकले। दिल्ली पहुंचकर उन्होंने मुगल सम्राट बहादुरशाह जफर को जिनके पास मुगलों का नाम व गद्दी तो थी परन्तु सत्ता नहीं थी, नेतृत्व प्रदान करने के लिए राजी कर लिया। शीघ्र ही बिजली की गति से एक बहुत बड़े क्षेत्र में विद्रोह होने लगे। हरियाणा से पश्चिम बिहार तक सारा क्षेत्र इसकी लपेट में आ गया और भारत के अन्य भागों में भी स्थान-स्थान पर विद्रोह हुए। कहा जा सकता है कि यह विद्रोह सम्पूर्ण भारत में नहीं फैला परन्तु भारत जैसे विस्तृत देश का यह चौथाई से कम भाग भी पश्चिमी

यूरोप के किन्हीं भी दो देशों से क्षेत्रफल, वह जनसंख्या में अधिकतर किसानों व जमींदारों ने भी सैनिकों के साथ-साथ विद्रोह में बढ़-चढ़कर भाग लिया। इस महा विद्रोह की विशेषता थी सरकार विद्रोही भावना की सक्रिय अभिव्यक्त थी। स्थान-स्थान पर अंग्रेजी राज्य के चिन्ह तक मिला देने का प्रयास किया।

अंग्रेजों को भी लगने लगा कि भारत उनके हाथ से निकलता जा रहा है। स्वयं गवर्नर जनरल कैनिंग पूर्ण विजय की बात करने लगे। परन्तु डेढ़ साल के भीतर ही जिस गति से ये फैला था उसी गति से सरकार इसे दबाने में सफल भी हो गयी। सन् 1860 तक शासक व शासित दोनों ही अपने-अपने कार्यों में जुट गये। परन्तु इस विद्रोह की याद कभी मिटी नहीं इसके बाद अंग्रेज इस तथ्य के प्रतीक पूर्ण रूप से सजग रहे कि वे भारत पर शासन भारतीयों के इच्छा से नहीं बल्कि जबदरस्ती बनाये हुए है। दूसरी और भारतीय इस समय दर्शायी गयी वीरता और बलिदान की भावनाओं को नहीं भूले।

इसके युद्ध के बाद से अंग्रेजी कम्पनी ने भारत पर सीधे तौर पर राज करना आरम्भ कर दिया। 1757 से लगातार भारतीय राजाओं की आपसी फूट तथा अकर्मण्यता के कारण अंग्रेजी कम्पनी फायदा उठाकर ब्रिटिश शासन देशी राज्यों पर लादती जा रही थी। जहाँ-जहाँ कम्पनी का शासन स्थापित होता अन्य कठिनाईयां भारत की जनता की बढ़ती जाती। 100 वर्षों के लगातार असहनीय स्थिति में जीवनयापन करती हुई भारतीय जनता का विद्रोह मध्ययुग के सबसे बड़े विद्रोह 1857 के सैनिक विद्रोह के रूप में फूट पड़ा। इसके कारणों में जनआक्रोष व डलहौजी की राज्य विस्तार नीति ने अहम योगदान किया। भारत की प्रमुख सल्तनत अवध को लार्ड डलहौजी ने 1856 में ब्रिटिश राज्य में मिला दिया। अवध को ब्रिटिश राज्य का हिस्सा बनाते समय नवाब पर आरोप लगाया कि नवाब व उसके तालुकदारों ने जनता का उत्पीड़न कर रखा है। यदि अंग्रेजी शासन लागू किया गया तो निःसंदेह लोगों को राहत मिलेगी परन्तु जनता को कोई राहत नहीं मिली। अब आम आदमी पर पहले से अधिक भूराजस्व और खाद्य सामग्रियाँ, मकानों, नौकाओं, अफीम तथा न्याय पर अधिक कर देने को मजबूर गया। झांसी के महाराज का देहान्त हो गया था वहाँ की वीरांगना महारानी लक्ष्मीबाई ने एक दत्तक पुत्र राजा बनाना चाहा परन्तु अंग्रेजों ने इस बात को नहीं माना और झांसी को अपने अधीन कर दिया। नागपुर राज्य का अपहरण भी अत्याचार का एक ज्वलन्त प्रमाण था नागपुर से 40 लाख रुपया राजस्व से प्राप्त होता था अतः अंग्रेज अपने साम्राज्य का विस्तार करने के हर। कुटनीति का सहारा सेना अनुचित वही समझते थे इसलिए उन्होंने नागपुर के राजा पर अव्यवस्था तथा कुशासन का आरोप लगाकर नागपुर को अपने राज्य में मिला लिया। सिन्ध विजय भी एक निर्लज्जतापूर्ण बदमाशी और विश्वासघातपूर्ण आक्रमण था। सिन्ध अमीरों के विरुद्ध जाली दस्तावेजों के आधार पर झूठे अभियोग लगाए गये और ब्रिटिश सेना की बंदूकों ने ब्लूचियों को भूनकर रख दिया। ब्लूचियों ने बड़ी वीरता के साथ लड़ाई की पर उनके पुराने जमाने यानी तलवार और भाले बन्दूकों के आगे बेकार थे। सिन्ध पर आक्रमण को नैपियर ने मजाक का रूप देने की कोशिश की मगर उसकी आड़ में सबसे बड़ा कारण पामर्सटन के शब्दों में “हिन्दुओं और सिक्खों के मिलन को भारत में जहाँ तक हो सके रोके रखना।” अंग्रेज भारतीयों पर बहुत अत्याचार करते हैं वे कर के रूप में उनको परेशान करने थे उनके ऊपर टैक्स लगा रखे थे जिसे भारतीय जनता देने में असहमत थी इसी नीति का भारतीय जनता पर बहुत बुरा प्रभाव पड़ा, फलस्वरूप 1854 में मि० ब्लैमेर ने ब्रिटिश संसद में कहा “दुःखी रैयत दानवी वसूली की चक्की में पिस रही है। लोगों की बुरी हालत है जनता शारीरिक व मानसिक रूप से बिल्कुल परत हुई कर्ज एवं अभाव में दबी हुई तथा गरीबी, मुसीबत और भुखमरी के गर्त में गिरी हुई है।”

अंग्रेज भारतीयों से ही नहीं उनकी संस्कृति, धर्म सभी से घृणा करते थे। हिन्दू धर्म के दार्शनिक तत्वों, ईसाई मिशनरी और उसके आचार विचार सभी बातों की निन्दा करते नहीं थकते थे। बहुत से फौजी और भारत के काफिरों का उद्धार करना अपना कर्तव्य मानते थे। भारतवासियों के लिए धर्म सबसे मुख्य बात थी इसी कारण अधिकांश भारतीयों में धर्मसंकट

की भावना आ गयी। धर्म पर खतरा, विद्रोह का एक जबर्दस्त कारण बना क्योंकि हिन्दू अपने धर्म को जीवन का मुख्य स्रोत समझते थे और अपने अस्तित्व की नींव समझते थे और साम्राज्यवादी शोषण के प्रति असंतोष की पराकष्टा के रूप में सामने आया था। 1857 का आम असंतोष का मसाला तैयार था, बस सिपाही चिंगारी की जरूरत थी यह चिंगारी चर्बी लगे कारतूसों की घटना थी। नई इनफील्ड राइफल फौज को पहली बार दी गई, उसके कारतूसों पर चिकनाई लगा होता था, जिसके किनारों को दांतों से काटना पड़ता था और फिर कारतूसों को राइफल में भरना होता था। इन चिकनाई वाले कागज में गोमांस और सुअर की चर्बी मिली होती थी। दोनों हिन्दू और मुसलमानों सिपाही इसे देखकर गुस्से से भड़क उठे। चिकनाई वाले कारतूसों के इस्तेमाल से उनके धर्म को खतरा पैदा हो गया। यह अंग्रेजी कार्य भारतीयों को धर्म भ्रष्ट करता था। 26 फरवरी, 1857 को बुरहानपुर में 19 नेटिव इन्फैन्ट्री ने इस प्रश्न पर बगावत करने की कोशिश की। इस प्रश्न पर मंगल पाण्डे ने अकेले ही अंग्रेज अफसर पर हमला कर दिया। उसके साथियों ने इस बगावत में हिस्सा नहीं लिया परन्तु उन्होंने अंग्रेज अफसर की सहायता करने की भी कोशिश नहीं की। इसके पश्चात् सेना की इन टुकड़ियों को भंग कर दिया।

सैनिक को चेतावनी देने के उद्देश्य से इन्हें बर्खास्त करने का आदेश सब टुकड़ियों में पढ़कर सुनाया गया। परन्तु इससे सैनिक घबराये नहीं। वास्तव में इस कदम का प्रभाव उल्टा ही हुआ लोगों ने सरकार की अवज्ञा करने वाले इन सैनिकों को कृतघ्न नहीं बल्कि साहसी माना। सरकार का रवैया क्रूर व अन्यायपूर्ण प्रतीत हुआ। बगावत करने वाले सैनिक भी शायद सरकार को चुनौती देने की नहीं सोच रहे थे बल्कि धर्मभ्रष्ट होने से बचना चाहते थे। परन्तु उस समय सरकार की राजनीतिक, आर्थिक, सामाजिक व धार्मिक नीतियों से भारतीयों को ऐसा लगने लगा था कि उनके परंपरागत मूल्यों, धारणाओं व सामाजिक व्यवस्था पर प्रहार किये जा रहे हैं। लोग सोचने लगे थे कि अपनी संस्कृति की रक्षा के लिए कुछ करना आवश्यक है। इस पृष्ठभूमि में सैनिकों के सरकारी विरोधी कारनामों से विद्रोह भड़क उठा। 1857 का भारतीय विद्रोह, जिसे प्रथम भारतीय स्वतंत्रता संग्राम, सिपाही विद्रोह और भारतीय विद्रोह के नाम से जाना जाता है। ब्रिटिश शासन के विरुद्ध एक सशस्त्र विद्रोह था यह विद्रोह दो वर्षों तक भारत के विभिन्न क्षेत्रों में चला इस विद्रोह का आरम्भ छावनी क्षेत्रों में छोटी झड़पों से प्रारम्भ हुआ परन्तु इसने बड़ा रूप ले लिया।

मातादीन भंगी मूलतः मेरठ के रहने वाले थे, लेकिन रोजी-रोटी के लिए इनके पूर्वजों ने उत्तर प्रदेश के कई शहरों की खाक छानी और एक समय बंगाल में जाकर बस गए, उस समय की सामाजिक परिस्थितियों के कारण वे पढ़ लिख नहीं पाए थे, क्योंकि हिन्दू धर्म व्यवस्था एक भंगी को पढ़ने का अधिकार नहीं देती थी, हालांकि मातादीन के पुरखे शुरु से ही अंग्रेजों के संपर्क में आने से सरकारी नौकरी में रहे थे, अतः शीघ्र ही मातादीन को भी बैरकपुर फैक्ट्री में खलासी की नौकरी मिल गई, यहां अंग्रेज सेना के सिपाहियों के लिए कारतूस बनाए जाते थे, अंग्रेजी फौज के निकट रहने के कारण मातादीन के जीवन पर उसका खासा असर पड़ा था, अनुशासन, संयम, स्वाभिमान, स्पष्टवादिता आदि गुण उन्होंने सैनिकों की संगत से ही पाए थे।

बैरकपुर छावनी कलकत्ता (वर्तमान में कोलकाता) से मात्र 16 कि०मी० दूरी पर स्थित है। इस हथियार फैक्ट्री में अंग्रेजी सेना में सिपाहियों के लिए कारतूस बनाए जाते थे। अंग्रेजी सेना के निकट रहने के कारण मातादीन के जीवन पर उसका खास असर भी पड़ा। अनुशासन, संयम, स्वाभिमान, स्पष्टवादिता आदि गुण उन्होंने सैनिकों को संगत से ही पाए थे। अंग्रेजी सेना के सम्पर्क में रहने से मातादीन को वहां की सारी गतिविधियों की जानकारी रहती थी।

1857 की क्रान्ति के सूत्रधार

मातादीन वात्सीकि को 1857 ई० की क्रान्ति का प्रणेता एवं सूत्रधार माना जाता है। एक दिन गर्मी से तर-बतर, थके-मांदे मातादीन ने मंगल पाण्डे से पानी का लोटा मांगा

मंगल पाण्डे ने इसे एक अछूत का दुस्साहस समझने हुए कहा कि “अरे भंगी, मेरा लोटा छूकर अपवित्र करेगा क्या?” इसके प्रति उत्तर में मातादीन ने मंगल पाण्डे को ललकारते हुए कहा कि “कैसा है तुम्हारा धर्म जो एक प्यासे को पानी पिलाने की इजाजत नहीं देता और गाय, जिसे तुम माँ मानते हो तथा सूअर, जिससे मुसलमान नफ़रत करते हैं, उन्हीं के चमड़े और चर्बी से बने कारतूसों को मुंह से काटकर बंदूकों में भरते हो।” मंगल पाण्डे वह चुनकर चकित रह गए। इसके बाद उन्होंने मातादीन को सम्मान से पानी पिलाया।

प्रति उत्तर में मातादीन ने मंगल पांडे ललकार दिया और कहा कि पंडित, तुम्हारी पंडिताई उस समय कहा चली जाती है जब तुम और तुम्हारे जैसे चुटियाधारी गाय और सूअर की चर्बी लगेकारतूसों को मुंह से काटकर बंदूकों में भरते हो,” मातादीन की ये बातें मंगल पाण्डे तक ही सीमित नहीं रही बल्कि एक बटालियन से दूसरी बटालियन, एक छावनी से दूसरी छावनी तक फैलती चली गई, इन्हीं शब्दों ने सेना में विद्रोह की स्थिति बना दी, 1 मार्च, 1857 को मंगल पाण्डे परेड मैदान में लाईन से निकल बाहर आया और एक अधिकारी को गोली मार दी, इसके बाद विद्रोह बढ़ता चला गया, मंगल पाण्डे को फांसी पर लटका दिया गया, जो गिरफ्तार हुए उनमें मातादीन प्रमुख थे, मातादीन को भी अंग्रेज ऑफिसर ने फांसी पर लटका दिया।

मातादीन वाल्मीकि ईस्ट इण्डिया कम्पनी की कारतूस निर्माण फैक्ट्री में सफाई कर्मि का काम इसलिए करते थे, क्योंकि उस समय चमड़े और मृत जानवरों की खाल करना निम्न जातियों का व्यवसाय माना जाता था। रुढ़िवादी उच्च जाति के हिन्दू उन्हें अपवित्र मानते थे। जब देश के स्वतंत्रता आन्दोलन की बात छिड़ती है, तो समाज के कमजोर वर्ग के लोग उसमें कहीं नहीं दिखते। जो लोग अंग्रेजों के साथ रहे वे ‘राय साहब’, ‘राय बहादुर’ तथा ‘खान बहादुर’ आदि की उपाधियों से सुसज्जित होते रहे। उन्हें देश भक्तों की श्रेणी में ला दिया गया, जबकि उनके ऊपर न जाने कितने क्रान्तिकारियों के खून का कर्ज चढ़ा है सवाल्टर्न इतिहाकारों का मानना है कि “मातादीन वाल्मीकि को 1857 ई0 को विद्रोह के पीछे का असली चेहरा माना जाना चाहिए। ऐसा इसलिए क्योंकि वे ही वह व्यक्ति थे जिन्होंने मंगल पाण्डे को इस तथ्य से अवगत कराया कि अंग्रेजों द्वारा जाने-अनजाने में उनकी धार्मिक भावनाओं को ठेस पहुंचाई जा रही है।” इस प्रकार वे पहले व्यक्ति थे जिन्होंने 1857 ई0 की क्रान्ति के बीज बोए। इस प्रकार कहा जा सकता है कि मातादीन वाल्मीकि एक बड़े देशभक्त तथा महान् स्वतंत्रता संग्राम सेनानी एवं क्रान्तिकारी थे। उन्होंने 1857 ई0 की क्रान्ति का सूत्रधार कहा जाए तो कोई अतिशयोक्ति नहीं होगी।

संदर्भ ग्रन्थ सूची

1. डॉ0 सिंह, देवेन्द्र कुमार, “आधुनिक भारत का इतिहास”, शिप्रा प्रकाशन, दिल्ली, 2013, पृष्ठ 113-114
2. शुक्ल, आर0एल0, “आधुनिक भारत का इतिहास”, हिन्दी माध्यम कार्यान्वयन निदेशालय, दिल्ली विश्वविद्यालय, 1996, पृष्ठ 238-240
3. डॉ0 भटनागर, ममता रानी, भारत का महान प्रथम स्वतंत्रता संग्राम एवं उसके आर्थिक कारण, 2012, दुर्गा पब्लिकेशन्स, दिल्ली, पृष्ठ 13-14
4. डॉ0 चौहान, राजेश, “19वीं सदी में भारत में सामाजिक-धार्मिक परिवर्तन, साध प्रकाशन आणंद, 2013, पृष्ठ 50
5. डॉ0 सिंह, देवेन्द्र कुमार, “आधुनिक भारत का इतिहास”, शिप्रा प्रकाशन, दिल्ली, 2013, पृष्ठ 373-376

6. डॉ० कुमार, महेन्द्र, "भारत के राष्ट्रीय क्रान्तिकारी आन्दोलन, दिण्यम् प्रकाशन, नई दिल्ली, 2017, पृष्ठ 9-10
7. भारत की राष्ट्रीय, सामाजिक, धार्मिक चेतना के विकास में आर्य समाज का अवदान, डॉ० पुष्पांजलि, श्री घुडमल प्रहलाद कुमार आर्य धर्मार्थ न्यास प्रकाशन, राजस्थान, 2013, पृष्ठ 15-16
8. स्वतन्त्रता आन्दोलन में पूर्वी उत्तर प्रदेश और महात्मा गांधी, डॉ० कुमार आलोक, डॉ० सिंह पूनम, संजय प्रकाशन, नई दिल्ली, 2011, पृष्ठ 79
9. चन्द्र विपिन, भारत का स्वतंत्रता संघर्ष, हिन्दी माध्यम कार्यान्वयन निदेशालय, दिल्ली विश्वविद्यालय, दिल्ली 2014, पृष्ठ 1, 4, 5
10. ताराचन्द्र, भारतीय स्वतन्त्रता आन्दोलन का इतिहास, खण्ड, 1-4, दिल्ली, 1977, पृष्ठ 10-12
11. भट्टाचार्य, सब्यसांची, "आधुनिक भारत का आर्थिक इतिहास, 1850-1947, दिल्ली, 1990, पृष्ठ 20
12. दत्त, रजनी पाम, "आज का भारत" 8, दिल्ली, 1977, पृष्ठ 50
13. शर्मा, रामविलास, "भारत में अंग्रेजी राज्य और मार्क्सवाद, खण्ड-2, दिल्ली, 1982, पृष्ठ 28
14. नायक, जे०पी० व नूरुल्ला सैयद, भारतीय शिक्षा का इतिहास (1800-1973), दिल्ली-1976



उर्दू विभाग में एक दिवसीय राष्ट्रीय संगोष्ठी के दौरान प्रो० आबिद हुसैन हैदरी की किताब के विमोचन करते हुए अतिथिगण

8. भारतीय राजनीति में मीडिया की भूमिका : एक अध्ययन

डॉ धनपाल
सहायक आचार्य विधि अध्ययन संस्थान
चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय मेरठ
विश्वविद्यालय मेरठ
Mel ID dr dhanpal singh 19@gmail-com

मनीष कुमार शोध छात्र
राजनीति विज्ञान विभाग
चौधरी चरण सिंह

सारांश

मीडिया जनसमूह तक सूचना, शिक्षा और मनोरंजन पहुंचाने का एक माध्यम है। यह संचार का सरल एवं सक्षम माध्यम है। जिसके द्वारा देश-विदेश की जानकारी, डाटा को एक साथ लाखों लोगों तक पहुंचाया जा सकता है। प्राचीन काल में लोग अपनी बात दूसरों तक पहुंचाने के लिए नृत्य, संगीत, नृत्यनाटिका आदि का प्रयोग करते थे। समय के साथ इसमें बदलाव आया और लोग अपनी बातों को आधुनिक संचार माध्यमों द्वारा व्यक्त करने लगे, जिसे मीडिया कहा जाता है। यह एक सशक्त एवं महत्वपूर्ण संस्था है। यह किसी भी समाज या राष्ट्र का प्रतिबिम्ब होता है, तथा राष्ट्र या समाज के राजनीतिक, सामाजिक, आर्थिक व सांस्कृतिक गतिविधियों को प्रतिबिम्बित करता है। इसने सदैव मानव के विचारों एवं व्यवहारों को प्रभावित किया है। विभिन्न देशों में होने वाली राजनैतिक व सामाजिक क्रांतियों में इसकी महत्वपूर्ण भूमिका रही है। इसी कारण ब्रिटिश विचारक आमण्ड वर्क ने इसे लोकतंत्र का चौथा स्तम्भ कहा है।

मुख्य शब्द: मीडिया, प्राचीन काल, राजनीतिक, सामाजिक, आर्थिक

1. प्रस्तावना

प्रजातंत्र का मूलाधार है—स्वतंत्रता, समानता और बन्धुत्व और जहां कहीं भी विचार और अभिव्यक्ति की स्वतंत्रता की पूर्ण स्वतंत्रता नहीं होती है वहां लोकतंत्र असफल हो जाता है। इस स्वतंत्रता का सही ढंग से प्रयोग मीडिया द्वारा ही किया जाता है। देश के सभी कोनों और घटनाओं पर इसकी पैनी दृष्टि होने के कारण ही शक्तिशाली शासक भी इसके महत्व एवं शक्ति की उपेक्षा नहीं कर पाते। इतिहास में ऐसे अनगिनत उदाहरण मिलते हैं, जब इसकी शक्ति को पहचानते हुए लोगों ने इसका उपयोग लोक परिवर्तन के भरोसेमंद हथियार के रूप में किया है।

आज भी इसकी ताकत के सामने बड़े से बड़ा नेता, उद्योगपति आदि सभी नतमस्तक हैं। जन जागरण में भी इसकी महत्वपूर्ण भूमिका है—बच्चों को पोलियो की दवा पिलाने का अभियान, एड्स के प्रति जागरूकता फैलाने का कार्य लोगों को वोट डालने के लिए प्रेरित करना, बाल मजदूरी पर रोक लगाने के लिए प्रयास करना, धूम्रपान के खतरों से अवगत कराना जैसे नेक कार्यों में इसकी सराहनीय भूमिका रही है।

इसके अलावा यह देश के भ्रष्टाचारियों पर भी नजर रखती है, तथा समय-समय पर स्टिंग आपरेशन कर इन सफेदपोशों का काला चेहरा समाज के समक्ष प्रस्तुत करती है। इस प्रकार यह एक वरदान की तरह है। मीडिया का यथार्थ जानने की कोशिश करना ठीक वैसा ही है जैसे ब्रम्ह के यथार्थ को जानने का प्रयास करना, यह अनुभव मात्र की वस्तु है यह अनुभवगम्य है तथा इन्द्रियातीत है। मनुष्य के सीधे-सादे जीवन को मीडिया ने केवल प्रभावित ही नहीं किया है वरन् परिवर्तित भी किया है।

जिज्ञासा और संचार मनुष्य की मूल प्रवृत्ति है। एवं आदिकाल से ही मनुष्य देश-दुनिया, समाज और ब्रह्माण्ड के बारे में जानने को उत्सुक रहा है, तथा अपनी उत्सुकता को शांत करने के लिए वह धार्मिक प्रवचन, कथा-वार्ता, यात्र-वृत्तांत और पर्यटन का सहारा प्रारम्भिक युग से ही लेता आ रहा है। परन्तु कालान्तर में सभ्यता के विकास और भाषा के आविष्कार के साथ मनुष्य की जिज्ञासा शांत करने की प्रक्रिया का स्वरूप भी परिवर्तित होता

रहा, तथा सभ्यता के विकास के साथ वे बोलकर, गाकर तथा अभिनय द्वारा विचारों का आदान-प्रदान करने लगे। भाव सम्प्रेषण की इस प्रक्रिया को संचार कहा जाता है। इसके लिए किसी न किसी माध्यम का होना आवश्यक है। आदिकालीन समाज में जहाँ संकेतों-प्रतीकों का आश्रय लिया जाता था वहीं सभ्यता के विकास के साथ धार्मिक कथाएँ, प्रवचन, गीत, संगीत, पत्र, पत्रिकाएँ, पुस्तकें, रेडियो, टेलीविजन और कम्प्यूटर आदि संचार माध्यमों के रूप में हैं।

1. भारत में संचार माध्यम (मीडिया):-

एक स्वस्थ लोकतांत्रिक राष्ट्र के लिए यह आवश्यक है कि वहाँ की मीडिया सशक्त, निष्पक्ष एवं दबाव मुक्त हो, चूँकि लोकतंत्र में जनहित को वरीयता दी जाती है, अतएव लोकतांत्रिक व्यवस्था में इसकी जिम्मेदारी कहीं अधिक बढ़ जाती है। चूँकि मीडिया को जनता की आवाज माना जाता है, इसलिए उससे निष्पक्षता एवं निर्भीकता की अपेक्षा लोकतंत्र के रक्षक के रूप में की जाती है। इसका निष्पक्ष एवं तटस्थ होना तथा सच से प्रतिबद्ध होना जरूरी है। लोकतंत्र में मीडिया को चतुर्थ जनशक्ति का स्थान इस लिए दिया गया है कि यह जनहितों की पैराकारी करते हुए सदैव लोकतंत्र को सार्थक आयाम देने के लिए कटिबद्ध रहता है।

भारतीय संविधान में यद्यपि अलग से मीडिया की स्वतंत्रता का कोई उल्लेख नहीं है, परन्तु अभिव्यक्ति की स्वतंत्रता में ही मीडिया की भी स्वतंत्रता अन्तर्निहित है। यह स्थिति भारतीय मीडिया के लिए विशेष लाभकारी और स्वस्थ लोकतंत्र के निर्माण की दृष्टि से महत्वपूर्ण है।

भारत में जनसंचार की अवधारणा काफी पुरानी है। श्री वी० एन० मल्हन ने भारत की संचार व्यवस्था को महर्षि नारद तथा संजय जैसे चरित्रों से जोड़कर मौर्यवंश तथा मध्यकालीन भारत की संचार व्यवस्था का विस्तार से वर्णन किया है, जिस भोजन और पानी। यह एक अत्यन्त व्यापक अवधारणा है, जिससे मनुष्य द्वारा अभिव्यक्ति के सभी

प्रकार के माध्यम— शब्द, चित्र, संगीत, अभिनय, मुद्रण आदि समाहित किये जा सकते हैं। संचार उतना ही पुराना है जितना पुराना मानव इसके लिए भाषा का माध्यम बनना अनिवार्य नहीं है। संकेत, हाव-भाव, ध्वनियाँ, गीत, नृत्य सभी के द्वारा संवाद स्थापित किया जा सकता है। यह एक सहज प्रवृत्ति है। समस्त प्राणी जगत संचार की एक लम्बी नैसर्गिक शृंखला से जुड़ा हुआ है अर्थात् ऐसा कोई भी क्षण नहीं होता, जब हम संचार की प्रक्रिया से न गुजर रहे हों।

भारतीय मीडिया ने अपने नैतिक उद्यमों, मूल्य आधारित पत्रकारिता, गम्भीर चिन्तन और सटीक बयानी से विशिष्ट पहचान बनाई है, जो लोकतांत्रिक मूल्यों के लिए अति आवश्यक है।

2. अध्ययन की आवश्यकता एवं प्रासंगिता

हम यह कह सकते हैं कि लेखक ने भारतीय मीडिया और राजनीति के अन्तर्गत राष्ट्रीय आन्दोलन के माध्यम से इसके विस्तृत सम्बन्धों को दर्शाने का प्रयास किया है। लेखकों का यह मानना है कि किसी भी देश के राष्ट्रीय आन्दोलन को मीडिया के द्वारा वृहद स्तर पर सहयोग प्रदान किया जाता है और भारतीय मीडिया ने भी इस कार्य को बेहतर तरीके से करने का कार्य सम्पादित किया है। राष्ट्रीय आन्दोलन में पत्रकार और राष्ट्रवादी दोनों में एक ही व्यक्ति कार्यरत था और वह था एक भारतीय जिसे अपने देश और नागरिकों के लिए स्वतंत्रता प्राप्त कर गौरव हासिल करना था। इस कार्य में मीडिया ने अपनी महत्वपूर्ण भूमिका का निर्वहन बखूबी निभाया।

प्रस्तुत पुस्तक में जहाँ लेखकों ने पंडित नेहरू के नेतृत्व में अपनी आस्था व्यक्त की है, वही गांधीवादी राजनीति में नेहरू जी की पूर्ण निष्ठा में कमी आयी है। अत्यधिक आदर्शवादी दृष्टिकोण तथा जनवादी चीन के ऊपर जरूरत से ज्यादा भरोसे की उन्होंने आलोचना की है।

लेखक ने पुस्तक के माध्यम से बताने का प्रयास किया है कि इतिहास और समाज विज्ञान के विद्यार्थी व शिक्षक इस प्रकार की पुस्तकों के आधार पर अपनी खुद की सोच विकसित करें। साथ ही उन्होंने स्पष्ट किया है कि ऐतिहासिक घटनाओं का विधिवत अध्ययन करना ही काफी नहीं है अपितु उन्हें तत्कालीन सामाजिक, आर्थिक, सांस्कृतिक व वैज्ञानिक विकास के साथ जोड़ना भी आवश्यक है। आज के कम्प्यूटर युग में क्या हुआ ही पर्याप्त नहीं है वरन् यह जानना भी जरूरी है कि कैसे हुआ क्योंकि आज का चिन्तनशील विद्यार्थी यह भी सोच सकता है कि ऐसा न हुआ होता तो क्या होता। जो बातें हमें इस पुस्तक के अध्ययन के पश्चात ज्ञात हुआ वह यह कि लेखक ने इस सम्पूर्ण इतिहास वृत्तान्त में मीडिया के सही रूप में परिभाषित नहीं किया है जो स्थान वास्तव में मीडिया का उस समय का था उसकी कहीं ना कहीं उपेक्षा की गयी है। आज मीडिया को विश्व की किसी भी राजनीतिक व्यवस्था का केन्द्र बिंदु माना जाता है और कोई भी राजनीतिक व्यवस्था बिना संचार माध्यम के सहयोग के अपनी प्रगति को सुनिश्चित नहीं कर सकती है। फिर भारतीय मीडिया तो राष्ट्रीय आन्दोलन से लेकर आज तक भारतीय राजनीति से साये की तरह जुड़ी रही है अतः किसी भी इतिहास लेखक के द्वारा राजव्यवस्था के इस मीडिया पक्ष को उपेक्षित किया जाना दुर्भाग्यपूर्ण है।

3. साहित्य की समीक्षा

डॉ० रुपा मंगलाजी :- ने अपनी पुस्तक भारतीय शासन एवं राजनीति के सैद्धान्तिक एवं व्यवहारिक पहलुओं को छूने का प्रयास किया है। स्वतंत्रता की आधी शताब्दी पार कर चुका लोकतंत्र अभी भी गतिमान और निरन्तर अग्रसर राष्ट्र के रूप में सदैव गतिमान है। लेखिका का मानना है कि तमाम अन्तर्विरोधों, तनावों, अवरोधों एवं विविधताओं के बावजूद भारत का लोकतांत्रिक ढांचा अविच्छिन्न चल रहा है। हालांकि पिछले 5-6 दशकों में भारतीय राजव्यवस्था के समक्ष अनेक संकट उत्पन्न हुए हैं और इन संकटों की पृष्ठभूमि में राजनीतिक व्यवस्था के पुनर्रचना की मांग भी उठी है। लेखिका के अनुसार उदारीकरण की नीतियों के प्रभाव के परिणाम स्वस्थ और सामाजिक परिस्थितियों में भारतीय लोकतंत्र के समक्ष नवीन पश्नों के सन्दर्भ में राजनीतिक संस्थाओं को प्राणवान बनाने की आवश्यकता अनुभव की जाती है। लेखिका ने स्पष्ट किया है कि भारत एवं भारतवासियों को स्वयं यह तक करना होगा कि उनकी शासनिक संस्थाओं एवं राजनीति का गंतव्य क्या हो ? भविष्य क्या हो ? भारतीय स्वयं अपने शासन एवं राजनीति की चुनौतियों का निराकरण कर सकते हैं। अधिकांश से प्रकाश की ओर गतिमान होने का जज्बा भारतवासियों में मौजूद है। यद्यपि कि लेखिका ने भारतीय राज्यव्यवस्था के सन्दर्भ में भारतीय राजनीतिक व्यवस्था की एक विस्तृत और सारगर्भित विवेचना की है।

डॉ० पृथ्वीनाथ पाण्डेय :- ने अपनी पुस्तक में मीडिया के वर्तमान परिवेश का राजनीति पर पड़ रहे प्रभाव का अध्ययन किया है जो निम्नवत है— मीडिया वर्तमान व्यवस्था में एक आकर्षण बन गया है। देश की गुलामी के समय प्रकाशित होने वाले अधिकतर समाचार पत्र भारतीय भाषाओं में प्रकाशित हुआ करते थे। और इसकी आर्थिक स्थिति भी दयनीय थी। सत्ता हस्तान्तरण के साथ स्थितियां बदली परन्तु प्रेस और राजनीति के सम्बन्ध अटूट रहे हैं।

लेखक ने अपनी पुस्तक में भारतीय प्रेस के इतिहास उसके राष्ट्रीय स्वतंत्रता आन्दोलन में योगदान और स्वतंत्रता के पश्चात भारत में होने वाले उत्थान को दर्शाने का प्रयास किया है। पुस्तक में लेखक ने पत्रकारिता के साथ ही हिन्दी साहित्य के इतिहास एवं भारतीय राजनीति पर प्रेस एवं समाचारपत्र, पत्रिकाओं के प्रभाव का भी अध्ययन करने का प्रयास किया है। समय परिस्थिति के अनुसार लेखक ने स्वतंत्रता पश्चात भारतीय मीडिया जगत की उपलब्धियों, असंगतियों, और दुर्बलताओं पर भी प्रकाश डाला है। स्थान-स्थान पर लेखक के द्वारा अन्य प्रेस समाचार पत्र, पत्रिकाओं की भाषा वाक्य गठन एवं शब्द संचयन पर भी ध्यान दिलाया है। भारतीय मीडिया जगत की अपनी जिम्मेदारियों को देखते हुए लेख के

द्वारा अनेको जगह पर भारतीय लोकतंत्र के लिए एवं इसके सफल कार्यकरण को सुनिश्चित कराने के लिए मीडिया की भूमिका पर उसे सराहना और प्रोत्साहन भी प्रदान किया है तथा अनेक स्थानों पर उसे लोकतंत्र के विकास को अवरुद्ध करने के लिए फटकार भी लगाया है।

भारत हो विश्व का सबसे बड़ा लोकतांत्रिक देश है, इसमें भी मीडिया की अहम भूमिका है। इस बात को नकारा नहीं जा सकता है कि, स्वतंत्रता संग्राम के समय स्वतंत्रता सेनानी और क्रांतिकारी अपने विचारों और ब्रिटिश सरकार के शोषण और अत्याचार को जनता तक पहुंचाने के लिए समाचार पत्र और सप्ताहिक पत्रिकाओं का सहारा लिया करते थे।

4. समंक संकलन के स्रोत

प्रत्येक शोध अध्ययन को करने के पीछे कुछ उद्देश्य निहित होते हैं और उन उद्देश्यों की प्राप्ति के लिये यह आवश्यक है कि शोध कार्य को योजनाबद्ध तरीके से किया जाये। इसी योजना की रूपरेखा को शोध प्ररचना कहते हैं। कर्लिंगर के अनुसार शोध प्ररचना अनुसंधान की योजना, संरचना एवं व्यवहारा रचना है जिसकी मदद से शोध के प्रश्नों का उत्तर प्राप्त किया जाता है तथा विषयता पर नियंत्रण करते हैं। इस शोध प्रारूप में शोध की प्रकृति सैद्धान्तिक, विवरणात्मक एवं तर्कपूर्ण विश्लेषणात्मक है।

प्राथमिक स्रोत

प्राथमिक स्रोत वे हैं जिनसे अध्ययनकर्ता पहली बार तथ्यों अथवा विभिन्न जानकारी संकलित करता है। प्राथमिक स्रोत भी दो प्रकार के होते हैं (1) प्रत्यक्ष स्रोत एवं (2) अप्रत्यक्ष स्रोत। इस शोध में प्रत्यक्ष एवं अप्रत्यक्ष दोनों ही स्रोतों से तथ्य संकलित किए जायेंगे। प्रत्यक्ष स्रोत वे हैं जिनमें अनुसंधानकर्ता मूर्त घटनाओं को स्वयं अपने सम्मुख घटित होते देखता है अथवा घटना स्थल पर जाकर अपने अध्ययन विषय सम्बंधित जानकारी को अवलोकित करता है। इसे दो प्रकार से किया जा सकता है अवलोकन एवं साक्षात्कार अथवा मौखिक छानबीन से है। अप्रत्यक्ष प्राथमिक स्रोत में प्रश्नावली के माध्यम से तथ्यों का संकलन किया गया है।

द्वितीयक स्रोत

शोध अध्ययन के सैद्धान्तिक पक्षों का विवेचन करने के लिए द्वितीयक स्रोतों से सूचनाएं एकत्रित की जायेंगी। इन द्वितीयक स्रोतों में सार्वजनिक प्रलेख की प्रकाशित सामग्री में विभिन्न पुस्तकें, संदर्भ-सूचियाँ, समाचार पत्र, (पत्रिका, दैनिक भास्कर, दैनिक नवज्योति आदि), पत्रिकाएं, शोध संस्थान, पुस्तकालय, अप्रकाशित लघु शोध ग्रन्थ, शोध प्रबंध, शोध-पत्र एवं लेख आदि सम्मिलित हैं।

5. भारतीय राजनीति में मीडिया की भूमिका

भारत विश्व का विशालतम लोकतांत्रिक देश है। लोकतंत्र का सामान्य अर्थ लोकप्रिय सम्प्रभुता पर आधारित शासन होता है। इस व्यवस्था में जनता का जनता के लिए और जनता द्वारा शासन होता है। लोकतांत्रिक व्यवस्था में जनता के विविध अधिकार व स्वतंत्रताएं प्राप्त होती हैं जिसमें भ्रष्टाचार व अभिव्यक्ति की स्वतंत्रता सर्वाधिक महत्वपूर्ण है।

भारतीय लोकतंत्र में मीडिया ने अपनी महत्वपूर्ण भूमिका स्थापित कर ली है। जहां तक मीडिया की बात है, इससे हमारा अभिप्राय व्यापक स्तर पर सूचनाओं के सम्प्रभण में लगे माध्यमों से है, दूसरे शब्दों में सूचना को प्रकाशन, सम्पादन, लेखन अथवा प्रसारण के कार्य में प्रिंट एवं इलेक्ट्रॉनिक माध्यमों से आगे बढ़ने की कला की मीडिया कहते हैं। यदि गहनता से इस पर विचार करें तो यह स्पष्ट होता है कि मीडिया दो तरह की है— प्रिंट मीडिया और इलेक्ट्रॉनिक मीडिया। पत्र-पत्रिकाएं, पम्पलेट आदि प्रिंट मीडिया के अन्तर्गत आते हैं। वहीं रेडियो, टेलीविजन, कम्प्यूटर, फिल्म व ई-मेल आदि इलेक्ट्रॉनिक मीडिया के भाग हैं। 1 आज के समय में इलेक्ट्रॉनिक मीडिया का ही एक भाग सोशल मीडिया के नाम से लोकप्रिय हो रहा है। जिसके अन्तर्गत प्रमुख रूप से प्रभावी फेसबुक, व्हाट्सअप, ट्विटर, ब्लॉग आदि हैं।

लोकतंत्र को सफल बनाने के लिए स्वतंत्र एवं निष्पक्ष प्रेस आवश्यक है। भारत में प्रेस का एक लम्बा इतिहास रहा है। ब्रिटिश सरकार ने प्रेस को नियंत्रित करने के लिए अनेक

विधियों का निर्माण किया जिसमें इण्डियन प्रेस एक्ट 1910 और 1931-32- इण्डियन प्रेस (इमरजेन्सी) अधिनियम आदि उल्लेखनीय हैं।

स्वतंत्रता पश्चात संविधान निर्माताओं ने प्रेस की स्वतंत्रता पर विशेष जोर दिया। संविधान में भाषण व अभिव्यक्ति की स्वतंत्रता के अन्तर्गत ही प्रेस की स्वतंत्रता निहित है। भारतीय संविधान के अनुच्छेद 19(1) द्वारा नागरिकों को भाषण अभिव्यक्ति की स्वतंत्रता प्रदान की गयी है जिसमें प्रेस की स्वतंत्रता भी निहित है। इसी तथ्य को समय-समय पर उच्चतम न्यायालय ने अपने निर्णय द्वारा स्थापित किया है। प्रेस की स्वतंत्रता की महत्ता को स्पष्ट करते हुए राष्ट्रपिता महात्मा गांधी ने स्वतंत्रता आन्दोलन के दौरान इसे स्वराज का एक आवश्यक कारक माना। गांधी जी के अनुसार भाषण की स्वतंत्रता संगठन की स्वतंत्रता और प्रेस की स्वतंत्रता की पुनः स्थापना ही स्वराज का मूल ध्येय है।

मीडिया की स्वस्थ लोकतंत्र के निर्माण में महत्वपूर्ण भूमिका होती है। यह लोकतंत्र का आधार है। मीडिया संसार में तथा हमारे चारों ओर घटित होने वाली सामाजिक, आर्थिक व राजनीतिक गतिविधियों के प्रति हमें जागरूक करती है। यह वह दर्पण है जो हमें जीवन के कड़वे सत्य और कटु वास्तविकताओं को दिखाती है या दिखाने का प्रयास करती है। लोकतंत्र का एक बड़ा साधन निर्वाचन है और मीडिया पिछले कुछ वर्षों में अति सक्रिय हुई है। टी0वी0 न्यूज चैनल्स निर्वाचन से पूर्व राजनीतिज्ञों को उनका द्वारा किये गये वादों को याद दिलाते हैं और जनसाधारण विशेष रूप से निरक्षर व्यक्ति को सही व्यक्ति का निर्वाचन करने में सहायता प्रदान करते हैं और सत्ता में बने रहने के लिए राजनीतिज्ञों को अपने आश्वासनों को पूरा करने का दबाव डालते हैं। यह लोकतांत्रिक व्यवस्था के छिद्र-विंदुओं को उजागर कर सरकार को उन्हें दूर करने के लिए प्रेरित करती है। और सरकार को अधिक जवाबदेह, उत्तरदायी और नागरिकों के अनुरूप बनाने में सहायता करती है। इसके अभाव में लोकतंत्र बिना पहिये का वाहन के समान है। मीडिया ही स्वस्थ जनमत निर्माण का साधन है। इसने भारतीय लोकतंत्र में राजनीतिक दलों एवं सदस्यों के नैतिक अवमूल्य एवं भ्रष्टाचार को अपने स्टिंग आपरेशन के द्वारा सबके सामने प्रस्तुत किया है। इस तरह के सत्य अनन्वेषण एवं तथ्यों की प्रस्तुति से जनता जनार्दन अपने प्रतिनिधियों के कृत्यों से न केवल अवगत होते हैं वरन् भविष्य के लिए सचेत भी रहती है।

मीडिया द्वारा किये गये विविध स्टिंग आपरेशन में आपरेशन दुर्योधन एवं आपरेशन चक्रव्यूह विशेष उल्लेखनीय हैं। मीडिया द्वारा किये गये इन आपरेशन ने हमारे सम्मुख इस तथ्य को रखा कि हमारे नेता गण किस प्रकार अपने विशेषाधिकार को कितने सरते में बेचने को तैयार हैं बल्कि इससे यह भी पता चलता है कि संसद व अपने अधिकार को यह किस तरह से देखते हैं। करीब दस महीने तक चले आपरेशन दुर्योधन ने जाहिर कर दिया कि कैमरे का सही इस्तेमाल करते हुए जनता द्वारा निर्वाचित प्रतिनिधियों की करतूतों का भण्डाफाड़ किया जा सकता है। संसद में सवाल उठाने के नाम पर पैसे लेने वाले सांसदों की सूची जब मीडिया ने जनता के सामने सब प्रमाणों के साथ प्रस्तुत की तो भारतीय लोकतंत्र का बदशक्ल चेहरा जनता के सामने उजागर हो गया। इसी तरह चक्रव्यूह आपरेशन में सांसद होने के अहंकार में वे यह भूल गये कि लोकतांत्रिक व्यवस्था में मीडिया का एक मजबूत तम्ब है।

5.1 भारतीय लोकतंत्र में मीडिया की भूमिका

लोकतंत्र को पूरे विश्व में स्थापित करने के लिए मीडिया ने एक महत्वपूर्ण भूमिका निभाई है। विशेष रूप से अमेरिकी स्वतंत्रता आन्दोलन और फ्रांसीसी क्रांति के समय से, यह जनता तक पहुंचने और ज्ञान के साथ उन्हें सक्षम बनाने में महत्वपूर्ण भूमिका निभा रही है। भारत के औपनिवेशिक नागरिकों के लिए मीडिया, जानकारी का एक स्रोत बन गयी है। क्योंकि वे ब्रिटिश औपनिवेशिक शासन की निरंकुशता के बारे में जागरूक हो गये हैं। और भारत के स्वतंत्रता आन्दोलन को एक नई शक्ति मिली, और लाखों भारतीय ब्रिटिश साम्राज्य के खिलाफ लड़ाई में नेताओं के रूप में शामिल हुए। वर्ष 1975 में आपातकाल के

समय प्रेस सेंसरशिप के दिनों से लेकर 2014 के लोकसभा चुनावों तक भारतीय लोकतंत्र में मीडिया की भूमिका में महत्वपूर्ण बदलाव आया है।

चूँकि मनुष्य अपने आस-पास घटित होने वाली घटनाओं के बारे में सदा जानने को इच्छुक रहता है, इसलिए उसकी यह इच्छा वर्तमान समय में विश्व की प्रमुख गतिविधियों तक बढ़ गयी है, तथा जानने की यह उत्कंठा जन संचार के विभिन्न साधनों से ही पूरी हो पाती है, इसका क्षेत्र काफी विस्तृत और बड़ा होता जा रहा है, यह दैनिक जीवन का एक हिस्सा बन गया है। यदि किसी दिन हमें समाचार-पत्र न मिले तो हमें जीवन में रिक्तता की अनुभूति होती है।

मीडिया में प्रिंट हो या इलेक्ट्रानिक दोनों के विषय में जन मानस के बीच अनेक प्रकार के विचार सुनने को मिलते हैं, कोई इसे वर्तमान और भविष्य की दिशा तय करने वाला सशक्त माध्यम मानता है तो कुछ इसके बारे में ऐसी भी धारणा रखते हैं कि आजादी के बाद इसने अपना नैतिक स्तर खो दिया है, परन्तु जो भी धारणा हो, एक बात तो स्पष्ट है कि भारतीय राजनीति में इसका महत्वपूर्ण स्थान है।

5.2 लोकतंत्र में मीडिया का महत्व

भारत में लोकतांत्रिक शासन व्यवस्था कार्यरत है जिसे जनतांत्रिक अथवा प्रजातांत्रिक व्यवस्था भी कहा जाता है। यह चार स्तम्भों पर खड़ा है— सरकार, विधानमण्डल, न्यायपालिका तथा मीडिया। प्रजातंत्र की सफलता के लिए इन चारो स्तम्भों का अमूल योगदान समान रूप से महत्वपूर्ण है। मीडिया में लोकतंत्र के लिए बेहतर दुनिया और भविष्य बनाने की सर्वाधिक क्षमता और शक्ति है। यह विभिन्न घटकों का समुच्चय है। तथा उसके सभी घटक मिलकर कार्य करते हैं लोकतंत्र की स्थिरता तथा विकास में मीडिया की भूमिका बहुत ही अहम है। राजनीति, खेल, शिक्षा, स्वास्थ्य, गरीबी, भ्रष्टाचार, मंहगाई, विस्थापन, आपदाएं, सामाजिक स्वास्थ्य, स्थानीय समस्याएं जैसे मुद्दों को वरीयता देकर तथा इनके सम्बन्ध में जनजागृति कर मीडिया ने लोकतंत्र के मायने ही बदल दिये हैं।

सरकार द्वारा किये गये निर्णयों, योजनाओं को सही समय पर जनता तक पहुंचाने का कार्य मीडिया ही करती है। यह आज के युग की वह शक्ति है जिसके होते और यही इस्तेमाल से कुछ भी असम्भव नहीं रहता है।

लोकतंत्र में जनता और सरकार के मध्य सम्पर्क, अटूट रिश्ता एवं समन्वय लाभदायक होता है। कुछ वर्ष पूर्व जनता और सरकार के मध्य सम्पर्क के अभाव के कारण दूरी बनी हुई थी उसे मिटाने का कार्य मीडिया ने किया है। यदि कोई घटना जन विरोधी है तो जनता की आवाज सरकार तक पहुंचाने का कार्य इसी के माध्यम से किया जाता है।

लोकतंत्र केवल एक शासन व्यवस्था नहीं है बल्कि इसका स्वप्न अत्यंत व्यापक है। लोकतंत्र की शुरुआत प्रत्येक व्यक्ति, प्रत्येक परिवार से होती है। यह एक विचार है, जिसे घर-घर तक पहुंचाने का कार्य माध्यमों ने और खासकर चैनलों, समाचार पत्रों तथा रेडियों ने किया है। चूँकि भारत में पितृसत्तात्मक पद्धति प्रचलित है। तथा घर के सभी निर्णय करने का अधिकार केवल मुखिया को था। अतः देश में लोकतंत्र होते हुए भी परिवारों के कोई भी निर्णय सभी सदस्यों के विमर्श से नहीं होता था। परन्तु आज स्थिति बदल चुकी है संचार माध्यमों के कारण उचित संस्कार जनता पर हो रहे हैं।

वर्तमान में अधिक संख्या में चैनल तथा प्रत्येक की पसंद भिन्न होते हुए भी शाम हो जब सारा परिवार घर पहुंचता है तब एक कार्यक्रम देखने पर एकमत होता है। इन्हीं छोटी-छोटी बातों से हमारा लोकतंत्र मजबूत हो रहा है लोगों को ज्ञानवान, सजग बनाने में मीडिया अपनी भूमिका बखूबी निभा रही है। आज इसके कारण लोग न केवल खबर जानते हैं बल्कि उसके कारण, विश्लेषण का भी संज्ञान रखते हैं और उस पर परिचर्चा भी करते हैं।

संचार माध्यम आज अनेक रूपों में मौजूद है। जो मीडिया 30-40 वर्ष पूर्व केवल दूरदर्शन के नाम से लोकप्रिय थी आज इतनी विकसित हो गयी है कि उसपर चलने वाली, प्रसारित की जाने वाली हर विधा के आधार पर चैनलों के कई प्रकार हो गये हैं। समाचार

चैनल, माडलिंग चैनल, केवल गानों के लिए चैनल, धारावाहिक के लिए चैनल, फिल्मों के लिए चैनल, खाना बनाने से सम्बन्धित चैनल, खेलों के नये चैनल उनमें भी नये खेलों के लिए विशिष्ट चैनल आदि।

6. निष्कर्ष

मीडिया अथवा जनसंचार माध्यम किसी भी समाज या राष्ट्र की वास्तविक स्थिति के प्रतिबिम्ब होते हैं। यह संदेशों एवं सूचनाओं को एक स्थान से दूसरे स्थान पर पहुंचाने का एक सशक्त माध्यम है। यह संदेशों के माध्यम से की जाने वाली सामाजिक अन्तःक्रिया है। इसे पहले प्रेस के नाम से जाना जाता था, एवं इसका कार्य विश्वभर में घटित होने वाली सूचनाओं का संग्रहण कर सर्वजन को सुलभ करना था। समय के साथ इसके स्वरूप में परिवर्तन हुआ तथा वर्तमान में इस अन्तःक्रिया का नामकरण मीडिया के रूप में हो गया।

मीडिया का शाब्दिक अर्थ है— माध्यम, साधन या सेतु। वर्तमान समय में इस शब्द का प्रयोग जनसंचार के माध्यम अर्थात् रेडियो, टेलीविजन, समाचार पत्र, पत्रिकाओं इत्यादि के लिए किया जाता है। यह किसी भी समाज या राष्ट्र का प्रतिबिम्ब होता है तथा राष्ट्र व समाज के राजनीतिक, आर्थिक व सांस्कृतिक गतिविधियों को प्रतिबिम्बित करती है। इसने सदैव मानव के विचारों एवं दृष्टिकोण को प्रभावित किया है। विभिन्न देश में होने वाली राजनीतिक व सामाजिक क्रांतियों में इसकी महत्वपूर्ण भूमिका रही है, इसी कारण ब्रिटिश विचारक एडमण्ड बर्क ने इसे लोकतंत्र का 'चौथा स्तंभ' कहा है। प्रजातंत्र का मूलाधार है—स्वतंत्रता, समानता और बन्धुत्व और जहां कहीं भी विचार और अभिव्यक्ति की स्वतंत्रता प्रदान की गयी है वहां इस स्वतंत्रता का पूर्ण और सही ढंग से प्रयोग मीडिया द्वारा ही किया जाता है। देश के सभी कोनों और घटनाओं पर इसकी पैनी दृष्टि होने के कारण ही शक्तिशाली शासक भी इसके महत्व एवं शक्ति की उपेक्षा नहीं कर पाते।

सन्दर्भ ग्रन्थ सूची

- ❖ मित्तल, जे0के0 (1991), पार्लियामेंटरी डिसेंट डिफेक्शन एण्ड डेमोक्रेसी, 35 जे0 आई0 एल0 आई0-7
- ❖ मिर्धा, आर0एन0 एवं जैन, आर0 बी0 (2001), रिव्यू आफ दी वर्किंग ऑफ पॉलिटिकल पार्टीज स्पेशियली विद रिलेशन टू इलेक्शन एण्ड रिफार्म आप्शंस, इस्टीमेट ऑफ कांस्टीट्यूशनल एवं पार्लियामेंटरी स्टडीज, नई दिल्ली.
- ❖ मित्र, राम (1992), "कास्ट पोलराइजेशन एण्ड पॉलिटिक्स", सिण्डीकेट पब्लिकेशन, पटना.
- ❖ मिश्र, एस0 एन0 (2011) भारतीय निर्वाचन संस्कृति : दशा एवं दिशा, विजय प्रकाशन मंदिर, वाराणसी.
- ❖ मिश्र, मधु सूदन (1980), रायबरेली संसदीय निर्वाचन 1980, लोकतंत्र, समीक्षा संसदीय संविधान संस्थान, नई दिल्ली, जनवरी
- ❖ मीना (2011), उत्तर प्रदेश विधानसभा में दलित विधायकों का अध्ययन 1997-2002, पी एच डी थीसीस, दिल्ली विश्वविद्यालय, दिल्ली.
- ❖ मुलर, डब्ल्यू0 सी0 एण्ड स्ट्रोम, के0 (2003), कोलिगेंस गर्वमेण्ट इन वेस्टर्न यूरोप, आक्सफोर्ड यूनिवर्सिटी प्रेस, लंदन.
- ❖ मेरियम, चार्ल्स ई0 (1939), दि डेमोक्रेसी एण्ड दी डेस्पोटिज्म, मैकग्रा-हिल एण्ड कं0, न्यूयार्क.
- ❖ मेहता, ए0 के0 एण्ड डी0 डी0 खन्ना (2003), पालिटिकल पार्टीज एण्ड पार्टी सिस्टम, सेज पब्लिकेशन्स, नई दिल्ली.
- ❖ मैकडानालड, नील ए0 (1963), पार्टी पर्सपेक्टिव : कम्परेटिव पॉलिटिक्स, आक्सफोर्ड यूनिवर्सिटी प्रेस, लंदन.

- ❖ मोन्टिनोला, गैब्रिला आर० (1999), पार्टीज एण्ड एकाउंटबिलिटी इन दि फिलिपिंस, जर्नल आफ डेमोक्रेसी, वा०-10,
- ❖ यंग, पी० वी० (1960-61), सांइटिफिक सोशल सर्वे एण्ड रिसर्च, एशिया पब्लिशिंग हाउस बाम्बे.
- ❖ यनाई, एन० (1999), 'व्हाई डू पोलिटिकल पार्टीज सरवाइव - एन एनालिटिकल डिस्कशन', पार्टी पालिटिक्स, अंक -5, नं० -1,
- ❖ रंजन, राजीव (2006), चुनाव लोकसभा और राजनीति, ज्ञान, रंगा प्रकाशन, नई दिल्ली.
- ❖ रंगराजन, एम० (2006), राजनीतिक व्यवस्था में संक्रमण 2004 के आम चुनावों के पश्चात भारत, शोधार्थी, अंक -2, सं०-1, जनवरी-मार्च,
- ❖ राजकिशोर (2006), दलित राजनीति की समस्याएं, वाणी प्रकाशन, नई दिल्ली.
- ❖ राजकुमार, (2009), शासन और राजनीति, अर्जुन पब्लिशिंग हाउस, नई दिल्ली.
- ❖ राजकुमार, (2014), लोकतंत्र में राजनीति के मायने, कथा-क्रम, जुलाई-सितम्बर,
- ❖ राजन, ए० (1986), माई बहुजन समाज पार्टी, एबीसीडी प्रकाशन दिल्ली.
- ❖ राजहंस, जी० एस० (2002), क्रिमिनलाइजेशन, रोल आफ मनी, मसल पॉवर एण्ड इलेक्ट्रोरल मालप्रेक्टिसेज, इन कश्यप, सुभाष सी (एडी०), नेशनल रिसर्जेन्स थ्रो इलेक्ट्रोरल रिफॉर्मर्स, इन शिप्रा पब्लिकेशन, नई दिल्ली.



फेयरवेल पार्टी के दौरान उर्दू विभाग के शिक्षकगण एवं छात्र-छात्राएँ

9. माँ श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी का धार्मिक महत्व

शोधार्थी

निर्दोष

एस0एस0वी0कॉलेज, हापुड़

Corresponding Author

शोध निर्देशक

डॉ0 दीपक कुमार

असिस्टेंट प्रोफेसर

एस0एस0वी0 कॉलेज, हापुड़

सारांश- देवबंद का इतिहास सदैव से धार्मिक रहा है। इस क्षेत्र में अनेक धर्म संप्रदाय के लोग रहते आए हैं। जो विभिन्न तरीकों से अपने धर्म की मान्यताओं का पालन करते आए हैं। मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी मंदिर का स्थान भी इसी श्रृंखला में आता है। देवबंद और इसके आसपास के क्षेत्र में मां का धार्मिक महत्व का भी ऊंचा है। मां को जगदंबा और कपालिनी आदि रूपों में पूजा जाता है। मां के परम भक्त ध्यानु ने मां की कीर्ति को बढ़ाया है और सदैव के लिए अपना स्थान मां के चरणों बना लिया है। यहां स्थित देवी कुंड के दर्शन और स्नान से ही भक्तों के कष्ट मां द्वारा हर लिए जाते हैं। यहां लगने वाले मेले ने तो मां की धार्मिक आस्था को चारों तरफ फैला दिया है।

शब्दावली- छिन्नमस्ता, धूमावती, सर्वस्पंदन, धात्री, त्रिपुरा, मणिद्वीप, हवन, ब्रह्मांड, कामास्त्र।

भारत में सदैव से ही धर्म तत्व विद्यमान रहा है। भारत में अनेक धर्म संप्रदायों द्वारा भिन्न भिन्न देवी देवताओं की पूजा होती रही है। हमारे धर्म में देवताओं की पूजा के साथ-साथ देवियों की पूजा का विधान भी प्राचीन समय से ही चला आ रहा है। हमारे धर्म इसी क्रम में हमारे शोध विषय जो कि उत्तर प्रदेश के सहारनपुर जिले के देवबंद कस्बे में मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी का मंदिर अवस्थित है। यह मंदिर काफी प्राचीन है। मां श्री त्रिपुर बाला सुन्दरी अपने धार्मिक महत्व के कारण इस क्षेत्र में प्रसिद्ध है। इस मंदिर का धार्मिक महत्व भी काफी महत्वपूर्ण है।

मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी को आदिशक्ति के विभिन्न रूपों में पूजा जाता है जैसे अनंत व्यापारियों की अधिष्ठात्री के रूप में, जयंती मंगल, काली, भद्रकाली, कपालिनी, दुर्गा, शिवा, धात्री, स्वाहा, स्वधा, तारा, छिन्नमस्ता, धूमावती आदि फिर दस महाविद्याओं के रूप में काली, तारा, छिन्नमस्ता, धूमावती आदि महाविद्याएं प्रमुख हैं। जिनमें महाषोडशी सकल कलाओं से पूर्ण राजराजेश्वरी ललिता, मां त्रिपुर बालाजी सुंदरी केंद्र बिंदु है। इनमें सर्वसौंदर्य, सर्वेश्वर्य, सर्वप्रकाश, सर्वस्पंदन सर्वशक्ति, सर्वज्ञान सभी अत्यंत निखरे हुए रूप में विराजमान है। श्री त्रिपुर बाला सुंदरी बाला सुंदरी ब्रह्माण्डमय है और ब्रह्मांड को पिंड रूप में स्थापित करने वाली भी माना जाता है। इन्हीं के द्वारा सृष्टि का सृजन पालन और संहार होता है। एक अवधारणा के अनुसार माना जाता है कि मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी के द्वारा ही संसार की रचना हुई थी और वही इस संसार का संहार भी करेंगे। मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी को महाशक्ति जगदंबा का भी एक रूप माना जाता है।¹² लक्ष्मी जी ने भी मां बाला सुंदरी की पूजा की थी। मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी के नाम से पूर्व श्री संबोधन लगाना लक्ष्मी जी की तपस्या का ही फल है। लक्ष्मी जी ने अनेक वर्षों तक मां त्रिपुर बाला सुंदरी जी की आराधना करके वरदान में उनके चरणों में रहने का आशीर्वाद मांगा था, परंतु मां बाला सुंदरी ने इसे मानने से मना कर दिया और लक्ष्मी जी को वरदान दिया कि वह अपने नाम की शुरुआत में

श्री लगाकर लक्ष्मी जी को धारण करेंगे तभी से मात्र पूरा बोलो सुंदरी की आराधना करने वालों को मोक्ष और भोग दोनों प्राप्त होते हैं।¹³

मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी को महाशक्ति जगदंबा का भी एक रूप माना जाता है। ब्रह्मा, विष्णु और रुद्र यह तीनों जिसमें समाहित हो वह त्रिपुर बाला सुंदरी है। एक महत्वपूर्ण अवधारणा के अनुसार माना जाता है कि राजराजेश्वरी श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी प्रातः कालीन बाल सूर्य मंडल की आभा वाली है। मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी मणि दीप में निवास करती हैं। मणिदीप अमृत के समुद्र में मानो का का द्वीप है जिसमें वर्षों की बड़ी लगी हुई है। नवरत्नों के नौ पर कोठी हैं बीच में कदंब का उपवन है। अमृत की बाढ़िया है। जिनके मध्य में चिंतामणि का महल है। जिसके भीतर एक दिव्य सिंहासन है। जिसे शिवाकर मंच कहा जाता है। मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी इसी मंच पर विराजित होती हैं।

एक बार देवता दोबारा हवन का प्रबंध किया गया। इस हवन अवसर पर मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी ने अपने दिव्य रूप में प्रकट होकर सभी के कष्टों को हर लिया। यज्ञ विधान में मां त्रिपुरा बाला सुंदरी देवी ने अपना वास्तविक रूप धारण किया। जो एक दिव्या प्रकृति थी। जिसका स्वरूप अत्यंत विलक्षण था। बाल सूर्यवर्दना तेज, रक्तिम, परिधान, चार भुजा, तीन नेत्र हाथ में धनुष बाण पाश और अंकुश तथा मस्तिष्क पर बालचंद्र शोभित थे। देवता मां के दर्शन पाकर प्रफुल्लित हो गए। ब्रह्मा, विष्णु, महेश आदि देवताओं ने श्री त्रिपुर बाला सुंदरी को अकेला पाकर प्रार्थना की हो, मां आप अकेले पूर्ण शोभा को प्राप्त नहीं हो रही है। आपका कोई पति अवश्य होना चाहिए। तब त्रिपुर बालाजी देवी ने अपने ही जैसा एक दृश्य पुरुष प्रकट किया और मां उसके वाम भाग में विराजित हो गई। उस दिव्य पुरुष को कामेश्वर का नाम दिया गया। जिसके कारण श्री त्रिपुर बाला सुंदरी कामेश्वरी कहलाई।¹⁶

मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी ने महाधनु भंडासुर का वध किया। भंडासुर 105 ब्रह्मांड का अधिपति था 14 भावनाओं का एक ब्रह्मांड होता है और एक ब्रह्मांड में 14 लोक होते हैं। भंडासुर ने ब्रह्मा विष्णु महेश सरस्वती गौरी लक्ष्मी आदि किसी से भी अपनी मृत्यु न होने का वरदान पाकर समस्त लोक में अत्याचार करना शुरू कर दिया। भंडासुर ने देवताओं को भी नहीं छोड़ा। इस राक्षस ने अपने भयानक अत्याचार के द्वारा देवताओं से 105 ब्रह्मांडों पर अपना आधिपत्य जमा लिया। तब भंडासुर के भीषण अत्याचारों से दुखी होकर सभी देवताओं ने ऋषि बृहस्पति जी की सलाह पर मां त्रिपुर बाला सुंदरी से सहायता के लिए प्रार्थना की। देवताओं की पुकार पर मां प्रकट हुई। देवताओं ने भंडासुर के अत्याचारों के बारे में मां को बताया और उससे मुक्ति दी लाने की प्रार्थना की। मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी ने भंडासुर को अधर्म का मार्ग छोड़कर धर्म के मार्ग पर आने का संदेश भिजवाया, किंतु भंडासुर ने इस संदेश पर कोई ध्यान नहीं दिया।¹⁸ अंत में मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी ने श्री चक्र में विराजमान होकर भंडासुर से घोर युद्ध किया। मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी ने दशावतार रूप में प्रकट होकर इस भयानक असुर का संहार करना चाह, लेकिन भंडासुर पर जब मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी के ब्रह्मास्त्र नारायण, अस्त्र वायु, चंद्रस्त्र आदि शस्त्रों का असर नहीं हुआ, तो मां ने अंत में कामास्त्र छोड़कर भंडासुर का वध किया। इस प्रकार त्रिपुर श्री बाला सुंदरी देवी मां ने देवताओं और संसार के कष्टों को हर लिया।¹⁹ मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी के मंदिर में मां की सवारी शेरों की दो अति सुंदर मूर्तियां स्थापित हैं। मां के वाहन इन दोनों शेरों के बारे में मान्यता है कि मां का प्रसाद इन शेरों की मूर्तियों पर भी अर्पण किया जाता है। यह मान्यता प्राचीन समय से ही चली आ रही है। इन दोनों शेरों पर भक्तों द्वारा चढ़ाया गया प्रसाद राजेश कुमार वाल्मीकि के पूर्वज लेते आए हैं और वर्तमान समय में भी उन्हीं के परिवार के द्वारा इस प्रसाद को ग्रहण किया जाता है। जो मंदिर में होने वाले उत्सवों परढोल आदि का प्रबंध भी करते हैं।¹¹⁰

मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी के मंदिर के मुख्य द्वार के सामने देवीकुंड के पास ही ध्यानु भगत की मूर्ति भी स्थापित हैं। जो अपने कटे हुए शीश को देवी को अर्पण करते हुए दिखाया गया है। माना जाता है कि ध्यानु भगत की मूर्ति पर मांगा गया वरदान पूर्ण होता है। स्थानीय निवास के अनुसार ऐसा माना जाता है कि ध्यानु भगत अकबर के समकालीन थे। एक बार ध्यानु भगत अपने सभी साथी के साथ माता के दर्शनों के लिए जा रहे थे। तभी रास्ते में उन्हें बादशाह अकबर मिल गए। अकबर द्वारा पूछे जाने पर ध्यानु भगत ने बताया कि वह माता के मंदिर में झंडा अर्पित करने के लिए जा रहे हैं। अकबर द्वारा ध्यानु भगत से पूछा गया कि इस देवी की क्या विशेषता है ध्यानु भगत ने बताया कि माता की शक्ति अपरंपार है। माता देवी किसी भी कार्य को करने में सक्षम हैं¹¹ अकबर ने ध्यानु भगत की परीक्षा लेने के लिए अपने घोड़े की गर्दन काट दी और कहा कि इस घोड़े को जीवित कर दो, तो माने। ध्यानु भगत ने कार्य सिद्धि हेतु मंदिर जाने की आज्ञा मांगी। अकबर ने उसे मंदिर जाने की आज्ञा प्रदान की। ध्यानु भगत मंदिर पहुंचकर देवी की पूजा करनी आरंभ कर दी, परंतु देवी प्रकट नहीं हुई। इस पर ध्यानु भगत ने अपना शीश काटकर देवी को अर्पित कर दिया। ध्यानु भगत की भक्ति को देखकर देवी प्रसन्न हुए और घोड़े व ध्यानु भगत को पुनर्जीवन प्रदान किया। इस घटना की बाद ध्यानु की प्रसिद्धि चारों ओर फैल गई। ध्यानु भगत की मूर्ति आज भी माता के मंदिर के मुख्य द्वार के सामने देवीकुंड पर स्थित है। माता की पूजा के साथ-साथ ध्यान भगत की पूजा भी की जाती है माता ने ध्यानु भगत की तो इच्छा पूरी कर दी, परंतु माता ने उसे एक आदेश भी दिया। माता ने कहा कि आज के बाद कोई भी भक्त मुझे अपनी वह अन्य किसी की बलि प्रदान नहीं करेगा और आज से केवल नारियल ही अर्पण किया जाएगा। तभी से माता देवी के मंदिर बलि आदि प्रथाओं का निषेध हो गया था।¹²

मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी मंदिर के निकट 18 बीघा के क्षेत्रफल में विशाल देवी कुंड है। धार्मिक मान्यताओं के अनुसार मां श्री बाला सुंदरी इसी देवीकुंड में स्नान करती थी। इसलिए भक्तगण इस तीर्थ स्थल पर आकर इस देवी कुंड में स्नान कर स्वयं को धन्य मानते हैं। इस देवी कुंड से संबंधित एक अन्य मान्यता भी है। जिसके अनुसार की निरंतान महिलाओं द्वारा इस देवी कुंड में स्नान करने से संतान की प्राप्ति होती है और देवी माता के द्वारा उनके जीवन में आने वाले सभी कष्टों का भी हरण हो जाता है¹³ मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी मंदिर के प्रांगण में स्थित देवी कुंड के बारे में दूसरी महत्वपूर्ण अवधारणा यह है कि इस कुंड को महाभारत कालीन युद्ध से जोड़ा जाता है। इस अवधारणा के अनुसार महाभारत के युद्ध में जो योद्धा वीरगति को प्राप्त हुए थे। उनकी पत्नियों ने इसी देवी कुंड के किनारे अपनी

चिता सजा कर सती हो गई थी। इसलिए इस देवी कुंड को सती कुंड भी कहा जाता है इस बात का साक्ष्य हमें वहां पर मौजूद बड़ी संख्या में सती की समाधियों के रूप में प्राप्त होता है। जहां पर उनसे संबंधित उनके वंशज साल में एक बार आकर पूजा पाठ करते हैं।¹⁴

देवबंद स्थित मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी देवी मंदिर की एक शाखा हिमाचल के त्रिलोकपुर नामक स्थान पर स्थित है 500 वर्ष पूर्व के लगभग हिमाचल के एक नमक व्यापारी लाल रामदास देवबंद आता है और नमक खरीदने के बाद देवबंद स्थित मंदिर के बाहर अपना शिविर स्थापित करता है। कई दिनों तक पूजा पाठ के बाद वह व्यापारी माता का एक पिंड लेकर अपने क्षेत्र त्रिलोकपुर पहुंच जाता है। इसके बाद वह अपने घर के पास ही एक पीपल के वृक्ष के नीचे माता की पिंड की स्थापना करता है।¹⁵ इसके बाद हिमाचल के स्थानीय राजा प्रदीप प्रकाश के द्वारा यहां पर त्रिपुर सुंदरी मां बाला सुंदरी के मंदिर का

निर्माण किया जाता है। इस प्रकार इस मंदिर की एक शाखा हिमाचल में भी स्थापित हो जाती है। जो आज काफी प्रसिद्ध है।¹⁶

देवबंद में माता का प्रसिद्ध मेला चैत्र महीने की चौदस के दिन लगता है। यहां पर एक भव्य मेले का आयोजन होता है। माना जाता है कि इस दिन माता हिमाचल स्थित अपने मंदिर से यहां आती हैं। इस दिन भारी वायु वेग से मंदिर की घंटियां बजने लगती हैं। जिसे माता के आने का संकेत माना जाता है। इस मेले में हर वर्ष लाखों भक्त बहुत दूर-दूर से यहां आते हैं।¹⁷ आसपास के क्षेत्र के निवासियों द्वारा इस मेले में एक उत्सव के रूप में भाग लिया जाता है। चैत्र माह की चौदस के दिन इस मेले के अवसर पर अधिकतर क्षेत्रवासी अपना सभी काम रोककर माता के दर्शनों के लिए यहाँ आते हैं। यह मेला लगभग 20 से 25 दिन तक लगातार चलता है।¹⁹ इस मेले में भक्तजनों के साथ-साथ नव विवाहित वर और वधू भी अपने जीवन की शुरुआत के लिए आशीर्वाद मांगने के लिए आते हैं।²⁰ माता के मंदिर में भक्तजन प्रसाद चढ़कर माता से प्रार्थना करते हैं और मनोवांछित फल पाते हैं। यह माता की शक्तियों का ही चमत्कार है कि दूर बैठा भक्त के मन में नाम लेने से ही अपने दुख-दर्द को भूल जाता है।

संदर्भ सूची-

1. सागर, हसन अली - देवबंद इतिहास, सागर प्रकाशन, देवबन्द, द्वितीय संस्करण प्रकाशन 2009 पृ0सं0-15
2. राज, किरण -मां श्री त्रिपुर बाला सुंदरी दर्शनम्, सत्य प्रकाशन, मुजफ्फरनगर, द्वितीय संस्करण 2016 पृ0सं0-17 ।
3. साक्षात्कार- सूरज सिंह पिता श्री राजकरण, आयु 56 वर्ष, निवास स्थल व पोस्ट देवबंद कस्बा, जिला सहारनपुर, उ0प्र0 ।
4. साक्षात्कार- राजेश पिताश्री धर्मवीर सिंह, आयु 40 वर्ष, निवास स्थल व पोस्ट देवबंद कस्बा, जिला सहारनपुर, उ0प्र0 ।
5. साक्षात्कार- सुभाष पिता श्री जय सिंह, निवास व पोस्ट ग्राम शाहपुर, जिला सहारनपुर, उ0प्र0 ।
6. सागर, हसन अली - वही, पृ0सं0-19 ।
7. राज, किरण- वही, पृ0सं0-25 ।
8. साक्षात्कार- राजपाल पिता श्री राम सिंह, आयु 40 वर्ष, ग्राम व पोस्ट मानकी, जिला सहारनपुर, उ0प्र0 ।
9. साक्षात्कार- कुलदीप सिंह पिता श्री महक सिंह, आयु 38 वर्ष, निवास स्थल ग्राम व पोस्ट बंदर जुड़ा, जिला सहारनपुर, उ0प्र0 ।
10. राज, किरण- वही, पृ0सं0 30
11. साक्षात्कार- संजय सिंह पिता श्री कृष्णा, आयु 45 वर्ष, निवास स्थान व पोस्ट बंदर जुड़ा, जिला सहारनपुर, उ0प्र0 ।
12. साक्षात्कार- सुशील सिंह पिता श्री राजपाल सिंह, आयु 56 वर्ष, निवास स्थल ग्राम व पोस्ट तिलहरी बुजुर्ग, जिला सहारनपुर, उ0प्र0 ।
13. सागर, हसन अली - वही, पृ0सं0 32
14. साक्षात्कार- राजकरण सिंह पिता श्री देशराज सिंह, आयु 70 वर्ष, निवास स्थल व पोस्ट देवबंद, जिला सहारनपुर, उ0प्र0 ।
15. साक्षात्कार- सुशील सिंह पिताश्री जय सिंह, आयु 52 वर्ष, निवास स्थल ग्राम व पोस्ट निहाल खेड़ी, जिला सहारनपुर, उ0प्र0 ।
16. सागर, हसन अली - वही, पृ0सं0 40
17. साक्षात्कार- वेदपाल सिंह पिता श्री राजेंद्र सिंह, आयु 60 वर्ष, निवास स्थल ग्राम व पोस्ट मिरगपुर, जिला सहारनपुर, उ0प्र0 ।
18. राज, किरण- वही, पृ0सं0 45
19. साक्षात्कार- राकेश सिंह पिता श्री रतिराम, आयु 56 वर्ष, निवास स्थल ग्राम व पोस्ट सखन कला, जिला सहारनपुर, उ0प्र0 ।
20. साक्षात्कार- बबलू मुखिया पिता श्री रामपाल सिंह, आयु 45 वर्ष, निवास स्थल ग्राम व पोस्ट शाहपुर, जिला सहारनपुर, उ0प्र0 ।

10. मुस्लिम विधि में मेहर की अवधारणा : एक ऐतिहासिक एवं कानूनी विश्लेषण

Dr. Apeksha Chaudhary¹¹, Mr. Ashish Kaushik¹², Dr. Vikas Kumar¹³

प्रस्तावना

मुस्लिम कानून में मेहर एक महत्वपूर्ण अवधारणा है, जो विवाह के समय दुल्हे द्वारा दुल्हन को दी जाने वाली एक प्रकार की राशि या उपहार है। यह एक पारम्परिक प्रथा है जो इस्लामी कानून में निकाह के समय दुल्हे की जिम्मेदारी के रूप में देखी जाती है। इस लेख में हम मुस्लिम कानून में मेहर की अवधारणा का ऐतिहासिक और कानूनी विश्लेषण करेंगे। नियमित प्रकार के विवाह में मेहर की रकम तय करने की प्रथा थी, जबकि जीतकर या पकड़कर लायी गयी स्त्री के साथ विवाह के समय मेहर नहीं होता था कभी-कभी दुल्हन का संरक्षक मेहर की रकम रखता था: वैसे प्रथा तो दुल्हन के ही मेहर लेने और रखने की थी। प्रारम्भ में मेहर शब्द उस भेंट के लिए प्रयुक्त होता था जो दुल्हन के माता-पिता को दी जाती थी, और पत्नी को स्वयं जो भेंट दी जाती थी उसे सदका कहा जाता था। नियमित तरीके की शादी में जो सदका अथवा मेहर दिया जाता था उसे इस्लाम ने मान्यता दी। कुरान ने कहा है: “तथा औरतो को उनका मेहर मुक्तहस्त से दो¹⁴।”

मेहर का अर्थ

डावर (DOWER) शब्द अरबी के मेहर शब्द का (ऑग्ल-मुस्लिम प्राविधिक) पर्यायवाची है। मुस्लिम विधि के अर्न्तगत मेहर वह धनराशी या सम्पत्ति है जिसका कुछ मौद्रिक मूल्य होता है इसे प्राप्त करने के लिए पत्नी अधिकृत है। इसे विवाह के प्रतिफल स्वरूप प्राप्त करती है।

मेहर की परिभाषा

मुल्ला के मतानुसार- मेहर एक ऐसी धनराशी या सम्पत्ति है जिसको विवाह के प्रतिकार के रूप में प्राप्त करने के लिए पत्नी हकदार है।

तैयबजी के मतानुसार- मेहर वह धनराशी है जो विवाह के बाद पति द्वारा पत्नी को पक्षकारों के करार या कानून के अनुसार देय होता है। वह या तो तात्कालिक (मुअज्जल) होता है या आस्थगित देय (मुवज्जल)।

अमीर अली के मतानुसार- मेहर पत्नी के अन्नय उपभोग और लाभ के लिए प्रतिकार है।

विल्सन के मतानुसार- मेहर पत्नी द्वारा शरीर के समर्पण का प्रतिकार (बदला) है।

मेहर एक ऐसी धनराशी या सम्पत्ति है जिसके भुगतान करने या देने का पति तुल्य वस्तु के रूप में पत्नी को देने का वचन (जो अपलक्षित भी हो सकता है) दिया हो, परन्तु सामान्यतया यह विवाह का प्रतिकार कहा जाता है।

¹¹ Assistant Professor, Institute of Legal Studies, Faculty of Law, Ch. Charan Singh University, Meerut.

¹² Assistant Professor, Institute of Legal Studies, Faculty of Law, Ch. Charan Singh University, Meerut.

¹³ Assistant Professor, Institute of Legal Studies, Faculty of Law, Ch. Charan Singh University, Meerut.

¹⁴ कुरान iv:4- Abdul Rahim, P-8

अब्दुल कादिर बनाम सलीमा¹⁵ के बाद में न्यायमूर्ति महमूद ने कहा था कि – “मेहर मुस्लिम विधि में वह धनराशी या सम्पत्ति होती है जिसे पति विवाह के उपलक्ष्य में पत्नि को देने का वादा करता है तथा यदि विवाह के समय इसे नियत न किया जाये या इसका जिक्र न किया जाय तो भी कानून पत्नि को मेहर का हक प्रदान करता है।”

ऐतिहासिक पृष्ठभूमि

मेहर की अवधारणा इस्लामी कानून में बहुत पुरानी है। इसका उल्लेख कुरान और हदीस में भी किया गया है। कुरान में मेहर को सादक (सदका) कहा गया है, जिसका अर्थ है उपहार या देन। हदीस में मेहर को मेहर कहा गया है जिसका अर्थ है विवाह के समय दुल्हे द्वारा दुल्हन को दी जाने वाली राशि। अरब में इस्लाम के अस्तित्व में आने के पश्चात् पैगम्बर मोहम्मद ने विवाह में काफी सुधार करने का प्रयास किया। विवाह के बाअल सम्बन्धी रूप में मेहर की परिकल्पना को शामिल किया इसको सदका की संज्ञा दी गयी।¹⁶

मेहर की प्रकृति

मेहर पैगम्बर मोहम्मद साहब द्वारा प्रारम्भ किया गया और प्रत्येक विवाह के लिये अनिवार्य बना दिया। मुस्लिम विधि का मेहर रोमन विधि से कुछ सादृश्य रखता है तथापि महत्वपूर्ण अन्तर यह है कि रोमन विधि के अन्तर्गत वह स्वेच्छा पर निर्भर था और मुस्लिम विधि के अन्तर्गत वह पूर्णतया अनिवार्य है।

मेहर की प्रकृति से सम्बंधित महत्वपूर्ण बिन्दु निम्नलिखित हैं—

1— मेहर तथा विक्रय की संविदा के बीच प्रायः सादृश्य दिखाया जाता है। पत्नी की तुलना सम्पत्ति से और मेहर की तुलना मूल्य से की जाती है।

2— वह दाम्पत्य समागम के लिये एक प्रतिकार है। वह पत्नी के प्रति “सम्मान के प्रतिक” के रूप में विधि द्वारा पति पर आरोपित एक दायित्व है।

3— मेहर विवाह की आवश्यक प्रसंगति और मूलभूत विशिष्टता है, जिसका परिणाम यह होता है कि यदि मेहर न निश्चित किया जाय तो भी पत्नी पति से कुछ न कुछ मेहर पाने की हकदार होती है। (आबिदुन्निसा बनाम मोहम्मद फतहउदीन)¹⁷

उदाहरणः

अ, ब से इस शर्त पर विवाह करता है कि उसका मेहर कुछ भी नहीं है। ऐसा विवाह वैध माना जायेगा। परन्तु ऐसे विवाह का अर्थ यह कदापि नहीं है कि पत्नी को मेहर किसी भी अवस्था में नहीं मिलेगा। पत्नी को उसका मेहर कभी भी (विवाह-विच्छेद होने पर या पत्नी द्वारा मागे जाने पर) न्यायालय द्वारा दिलाया जायेगा।

मेहर का उद्देश्यः— मेहर के मुख्य रूप से दो उद्देश्य हैंः—

1— पत्नी के प्रति सम्मान के प्रतिक के रूप में पति पर एक दायित्व का आरोप करना।

2 —पति द्वारा तलाक के मनमाने उपयोग पर एक अवरोध रखना।¹⁸

मेहर का महत्वः

मेहर का महत्व मुस्लिम निकाह (विवाह) में बहुत अधिक है। मेहर दुल्हन को वित्तीय सुरक्षा प्रदान करता है और उसे अपने भविष्य के लिए तैयार करता है। मेहर का भुगतान दुल्हे की जिम्मेदारी के रूप में देखा जाता है और यह विवाह की स्थिरता को बढ़ावा देता है। **फतवा-इ-काजी खॉं** के अनुसार मेहर विवाह का एक ऐसा अंग है कि यदि विवाह के समय

¹⁵ ILR (1886) इलाहाबाद 149

¹⁶ नकवी सै0 खुशीद अकबर, मुस्लिम विधि ओरिएन्ट पब्लिशिंग कम्पनी प्रथम संस्करण, 2004

¹⁷ 41 मझस 1026

¹⁸ रशीड सयद खालिसा, मुस्लिम विधि, ई0 बी0 पब्लिकेशन द्वितीय संस्करण 2018 p-86

संविदा में उल्लेख न हो, तो भी विधि स्वतः संविदा के आधार पर उसकी उपधारणा कर लेगी।

मेहर का इतना महत्व इस कारण है कि वह पति द्वारा तलाक देने के अधिकार के मनमाने प्रयोग के विरुद्ध पत्नी को सुरक्षा प्रदान करता है। इसी कारण पत्नी के मेहर का अधिकार विवाह की संविदा का एक मूलभूत अंग है। पति पत्नी के पारस्परिक अधिकारों पर प्रभावी पारिवारिक सम्बन्धों की योजना में उसका केन्द्रीय स्थान है।

मेहर की विषय वस्तु (नियम 81):- मेहर की विषयवस्तु केवल पैसे अथवा सम्पत्ति तक ही सीमित नहीं है इसमें व्यक्तिगत सेवाएं तथा अन्य वस्तुएं भी सम्मिलित होती हैं। निम्न वस्तुओं को मेहर की विषयवस्तु माना गया है—

- 1 मुठीभर खजूर (अबू दाउद)
- 2 एक जोड़ी जूती (तिरभिझी)
- 3 यदि पति गुलाम है तो पत्नी की सेवा (मोहित सरखसी)
- 4 पति के गुलाम की सेवाएं (पत्नी के प्रति) (फतवा-इ-आलमगीरी)
- 5 पति द्वारा अवयस्क पत्नी के संरक्षकों को दी जाने वाली सेवाएं (दूरल मुख्तार)
- 6 पत्नी को कुरान की शिक्षा देना (एक प्रथा)

कोई भी निश्चित की गयी वस्तु जिसका कुछ मूल्य हो जो माल की परिभाषा में आती हो और अस्तित्व में हो मेहर की विषयवस्तु हो जाती है।

परन्तु कुछ वस्तुएं जो मेहर की विषयवस्तु बनायी जाने से वर्जित की गयी हैं, वे निम्नलिखित हैं—

1— वस्तुएं जो मेहर के निश्चित किये जाने के समय तक अस्तित्व में न आयी हो, जैसे— अगले वर्ष की फसल।

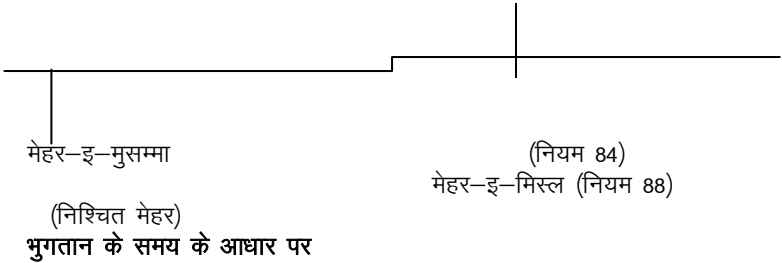
2— वस्तुएं जो मुसलमानों के लिए निषिद्ध हो, जैसे— शराब, शुअर का मांस इत्यादि।

मेहर का वर्गीकरण

मेहर का वर्गीकरण (Classification of Dower)

नियम 83

राशि के आधार पर



¹⁹ फैजी आउटलाइन ऑफ मोहम्मडन लॉ तृतीय संस्करण, 126

²⁰ मुल्ला: प्रिंसिपल्स ऑफ मोहम्मडन लॉ : 17 वां संस्करण, 277

मेहर-इ-मुसम्मा: यदि विवाह-संविदा में मेहर की धनराशी का उल्लेख हो तो ऐसा मेहर निश्चित मेहर होता है। यदि विवाह के पक्षकार व्यस्क और स्वस्थचित के हो तो वे मेहर की धनराशी विवाह के समय स्वयं निर्धारित कर सकते हैं। यदि किसी अवयस्क बालक के विवाह की संविदा उसके संरक्षक द्वारा की जाती है तो ऐसा संरक्षक विवाह के समय मेहर की धनराशी निर्धारित कर सकता है और ऐसे संरक्षक द्वारा निर्धारित धनराशी बालक के ऊपर बाध्यकारी होगी।

निश्चित मेहर दो प्रकार का होता है:-

1. **मेहर-ए-मुअज्जल (Prompt Dower)** यह विवाह के बाद मॉग पर तत्काल देय होता है। अमीर अली के मत में पत्नी मेहर के मुअज्जल भाग के भुगतान के समय तक पति के दाम्पत्य अधिवास में प्रवेश करने से इन्कार कर सकती है

2. **मेहर-ए-मुवज्जल** यह मृत्यु या विवाह विच्छेद द्वारा विवाह के समाप्त हो जाने पर अथवा करार द्वारा निर्धारित किसी घटना के घटित होने पर देय होता है। अमीर अली के मतानुसार विवाह संविदा को पूर्ण कराने के लिये पति को विवाह करने के उद्देश्य से भारत में मुवज्जल मेहर की राशी सामान्यतया अत्यधिक होती है—

मेहर-इ-मिस्ल:- यदि मेहर की राशी निश्चित न हो तो तो पत्नी मेहर-इ-मिस्ल की अधिकारिणी होती है चाहे विवाह की संविदा इस शर्त पर की गई हो कि पत्नी किसी मेहर का दावा नहीं करेगी। उचित मेहर का निर्धारण पत्नी के पिता के खानदान की अन्य स्त्रियों यथा²¹ पिता की बहनों के लिये निश्चित को ध्यान में रखते हुए किया जाएगा। खाजी मेहर की निर्धारण निम्नलिखित आधारों पर किया जाता है

1. पत्नी की निजी अर्हताएँ—उम्र, सौन्दर्य, समृद्धि, समझदारी और सदाचार
2. उसके पिता के खानदान की सामाजिक स्थिति
3. उसके पितृपक्ष की सम्बंधिनी स्त्रियों को दिया गया मेहर
4. उसके पिता की आर्थिक स्थिति
5. तत्कालीन परिस्थितियाँ

मेहर का भुगतान न किये जाने पर पत्नी के अधिकार

1. पति के साथ सम्भोग करने से इन्कार करना
2. ऋण के रूप में मेहर की धनराशी का का अधिकार
3. मृतक पति की सम्पत्ति पर कब्जा रखना।

सुन्नी विधि और शिया विधि में अन्तर

क्रम संख्या	सुन्नी विधि	शिया विधि
1	निश्चित मेहर की राशि कम से कम 10 दिरहम विहित है।	मेहर की न्यूनतम सीमा विहित नहीं है।
2	उचित मेहर की कोई सीमा नहीं है।	उचित मेहर 500 दिरहम से अधिक नहीं हो सकती है।
3	निश्चित मेहर की कोई अधिकतम सीमा नहीं है।	500 दिरहम से अधिक मेहर का करार घृणित समझा जाता है, यद्यपि अवैध नहीं है।
4	यदि मृत्यु के कारण वैवाहिक जीवन का अन्त हो जाय और मेहर या तो निश्चित न हुआ हो या न यह करार हुआ हो कि कोई मेहर नहीं दिया	इन परिस्थितियों में यदि विवाहोत्तर समागम न हुआ हो तो मेहर देय न होगा।

²¹ अहमद अकील, मुस्लिम विधि सेन्टर लां एजेन्सी, 30 वा संस्करण, 2016

	जायेगा तो उचित मेहर देय होगा। चाहे विवाहोत्तर समागम हुआ हो या नहीं।	
5	किसी करार के अभाव में मेहर के सिर्फ मुक्ति युक्त मार्ग को ही मुअज्जल होने की पूर्वाधारणा की जाती है।	पूरे मेहर के मुअज्जल होने की पूर्व धारणा की जाती है।

मेहर का भुगतान:

मेहर का भुगतान विवाह का समय या उसके विवाद किया जा सकता है। यदि दूल्हा मेहर का भुगतान नहीं करता है तो दुल्हन को अदालत में जाने का अधिकार है। अदालत मेहर की राशि का निर्धारण कर सकती है और दुल्हे को मेहर का भुगतान करने का आदेश दे सकती है।

मेहर के कानूनी पहलू

मुस्लिम कानून में मेहर के कानूनी पहलू बहुत महत्वपूर्ण हैं। मेहर की राशि दुल्हे द्वारा दुल्हन को दी जाने वाली एक प्रकार की राशि है जो विवाह के समय दुल्हे की जिम्मेदारी के रूप में देखी जाती है। मेहर की राशि का निर्धारण दुल्हे और दुल्हन के परिवार के बीच बातचीत के माध्यम से किया जाता है।

भारतीय न्यायपालिका का मेहर के प्रति न्यायिक दृष्टिकोण

भारतीय न्यायपालिका में मेहर एक महत्वपूर्ण मुद्दा है जिस पर न्यायपालिका को विचार करना पड़ता है, खासकर जब दहेज के मामले में विवाद उत्पन्न होते हैं। भारतीय न्यायपालिका ने मेहर के सम्बन्ध में कई महत्वपूर्ण निर्णय दिए हैं। इन निर्णयों से यह स्पष्ट होता है कि न्यायपालिका मेहर को एक महत्वपूर्ण अधिकार के रूप में देखती है जो महिलाओं को विवाह के समय प्राप्त होता है। न्यायपालिका ने यह स्पष्ट किया है कि मेहर का भुगतान दुल्हे द्वारा दुल्हन को करना आवश्यक है और इसका उल्लंघन करने पर कानूनी कार्यवाही की जा सकती है। भारतीय न्यायपालिका में मेहर के सम्बन्ध में कई महत्वपूर्ण मामले सामने आए हैं। इन मामलों में से एक महत्वपूर्ण मामला है—

मोहम्मद अहमद खान बनाम शाह बानो बेगम²²

इस मामले में उच्चतम न्यायालय ने निर्णय दिया कि मेहर का भुगतान दुल्हे द्वारा दुल्हन को करना आवश्यक है और इसका उल्लंघन करने पर कानूनी कार्यवाही की जा सकती है।

श्रीमति नाजिमा बेगम बनाम रिजवान अली²³ के मामले में इलाहाबाद उच्च न्यायालय में यह मत व्यक्त किया है कि मुअज्जल मेहर को प्राप्त करने का अधिकार समागम से पूर्वगामी है। इस वाद में अवलोकन किया गया कि निःसंदेह मुस्लिम विधि के अन्तर्गत मेहर का तात्पर्य ऐसी धनराशि अथवा सम्पत्ति से होता है जिसे विवाह के प्रतिफल के रूप में प्रति से प्राप्त करने के लिए पत्नी हकदार है।

हमीरा बीबी बनाम जुबैदा बीबी²⁴ के बाद में न्यायिक समिति ने यह निर्णय दिया कि मुस्लिम विधि के अन्तर्गत मेहर विवाह की हैसियत की एक आवश्यक प्रसंगति है। ऐसा इस हद तक है कि जब विवाद की संविदा के समय उसका उल्लेख न किया गया है तो विधि यह घोषित करती है कि नियत सिद्धान्तों के अनुसार उसका निर्धारण आवश्यक है। मेहर नियत करने का एक महत्वपूर्ण आधार खानदान की दूसरी स्त्रियों का मेहर है।

²² 1985 SSC (2) 556

²³ AIR 1980 All 119

²⁴ (1916) 38 इलाहाबाद 581

मोहम्मद शहरबुद्दीन बनाम उमरतुरसूल (1960) पटना 511 के बाद में पटना उच्च न्यायालय ने कहा — मेहर की राशी सामान्यतया मौखिक संविदा द्वारा नियत की जाती है और यह रीति मान्य है। मेहर की राशी पति में निहित तलाक देने की शक्ति के मनमाने प्रयोग को रोकने की आवश्यकता, स्त्री के पिता के खानदान की स्थिति, स्त्री की बौद्धिक योग्यता, वैयक्तिक आकर्षण और योग्यताएँ, पति की आर्थिक स्थिति, स्त्री की परवर्ती सामाजिक अवस्था पर निर्भर होती है।

मिर्जा बेदूर बख्त बनाम मिर्जा कामरान बख्त (1948) लाहौर 136 मद्रास उच्च न्यायालय ने निर्णीत किया है कि दम्पति किसी भाग का भुगतान सुव्यवस्था रूप में स्थगित न कर दिया गया हो कम से कम मद्रास प्रेसिडेन्सी के क्षेत्र में मेहर के मुअज्जल होने की पूर्व धारणा की जानी आवश्यक है।

अमजुम हसन सिद्दीकी बनाम सलमा बीबी इस मामले में इलाहाबाद उच्च न्यायालय में यह निर्धारित किया कि एक परित्यक्ता स्त्री द्वारा धारा 3 मुस्लिम स्त्री (विवाह विच्छेद होने पर अधिकारों की रक्षा) अधिनियम 1986 के अन्तर्गत मेहर की धनराशी से सम्बन्धित आवेदन पत्र सम्बन्धित आवेदन मजिस्ट्रेट के न्यायालय में ही प्रस्तुत होगा।

निष्कर्ष— अतः उपरोक्त विवेचन से स्पष्ट है कि मेहर वह वस्तु है जिसका कोई मूल्य होता है। मेहर की राशी प्राप्त करने के लिए पति अधिकृत माना गया है। यदि पति की मृत्यु हो जाती है तो मेहर की राशी की अदायगी पति के उत्तराधिकारियों द्वारा की जाएगी। विधवा या तलाकशुधा पति मेहर श्रण की वसूली हेतु उस सम्पत्ति की बाबद वाद संस्थित कर सकती है जो पति के कब्जे में है। भारतीय न्यायपालिका की भूमिका मेहर के मामले में बहुत महत्वपूर्ण है। न्यायपालिका को यह सुनिश्चित करना होता है कि मेहर का भुगतान दुल्हे द्वारा दुल्हन को किया जाए, और इसका उल्लंघन करने पर कानूनी कार्यवाही की जाए। न्यायपालिका को यह भी सुनिश्चित करना होता है कि महिलाओं को उनके अधिकारों के बारे में जागरूक किया जाए और उन्हें न्याय प्राप्त करने के लिए उचित सहायता प्रदान की जाए।



उर्दू विभाग में श्री हक्कानुल कासमी व डॉ० जेबा नाज के सम्मान समारोह का दृश्य

उर्दू विभाग की गतिविधियाँ

1. शिक्षकों द्वारा राष्ट्रीय तथा अंतरराष्ट्रीय स्तर पत्रिकाओं में प्रकाशित शोध पत्र— प्रो. असलम जमशेदपुरी के 5 शोध पत्र अंतरराष्ट्रीय स्तर की पत्रिकाओं में तथा 20 शोध पत्र राष्ट्रीय पत्रिकाओं में, डॉ. आसिफ अली के तीन शोध पत्र राष्ट्रीय पत्रिका में, डॉ. शादाब अलीम के तीन शोध पत्र राष्ट्रीय पत्रिका में, डॉ. इरशाद स्यानवी का एक शोध पत्र अंतरराष्ट्रीय स्तर की पत्रिका तथा तीन राष्ट्रीय स्तर की पत्रिका में प्रकाशित।

2. शिक्षकों द्वारा प्रकाशित पुस्तक— प्रो. असलम जमशेदपुरी की एक पुस्तक “धनौरा” उपन्यास का हिंदी वर्जन, डॉ. इरशाद स्यानवी की एक पुस्तक “फिक्शन तनकीद : रिवायत और असरी मंजरनामा” प्रकाशित हुई हैं।

3. राष्ट्रीय तथा अंतरराष्ट्रीय स्तर के सम्मेलन/सेमिनार/कार्यशाला का आयोजन— 1 अंतरराष्ट्रीय सेमिनार एवं तीन राष्ट्रीय सेमिनारों का विभाग द्वारा ऑफलाइन आयोजन किया गया है तथा राष्ट्रीय – अंतरराष्ट्रीय स्तर की लगभग 35 संगोष्ठी ऑनलाइन आयोजित की गई हैं।

4. राष्ट्रीय तथा अंतरराष्ट्रीय स्तर की सम्मेलन/सेमिनार/कार्यशाला में प्रतिभाग – प्रो.असलम जमशेदपुरी ने एक अंतरराष्ट्रीय एवं चार राष्ट्रीय, डॉ. आसिफ अली ने एक अंतरराष्ट्रीय एवं तीन राष्ट्रीय, डॉ. शादाब अलीम एक अंतरराष्ट्रीय एवं तीन राष्ट्रीय, डॉ. अलका वशिष्ठ ने एक अंतरराष्ट्रीय और चार राष्ट्रीय, डॉ. इरशाद स्यानवी ने एक अंतरराष्ट्रीय और तीन राष्ट्रीय, फरहत अख्तर ने एक अंतरराष्ट्रीय और तीन राष्ट्रीय सेमिनारों में प्रतिभागिता की।

4. अन्य विश्वविद्यालयों/संस्थानों में दिए गए विशेष व्याख्यान— 3 व्याख्यान प्रो. असलम जमशेदपुरी द्वारा तथा 1 व्याख्यान डॉ. शादाब अलीम द्वारा दिया गया है।

5. नेट/जेआरएफ में उत्तीर्ण छात्र-छात्राएं— 3 छात्राओं ने नेट परीक्षा उत्तीर्ण की— सैयदा मरियम इलाही, फरहत अख्तर, नुजहत अख्तर।

6. विभाग के छात्र-छात्राओं का नौकरी में चयन— 4 छात्राओं का दिल्ली बोर्ड द्वारा केंद्रीय स्कूलों में चयन एवं ज्वाइनिंग।

7. अन्य – उर्दू विभाग द्वारा महिलाओं के उत्थान के लिए एक संस्था “मजलिस उन निसा” की स्थापना की गई।



मेरठ के मशहूर गज़ल गायक श्री मुकेश तिवारी बयाद-ए-हक्की हिज़ी कार्यक्रम में गज़ल पेश करते हुये



2-1
جلد نمبر 21-22

ગોશા-એ-અદબ અતપાલ

[illegible][illegible]

انسانی کی سطوح پر اے کی طرح اسی دوا کو گھسیٹا ہے۔ اس کے سپرد ایڈیٹر کریں۔ انکی آکھوں پر 40% عارضہ ہوئی ہا سٹنگی ۔

تلفون: 0511119865

E-mail: upurduakademi3@gmail.com

उर्दू विभाग, चौधरी चरण सिंह विश्वविद्यालय, मेरठ